

خوبصورت کسائیوں کا مجموعہ

سینسٹیشن ڈائجسٹ

ماہنامہ

فروری 2015

گلشن

مہینہ



WWW.PAKSOCIETY.COM

FEB-2015 PRICE RS. 60/=

REGD. NO. 1884

Monthly SUSPENSE DIGEST

انشائیہ

جون ایلینا

ستانون سازی اور ستانون کی
پابندی پر ایک صاحب نظر کا اظہار

سینس کی مجلس مشاورت و ستارٹین کی تلخ و
شیریں باتیں گلے شکوے اور حسدوں مشہورے

ماضی کا آئینہ۔ اختیار اور اختیار اختیار
انسانی کے سبب آموز اور عبرت آمیز واقعات

دکاندہ عشق

الیاس سینتاپوری

16

آپ کے خط

مدیر اعلیٰ

08

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

سورائے جنوں

84

ڈاکٹر شہزادہ منٹو

کامیاب مفتوح

75

اجنبلی رنگت اور سرود چہ سرون والی
شیطانی قوتوں کی بربریت کا لرزہ خیز منظر
مکافات کی لپیٹ میں آنے والے
عقل مندوں کی مندی عقل کی روداد



پہیلی کی صورت الجھادینے
والی ایک۔ دو شیزہ کا قصہ

دوسروں کی منگت میں جنل
اندازی کرنے والے ایک ساحر کی فتکاری

کاش

ملک صفدر حیات

128

مہمان

ڈاکٹر نعیم

117

قارئین

محفل شعرون

160

ڈاکٹر شیر شاہ سید

گہرا خم

155

آپ کے ہاتھوں ہی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

سارے رشتوں میں ایک
عظیم ترین رشتے کی نفرتوں کا قصہ

جلد 45 • شمارہ 02 فروری 2015 • ذرا لانا 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

خط کتابت کاپنا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: (021) 35895313 • نیکی (021) 35802551 • E-mail: jdpgroup@hotmail.com

Copied From Web

واپسی کا سوال
تذکرہ خلیل

163

واپسی کے تمام اراحتے مسدود کر کے اچھے
انجام کی توقع رکھنے والے کی عبرت نثر کہانی

کسی کی زندگی کے شب و روز میں اپنا
عکس دیکھنے والے شخص کی ذہانت کا ثبوت

ایک چھوٹی بوپ بھی چھاؤں میں دھوپ بھرتی کی
مناجیوں رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک نیا سلسلہ

نیشیں
شیر م خلیل

217

ماروی
محی الدین انوار

174

عارف حق
صبا نسیم بلگرامی

227

قطعہ کہانی
منظور احمد

223

اللہ کے ایک نیک بندے
کے سچے قول فعل اور کھری میزان کا قصہ
دل کے حور اور ظہر کے دھوکوں پر مشتمل
ایک حیرت انگیز کہانی



آنکھوں کے رستے دل میں گھر
کرنے والوں کا گشتہ گی کا ماجرا
تمام اندیشوں سے بے نیاز
ایک منہ بہ ساز کی حب لالائی

زندہ بھوت
تنویر ریاض

241

بانڈیر
سلیم انور

239

کتر نہیں
ارازہ

252

عکس
کاظم زبیر

252

دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطفے پہنچے
انتہاسات، مسکرائیں اور تہمتیں سب پہنچا آپ کے لیے

سچے سوتیوں کی چھوٹی وفاداری کا پر فریب
منظر... ایک ممتا کی ماری کا دلخراش احوال



Pakistan's ONLY
Baking Soda
Toothpaste



دانت سفید چاکلپ

 [facebook.com/snscares](https://www.facebook.com/snscares)

SW-08-14

Copied From Web



قانون

”تم باہر تو جا رہے ہو مگر تمہیں کسی نے اغوا کر لیا تو.....“
 ”ہوں..... میں، ہر تو جا رہا ہوں مگر مجھے کسی نے اغوا کر لیا تو..... مجھے کسی نے اغوا کر لیا تو.....“
 ”مگر تم مجھے خواخوہ دہلا تے رہتے ہو۔“
 ”میں خواخوہ دہلا تا رہتا ہوں..... تمہیں مقدس صحیفوں کی قسم، کیا تم یہ بات دل سے کہہ رہے ہو؟“
 ”تو پھر تم بھی میرے ساتھ چلو۔“
 ”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں..... مگر ہم دونوں کو اغوا کر لیا گیا تو.....؟“
 ”ہاں یہ تو ہے۔ اگر ہم دونوں کو اغوا کر لیا گیا تو..... تو پھر؟“

”تو پھر یہ کہ باہر تو جانا ہی ہوگا، ہم اندر کب تک رہ سکتے ہیں؟ باہر ہی تو ساری زندگی ہے۔ باہر ہی تو سب کچھ ہے۔ ہمارے نام اور ہماری پہچان بھی تو باہر ہی ہے اور یہ کہ تم بھی تو میرے باہر ہی ہو..... میں بھی تو تمہارے باہر ہی ہوں..... میرے اور تمہارے سانس بھی تو باہر ہی ہیں۔“

”میرے بھائی! آخر ان بستیوں کو ہو کیا کیا ہے؟ وہ کون لوگ ہیں جو نہ جانے کہاں سے یہاں آ گئے ہیں؟ بہت سے لوگوں نے اسی بستی میں ہوش سنبالا ہے، کوئی بتائے کہ یہ لوگ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں.....؟“

”یہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ باہر سے آئے ہیں؟ گنیں یہ لوگ ہمارے اور تمہارے اندر سے تو نہیں نکل آئے؟“
 ”ہاں، ایسا ہوتا سکتا ہے کہ یہ لوگ ہم ہی میں سے برآمد ہوئے ہوں..... اور ایک دوسرے کو خود ہی اغوا کر لیتے ہوں مگر پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ہونا تھا مگر کبھی کبھی..... لیکن اب تو یہ روز کا معمول بن گیا ہے۔ ایسا کیوں ہوا ہے؟ یہ گلیاں، یہ نگر، یہ راستے، یہ شاہراہیں اور یہ بستیاں اتنی مہلک اور مہیب کیوں ہو گئی ہیں؟ ہم نے تو ان بستیوں کو بڑے چاؤ سے بسایا تھا، ہم نے تو اپنے مسکنوں کو اجاڑ کر ان بستیوں کو اپنا مسکن بنایا تھا..... تو پھر یہ بستیاں ہمارے اور تمہارے حق میں اتنی نامہرباں کیوں ہو گئی ہیں؟ میرا نام زید ہے، میں اردو بولتا ہوں اور میں اس بستی میں غیر محفوظ ہوں۔ میرے ایک دوست کا نام مہتاب منگر یو ہے، وہ سنہمی بولتا ہے اور وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے۔ میرے ایک اور دوست کا نام عثمان بلوچ ہے، وہ بلوچی زبان بولتا ہے۔ اردو بھی جانتا ہے، وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے۔ میرا ایک یار ہے القار جالب، جو پنجابی اور اردو میں لکھتا ہے۔ اسی بستی میں رہتا ہے اور وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے۔ اور میرا ایک یار ہے القار جالب، جو پنجابی اور اردو میں لکھتا ہے۔ اسی بستی میں رہتا ہے اور وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے۔“

”مگر پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اب ایسا کیوں ہوتا ہے؟ پہلے اگر ایسا ہوتا بھی تھا تو بہت کم ہوتا تھا۔“
 ”سنا چاہتے ہو.....؟ یہ قانون کی شکست ہے۔ یہ قانون کی بے حرمتی ہے اور یہ قانون کی معزولی ہے۔“

”ہیں..... قانون کو کس نے معزول کیا؟ قانون کی کس نے بے حرمتی کی؟“

”قانون کو کس نے معزول کیا، قانون کی کس نے بے حرمتی کی..... میرے بھائی! کیا تم یہ بات بھی نہیں جانتے؟ یہ بات تو کریم سبزی فروش بھی جانتا ہے اور یہ بات تو خلیفہ مجید کے اکھاڑے کے پٹھے بھی جانتے ہیں..... اور یہ بات تو توحید تراث بھی جانتا ہے کیا میں اس سے آگے بھی کچھ کہوں؟ یہ بات تو وہ لوگ بھی جانتے ہیں جو حکومت کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے قانون بنایا اور اب جو فرق پڑا ہے، وہ یہ ہے کہ عام آدمیوں نے بھی قانون سے حیلنا شروع کر دیا ہے۔ جب تک قانون بنانے والے قانون کا احترام نہیں کریں گے تو بستیوں اور شہروں کے عام لوگ بھی اس کا احترام نہیں کریں گے۔ حکمرانوں سے کہو کہ وہ عام آدمیوں سے یہ سمجھواتا کریں کہ؟ قانون ہم نے بنایا ہے، ہم بھی اس کا احترام کریں گے اور تم بھی اس کا احترام کرو گے..... اور اگر نہیں تو نہیں، ہرگز نہیں۔ اگر تم آری کو قانون کا پابند بنایا گیا تو پھر خاص آدمیوں کو بھی اس قانون کی پابندی کرنی پڑے گی۔ اگر قانون کی دوطرفہ رعایت نہیں کی گئی اور اس کی حرمت کو برقرار نہیں رکھا گیا تو پھر ان بستیوں میں جنگل کے درندے ہی آ کر ہانپوں گے۔“

❦ ❦ ❦



محترم قارئین
السلام علیکم!

فروری 2015ء کا دُھریب شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے..... مہذب حاضر میں ماہ فروری کو محبت سے منسوب کیا جانے لگا ہے۔ یہ نظریہ کبھی سے بھی مستعار لیا گیا ہو اور خواہ ایک دن کے لیے ہی سہی، محبت و خوشی کی بجلی کی لہر ضرور دلوں میں ابھرتی ہے لیکن..... اس حوالے کا جو مخصوص مطلب لیا جاتا ہے وہ بے شمار برائیوں کو جنم دینے کا سبب بھی بن سکتا ہے لہذا مثبت رویہ ہی بہترین طرز عمل ہے۔ محبت کا ایک خوب صورت حوالہ پھولوں کے مانند مصوم بیج ہیں لیکن دمبر میں پشاور آرمی پبلک اسکول میں انہی پھولوں کو جس بے دردی سے روندنا گیا مگلی تاریخ میں اس سے بدترین مثال اور کوئی نہ ہوگی۔ جانے والے اپنی داستان تھوڑے گھر گئے مگر گئے جانے والے سچے اس خوبی داستان کو کبھی نہ بھول جائیں گے۔ خوف کا یہ نہ ہر اس نئی نسل کے اذہان و قلوب کو اپنی آلودگی سے باہر نہ لگنے دے گا۔ ”بہت دیر کی مہرباں آتے آتے“ کے مصداق مگلی سلامتی کے لیے تمام جماعتوں اور پوری قوم کا ایک نقطے پر متحد ہونا کہ اب مزید لاقانونیت اور دہشت گردی برداشت نہ کی جائے گی..... بلاشبہ مثبت سوچ اور رویہ ہے لیکن قیمتی جانوں کا نقصان کبھی نہ پورا کیا جاسکے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کمزور نظام فرعونیت کو فروغ دینے کا سبب جتا ہے۔ اگر ”نظام“ کی ابتدا کے بارے میں غور کیا جائے تو ہر انسان کو سب سے پہلے اپنے اندر جمنا کتا پڑے گا کیونکہ ”نظام“ ایک ایسی ترتیب کا نام ہے جس سے وجود یا کوئی معاشرہ تشکیل پاتا ہے اور جہاں اس ترتیب میں کچھ گڑبڑ ہوتی ہے وہاں نتائج بھی غلط نکلتے ہیں اور نئی غلط نتائج کی وجہ سے وجود یا اور معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ لہذا نظام کی تبدیلی کے لیے ترتیب کو درست کرنا ضروری ہے اگرچہ حالیہ دنوں میں حکومت کی جانب سے نظام کی درستی کے لیے بہتر اقدامات کیے جا رہے ہیں لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کے ثمرات کب تک عوام کے حصے میں آتے ہیں اور اب اچھی امیدوں کی آس لیے چلتے ہیں اپنی نیت کھٹ محفل کی جانب۔

✽ اور شہوار بھی بڑا دہ، بہاولپور سے تشریف لائی ہیں ”سپنس ڈائجسٹ“ نئے سال کی نوید دیتا ہوا 17 دمبر کو ملا۔ مگر سانحہ پشاور کا سن کر دل غم سے چرچا۔ ٹائٹل دل میں سما گیا۔ حسینا اپنے بالوں میں پھول سجائے نئے سال کی خوشیوں کا انتظار کر رہی ہے۔ بے دوقی میں جون اطمینان کی کڑوی کھلی باتیں یہ شکل سہمے۔ اے۔ ادارہ اچھا رہا۔ تفسیر عہاس باہر صاحب کو صدارت مبارک۔ رمضان پاشا اچھے تہرے کے ساتھ موجود تھے۔ اعجاز احمد رائل مہی کا تہرہ کو کہتے تھے لیکن جانتا رہتا تھا۔ ظاہر و گلزار ہمیشہ شکوہ کرتی نظر آتی ہیں۔ گل مروت نے بھی اپنے لالاؤں کے ساتھ شادی کے بعد حاضری دی۔ سحر یہ بخاری آپ نے یہ کیوں کہا کہ ٹائٹل دیکھ کر آنکھوں میں سوتیا اتر آیا حالانکہ آپ کا سوتیا پک گیا ہے۔ اشفاق بی الدین آپ نے زویا اعجاز کے بارے میں درست تجزیہ کیا ہے۔ مہربان ناز کا تہرہ واقعی انتہا ہوتا ہے۔ میری ہم شہر بشری افضل جی آپ کو مس کرتے ہیں۔ نئے سال کی کہانیاں بہت اچھی درجہ کی سے بھر پور ہیں۔ موڈ خوشگوار کرنے کے لیے سب سے پہلے منظر امام کو پڑھا۔ پہلے آئیے، واقعی لیں یہ مسکراہٹ بکھر گئی..... دعاؤں سے واقعی تقدیر بدل جاتی ہے اور ہمیں اپنی اچھی نیت اور دعاؤں کا پھل ملتا ہے۔ تئوریہ ریاض کی چھان بین، ہر انسان میں خامیاں خوبیاں ہوتی ہیں فرشتہ جیسا انسان تلاش کرنے والی لڑکیاں اکیلا رہ جاتی ہیں۔ مرزا امجد بیگ نے کہنہ مشق میں اشتیاق بیگ کے قاتلوں کو بہترین طریقے سے بے نقاب کیا۔ زگرس اور فرید غوری نے فل پلانٹ کی وحیدہ کو پھنسا نے کی مگر مجرم کہیں نہ کہیں غلطی کر ہی جاتے ہیں۔ ماری کوئی اب صاحب نے محبت سے شروع کیا اور اب مراد صاحب بھارت میں جرائم کی دنیا میں کھوکھرت محبت سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ سوائے جنوں، ڈاکٹر عبدالرب یعنی اسلام دشمن عناصر کو نئے انداز میں بے نقاب کر رہے ہیں لیکن تمام سازشی لوگ منہ کی کھاتے ہیں کیونکہ اسلام دین حق ہے۔ سلیم قادری صاحب کی بے شرم سافت بیسٹ رہی۔ صلحہ کے شب و روز مرثیہ کی موت اور شہرہ کی منہ بیک واپسی کی داستان پر لکھتے تھے۔ امام ابو العباس اللہ کی رضا میں رہنے والے ہی اللہ سے اور مخلوق سے عزت پاتے ہیں۔ ضیا نسیم بلگرامی کو اللہ رب العزت ہمیشہ خیر عطا کرے۔ محفل شعر و سخن یا محفل دلربا ہی اتنے اعلیٰ ذوق اشعار کے دل شش اش کر اٹھے۔ قارئین کے ساتھ سلیکٹرز کے لیے بھی ویڈیو سن۔ مرسلے بھی قابل تھے۔ 2015ء کا پہلا شمارہ فرسٹ پوزیشن میں پاس ہوا۔ (بھر پور تہرہ کرنے کا شکریہ)

✽ شانہ حسن (ہرور کینٹ سے جلی آرمی ہیں) اپنا لاڈلا چیتا اور چھارا اسپنس اپنی تمام برائیوں کے ساتھ 18 دمبر کو ملا۔ ادب کے افق پر چمکتا ہوا اسپنس وہ درخشش چاند ہے جس کے ارد گرد ان گنت دھنک رنگ ستارے جھل جھل جھل جھلار رہے ہیں۔ سرورق بہت پسند آیا۔ میرے ہم وطن سانحہ پشاور پر جتنا بھی غم ہوا کیا جائے کم ہے۔ جب بھی کوئی ایسا ہونا کہ واقعہ ہوتا ہے ہمارے سیاست دان یک زباں ہو کر ایک ہی نقطہ کہتے ہیں کہ ہم اس واقعے کی پمڈرمت کرتے ہیں۔ کاش پاکستان ہماری زندگی میں ہی امن کا جوارہ بن جائے۔ تفسیر عہاس صاحب کو اتنے بڑے تہرے کی مبارک باد۔ شاداب و ماہتاب آپ نے سوہنی لڑیوں کو یاد کیا اور ہم حاضر۔ ابرار وارث واقعی لائق سنوڈنٹ پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔



طالب حسین ظلوا اللہ تعالیٰ آپ کے امیری کے دن تمام کرے۔ تبہرا اچھا تھا۔ عادل خان ہمیں آپ کی ادارے کو ذی گنی گز اہل اچھی لگی۔
 زیب حسن گیارہ مہینے خائب رہنے کی وجہ شوکت بھائی نے گل مروٹ کی ساری مصروفیات بتادیں۔ ہارون چہرس اپنے نام پر کیوں نہیں
 آئی۔ سلیم فاروقی کی بے شرم مسافت، ہمدرد و غلط محبت نے بگاڑ دیا تھا مگر مشاکی محصوم محبت نے اس کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ
 نے معافی کی صورت میں شہرہ کا ساتھ عطا کیا، ناقابل معافی ڈاکٹر شیر شاہ سید نے بتایا کہ درہن مانی بد عنوانی کرنے والوں کو معاف نہیں کرتے لیکن ہم
 پاکستانی ایسے لوگوں کو سراگھوں پر بٹھاتے ہیں۔ جہان بین خوریر ریاض ہر انسان میں کوئی نہ کوئی خامی ہوتی ہے۔ کوئی بھی بے عیب نہیں اور لینا کو بے
 عیب سامھی چاہیے تھا۔ منظر ام پہلے آئے میں اپنے مخصوص مسائل میں آئے۔ ان کی تحریر پڑھ کر موڈ خوشگوار ہو جاتا ہے۔ سلیم انور گلگتہ میں بتاتے
 ہیں کہ موٹے لوگ اگر اپنے منہ کو کذب لگا لیں تو بہت سی مشکلات سے بچ سکتے ہیں۔ راہ عشق میں سید احتشام اگر عشق کی راہ سیدھی ہوتی تو ہر انسان اس
 سے آسانی سے گزر جاتا۔ ظاہر جاوید فضل صاحب، یہ اربئی بڑوں کو کیوں نہیں ہوتی کیونکہ وہ سچی محبت نہیں کرتے اور وہ بڑوں کے آنسو کا مطلب بھی
 نہیں سمجھ پاتے۔ کاشف زیب کی عنقریب ہر ماں اپنی اولاد سے اسی طرح محبت کرتی ہے، میگاٹ بھی چاہتی تھی کہ اس کا چہنا زندہ رہے۔ ماروی میں
 جناب محی الدین نواب آخر کار قارئین کا دل جیتنے میں کامیاب ہو گئے۔ جرائم کی دنیا میں مراد نے بہت دشمن پال لیے۔ سو دئے جنوں میں عبدالرب
 بھی صاحب مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن یہودیوں کی سازشیں بے نقاب کر رہے ہیں۔ اسٹوری ویجی کی طرف رواں دواں ہے۔ محفل
 شعرو سخن کا معیار بڑھتا جا رہا ہے۔ ہر شعر و قطعہ پڑھ کر دل جموم جموم جاتا ہے۔ زاہد چودھری، امیرین ناز، مسد یہ بخاری، نورین عباس اور عائشہ بانی کے
 انتخاب بہت حسین تھے۔ مرے لیے بھی کافی معیاری تھے۔“

✽ محمد صفدر معاویہ، خانیوال سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں۔ جنوری 2015ء کا شمارہ 17 دسمبر کو اپنے شہر خانیوال میں حاصل کیا۔
 سرورق کوہ ڈل اور نیا سال مبارک سے سجایا گیا۔ جون ایلینا کا ایک ایک لفظ لیتی تھا۔ آپ کا ادارہ قابل تحسین تھا۔ اب یہ لکھتے ہوئے ہاتھ کانپتے ہیں
 اور دل خون کے آنسو روتا ہے کہ 132 بچوں سمیت 142 افراد کو سلاوا یا گیا۔ خالوں کو ذرا بھی ترس نہ آیا۔ ان پھول جیسے بچوں کا کیا قصور
 ہے بچے تو بچے ہوتے ہیں چاہے کسی کے بھی ہوں۔ کیا ان کو ذرا بھی خوف نہیں آتا۔ ہمارے بچوں کے ساتھ ایسا ہو جائے تو..... میں پاکستان کی
 ماؤں کو سیلوٹ کرتا ہوں کہ بچے قربان کروانے کے بعد بھی ان کے حوصلے چٹانوں جیسے ہیں۔ ماؤں کے جنت کے پھول جنت میں چلے گئے۔ جب
 تک جان میں جان ہے ہم پاکستان کی خاطر پاکستان میں رہنے والوں کی خاطر لاتے رہیں گے۔ تفسیر عباس بابر کا اچھا تبصرہ تھا۔ ویڈیو۔ قدرت
 نازنی اور اعجاز احمد راحیل کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ باقی سب دوستوں کے تبصرے بھی بہت نائس تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے عشق ناقام
 پڑھی۔ خامر کی قربانی نے بہت متاثر کیا تو وہیں میزہ نے بہت مایوس۔ ماروی عجیب تر اسٹوری جاری ہے۔ مراد ایک سے دوسرے امتحان میں پڑتا
 جا رہا ہے۔ سو دئے جنوں ڈاکٹر عبد الرب بھی کے کلمے سے لکھی گئی سچ پر مبنی تحریر ہے۔ بے شرم مسافت، ہمدرد نے ایک طلحی کی اور کتا بچتا بچتا چلا
 بہت عشق میں بہت صاحب نے بہترین نکالت کرتے ہوئے مجرم کو چھان۔ باقی سب کہانیاں بھی سیٹ تھیں۔ اشعار کی محفل اور کڑی بھی بہترین
 تھیں۔ سال نو کا پہلا شمارہ بیست رہا۔“

✽ محمد قاسم رحمان، ابراہار کالونی ہری پور سے محفل کی زینت بنے ہیں۔ 20 دسمبر کو سہنس میر سے دل کی ٹھری میں اترا۔ ٹائل بہت
 زبردست۔ ٹائل گرل مجھے زویا اعجاز لگی۔ یقین جانیے میرے وہاں میں آپنی زویا اعجاز کا ایسا بلکہ بالکل ایسا ہی خاک کہ ہے ساتھ میں اسٹائلش
 کر کے لکھا ہوا نیا سال مبارک ٹائل کو بریکٹ کر رہا تھا۔ سب سے پہلے اواز یہ پڑھا۔ واقعی ہمارا ملک نازک دور سے گزر رہا ہے اور اس کے
 ذمے دار ہمارے تمام سیاسی لیڈر ہیں۔ اس مرتبہ کری صدارت پر اوکاڑہ سے تفسیر عباس بابر کا قبضہ تھا۔ وزارت کے عہدے پر یوسف سانول کا کر
 تھے۔ گل مروٹ، قدرت اللہ نازنی ویکم کرنے اور تبصرہ پسند کرنے کے لیے بڈل آف ٹھیکس۔ باقی ظاہرہ گزار اور سید اکبر شاہ شکر ہے آپ
 دونوں واپس آ گئے۔ دراصل میں نے آپ کی تحریریں پڑھ کر ہی لکھنا شروع کیا تھا۔ کہانیوں کی ابتدا اس مرتبہ خلاف معمول منظر امام کی تحریر سے
 کی۔ کیا افسانوی ناپک تھا۔ حقیقت سے بہت دور۔ ظاہر جاوید فضل عرف محفل انکل کیا کہنے آپ کے۔ آپ ایسا لکھتے ہیں کہ پڑھنے والا اس میں
 ڈوب ہی جاتا ہے۔ اس مرتبہ ڈاکٹر شیر شاہ سید کچھ خاص متاثر نہ کر سکے۔ ماروی کی یہ قطعہ دھماکا خیز تھی۔ حالات مراد کے حق میں ہو رہے ہیں۔ اس
 مرتبہ مراد نے زبردست چال چلی۔ دوسری جانب مرید سمدھ نے کا نام نہیں لے رہی۔ آخری صفحات پر بے شرم مسافت بہت زبردست رہی۔ شہرہ
 انراپنے جذبات کو نہ چھپاتی تو، مشاق جان بچ سکتی تھی۔ شہنوش مسانتھا ایلمشن نے بڑی مہارت اور پراسرار طریقے سے جسم کا وزن ڈیڑھ سو
 پونڈ کم کر دیا۔ راہ عشق زبردست تحریر تھی مگر انجام غیر متوقع تھا۔ کہنہ عشق مرزا احمد بیگ نے بڑی مہارت کے ساتھ ایک اچھے ہوئے کس کو گل کہا۔
 مجھے شروع ہی سے ترس پر شک تھا۔ جہان بین اور عنقریب اچھے ناول تھے۔ عشق ناقام بھی آخر کار تمام ہوا ویڈیو۔ میرا یہ خط فروری میں شائع
 ہوگا اور 10 فروری کو میرا تبصرہ آئے ہے، یقیناً ادارہ مجھے ضرور دوش کرے گا۔“

✽ اور نیس احمد خاں، نغمہ آباد، کراچی سے محفل میں شریک ہیں۔ ٹائل چیتے مسکراتے چہرے والی نازین آنے والی نئے سال کی
 ساتوں کے دھریب نقاروں کے نئے نئے خوب بننے میں مصروف ہیں۔ سال 2014ء جو طع یادوں کے الم ناک لہوں پر مشتمل تھا گزر گیا۔ جس
 میں ایسے ہی ایسے تھے۔ جس سر تازہ تازہ پشاور کا انانیت سوز واقعہ انیت کے نام پر برنما دھہ ہے۔ گزرتے محفل میں بھی روز بروز دھہر کے
 بھونک سے ہکتے نچے جو روٹی کے حصول میں ناکام بہت۔ جان کی بازی ہار گئے۔ دوسری ہی کے تبصرہ کو شے تھے کسی ماں کی آرزو تھے کسی باپ کے ارمان



تھے۔ انسان جان جو اہم ترین شے ہے جس کا دنیا کی جیتی سے لیتی، دولت سے موازنہ نہیں کر سکتے۔ افسوس صد افسوس انسان انسانیت کی معراج سے گزر گیا ہے۔ انٹائیپ جس میں انسان کی بے بسی کو لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اور کہے میں بھی کچھ بھی اسباب بیان کیے گئے ہیں مگر ہر حالت میں ہر مشکل میں انسان کا کام تو صبر و شکر اور اللہ سے بہتری کی ہی امید رکھنا اور دعا مانگنا لازم ہے کیونکہ وہ مسہب الاسباب ہے۔ سسٹمز میں سب سے پہلے سو دوائے جنوں پر مبنی۔ جس میں حصص جنوبی اسرائیلیوں کی مسلمانوں سے ازلی دشمنی کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ جنہوں نے ظلم کرنے میں نازیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ دوسری کہانی نئی الدین نواب کی ماروی تھی۔ کہانی بس چل رہی ہے کوئی نیا پن نظر نہیں آ رہا ہے۔ تیسری کہانی الیاس بیٹا پوری کی کہانی عشق ناقص تھی۔ حضرت کاشف زہیر کی اچھی کہانی تھی۔ جدا انتقام طاہر جاوید محفل کی منفرد کہانی تھی جس میں محبت کے لطیف جذبات کا اظہار کیا گیا۔ کہتے عشق احمد بیگ کا اچھا کارنامہ تھا۔ راہ عشق نے بھی اثر پذیر ی کا کام کیا۔ شعر و سخن میں اچھے اور معیاری اشعار نے مرہ و دیا۔ کلچر بھی بہتر تھی۔ پہلے آئیے مسٹر امام کی گفتگو تحریر تھی۔ امام ابو العباس نے دل کو ایمان کی روشنی سے منور کیا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر ناقص معافی نے بھی بہت متاثر کیا۔ ان کی کہانیاں دلوں کو ہنسنے والی ہوتی ہیں۔ چھان بین بھی اچھی لگی۔ اقوال زریں بھی اچھے لگے۔ آخری صفحات کی کہانی بے شرف سائنس کی بہترین کہانی تھی۔ صدف راجی تک دو دو کے بعد کچھ حاصل نہ کر سکا۔ محبت بھی بے شرم رہی۔ ہماری طرف سے سسٹمز پڑھنے والے قارئین دو دوستوں کو نئے سال کی پر خلوص مبارکباد اور دعا کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اپنے نیک مقاصد میں کامیاب کرے اور پاکستان کو ترقی اور استحکام دے اور ماضی اور حال کی ساری تکلیفیں دور کر دے کہ ہر انسان امن و سکون کی زندگی بسر کر سکے۔ آمین۔“

اعجاز احمد راجیل، ماسی، ساہیوال سے حاضر خدمت ہیں۔ نئے سال کا چٹکا دکھنا شمارہ 18 دسمبر کو مل گیا۔ سمجھ نہیں آتی کیا لکھوں؟ پشاور میں جس طرح ظلم و ستم کی انتہا ہوئی ہے۔ اس کو تم کرنا ظلم ہاتھوں کے بس کی بات نہیں۔ سرورق پر موجود مجاہد بنو نواز آنکھوں میں امید ویاس کے دیپ جلانے یا دماغی کے خوشگوار لگات اور ادھوری خوشیوں کے بحر میں کھولی ہوئی لٹی ہے انٹائیپ اور ادارہ تو گویا گوبر نایاب ہیں۔ ہماری اصلاح کے ساتھ معلومات میں کچھ اضافہ ہوا ہے۔ کرسی صدارت پر اس دفعہ اپنے بھائی تفسیر عباس پابر براجمان تھے مبارک۔ محفل میں برادر سید گلگیر حسین کاظمی کی کمی نہیں ہر بار شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ سب سے پہلے شیر لاہور طاہر جاوید محفل صاحب کی جدا انتقام پر مبنی۔ لفظ لفظ اپنے اندر درد سموئے ہوئے ہے۔ دل کی سلطنت جب زیر و زبر ہو جائے تو انسان اپنے جینے کا انتقام کسی نہ کسی صورت پیدا کر ہی لیتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھی کی سو دوائے جنوں۔ واہ بھی صاحب انہما کہتے بہت عمدہ تحریر ہے۔ بہت ہی گہرے مشاہدے کا پھڑ ہے۔ بیحدیوں نے فلسطین میں جس طرح خون کی ہولی کھیلی ہے مجبور ہے بس جسے سہنا لوں پر جبر کے پراڑ توڑے ہیں، مسلمانوں کے سچے جذبے ان کو زک پہنچاتے رہے ہیں۔ سلیم فاروقی کی بے شرف سائنس آخری صفحات پہ اپنا رنگ جمائی۔ زیست کی راتیں ہوں یا بے شرف سائنس مگر جب گن گنی ہو اور ماں جیسی ہستی کی دعا میں شامل ہوں تو بے شرف سائنس بھی منزل مقصود پہ پہنچا دیتی ہیں۔ عشق ناقص کا دوسرا حصہ بہت اچھا لگا۔ رشتوں کے گرداب میں الجھا ہوا انسان اپنے مانتے کا تعین مشکل سے کر پاتا ہے۔ ہارون کا بے بسی اور تیز وہ کی بے بسی اپنی اپنی جگہ۔ نئی زمانہ بھی کچھ ہو رہا ہے۔ ماروی محبتوں کی رنگینوں اور حالات کی سنگینیوں میں کھوئے عاشقوں کی عمر 110 سال ہے۔ گلشن بانی اور اس کی بیٹیاں، عبداللہ کبڈی اسٹوری میں خوشگوار اضافہ ہیں۔ پہلے آئیے مسٹر امام صاحب نے جگہ پہلے انداز میں تحریر کی مگر وہ اپنی ہماری زندگی میں کچھ شے یا چیزیں دعاؤں کی مرہ بن منت ہوتی ہیں۔“

علامہ ایم عیاس ڈھکو، ساہیوال سے شریک محفل ہیں۔ سسٹمز جنوری 2015ء کے شمارے کا مطالعہ کیا۔ جتنی بھی تعریف کروں، وہ تم ہے۔ اس میں طاہر جاوید محفل کے قلم سے لکھی ہوئی تحریر بے حد پسند آئی۔ میری طرف سے آپ کو بہت مبارک ہو۔ اس کے علاوہ اس شمارے میں حضرت، چھان بین، ماروی اور عشق، بے شرف سائنس، بے حد پسند آئی۔ میری طرف سے آپ سب کو دل کی گہرائی سے مبارک ہو۔ محفل شعر و سخن بہت اچھی ہے اگر ان کے صفحات میں اضافہ کر دیا جائے تو کیا ہی بات ہے۔ امید کرتا ہوں کہ مجھے اس محفل میں خوش آمدید کہا جائے۔ (خوش آمدید جناب) میں کوشش کروں گا کہ اپنے سب دوستوں کو اس طرف متوجہ کروں اور اگر حوصلہ افزائی ہوئی تو انشاء اللہ جب تک سانسوں نے ساتھ دیا، اس محفل میں حاضر ہوتا رہوں گا۔ (بہت شکر ہے)

علامہ احمد خان توحیدی، پاکستان اسٹیل کراچی سے تمبرہ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نیا سال پوری دنیا کے لیے مبارک کرے۔ پاک وطن ترقی پر گامزن ہو (آمین تم آمین) انٹائیپ جون ایلیا بے دوستی، جس قوم کے لیڈران ہنرمند کا بھرا ہوا کنگول اپنی جھولی میں بھر لیں۔ ہنرمند کی بے دوستی بے دوستی نہ ہوگی تو کیا ہوگی؟ ماہ دسمبر کی محبت، سقوط ڈھاکہ کے دھوپ میں ہی کیا کم تھی۔ جوشی القلب دردوں نے معصوم کلیوں کو مسل ڈالا۔ ہائے کون دیکھے یہ بے بسی دل کی۔ جگر خراش ساخہ کے بعد کرتا دھرتا لیڈران کو ہوش میں رہ کر مل بیٹھ کر سدباب کرنا چاہیے۔ محفل میں آمد تفسیر عباس تخت پر جلوہ افروز مبارک لگی۔ سسٹمز یا اعجاز، ہر شاہ فرست ہو تو چند دنوں میں کیا 24 گھنٹوں میں بھی تک جاتا ہے۔ سسٹمز طاہر گھڑا، پشاور آپ بھول جانے والی ہستی نہ ہیں۔ سسٹمز یہ تاری، انگ، بیٹروں دو گراشا حکومت کتنی کم قیمت کر دے ان کا راستہ آسان کی طرف ہی جاتا ہے۔ عوام کا نصیب ہے۔ ہم کے دائرے میں ماروی کو چھا ڈالا۔ نواب صاحب نے مراد کو ایمان ملی اور عبداللہ کبڈی کو مراد یوتا بنا دیا۔ مراد اور ماروی کی شادی کر کر از دو ای زندگی سے اٹھ اندوز کر کر خاندان کی نسل بڑھا لیں۔ پھر بے شرف سائنس میں سلیم فاروقی کے ساتھ مل دیے۔ صدف راجی بے راہ رہی،



رہا کی انسانک موت کا قافی رکھ ہے۔ شہرہ اور صفدر کی محبت شادی کے روپ میں اچھا انجام ہے۔ ایک صاحب کی کہہ مشق اور ملک صفدر حیات صاحب قافل تک پہنچ جانے والی کہانیاں پڑھتے پڑھتے ہونے کے ساتھ پورے ہونے لگے۔ سو یہ حدیث پر ہونے کے باوجود آج کل کی طرح مکہ والی ناکام کہانیاں بھی لائیں۔ راجہ کرچی، قیصر اعوان، مسعودیہ بخاری، تفسیر عباس، مہرین ناز ایچھے اشعار، عشق ناتمام، لاجواب تاریخی تحریر پر الیاں سیتا پوری صاحب کا شکر ہے۔ سو دوائے جنوں پہلے سے زیادہ دلچسپ۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ امام ابو العباس ایمان تازہ کرنے والی تحریر۔ بلکرامی صاحب کا شکر ہے۔ قلمیہ لائق گزارہ، جدہ انتظام، شادی کے بعد لڑکیوں کو سب بھول کر اپنے خاندان کے عشق میں ڈوب جانا چاہیے۔ عیاذ جہنم والے نزلے کا خاتمہ ہو جائے گا۔ عمومی طور پر نئے سال کا پہلا شمارہ اچھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نئے سال میں سب کو اپنی رحمتوں و نعمتوں سے مالا مال کرنے کے ساتھ پرسکون امن و امان پاک سرزمین کو ترقی پر گامزن فرمائے۔ آمین ثم آمین“

✽ محبوب مصور سومرو، گوڈھ کھری سے محفل میں شریک ہیں ”دعا ہے دل سے کہ آپ اور آپ کی پوری ٹیم سدا سلامت رہے آمین۔ عرض اور غرض یہ ہے کہ میں ایک چھوٹا سا شاعر ہوں۔ اچانک آپ کا یہ سہنس ڈائجسٹ ملا۔ آپ کا یہ ماہنامہ سہنس ڈائجسٹ میرے پڑوسی مولانا اعجاز احمد سومرو صاحب کی چھوٹی سی لائبریری میں پڑھنے کی توفیق ہوئی۔ دسمبر 2014ء والا۔ جون ایلیا کی ”سلامتی کی راہ“ شعر و سخن تو میرے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ یہ ڈائجسٹ تو تھم کر میں میرے دل کی باتوں کی طرح ملا ہے۔ ہر ایک صفحہ سخن آئینہ ہے دل بھانے والا ناقص تو دلقریب ہے۔ باقی رسالہ بھی بہت معیاری اور خوب صورت ہے۔“

✽ ناوہ سیال، مہانوالی سے شرکت کر رہے ہیں ”جنوری 2015ء کا شمارہ نئے سال کی طرح بہت خوب صورت امن سلامتی اور تمام اہالیان وطن کو بے شمار دعاؤں کے ساتھ۔ مجھ سمیت تمام 50 قارئین جو محفل میں آئے درجنوں آئے ان کو اور جو ہمیں پیارا سہنس اتنے اچھے لفظوں کے ساتھ سلیٹے کے ساتھ چھاپ کر ہم تک پہنچاتے ہیں ان کو امن اور خوشی کا پیغام دیتا ہوں سب کے آگن میں ہنسا مسکراتا خوشیاں بکھیرتا داخل ہوا اور میرے آگن میں 18 تاریخ کو پہنچا۔ نائل گرل نئے سال کی طرح خوب صورت سی پھولوں کو خوبصورت بالوں میں بانڈھی اگلی سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دکھ کر کہنے لگی نیا سال مبارک ہو۔ رخصت سال 2014ء ہمیں اور پوری قوم کو ایک ایسا زخم دے گیا جو سازی زندگی ہمیں یاد رہے گا۔ جو ختم ہونے والا اور دوسرے گیا۔ پشاور میں امارے پھول جیسے بیچے جو درندوں کا فکا رہے۔ جب ان کے بارے میں سوچیں تو بدن پر زہر طاری ہو جاتا ہے۔ میری دعا ہے اللہ پاک ان شہید بچوں کے والدین کو صبرِ قیل دے۔ میری دعا ہے نیا سال 2015ء کا تمام اہالیان وطن کے لیے خوشیاں لے کر آئے۔ سہنس سے اتنے ماہ غیر حاضر رہا۔ غیر حاضری کی وجہ میری ماں تھی میری پیاری ماں جو مجھے اس بھری دنیا میں اکیلا چھوڑ کر اللہ میاں کے ہاں چلی گئی۔ میری ماں کے لیے بھی دعا کرنا۔ (اللہ آپ کو صبر و تحمل عطا فرمائے۔ ہم سب آپ کے غم میں شریک ہیں) تفسیر عباس کو کرسی صدارت پر براجمان پیشا پانچ مبارکوں۔ قدرت اللہ نیازی آپ کا تہرہ میں شوق سے پڑھتا ہوں۔ کنول شاہین آپ صرف اپنے کزن کو بتانے آئی تھیں اکبر شاہ ہم آپ کا جملہ تو سمجھ گئے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ سہنس صرف آپ کا نہیں ہم سب کا ہے۔ احسان عمر اس بار آپ دیکھی رفتار سے تھے کیوں کیا ہوا۔ مہرین ناز عبدالجبار روڈ۔ ان سب کے تہرے اچھے تھے باقی اس بار نئے نام کافی پڑھنے کو ملے اچھی بات ہے۔ اگلی کراچی آپ کہاں گم ہو۔ ناراضگی چھوڑو اور محفل میں اٹھری دو۔ سب سے پہلے محفل اللہ تعالیٰ صاحب کی ماروی انداز اور ایکشن کے ساتھ بھر پور آگے جارہی ہے۔ مراد ایمان علی بن گیا اور عبداللہ کبڑی مراد۔ اگلی تحریر کا بڑی بے تابی سے انتظار ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سو دوائے جنوں پڑھی، دوسری قسط بھی ایمان تازہ کر دینے والی تھی۔ بے شرف مسافت سلیم فاروقی کی بڑی محبت بھی کیا عجیب چیز ہوتی ہے۔ آدی کو اندھا کر دیتی ہے اپنا نفع نقصان سوچے سمجھے بغیر بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ بے چاری رہا کو کس گناہ کی سزا ملی ہے۔ عشق ناتمام الیاس سیتا پوری کی تحریر پڑھی، بہت اچھی لگی۔ میزہ کو تو دونوں طرف سے سکون نہیں ہے۔ قارئین میں سے ایک مہربان نے مجھے جنل میں خط کے ذریعے دیکھ بھجا۔ میں اس کا دل سے شکر گزار ہوں۔“

✽ وسم احمد خان، خانپال سے تشریف لارہے ہیں ”لیجے مابودلت کو سہنس کا استقبال قاری بنے ایک سال ہو چکا ہے۔ اب ہم اپنی پہلی سالگرہ قاری سہنس نئے سال کی خوشی اور جشن آمد رسول ﷺ اکتھا سنا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نیا سال ہم سب مسلمانوں کے لیے بہت پر امن بنائے۔ 2014ء تو جاتے جاتے بھی ساتھ پشاور کی صورت مصوم بچوں کی شہادت کا دکھ دے گیا، یہ غم ہی اتنا شدید ہے کہ ہم اس کا لفظوں میں مدد و نصیب کر سکتے۔ اس سال 9 خطوط ہم سے صرف اور صرف 2 خطوط ہی سہنس کی محفل کی زینت بن سکے باقی سبھی ہم 2 ماہ تک سیر و تفریح اور بھانوں کی شادی کی وجہ سے کوئی تہرہ نہ کر سکے۔ دسمبر کا سہنس بھی کراچی سے خانپال واپسی پر ٹرین میں خرید کر پڑھنا شروع کیا۔ جنوری کے شمارے کے نائل پر ایک خوب صورت سی حدیث خوب صورت انداز لیے جلوہ افروز تھی۔ نائل ہر لحاظ سے بہترین تھا۔ سب سے پہلے سہنس امام کی پہلے آئیے، پڑھی۔ پھر اس کے بعد طاہر جاوید مٹل کی بہا انتظام پڑھی جو ان دیگر تحریروں کی طرح ایک خوب صورت تحریر ہے۔ آخری صفحات پر سلیم فاروقی صاحب کی بے شرف مسافت پڑھی جس میں غلطی کے اثر پر روشنی ڈالی گئی جو کہ آج کل کے نوجوانان کے لیے مشکل راہ ہے۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں کہ ان کو پڑھ کر اور ان کے تہرے کی وجہ سے ہم اپنی محفل میں غیر حاضر نہ ہو جائیں۔ محفل شعر و سخن قدرت اللہ نیازی خانپال، جبران احمد، کراچی، تفسیر عباس اوکاڑہ کے شعروں سے جگمگا رہی تھی۔ باقی سب کے شعروں اور کتروں نے بھی سہنس کی خوب صورتی کو چھوڑیں گا چاند لگا رکھا تھا۔“

یہاں زمرین نمازی، کوئٹہ سے پہلی مرتبہ محفل میں شرکت کر رہی ہیں۔ سسپنس پر لگا 'نیاساں مبارک' Tag بہت زبردست تھا۔ بزم یاراں شام تفسیر عباس باہر اپنے بھرپور اور گراں قدر تہرے کے ساتھ کرسی صدارت پر جلوہ افروز تھے۔ بہترین تہرے پر مہار کباہ۔ شاداب ایچ ماہ تاب، یوسف سانول اور سیدگی الدین اشفاق کے تہرے چارے تھے۔ طالب حسین طلحہ اللہ آپ کو جلد از جلد رہائی عطا فرمائے اور نیا سال آپ کو اس آئے۔ اکبر شاہ کا مختصر سا تبصرہ بھی پسند آیا اکبر شاہ آپ اتنے چھوٹے سے ہو کے اتنی پیاری باتیں کیسے کر لیتے ہو؟ ظاہر گلزار اور عادل خان کے تہرے کافی عرصے بعد نظر آئے۔ زیب، حسن بھائی میں بھی آپ کی طرح ظاہر جاوید کا دیوانہ ہوں۔ چتا نہیں کب آخری صفحات پر ظاہر صاحب کی طویل کہانی ویں گے؟ عبدالباقی رووی اک عجیب انداز پڑھنے کو ملا۔ تبصرہ پینے کر کے بعد میں بتاتے کہ یہ کہانی ہے۔ رانا حبیب الرحمن صاحب اس دفعہ خوش ہو لو ایک چوڑی بھی نہیں تھی، ویشیزہ جی کے ہاتھ میں... عبدالغفور خان اللہ جو بھی فیصلہ کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ آپ کی آئندہ زندگی میں کوئی مشکل نہ آئے اور ہاں آپ کے شورے کا بہت بہت شکر ہے۔ اتنی زبردست قسط وار کہانی سسپنس میں دینے کا شکر ہے۔ سب سے پہلے سو دوائے جنوں پڑھی۔ کیا زبردست قسط تھی۔ لیلی اور باقر کی جوڑی نے اپنے عبادین کے ساتھ مل کر بیویوں کو ناکوں چنے چنوا دیے۔ اسی طرح زبیرہ اور مسن نے بھی اپنی جانوں کی پروا نہ کی اور اپنے کئی ساتھیوں کو خدا کی راہ میں پیش کیا۔ بازو اور عابد کئی دفعہ دشمنوں کے نرے میں آئے اور نکل گئے۔ دیکھو کیا ہوا عابد تو نکل گیا اور نامہ کو بھی عبدالحرب صاحب بخیر و عافیت نکال ہی دیا۔ اس کے بعد ماروی پڑھی۔ شکر ہے کچھ تبدیلی پڑھنے کو ملی۔ مراد نے اپنی شکل بدلی اور ایمان علی بن گیا۔ ہائے بے چارہ ایمان علی بن کے مزید پھنس گیا۔ سچ ہے اللہ کے کاموں میں مداخلت کبھی ہی پڑتی ہے۔ عبداللہ کبھی مراد بن کے دشمنوں کو الجھا رہا ہے لیکن مرید سے ازم مجھے تو یہی امید تھی کہ وہ اتنی بے وقوف نہیں کہ بونے کو مراد بن لے اور ہوا بھی وہی... محبوب علی کی انٹری اس دفعہ نہ ہوئی۔ بہر حال قسط میں اس دفعہ کچھ اترا تنگ ٹوٹ آئے ہیں۔ سلیم فاروقی کی بے مرسافت پڑھی۔ صفحہ کی مسافت بے ثمر تو نہ رہی اسے شرم ل تو گئی تھی۔ تحریر بہت اچھوتی تھی کہیں بھی کوئی جھول دیکھنے میں نہیں آیا۔ صفحہ بے چارہ ساری عمر کا بچھا تا اپنی جان کو لگا بیٹھا۔ بے چاری رحشا بلا وجہ جان سے گئی۔ سچ ہے محبت انسان کی شناخت ہوتی ہے ظلمت کا۔ انہام۔ کاشف زبیر اس دفعہ ایک خوبی بلا کا احوال لے کے آئے۔ بے چارہ جیف انعام لینے کی خواہش میں خود بھی عفریت نما بن کے چل مر گیا۔ منظر امام کی پہلے آئے والی کہانی۔ کہانی تم اور تحول زیادہ تھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ کی ہر تحریر معاشرتی ایسے سے پر ہوتی ہے۔ یہ بھی معاشرتی ناہمواریوں اور بے ایمانیوں پر مشتمل تھی۔ محفل شعر و سخن میں سب کے اشعار بہت پسند آئے خصوصاً عبدالغفور خان کا۔ ان دنوں پورا ملک ساتھ پٹا رو کی وجہ سے سوگوار ہے۔ آج تیسرا دن ہو گیا ہے سولہ دسمبر کو زمرے لیکن آدہ بکا ابھی تک اسی طرح ہے کون ہیں یہ لوگ؟ جن کو بچوں پر بھی ترس نہیں آتا۔ ان خبیثوں کو ذرا رحم نہیں آتا کہ کیسے کیسے ماؤں کے بچوں کو انہوں نے آن کی آن لہو میں ڈبو دیا۔ اے اللہ! ہمارے ملک کو اس دہشت گردی کی لعنت سے محفوظ فرما۔ اے اللہ ہمارے لیے یہ نیا سال خوشیوں بھرا بنا دے اور ہماری قوم کی صفوں میں اتحاد و یکجہتی پیدا فرما۔" (آمین)

مہرین ناز: حیدرآباد سے چلی آ رہی ہیں "جنوری 2015ء کا پہلا نظریہ شمارہ ہمارے زیر نظر ہے۔ نیا سال، نئی سوچ، نئے دلوں کے نئے حالات میں کوئی نیا پن نہیں۔ اللہ کرے یہ نیا سال ہماری زندگی اور ملکی حالات وہ اچھوتی حالت میں بھی خوشگوار تبدیلی لائے۔ (آمین) ناٹل کافی یونیک اور نئے سال کی مناسبت سے تھا۔ فہرست خوب صورت اور آسان تھی۔ انٹرایم پڑھ کر نظریں جھک گئیں، کاش ہمارے حکمرانوں کو بھی یہ آئینہ دکھایا جائے۔ محفل میں تفسیر عباس باہر، بھرپور تہرے کے ساتھ کرسی پر براجمان تھے۔ اعجاز احمد رحیل آپ اپنے تبصروں میں وہی شاعرانہ انداز لائیں۔ طلحہ حسین طلحہ، عبدالباقی رووی اور عادل خان آپ اچھا تبصرہ کر لیتے ہیں۔ مشق جاری رکھیے۔ زویا اعجاز، سعید، بخاری، گل مروت، کنول اور ظاہر خوب صورت اور جاندار تبصروں کے ساتھ محفل کی رونق بڑھا رہی ہیں۔ ہارون برس اور رانا حبیب آپ اچھا لکھ لیتے ہیں۔ الیاس سیتا پوری ابتدائی صفحات پر تاریخ کے دکش لحات کے ساتھ حاضر ہوئے۔ ویسے تو اس جہاں میں ہم عمل نہیں ہے لیکن مشق کی بھی واقعی کوئی حد نہیں۔ عامر کی سنے بھائی ابراہیم کے لیے اپنی جان کی قربانی قابل ستائش ہے۔ سلیم فاروقی کے قلم کا تیا ب تھوہ بے مرسافت خوب رہی۔ زندگی کی راحتیں ہوں یا بے مرسافتیں بہرہ ال دلی سکون بھی کسی ایک لمحہ میسر آتا ہے۔ صفحہ کی طویل مسافت کو ٹھنسی ہی گیا۔ کرے کون بھرے کون بھاری رمشا اپنی جان سے گئی۔ سلیم فاروقی صاحب نے لاہور کے خاص ماحول کو بہترین انداز میں اجاگر کیا۔ ڈاکٹر عبدالحرب بھی کی شاہکار سنسلا وار تحریر امت مسلمہ کے خلاف ہونے والی سازشیں و تباہ کاریاں واقعی عبرت اثر و استائن ہے۔ شخص ڈی کارلو جیسے برخصلت یہودی مسلمانوں کی ترقی و خوشحالی میں رکاوٹ بنتے رہتے ہیں اور مسلمانوں کو نقصان پہنچتے ہیں۔ عابد شیکھری اور نامہ بہترین کارنامے انجام دیتے نظر آئے۔ جی الدین نواب کے قلم کا پتھار پین ماروی کا اگلا پڑاؤ بہترین رہا۔ محبت کی گہرائیوں کا اظہار اور زمین نجات کی سنجیدگی، ماروی نے واقعی ہمارے دلوں میں جگہ بنائی ہے۔ حسام بٹ کہنہ مشق میں مرزا امجد بیگ کی ڈائری سے ایک بہترین کس لائے۔ مرزا امجد بیگ کے دھواں دار دلائل اور قانونی چبھیے گیناں ہمیشہ اپنی ذہانت سے سلجھا دیتے ہیں۔ ایسے نیکل نایاب ہیں۔ ناقابل معافی، ڈاکٹر شیر شاہ سید کی حقیقت پر جی تحریر ہے۔ ماضی کی تلخ یادوں کو دہراتے نظر آئے۔ پاکستانی بد عنوانی کی حقیقت سامنے آئی۔ نکولس جیسا کر پٹ بندہ سیزنگ نہیں بن سکتا مگر یہاں پاکستان میں، اللہ کی پناہ!! راہ عشق، سید احتشام، کسی کو چاہتا اور چاہے جانا اگرچہ کوئی مشکل کام نہیں بلکہ یہ تو فطری تقاضا ہے لیکن اسٹہ کی طرز چاہتوں کا ثبوت دینا کسی کا کام ہوتا ہے۔ منظر امام ہمیشہ ہمارے لیے خوشیاں سمیٹ آتے ہیں۔ یو جیل اور اداس شاموں میں ان کی تحریر اسیر کا کام کرتی ہے۔ پہلے آئیے، واقعی پہلے پائیے والی بات ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر پوہ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



عزیزت، کاشف زبیر کی عمر، تحریر، ماں تو ماں ہوتی ہے دوسروں کے لیے عزیزت ماں کے لیے پیارا بیٹا۔ محفل شعر و سخن سدا کی طرح دلکش
 و حسین انتخاب کا گلہ ستم سے لے بھی دلچسپ تھے۔ جنوری 2015ء کا شمارہ ہمارا پیار سینے میں کامیاب رہا۔ (بہت شکر یہ)

✽ اراٹا حبیب الرحمن، خوش بخت الرحمن، سینئر نیشنل لاہور سے شریک ہوئے ہیں جنوری 2015ء کا شمارہ جس پر نیا سال
 مبارک خوب صورت انداز میں جگمگا رہا تھا۔ جو بہت خوب صورت لگا۔ ہمارے عیار سے ملک میں جہاں جموں نے دعووں اور نئی نئی جالوں کو سیاست کا نام
 دیا گیا ہے۔ اس وقت ہر طرف فضا سوگوار ہے۔ شمارہ ہاتھ میں آنے کے چند دن پہلے سانحہ پشاور آرمی پبلک اسکول میں بچے اور سچر شہید ہوئے ان کا
 غم ہمارے لیے بھی ہے کہ ان کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ جیلوں میں فضا سوگوار ہے کہ بھائی پر حملہ آور شروع ہو گیا ہے اور فیصل آباد قتل میں 6 آدمی
 بھائی پر چڑھا دیے گئے۔ انہوں نے تو اس بات کا ہے کہ اس ملک میں انصاف نہیں ملتا۔ سوگوار حالت میں صرف ناز پری کے تہرے اور شعر پند آئے۔
 خوشی اسی بات کی تھی کہ سہ ماہی قاری اور کئی دوسرے لوگ بھی شامل تھے۔ شمارہ مجموعی طور پر ٹھیک تھا۔ (کہانیوں پر تبصرہ کیوں غائب کر دیا؟)

✽ طاہرہ گلزار، پشاور سے تبصرہ کر رہی ہیں "مجموعی طور پر اس سال سسٹنس پڑھ کے دل سے معراج اگل اور ادارے والوں کے لیے
 دعا میں نکلیں لیکن سانحہ پشاور سے ہر دل پر قیامت گزر گئی۔ دشمن یہ نہیں جانتے کہ مسلمان موت سے نہیں ڈرتے۔ اللہ ہم مسلمانوں پر اور پاکستان پر
 اپنی رحمت کی بارش کر دے (آمین) لہرست میں اپنے پسند کے دیگر کاشف زبیر، طاہرہ جاوید، مغل، عبدالرب بھٹی، مظہر امام اور ڈاکٹر شیر شاہ سید کے نام
 پڑھ کے دل کے دکھ پہ تھوڑا مرہم پڑ گیا۔ انتہائی میں جون ایلیا کی تحریر بے دہلی پڑھی۔ ہم حساس دل رکھنے والوں کو تڑپا گیا۔ پہلے نمبر پر لفظوں کے
 کھلاڑی تبصرہ ماس باہر آئے۔ بھائی مبارک! بڑا دلچسپ اور طویل خط تھا۔ ناہ تاب گل اور سید محی الدین کا مختصر خط بھی اچھا لگا۔ ابراہیم وارث بھائی یہ
 سال ہمیں دام کے 60 شہیدوں کے ساتھ 16 دیکر کو مصوم بچے جو شہید کر دیے گئے یہ داغ دے کے گزر گیا۔ اللہ تعالیٰ آگے ہم پر رحم کرے۔
 قدرت اللہ بھائی سرورق کی تعریف کر کے بھائی سے مبارکبادی ہے ہا ہا ہا۔ احسان سحر بھی 9 لکیروں کے ساتھ حاضر تھے۔ زیب حسن اچھرہ کیا آپ کو
 سالانہ سہ ماہی کہا جائے ہا ہا ہا۔ یہ بخاری بھی آخر حاضر ہو گئی اپنے بھر پور تبصرہ کے ساتھ۔ عبد الباقی روزنی کا تبصرہ بھی کافی شاعرانہ تھا۔ عبد الغفور خان
 ساغری اللہ آپ کے اد پر دم کر۔۔۔ بھائی یہ وقت 2004 میں مجھ پہ بھی تڑپا ہے۔ غیر حاضر دوست باہر ماس، آغا فرید احمد خان آف سکریٹری علی خان،
 ہمایوں سعید اور ماہا ایمان علیز انبی دین۔ سب سے پہلے طاہرہ جاوید مغل کو بیٹے کی شادی مبارک ہو جو 27 دیکر کو ہو چکی ہے۔ محبت کے سفیر مغل اعظم کی
 یہ تحریر محبت بھی شاندار محبت کرنے والوں کی مزا ایاز اور لڑکی جوان کا نصیب ہے بہت کچھ بھجا گیا۔ شکر ہے کہ اللہ نے پیاز پیدا کی ہے۔ دوسرے
 نمبر پر کاشف صاحب کی شاہکار تحریر عزیزت پڑھی۔ ویلڈن کاشف زبیر زور قلم اور تیز ہو۔ عبدالرب بھٹی کی تحریر سوادے جنوں۔ بھٹی صاحب کی یہ
 تحریر اس وقت کے حساب سے سونے پہ پہا گاہے کیونکہ نئی نسل جو اسلامی باتوں سے دور جا رہی ہے وہ دکھ کے دل خوش ہوا کایسے موضوع آگے بڑھتا
 چاہیں ہمیں بھی لیلیٰ، زبیرہ، عامرہ حسن، نامہ اور عابد شیکھری جیسی نوجوان نسل چاہیے۔ تاہم بھٹی کہانی ناقص مشق الیاس سیتا پوری کی یہ قسط بھی بہت
 دلچسپ اور یادگار رہی۔ احمد بیگ صاحب کا ایک اور کامیاب کیس اصلی طور پر زبیرہ خوری پکڑا گیا۔ نرگس نے ان کے ساتھ مل کر شوہر کو قتل کیا اور الزام اپنی
 بے گناہ ملازمہ وحیدہ ڈال دیا لیکن بیگ صاحب تو پھر مجھے ہونے کھلاڑی ہیں۔ مظہر امام صاحب کی تحریر پہلے آئیے حراجیہ انداز میں ایک سچی
 آموز بات سمجھا گئی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر ناقص معافی واقعی ناقص معافی ہی لکھا لیکن ہر رے ملک میں نہیں۔ آخری صفحات پر سلیم فاروقی کی
 تحریر بے شرمسافت نے دل دگنی کر دیا۔ صفحہ کی خود مرضی نے رشتا کی جان لی اور دولت کی ہوس نے شہرہ کی زندگی تباہ کر دیا۔ زبیرہ دوست تحریر یاد رکھنے
 والی۔ آخر میں نیا سال مبارک ہو سب کو۔"

✽ اسماء عبدالغفار انصاری، لاہور سے محفل میں شریک ہیں جنوری کا پیارا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ خوب صورت لڑکی بالوں میں
 خوب صورت پھول سجائے مسکراتی ہے۔ جون ایلیا کی خوب صورت باتیں اقوال زریں کی طرح دل میں گھر کر جاتی ہیں۔ باقی سب
 بہن بھائیوں کے خطوط بڑھے بہت اچھے لگے۔ میں پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہوں۔ امید ہے مجھے بھی اس محفل میں خوش آمد یہ کہا جائے گا (خوش آمد یہ
 جناب) عشق تمام راہ عشق، ماری اور چھان بین بہت اچھی کہانیاں ہیں۔ کہانیوں کا ہر کردار ہی لاجواب ہوتا ہے۔ جیسے عشق تمام میں منیرہ کو اولاد
 سے محروم رکھنے کی بات ہوتی ہے۔ الا لکھو وہ حاضر سے بھی بہت محبت کرتی ہے اور پھر وہی حاضر اپنی قربانی دے کر اپنے سوتیلے بھائی اور منیرہ کے بیٹے
 ابراہیم کے لیے امر ہو جاتا ہے۔ یہ تاریخی کہانی بہت پسند آئی مجھے۔"

✽ سیدہ مینا نقوی، بنگلہ سے تشریف لاتی ہیں "سسٹنس سے رشتہ بہت پرانا اور مضبوط ہے محفل میں شرکت کی یہ پہلی کوشش ہے۔ اس
 امید پر کہ شرف بازیابی بخشا جائے گا (خوش آمد یہ) گھر میں ڈائجسٹ پڑھنے کی اجازت نہ ہونے کے سبب چھپ کر پڑھنا پڑتا ہے اور محفل میں
 شرکت کے لیے یہ خط بھی بہت ڈر ڈر کر اور چھپ کر لکھنا پڑ رہا ہے۔ سسٹنس کی آمد سے قلم ہی پشاور میں ایک اسکول پر حملے اور بچوں کی شہادت کی
 اندوہناک خبر سنی تو دل لرز اٹھا۔ اللہ پاکستان کو دشمنوں سے محفوظ رکھوں اور رکھے۔ 16 دیکر سانحہ سقوط ڈھاکا کے دن دشمن ہمیں ایک اور زک پہنچانے
 میں کامیاب رہا۔ قصور کس کا ہے انہی تک کوئی چٹائیں۔ اس سانحے کے بعد سیاسی جماعتوں کا اتحاد خوش آئند ہے۔ شاید یہ سانحہ ہمارے اتحاد کا
 سبب بن جائے۔ سسٹنس اور جاسوسی شروع سے ہی میرے پسندیدہ شمارے رہے ہیں۔ سنسنے دار اور دلچسپ کہانیاں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ اس
 بار صرف رجسٹریشن کروا رہی ہوں، باقی تبصرہ انشا اللہ آئندہ ماہ لکھوں گی۔"



عبدالجبار بروہی انصاری، لاہور سے بھرپور تہرے کے ساتھ حاضر ہیں۔ خوب صورت چٹکا دکھانا نائل گولڈن کلر میں مفرد انداز سے نئے سال کی مبارکباد پیش کر رہا تھا اور اس کے جنوم میں پیاری سی سکر ایٹ کے ساتھ دلکش آنکھوں سے جھانکتی تیس گیسو میں بھول سجائے خوب صورت، دو شیزہ نئے سال کی آمد کا اظہار کر رہی تھی۔ یوں جتوری کا نائل ڈاکرا نکل کی کاوشوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ پشاور میں 16 دسمبر کو ایک اسکول میں قیامت منبری گزر گئی۔ سفاک و ہشت گردوں نے معصوم بچوں کی جان لے لی۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ معصوم بچوں کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے اور ان کے والدین کو صبر جمیل دے۔ اسے اللہ ہم سب کو اس کڑی آزمائش میں سرفرو فرما (آمین) جون ایلیا نے ٹھیک فرمایا اور ہم کب تک اپنی ہنرمند قوم کی بدولت اپنے پاؤں پہ کھڑے ہوں گے ہمارے حکمرانوں نے تو قوم کو گدا کر بنا دیا۔ محفل میں مدبر اعلیٰ کی باتیں بھی آج کی دکاسی کی واضح جھلک تھی۔ کرسی صدارت تفسیر عباس پارکے جسے میں آئی جو کئی حالات پر نظر رکھے حکمرانوں کی نااہلی پر بات کر رہے تھے بہت زبردست تہرہ کیا ہے۔ محمد یوسف سانول آپ کی باتیں بھی اچھی لگیں اور ملک صاحب شخصیت کے لحاظ سے بھی گھوڑے تانگے پر اس وقت اچھے لگے تھے۔ سیدتی الدین اشفاق اپنے مختصر تہرے میں نام کے ساتھ خوب صورت لگ رہے تھے۔ ابرار وارث دیکھ لو بھی نیا سال کا شمارہ مفرد انداز میں ہی آیا ہے۔ طالب حسین طلوع اللہ تعالیٰ آپ کو جلد ہی اس قید تھما کی سے نجات دے۔ زویا اعجاز آپ کا انداز بھی متاثر کن ہوتا ہے۔ قدرت اللہ نیازی نے بھی مصروفیت سے ناگم نکال کے اچھا تاثر دیا ہے۔ اعجاز راضی وقت کا کہاں بنا چلتا ہے۔ یونہی باتوں باتوں میں ہی بیت جاتا ہے۔ قائم رحمان ویسے تو آپ کی عمر بھی اسٹیڈی کی ہے گھر والوں سے چھپ چھپا کے مگر تہرہ کھل کے کرتے ہو۔ ارے طاہرہ گلزار آپ کی سسپنس سے اپنا بہت قابل دید ہے۔ زیب حسن اتنا اچھا لگتے ہو تو ہر ماہ شمارے کی زینت بن جایا کرو ڈیڑھ۔ سہد یہ بخاری کی حاضری بھی خوب ہے۔ محفل شعر و سخن میں امتیاز علی سہد یہ بخاری اور مہرین ناز کے شعر اچھے تھے۔ ہارنجی پس منظر کی کہانی عشق ناقص نے زبردست موڑ لیا۔ ایک طرف میزہ کی اولاد کی خواہش پوری ہوئی تو دوسری طرف آخر میں قل کی مزا آئے۔ لیے عامر نے ابراہیم کی جگہ لے لی۔ ایک عظیم بھائی کے عظیم الشان شمارہ پر دل اش کر اٹھا۔ کاشف زبیر کی کبھی خون کا کہانی عنقریب نے تو خون خشک کر دیا، زبردست کہانی تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سوادے جنوں کا دوسرا حصہ بھی زبردست رہا۔ لڑکیاں پیاز کیوں کاٹتی ہیں، آنسوؤں کی پردہ داری میں کتنے دکھ چھپے ہوتے ہیں۔ ہائے عورت کی مجبوریاں۔ طاہرہ جاوید محفل نے جدا انتظام کی صورت گمشدہ محبت کی خوب صورت دکاسی کی ہے۔ شاطر سے شاعر شخص کو بھی اس کی عیاری لے ڈوٹی ہے مگر اس کیس میں پولیس کی تفتیش تو زبردست نظر آئی۔ ہاں مرزا احمد بیگ نے کہتے ہیں کہ میں اپنے جنموں کا زبردست استعمال کیا اور وحید کو بے گناہ ثابت کر کے رہائی دلائی۔ معزز ساتھیو! اب اس ورکھ دھندے کو ختم ہو جانا چاہیے۔ جارنج بے گناہ ہے اور اسٹہ بھی بے گناہ ہے، یہی ہمارا فیصلہ ہے۔ واہ زبردست۔ سید احتشام کی راہ عشق نے بھی آخر راہ نکال ہی لی۔ سلیم انور کی تحریر رشتہ بس ٹھیک ہی رہی۔ مٹاپے کو کم کرنے کی نفسیاتی تیس اچھی تھیں۔ دل و دل سے راہ ہوتی ہے۔ جی الدین نواب کی سحر انگیز کہانی، روٹی بھی اپنے خوب جوہن دکھائی ہے۔ کہانی کے ہیر و مراد کہیں تو خوب رویشیزاؤں کے حسن میں جکڑے نظر آتے ہیں تو کہیں اپنی پار سالی کی، عا نامتے ہیں۔ یوں اللہ بھی اس پر کرم کرتا ہے۔ ہائے ہائے سحر امام نے پہلے آئے میں مختصر تحریر دے کر بھی سکر ایٹ بکھیر دی۔ پہلے آؤ پہلے پاؤ کا اصول اچھے طریقے سے سمجھا دیا۔ نیا نسیم بگماری کی راہ حق کی معانیوں اور کرامتوں کے ولی امام ابو العباس کی خوب صورت باتوں نے ایمان تازہ کر دیا۔ ہر شمارے میں اسلامی کہانی زندگی کوئی راہ دکھاتی ہے۔ مغرب اور ہمارے معاشرے میں یہی توفیق ہے کہ وہاں کوئی بد عنوان شخص میسر نہیں بن سکتا مگر ہمارے ہاں کرپشن اور ہر طرح کی برائی سے بڑے بڑے گمراہے ہوں گے لیکن پھر کامیاب ہو کر لوٹ مار میں ملوث ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید نے ناقابل معافی میں بڑے واضح انداز میں اچھے برے کی تیز دکھائی ہے۔ کاش کوئی اسے سمجھنے والا ہو۔ وہ ابھی تک جمیلری کی باتوں کو نہیں سمجھ پائی تھی اور جینیری اپنی پیشہ ورانہ جہان میں کھل کر کے جا چکا تھا۔ تحریر ریاض نے اچھی کہانی دی مگر اس میں بھی کسک چھوڑ دی۔ اب آخری کہانی کی طرف بڑھیں۔ سلیم فاروقی نے بے شرم سافت بھی بہت سے سبق دے گئی۔ اس گھر میں کوئی تو ایسا ہے جو صوفیوں کے لیے جان دے سکتا ہے مگر معصوم ہر مٹا بھی صوفی کی خط محبت کی جینٹ چہ گئی۔ چلو آخر صوفی کی کیکٹ فر محبت شمرے سے تو شادی ہوئی۔ بعض اوقات دولت کے نشے میں انسان اپنے سے کمزور رشتے داروں کو حقیر سمجھتا ہے تو پھر وہیں پردہ بہت کچھ کھوتا پڑتا ہے۔

توصیف احمد، کراچی سے محفل کی زینت بنے ہیں "16 دسمبر 2014ء کی تاریخ کا سیاہ ترین دن۔ کسی تہرہ نگار نے خوب کہا ہے کہ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ساتھ پشاور سقوط ڈھاکا سے بھی بڑا ساخو ہے جو تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ اپنی وحشت کی آپ جیتی جان کرے گا۔ اسکول کے طلبا کو ہنگامی صورت حال میں خود کو بچانے اور ساتھی کو ابتدائی طبی امداد فراہم کرنے کی تربیت دی جا رہی تھی لیکن ان میں سے شاید کسی کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ان کے پاس کسی دوسرے کو کیا خود کو بچانے کا وقت نہیں ہوگا۔ ہمارا دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پاکستان سمیت پورے عالم اسلام کے ساتھ اپنے رحم اور فضل کا سہارا فرمائے (آمین) صدر محفل جناب تفسیر عباس پارکے تہرہ واقعی شاندار تھا۔ مبارک ہو۔ زویا اعجاز T20 ٹیوڈ میں تھیں، خوب صورت تہرے کے ساتھ۔ بس ایک بات سے متعلق نہیں کہ ملک صاحب کی کہانیاں تو سسپنس کی جان ہوتی ہیں اور میں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ اس کے علاوہ اعجاز احمد راضی، شوکت شہریار سہد یہ بخاری اور ہارون جہنم کے تہرے بھی لائق تھیں تھے۔ کہانیوں کی ابتدا اس بار خلاف معمول بیگ صاحب کی کہتہ مشق سے کی۔ بیگ صاحب ملام یا مجرم کے بجائے منندے کے انکوائری آفیسر سے زیادہ نمبر آزمائش نظر آئے لیکن کہانی کو آخر میں کچھ جلدی میں سمیٹ گیا تھا۔ بہر حال نرس اور فرید عوری اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ محبت کے سفیر طاہرہ جاوید محفل کی جدا انتظام مختصر لیکن

Copied From Web

درماندہ عشق

الیاس سینا پوری

دنیا میں سب سے مضبوط اور مخلص رشتہ اللہ تعالیٰ نے والدین کا بنایا ہے... اس حقیقت کا ادراک ہر اس شخص کو یہ خوبی ہوگا جس کے سر پر یہ سایہ موجود نہیں، والدین... جو اپنی اولاد کو زمانے کی تہی دھوپ اور راہ میں بچھے کانتوں سے بچا کر اپنی شفقت کی چادر میں چھپا لیتے ہیں، بس یہی دکھ اس کی زندگی کا سب سے بڑا روگ بنتا جا رہا تھا جو حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر ایسے لوگوں کے درمیان پھنس گیا تھا جنہیں اس پر ظلم ڈھاتے وقت نہ تو انسانیت کا سبق یاد رہتا ہے اور نہ ہی عذاب الہی کا خوف... تاریخ گواہ ہے کہ ایسے کتنے ہی کرداروں نے اپنی تمام تر کم مائیگی کو اپنی ایسی طاقت بنا لیا جس سے نہ صرف زمینی مملکتیں بلکہ دل کی دنیا بھی تسخیر کر لی۔ وہ بھی ایک ایسی ہی داستان رقم کرنے نکلا تھا جس کا ہر لفظ ایک الگ ہی معنی میں ملبوس تھا۔ جس کے ہر موڑ پر تحیر و اسرار پوشیدہ تھے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی بھید بھری شخصیت نے ایک اور ہی روپ دھار لیا جس کے باعث تاریخ نے اسے اپنے دامن میں چھپا لیا کیونکہ... اس کی زندگی کے نشیب و فراز سب سے جدا تھے۔

ہماچی کا آئینہ | باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

شامل تھا۔ کبھی کبھی ہمتوں گھر کی مثل تک دیکھنا نصیب نہ ہوتی۔ جب گھر آتا تو فیروز بخت کی شکایتوں کا دفتر کھل جاتا۔ اس کی شرارتیں، کام چوریاں، چالاکیاں، گستاخیاں اور معلوم نہیں کیا کیا۔ بیوی یہ بھی کہتی کہ اسے اندیشہ ہے کہ فیروز بخت بڑا ہونے پر اس کے دونوں بچوں کو جان سے مار دے گا۔ رقم دل مشہدی ساری شکایتیں سننے کے بعد بھی کہتا۔ ”خدا سے ڈر اور اس حکیم پر رحم کر، تیرے بھی دو بچے ہیں۔ کہیں فیروز بخت کا وبال ان دونوں کو نہ بھگتا پڑے۔“ بس یہیں سے ان دونوں میں جھگڑا شروع ہو جاتا اور فضا اتنی یوٹھل ہو جاتی کہ پڑوسیوں کو مداخلت کرنا پڑتی۔ پڑوسی بھی فیروز بخت سے ہمدردی کرنے لگے۔ انہی پڑوسیوں میں ایک تاجر بھی رہتا تھا، اس کے کئی کاروبار تھے۔ یہ اسلحہ سازوں سے ہتھیار تیار کر کے بادشاہ اور اس کی سپاہ کے ہاتھ بیچ دیا کرتا۔ شاہی فوج کے لیے رسد بھی فراہم کرتا۔ یہ تاجر شاہی کارخانوں میں تیار ہونے والے کپڑوں

جب ہمایوں ایران کی مدد سے ہندوستان کا دوبارہ بادشاہ بنا تو اس کے ساتھ جو غیر ہندی سپاہی، ان میں فیروز بخت کے والدین بھی شامل تھے جو سفر کے میں مارے گئے۔ اس وقت فیروز بخت دو سال کا تھا، ایک مشہدی کو اس پر رحم آیا اور اسے اپنی بیوی کے حوالے کر دیا۔ یہ مشہدی ہمایوں کے ساتھ دہلی چلا آیا۔ مشہدی کی بیوی اپنے دو بچوں کے مقابلے میں فیروز بخت سے برا سلوک کرتی۔ بات بات پر پٹائی بھی ہو جاتی اور مشہدی کی بیوی اس کو جب مارتی یہ ضرور کہتی۔ ”اس کے ماں باپ معلوم نہیں کیسے جاہل اور احمق تھے کہ اس منحوس کا نام فیروز بخت رکھ دیا۔ پیدا ہوتے ہی دو سال کے اندر اندر دونوں کو کھا گیا اور اب ہمیں کھانے آ گیا ہے۔“

نئے فیروز بخت نا سمجھ میں اس عورت کی باتیں نہیں آتی تھیں لیکن وہ ڈرا سا ضرور رہنے لگا۔ مشہدی کا زیادہ وقت باہر گزرتا تھا کیونکہ وہ ہمایوں کے حفاظتی دستے میں



Copied From Web

مشہدی کی بیوی تیزی سے اس کے پیچھے دوڑی لیکن وہ باہر نکل چکا تھا۔ مشہدی کی بیوی اسے پکڑ نہیں سکی اور دروازے پر کھڑی ہو کر شور کرنے لگی۔ ”لوگو! کیا ستم ہے کہ میں تو اس منحوس کو اپنی اولاد کی طرح پال پوس رہی ہوں اور یہ کم بخت بھاگنے کی دھمکی دے کر گھر سے نکل گیا۔ شوہر کی موجودگی میں گھر سے بھاگتا تو میں ذرا بھی فکرت نہ کرتی لیکن ان کی عدم موجودگی میں یہ ہر طرف میرے جھوٹے مظالم کی داستاںیں سناتا کر مجھے ذلیل و خوار کرتا پھرے گا۔“

مشہدی کی بیوی کی آہ دو اویلاں کر عام حالات اور لاطمی میں لوگ فیروز بخت کو پکڑ کر مشہدی کی بیوی کے حوالے کر دیتے لیکن تقریباً سبھی کو ان مظالم کا علم تھا جو وقتاً فوقتاً فیروز بخت پر ٹوٹتے رہتے تھے۔ فیروز بخت بھاگ کر داؤد کرمانی کی حویلی کے پھانگ کے کنارے جا کھڑا ہوا اور اپنے مکان کی طرف دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک عورت سر سے پاؤں تک چادر میں لپیٹی ہوئی فیروز بخت کے پاس آن کھڑی ہوئی اور بولی۔ ”دیکھ ابھی تو میں تجھ سے نرمی سے کہہ رہی ہوں کہ میرے ساتھ گھر چلا جا، ورنہ مشہدی کو بلا کر تیری ہڈی پسی تڑا دوں گی۔“

فیروز بخت سر تا پا سرکشی اختیار کیے ہوئے تھا، بولا۔
”اب میں اس گھر میں نہیں جاؤں گا۔“
مشہدی کی بیوی نے پوچھا۔ ”اگر گھر نہیں جائے گا تو کہاں جائے گا؟“

فیروز بخت نے اسی طرح سخت اور اٹل لہجے میں جواب دیا۔ ”میں نے کہہ جو دیا کہ میں کہیں بھی جاؤں لیکن اب میں تیرے ساتھ گھر واپس نہیں جاؤں گا۔ میں دریا میں ڈوب کر جان دے سکتا ہوں، کنوئیں میں چھلانگ لگا سکتا ہوں لیکن تیرے ساتھ گھر ہرگز نہ جاؤں گا۔“

مشہدی کی بیوی اتنا سخت جواب سن کر آپے سے باہر ہو گئی۔ فیروز بخت نے جھک کر کئی پتھر اٹھالیے اور بڑی سختی سے کہا۔ ”میں نے کہہ جو دیا کہ اب میں گھر نہیں جاؤں گا۔ اگر تو نے زیادہ زبردستی کی تو میں پتھروں سے تیری شکل بگاڑ دوں گا۔“

مشہدی کی بیوی ڈر گئی۔ فوراً گھر واپس جاتے لگی لیکن سی وقت داؤد کرمانی ایک رتھ نما گاڑی میں بیٹھا ہوا اپنے پھانگ کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس رتھ کو چار گھوڑے کھینچ رہے تھے اور چاروں گھوڑوں کا رنگ بالکل سفید تھا مگر ان کی دمیں سیاہ تھیں۔ فیروز بخت رتھ کو پھانگ کی طرف آتے دیکھ کر لپکا اور التجا کی۔ ”مجھے بچالو، اس ظالم

کے علاوہ جین اور اندرون ملک کے مختلف حصوں میں بنے جانے والے کپڑے کا بہت بڑا پوپاری تھا۔ اس کے میٹروں ملازم تھے۔ یہ کاروبار ان لوگوں کے لیے روپے کے لین دین یعنی ہنڈی کا کام بھی کرتا تھا اس تاجر کا نام داؤد کرمانی تھا اور اس کی ایک بیوہ بہن تھی۔ قلعہ نما حویلی میں بہت سارے نوکروں چاکروں کے ساتھ یہ دونوں تنہا رہتے تھے۔ داؤد نے کسی زمانے میں شادی بھی کی تھی لیکن لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ داؤد کو اپنے کاروبار سے زیادہ بیوی پیاری نہیں تھی۔ وہ بیوی اور بہن کو حویلی میں تم اچھوڑ کر بیٹوں غائب رہتا اور جب وطن واپس آتا تو یہاں بھی کاروبار ہی میں الجھا رہتا۔ بیوی کو تنہائی کا احساس گھن کی طرح چاشنارہا اور آخر کار شادی کے چھ سال بعد وہ انتقال کر گئی۔

اسی داؤد کرمانی کے پڑوس میں مشہدی کا کنہہ اور فیروز بخت بھی رہتے تھے۔ مشہدی کے گھر میں جب بھی ہنگامہ ہوتا تو داؤد کی بیوہ بہن اپنے نوکروں کو بھیج کر مداخلت کرواتی۔ آخر فیروز بخت آٹھ سال کا ہو گیا۔ اب وہ اپنا اچھا برا خوب سمجھنے لگا تھا۔ فیروز بخت، پڑھنا چاہتا تھا لیکن اسے پڑھنا کون..... مشہدی کے دونوں لڑکے پڑھ رہے تھے۔ فیروز بخت ان دونوں کو مدرسے جاتا دیکھتا تو بہت کڑھتا۔

ایک دن دونوں لڑکے باہر نکلے تو دیکھا کہ فیروز بخت ان کا انتظار کر رہا ہے۔ فیروز بخت انہیں دیکھتے ہی ان کی طرف بڑھا اور بولا۔ ”تم دونوں کے ساتھ میں بھی پڑھنے چلوں گا۔“

مشہدی کے بڑے لڑکے نے پوچھا۔ ”مدرسے میں تو پڑھائی کے پیسے گتے ہیں، تو پڑھائی کے پیسے کہاں سے دے گا؟“

فیروز بخت لاجواب ہو گیا لیکن وہ پھر بھی ان دونوں کے پیچھے پیچھے مدرسے چلا گیا۔ وہاں دونوں تو پڑھتے رہے اور یہ تماشائی بنا بیٹھا رہا۔ جب یہ تینوں گھر واپس پہنچے تو مشہدی کی بیوی نے فیروز بخت سے کڑک کر پوچھا۔ ”انہی دیر سے تو کہاں غائب تھا؟“

فیروز بخت نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ ”میں دونوں بھائیوں کے ساتھ مدرسے چلا گیا تھا۔“

مشہدی کی بیوی نے بے درپے کئی طمانچے رسید کر دیے اور بولی۔ ”خبردار جو آئندہ ان دونوں کو اپنا بھائی کہا۔ تو منحوس کیا یہ چاہتا ہے کہ میرے بچوں کو اپنا بھائی کہہ کر اپنی نحوست کا اثر ان پر بھی ڈال دے۔“

فیروز بخت نے مار سے بچنے کے لیے باہر کا رخ کیا تو

میں وراٹھیوں سے کتنی گود دباتے ہوئے یولا۔ "تو کیا تو وہی لڑکا ہے جس کو اکثر پیشتر پیٹا جاتا تھا اور محلے کے لوگ بچ بچاؤ کرادیا کرتے تھے؟"

مشہدی کی بیوی نے جواب دیا۔ "تو اس نے پورے شہر میں مجھے بدنام کرنے کا منصوبہ بنا رکھا ہے۔ میں اس کی چالوں میں نہیں آؤں گی اور میں خود بھی یہ نہیں چاہتی کہ تو میرے ساتھ رہے لیکن مجھے ذرا اپنے شوہر کا خوف اور خیال ہے جو اسے گھرواپس لے جانا چاہتی ہوں ورنہ میں نہیں اسے مارتی اور جب تک تو بہ نہ کروا لیتی ہرگز نہ چھوڑتی۔"

داؤد نے اپنے خدمت گاروں سے کہا۔ "فیروز بخت کو اسی وقت اندر لے جاؤ۔ میں اس دلچسپ اور تیز طرار عورت سے کچھ باتیں کر لوں۔"

اس کے فوراً بعد مشہدی کی بیوی سے رجوع کیا گیا، پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ تیرا یہ بیٹا ہمیشہ تم کو ستاتا اور پریشان کرتا چلا آ رہا ہے اور بقول تیرے یہ منحوس بھی ہے؟"

"ہاں اور کوئی ایسا دینا بہت زیادہ، خدا بچائے اس کی نخواست سے۔"

مشہدی کی بیوی نے پر جوش لہجے میں کہا تو داؤد نے ذرا سختی سے کہا۔ "خاتون! چونکہ یہ بچہ تمہارا نہیں ہے۔ منحوس اور گستاخ بھی ہے، تیرے حق میں دردمس بھی رہا ہے اس لیے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تو اس سے نجات ہی حاصل کر لے؟"

مشہدی کی بیوی نے جواب دیا۔ "مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن جب تک مشہدی، میرا شوہر واپس نہ آجائے فیروز بخت میرے ہی پاس رہے گا۔"

داؤد نے بے مروتی سے کہا۔ "خاتون! ایمان داری کی بات تو یہ ہے کہ اب میں اس کو اپنے پاس ہی رکھوں گا۔"

جب تیرا شوہر مشہدی آجائے تو مجھ کو مطلع کرو دینا میں تیرے شوہر سے باتیں کر کے اور پوری طرح مطمئن ہو جانے کے بعد لڑکے کو کسی کے حوالے کر دوں گا۔ یوں خالی غولی باتیں بنا کر اسے مجھ سے کوئی بھی نہیں لے سکتا۔"

داؤد حویلی کے اندر چلا گیا۔ گاڑی اور گھوڑوں کو سائیس نے سنبھال لیا اور خود خدمت گاروں سے پوچھ کر فیروز بخت کے پاس گیا۔ وہ ایک کمرے میں سر جھکائے کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کی محویت کا یہ عالم تھا کہ داؤد کمرے میں داخل ہوا، چلا ہوا اس کے قریب پہنچا مگر فیروز بخت کو پتا بھی نہ چلا۔

داؤد کچھ دیر ساکت کھڑا اس کی شکل دیکھتا رہا۔ اسے یہ لڑکا بہت اچھا لگا۔ مایوسی اور بے بسی کا یہ ننھا جسمہ کسی سوچ

گاڑی ایک دم رن گئی اور اس پر سے پانچ آدمی نکلے بعد وگھرے اترے۔ ان پانچوں میں چار تو خدمت گار تھے اور پانچواں داؤد کو کہانی خود تھا۔ مشہدی کی بیوی نے بھی ان سب کو اترتے دیکھ لیا تھا۔ وہ رک گئی اور یہ دیکھنے لگی کہ فیروز بخت کے ساتھ اب کیا پیش آتا ہے۔

داؤد کہانی نے فیروز بخت سے پوچھا۔ "بیٹے! کیا بات ہے، یہ ہاتھوں میں پتھر لیے کیوں کھڑا ہے؟"

فیروز بخت نے مشہدی کی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ مجھے پکڑنے آرہی تھی اور اگر یہ مجھے پکڑتی تو میں ان پتھروں سے اس کی شکل بگاڑ دیتا۔"

مشہدی کی بیوی اُپک کر ان کے قریب پہنچی اور داؤد سے کہا۔ "بھائی! ذرا اس کے ہاتھ سے پتھر تولے لے، پھر میں سب کچھ سچ سچ تجھے بتا دوں گی۔"

داؤد نے فیروز بخت سے کہا۔ "یہ پتھر مجھ سے دے۔" فیروز بخت نے ذرا شک و شبہ سے پہلے تو مشہدی کی بیوی کی طرف دیکھا پھر داؤد کی طرف دیکھ کر پتھر پھینک دیے۔

مشہدی کی بیوی نے جھپٹ کر انہیں اٹھا لیا اور فیروز بخت سے بولی۔ "بول اب کیا کہتا ہے؟ میں پھوڑوں تیرا سر ان پتھروں سے؟"

داؤد نے فیروز کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آڑ میں کر لیا اور انسوؤں سے کہا۔ "خاتون! میں شرمندہ ہوں کہ لڑکے سے پتھر پھینکوا کر انہیں تیرے ہاتھوں میں جانے دیا اور اس ذرا سے واقفے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ واقعات کچھ بھی

ہوں، ان میں زیادتی تو نے ہی کی ہوگی۔ یہ لڑکا سعادت مند معلوم ہوتا ہے۔"

مشہدی کی بیوی نے، چمک کر جواب دیا۔ "معلوم نہیں کن منحوسوں نے اس کا نام فیروز بخت رکھا تھا۔ نام فیروز بخت اور نخواست کا یہ عالم کہ پیدا ہونے کے دو سال کے اندر اپنے والدین کو کھا گیا اور جب سے میرے گھر آیا ہے مجھے پریشان کر رہا ہے۔ میں نے اسے دو سال کی عمر سے اپنے پاس رکھا ہے، بالکل بیٹوں کی طرح لیکن اب

سنبولے کی طرح مجھی کو ڈس لہنا چاہتا ہے۔"

داؤد نے فیروز بخت کی طرف دیکھا، اس نے مٹھی بھینچ کر اور آنکھیں بند کر کے جواب دیا۔ "میں اس ظالم عورت کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ میں مر جاؤں گا لیکن اس کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔"

داؤد نے اپنے ذہن پر ذرا سا زور دیا۔ آنکھیں بند

نے گلنار کو مطلع کیا۔ گلنار نے حکم دے دیا کہ لڑکا عورت کے حوالے کر دیا جائے۔

لیکن فیروز پر متعین ملازم نے حکم ماننے میں ہنس و پیش سے کام لیا۔ اس کو فیروز بخت سے اہم روی ہو گئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”جب تک میرا مالک مجھے یہ حکم خود نہ دے، میں لڑکا اس عورت کے حوالے نہیں کروں گا۔“

گلنار شیرنی کی طرح پھر کر بولی۔ ”تو کیا بک رہا ہے لڑکا اسی وقت اس عورت کے حوالے کیا جائے گا۔ یہ میں کہہ رہی ہوں، یہ میرا حکم ہے اور اس حویلی کا ہر فرد جانتا ہے کہ میری حکم عدول کا نتیجہ کیا ہوگا۔“

خدمت گار نے بھی سختی سے جواب دیا۔ ”بی بی! میں نے اس حویلی کا نمک کھا یا ہے اس لیے میں تمک حرامی نہیں کر سکتا۔ اگر اس حویلی کا مالک مجھے یہ حکم دیتا تو میں فوراً تعمیل کرتا لیکن مالک کی عدم موجودگی میں اس کے نافذ حکم کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔“

گلنار غصے میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ اس کمرے کی طرف تیز تیز قدموں سے بھاگی جس میں فیروز بخت رہتا تھا۔ اس کے پیچھے خدمت گار بھی دوڑا۔ گلنار نے کمرے میں داخل ہوتے ہی فیروز بخت کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ اس وقت جا من کھا رہا تھا۔ گلنار نے ہاتھ پکڑ کر جھٹکا جو دبا تو سارے جا من بھر گئے اور فیروز بخت منہ کے تل گرتے گرتے بچا۔ گلنار نے اسے سمجھ کر کمرے سے باہر کر دیا، بولی۔ ”چل، تو یہاں کیا کر رہا ہے۔ تیری ماں تجھے لینے آئی ہے۔ اس کے ساتھ اپنے گھر جا، یہاں کب تک رہے گا۔“

فیروز بخت نے خوف زدہ آواز میں جواب دیا۔

میری کوئی ماں نہیں، میری ماں تو کب کی مرچکی۔“

گلنار نے اسے دھکا دے کر گرا دیا۔ ”کیا اس عورت نے تجھ کو پالا پوسا نہیں ہے؟ کیا یہ تیری ماں نہیں کہلائے گی؟ احسان فراموش..... اگر تو اس عورت کو ماں نہیں مانتا تو میں تجھ سے کیا امید کروں گی۔ تو میرے ہارے میں بھی اسی قسم کی باتیں کرے گا۔“

خدمت گار فیروز بخت اور گلنار کے بیچ میں آ کر بولا۔

”آپ اس لڑکے کا ہاتھ چھوڑ دیجیے۔ میں نے کہہ جو دیا کہ جب تک اس حویلی کا مالک آن نہیں جائے گا، یہ لڑکا یہیں اس حویلی میں رہے گا۔“

گلنار نے خدمت گار کو بھی ڈانٹ دیا۔ ”اس کے ساتھ تو ہمیں نکل جا اس حویلی سے..... ورنہ میں دھکے دے کر نکلوا دوں گی۔“

میں حکم تھا۔ داؤد نے سکوت توڑا۔ ”ہاں لڑکے! اب بتا کہ بات کیا ہے؟“

لڑکا کھڑا ہو گیا۔ اس تفصیل طلب سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، بولا۔ ”کچھ بھی نہیں۔“

داؤد مسکرایا۔ ”اگر بات کچھ بھی نہ تھی تو اتنا بڑا ہنگامہ کیوں ہو گیا..... یہ عورت تیری ماں تھی کیا؟“

فیروز بخت سے جواب دیا۔ ”نہیں، وہ میری ماں نہیں ہے۔“

داؤد نے کہا۔ ”اچھا تو یہیں رہ، میں اس سے بات کر لوں گا لیکن ایک بات کا.....“

اس وقت داؤد کی بیوہ بہن گلنار بھی آگئی اور لڑکے کو دیکھ کر بے زاری ظاہر کی۔ فیروز بخت پھر سہم گیا۔ گلنار کے لب و لہجے میں شہدی کی بیوی کا رنگ جھلک رہا تھا۔ اس نے اسکی سہی نظروں سے گلنار کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔ داؤد نے بہن سے کہا۔ ”گلنار! لڑکے کو کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بڑا دمکی معلوم ہوتا ہے۔“

داؤد اپنی بہن کو لے کر چلا گیا اور فیروز بخت، گلنار سے بھی خوف زدہ ہو گیا۔ وہ اس حویلی میں بھی شہدی کی بیوی کا وجود محسوس کرنے لگا۔ یہ الگ بات تھی کہ یہاں شہدی کی بیوی کا نام گلنار تھا اور گلنار داؤد کی بہن تھی۔

داؤد نے ایک ملازم فیروز بخت پر متعین کر دیا اور اسے حکم دیا کہ وہ لڑکے کے آرام و آسائش کا خاص خیال رکھے۔ حویلی کے خدمت گار حیران تھے کہ داؤد نے اس لڑکے میں ایسی کون سی بات دیکھ لی کہ اسے فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا لیکن گلنار کو لڑکا اچھا نہیں لگا۔ اس کا بھائی داؤد اس سے بہت محبت کرتا تھا لیکن اب اس محبت میں یہ لڑکا بھی شریک ہو گیا تھا۔

داؤد کو اپنے کاروباری سفر پر احمد آباد روانہ ہونا تھا لیکن اب وہ رک گیا تھا۔ شہدی کی بیوی بار بار مٹھے کے آدمی بھیج رہی تھی کہ اس کا بیٹا اسے واپس کیا جائے لیکن داؤد یہ جواب دے کر واپس کر دیتا کہ لڑکا اس کا نہیں ہے شہدی کے آنے پر بات ہو جائے گی۔

داؤد کی لاطنی میں گلنار کے اکسانے پر شہدی کی بیوی چادر اوڑھ کر خود حویلی پہنچ گئی اور وہاں ہنگامہ کر دیا۔ دربانوں سے جھگڑنے آئی۔ ”میرا لڑکا مجھے واپس کر دو ورنہ میں بادشاہ سے شکایت کروں گی اور اس حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی۔“

اس وقت داؤد حویلی میں موجود نہیں تھا۔ دربانوں

کہا۔ ”اور تم سب نے بھی گلنار کا حکم نہ مان کر اپنے حق میں بہت برا کیا ہے۔“

فیروز بخت کے خدمت گار نے اڑ کر جواب دیا۔
”میں کہتا ہوں کہ تو میرے منہ نہ لگ ورنہ میرا دماغ بہت خراب ہو رہا ہے۔ اس وقت تو میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنی بات ادھی رکھوں گا اور کسی کی بات ہرگز نہ مانوں گا۔ جس کی ہمت ہو میرے مقابلے میں آئے اور تجربہ کرے۔“
یہ دوسرا خدمت گار بھی بڑا گرم مزاج تھا۔ مقابلے کو بڑھا لیکن دوسرے کئی خدمت گاروں نے بچ بچاؤ کر دیا۔ ابھی یہ فتنہ ڈرا دبا ہی تھا کہ گلنار، مشہدی کی بیوی کو لے کر آگئی اور فیروز بخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
”یہ رہا تیرا بیٹا، اس کا ہاتھ پکڑ اور اپنے گھر لے جا۔ اب یہ یہاں نہیں رہ سکتا۔“

فیروز بخت مشہدی کی بیوی کو اپنے قریب دیکھ کر مٹی سے خوف کھائے جو ہے کی طرح کمرے میں کھڑے ہوئے تخت کے پیچھے جا چھا۔ مشہدی کی بیوی اس کی طرف دوڑی لیکن فیروز بخت کے خدمت گار نے اس کا راستہ روک لیا اور گرج کر بولا۔ ”خبردار جوڑے کو ہاتھ لگا یا۔“

مشہدی کی بیوی خدمت گار کے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر ڈر گئی۔ منہ پر چادر ڈال کر رونے لگی۔ ”کوگو! یہ کیسا ظلم ہے کہ میری اولاد کو مجھ سے جدا رکھا ہے۔ فیروز بخت میرا لڑکا ہے، خدا کے لیے میرے حوالے کر دو۔“

اچانک خدمت گاروں میں ہلچل مچ گئی اور وہ ادھر ادھر دیکھنے لگے لیکن فیروز بخت کا خدمت گار اپنی جگہ پر ڈٹا کھڑا رہا۔ گلنار بھی ایک طرف سٹ گئی اور مشہدی کی بیوی جہاں کھڑی تھی، وہیں گھونٹ نکال کر بیٹھ گئی۔ اب ان سب کے سامنے داؤد آچکا تھا۔ خدمت گار داؤد کی طرف تیزی سے بڑھا اور جھٹک کر اس کے پاؤں پکڑ لیے، گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

”مالک! آپ مجھے نوکری سے نکال دیجیے کیونکہ اگر میں آپ کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں تو حویلی کے دوسرے لوگ میرے دشمن ہو جاتے ہیں۔“

گلنار چننی ہوئی بولی۔ ”بھائی اس تک حرام کو اسی وقت نکال دے اس حویلی سے ورنہ میں اسے گل کر دوں گی۔“
مشہدی کی بیوی رونے لگی۔ ”ہائے میرا لڑکا، میرے فیروز بخت کو واپس کر دے ورنہ میں یہیں اپنی جان دے دوں گی۔“

داؤد نے گرج دار آواز میں کہا۔ ”حویلی میں رونے

خدمت گار تن کر کھڑا ہو گیا۔ ”میرے بارے میں کسی کو حکم نہ دیجیے گا کیونکہ میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ جو بھی میرے مقابلے پر آئے گا، میں اس کا مقابلہ کروں گا اور پھر یا تو اپنی جان دے دوں گا یا پھر اس کی جان لے لوں گا۔“
گلنار نے کوئی پروا کیے بغیر فیروز بخت کو کھینچنا شروع کر دیا۔ فیروز بخت راہ رو کر خوشامدیں کرنے لگا۔ ”مجھے اس ظالم عورت کے حوالے نہ کیجیے۔ میں اس ظالم عورت کے پاس نہیں جاؤں گا۔ میں سمجھتے سے کہو کہ جان دے دوں گا نیلن اس سفاک عورت کے گھر نہیں جاؤں گا۔“

گلنار بدستور چنچ رہی تھی۔ ”اس کو لے جاؤ، اس۔ بد ذات کو اس حویلی سے اتنی وقت نکال دو۔“
خدمت گار پھر گرجا۔ ”میں کہتا ہوں تم لوگ میرے آڑے نہ آؤ ورنہ اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔“

یہ کہہ کر خدمت گار نے کمرے سے نکل لیا اور وہاں لہراتے دت بولا۔ ”خبردار جو کسی نے اس لڑکے کو ہاتھ لگا یا۔ اگر ہاتھ لگا یا تو میں آتیں نکال لوں گا۔“

لیکن گلنار پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے ایک بار پھر فیروز بخت کو دھکا دینا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی خدمت گار نے گلنار پر حملہ کر دیا پھر جو شور مچا تو قیامت ہی کھڑی ہو گئی۔ خدمت گار نے گلنار کا گریبان پکڑ لیا اور کئی زوردار جھٹکے دے کر ایک طرف دھکیل دیا۔ ”کیا میں نے پہلے ہی یہ نہیں بتا دیا تھا کہ فیروز بخت کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔“
گلنار بھی ہار ماننے والی عورت نہیں تھی۔ اس نے دوسرے خدمت گاروں کو آواز دی جو فوراً دت کر۔ اس کے پاس آگئے۔ گلنار نے لڑکے کے خدمت گار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کو باندھ کر مارا جائے اور جب تک میں سچ نہ کروں مرمت ہوتی رہے۔“

لیکن خدمت گار پر قہر بونا آسان کام نہیں تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”دیکھو! تم لوگ مجھ سے دور ہی رہنا ورنہ اس وقت تو مجھ پر خون سوار ہے۔ میں دو ایک کی جان لیے بغیر نہیں رہوں گا۔“

خدمت گاروں کو ہچکچاتے دیکھ کر گلنار بالکل بے قابو ہو گئی۔ پاؤں پھینتی ہوئی مشہدی کی بیوی کی طرف چل دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”تم سب تک حرام ہو۔ تم سب میری حکم عدولی کر کے اچھا نہیں کر رہے ہو۔ بھائی داؤد کو آنے دو، ایک ایک کو نکلوانے دوں تو میرا نام گلنار نہیں۔“

ایک خدمت گار نے فیروز بخت کے خدمت گار سے کہا۔ ”تو نے یہ اچھا نہیں کیا۔“ پھر اپنے ساتھیوں سے

دھونے کی کوئی ضرورت نہیں، اب شور و غل بند ہو جانا چاہیے۔
 شہدی کی بیوی نے چیخ کر جواب دیا۔ ”میرا لڑکا
 میرے حوالے کر دو، نہ میں قیامت اٹھا دوں گی۔“
 داؤد نے خدمت گار کو حکم دیا۔ ”اگر یہ عورت خود سے
 نہ جائے تو اس کو زبردستی دھکے دے کر نکال دے۔“
 خدمت گار شہدی کی بیوی کی طرف بڑھا۔ گلنار،
 بھائی کے خوفناک تیور دیکھ کر سامنے سے نکل گئی۔ شہدی کی
 بیوی نے خدمت گار کو اپنی طرف بڑھتے اور گلنار کو فرار
 ہوتے جو دیکھا تو اس کی ہمت بھی جواب دے گئی اور وہ
 پھاٹک کی طرف بھاگی۔ کچھ دیر بعد مطلع صاف ہو گیا۔ داؤد
 فیروز بخت کے کمرے میں داخل ہوا اور ادھر ادھر دیکھ کر
 خدمت گار سے پوچھا۔ ”یہ فیروز بخت کہاں چلا گیا؟“
 خدمت گار نے جواب دیا۔ ”مالک! اگر اس وقت
 آپ نہ آجاتے تو معلوم نہیں کیا ہو جاتا۔ فیروز بخت اسی
 کمرے میں کہیں چھپا ہوگا۔“
 داؤد نے کہا۔ ”فیروز بخت کو تلاش کر، یہ معاملہ کیا تھا؟“
 خدمت گار نے فیروز بخت کو تخت کے پیچھے سے نکال
 لیا۔ وہ سہا سہا سر جھکا کر داؤد کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی
 آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور رخساروں پر آنسوؤں کے
 قطرات کے علاوہ خشک آنسوؤں کی لکیریں بھی تھیں۔ داؤد
 نے پھر پوچھا۔ ”یہ معاملہ کیا تھا؟ یہ عورت حویلی میں یہاں
 تک کس طرح آگئی؟“
 خدمت گار نے اپوری تفصیل بتادی اور کہا۔ ”گلنار بی
 بی نے اگر اس عورت کی ہمت افزائی نہ کی ہوتی تو وہ حویلی
 میں اس کمرے تک نہیں آسکتی تھی۔“ اس کے بعد وہ زارو
 قطار رونے لگا اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولا۔ ”میں نے گلنار
 بی سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک خود مالک مجھے یہ
 حکم نہیں دیں گے کہ اس بڑے کو اس عورت کے حوالے کر دیا
 جائے، میں کسی اور کا حکم نہیں مانوں گا اس پر گلنار بی بی نے
 مجھے نکلوا دینے کی دھمکی دی۔“
 داؤد پر خدمت گار کے رونے کا کوئی اثر نہ ہوا۔
 تھکسانہ انداز میں جواب دیا۔ ”پھر دتا کیوں ہے؟ کیا تو یہ
 سمجھتا ہے کہ میں تجھے نکال دوں گا؟ تو خوش ہو جا کہ میں تجھ کو
 نہیں نکالوں گا۔“
 اس کے بعد داؤد فیروز بخت کی طرف متوجہ ہوا۔
 فیروز بخت پرش احوال پر بلک بلک کر رونے لگا۔ داؤد
 نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”ارے تو کیوں رو
 رہا ہے۔ تو بالکل محفوظ ہے اس حویلی میں۔ تیرا تو بال کا

بھی نہیں ہوگا۔“
 ”آج میں نے تیرے سر پرست شہدی سے بھی
 تیرے بارے میں بات کر لی ہے۔ شہدی تو بڑا رحم دل اور
 بہت اچھا آدمی ہے۔ وہ اپنی بیوی کے مظالم اور جبر پر خاصا
 شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی میں نے اس کو یہ پورا
 واقعہ سنایا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں تجھے اپنے پاس
 رکھنا چاہتا ہوں تو وہ بہت خوش ہوا اور کھلے دل سے اجازت
 دے دی کہ میں تجھے اپنے پاس رکھ سکتا ہوں۔ ہاں شہدی
 کبھی کبھی تجھے دیکھنے آجایا کرے گا۔“
 داؤد کی باتوں نے فیروز بخت اور خدمت گار دونوں
 کو خوش کر دیا۔ خدمت گار نے رک رک کر کہا۔ ”لیکن
 یہاں جگن ایک.....“
 داؤد نے ڈانٹ دیا۔ ”زیادہ بکواس نہ کر، میں اس
 حویلی اور اس کے لوگوں کے بارے میں تجھ سے زیادہ جانتا
 ہوں۔ ب جو کچھ ہو گیا ہو گیا۔ اس پر کسی قسم کی رائے زنی یا
 اس کا با۔ بارڈ کر کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔“
 فیروز بخت فرط جوش میں داؤد سے چٹ جانا چاہتا تھا
 لیکن ہمت نہیں پڑی اور اس نے سر اٹھا کر داؤد کو سرسری
 نظروں سے دیکھا اور اس کے پاؤں پکڑ لیے، بولا۔ ”اب میں
 یہیں رہوں گا آپ ہی کے پاس، میں کہیں نہیں جاؤں گا۔“
 داؤد نے اس کو اپنے قدموں سے اٹھا کر سینے سے
 لگایا، بولا۔ ”بیٹے! اس کو تو اپنی حویلی سمجھ اور پھیلی باتوں کو
 بھول جا۔ تو یہ سمجھ کہ تو ایک بہت بڑے تاجر کا بیٹا ہے اور
 اب تجھ پر کوئی ظلم نہیں کر سکے گا۔“
 کچھ دیر بعد داؤد نے فیروز بخت کو اپنے سینے سے جدا کیا
 اور خدمت گار سے کہا۔ ”تو اس کا، فیروز بخت کا خدمت گار
 ہے۔ اس لیے تجھ پر کسی اور کی خدمت گزارا نہیں ہے۔ تو
 اپنا سارا وقت اس کو دے گا کیونکہ یہ میرا وارث ہے میری
 دولت، میری جائیداد اور میرے کاروبار کا واحد وارث۔“
 داؤد کے اس فیصلے کا حویلی کے لوگوں پر متضاد اثر ہوا
 لیکن خوش کوئی نہ ہوا۔ گلنار کو سب سے زیادہ دکھ ہوا۔ یہ فیصلہ
 گلنار کے لیے ناقابل قبول اور ہتک آمیز تھا۔ رات کے کھانے
 کے بعد داؤد نے عشا کی نماز پڑھی اور کچھ دیر چھل قدمی کے
 بعد جب وہ اپنی خواب گاہ میں داخل ہوا تو وہاں گلنار پہلے سے
 موجود اس کا انتظار کر رہی تھی۔ داؤد اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔
 پوچھا۔ ”گلنار! خیریت تو ہے، آج یہاں کیسے؟“
 گلنار نے ترش لہجے میں جواب دیا۔ ”آج میں اس
 لیے یہاں آئی ہوں کہ آپ کو شادی پر مجبور کروں، اب

شادی ہو یا نہ ہو لیکن تیری شادی ضرور ہوگی کیونکہ میرا خیال ہے کہ تو تنہائی سے اکتار ہی ہے۔“
گلنار نے اس فیصلے کو ٹھنڈا ہٹ سے سنا اور چلی گئی لیکن داؤد کو الجھن میں ڈال گئی۔ اس لڑکے نے تو اس کا اور اس حویلی کا سکون تہاہ و برہاؤ کر دیا تھا۔

☆☆☆

فیروز بخت کا خدمت گار بڑی تن دہی اور محبت سے اس کی خدمت گزاری میں مشغول تھا۔ داؤد نے فیروز بخت کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک اتالیق رکھ دیا۔ یہ اتالیق اس کا استاد بھی تھا۔ گلنار شب و روز حسد کی آگ میں جھلس رہی تھی اور اب سے اب فیروز بخت کے ساتھ ہی اس کے خدمت گار اور اتالیق کے خلاف بھی سوچنا اور کچھ نہ کچھ کرنا پڑ رہا تھا۔ فیروز بخت اس نگاہ میں مبتلا تھا کہ وہ کیا کرے؟ گلنار اور اس کے زیر اثر خدام کے متقی اور حاسد رویوں پر صبر کرے یا راہ فرار اختیار کرے یا پھر داؤد کے طفیل خوش قسمتی سے اس کو جو بلند مرتبہ میسر آ گیا تھا، اس کا حاکمانہ اظہار بھی کرے لیکن فی الحال ایک بات صاف تھی۔ وہ یہ کہ فیروز بخت نے جس بدتر ماحول میں ہوش سنبھالا، اس نے فیروز بخت میں ایک ڈر اور ایک نامعلوم سا اندیشہ دل میں بٹھا دیا تھا۔ رشتوں کی آبرو ختم کر دی تھی اور انسانی شفقت، محبت اور رحم دلی اور ہمدردی کو بے متقی اور فضیل قرار دے دیا تھا۔ اس کو داؤد کے فیصلے کی پائیداری پر یقین نہیں تھا اور اسے یقین کی حد تک یہ وہم پریشان کرتا رہتا تھا کہ داؤد کی مہربانیاں وقتی ہیں اور یہ کسی بھی دن ختم ہو سکتی ہیں۔ ان احساسات اور خیالات میں پروان چڑھنے والا فیروز بخت اپنے اعمال اور کردار میں بڑائی اور برتری نہیں پیدا کر سکا۔ وہ اتالیق سے اس طرح پیش آتا جس طرح کوئی ملازم اپنے آقا سے پیش آتا ہے۔ وہ اپنے خدمت گار سے یوں باتیں کرتا جس طرح کوئی احسان مند اپنے محسن سے یوں کرتا ہے۔ وہ اپنی خواہشوں کا اظہار بھی اتنا آمیز پیرائے میں کرتا۔ داؤد کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ ان نازک امور پر غور کرتا، دیکھتا اور کوئی مناسب قدم اٹھاتا اور اگر وہ ان باتوں کو محسوس بھی کرتا تو ان کی تہ میں موجود عوائل اور عناصر کے تجزیے سے لاعلم اور محروم رہتا۔ اور جب مرض کی تشخیص ہی نہ ہو سکے تو اس کا علاج کس طرح کیا جاسکتا ہے؟

داؤد کو اپنے کاروباری سفر پر روانہ ہونا تھا۔ وہ احمد آباد جا رہا تھا لیکن احمد آباد جانے سے پہلے وہ گلنار کی شادی کر دینا چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ گلنار کو احساس تنہائی ہمیشہ پریشان کرتا رہے گا اور گلنار جب خود پریشان ہوگی تو

آپ کو شادی کر لینا چاہیے۔“
داؤد نے بے دلی سے تکیہ اٹھا کر ایک طرف دکھ دیا اور گلنار کے سامنے بیٹھ گیا، پوچھا۔ ”گلنار! ایک دم شادی کا خیال کیونکر آیا؟“
گلنار نے جواب دیا۔ ”صرف اس لیے کہ آپ کے کاروبار، جائداد اور دولت کا کوئی وارث بھی تو ہونا چاہیے۔“

داؤد نے مسکرا کر کہا۔ ”گلنار! میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تیری شادی کر دی جائے کیونکہ میری شادی بیکار رہے گی اور ویسے بھی میں نے فیروز بخت کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے اور اب یہی میرا وارث اور میرے کاروبار، جائداد اور دولت کا مالک بھی ہوگا۔ میں نے یہ فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے۔“
گلنار ایک دم پھٹ پڑی۔ مشتعل ہو کر بولی۔ ”بھائی! آپ میری باتوں کا برانا نہیں یا بھلا لیکن میں اس لڑکے کے معاملے میں چپ نہیں رہوں گی۔ کیا آپ اس لڑکے کے بارے میں تفصیل سے جانتے ہیں؟“

داؤد نے پوچھا۔ ”میں نے مشہدی سے معلوم کر لیا ہے اس کے والدین شریف لوگ تھے۔ میں تیرا مطلب نہیں سمجھا تو کہنا کیا چاہتی ہے؟“

گلنار نے برا سامنہ بتایا، بولی۔ ”مشہدی کوئی فرشتہ تو نہیں ہے۔ وہ جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ فیروز بخت کسی کی ناجائز اولاد بھی ہو سکتا ہے۔“

داؤد مشتعل ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ”گلنار! بس اپنی زبان کو لگام دے، میں تیری مزید بکواس نہیں سن سکتا۔ میں نے جب ایک بار یہ کہہ دیا کہ مشہدی ایک شریف انسان ہے اور اس نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ فیروز بخت کے والدین بہت شریف تھے تو اب کسی کو بکواس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔“

گلنار رونے لگی، دوپٹے کے پلو سے دونوں آنکھیں چھپائیں اور سسکیاں لے لے کر کہنے لگی۔ ”بھائی! اگر آپ اس لاوارث کے بارے میں اتنے ہی جذباتی ہو رہے ہیں تو میں اپنی زبان بند رکھوں گی لیکن میں یہ بات بار بار اور ہزار بار کہوں گی کہ آپ کی جائداد، دولت اور کاروبار کا وارث آپ کا اپنا بیٹا ہی ہونا چاہیے۔ میں اس لاوارث لڑکے کی ہمیشہ مخالفت کروں گی۔“

داؤد نے کمرے میں ٹھلنا شروع کر دیا۔ دونوں ہاتھ پیچھے کر پر باندھ لیے، اور خیالوں میں گم ہو گیا۔ گلنار سسکیاں لے لے کر معلوم نہیں کیا کیا کہتی رہی، داؤد کچھ بھی نہ سن سکا۔ آخر وہ یہ کہتا ہوا اپنی سہمی پر دوبارہ بیٹھ گیا۔ ”گلنار! میری

شادی کر لی اور اس کی اولاد ہوئی تو تو کیا ہوگا؟“
 داؤد نے کہا۔ ”میں فیروز بخت کو سمجھاؤں گا کہ میری
 ہی طرح وہ بھی شادی نہ کرے اور ابھی تک میں نے یہی
 اندازہ لگا پایا ہے کہ فیروز بخت میرے حکم، میری خواہش اور
 میری رضا کی تعمیل کرے گا۔“
 گلنار بولی۔ ”آپ جو چاہیں کریں، لیکن میں آپ
 کی شادی ضرور کرواؤں گی۔“

داؤد ہنس دیا۔ ”دیکھا جائے گا۔“
 یہاں سے اٹھ کر وہ فیروز بخت کے پاس چلا گیا اور وہ
 تک یہی سمجھا تا رہا کہ میری عدم موجودگی میں کسی سے لڑنے
 جھگڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر ایک کو خوش رکھنا ہے۔
 اس کے بعد خدمت گار کو سمجھایا۔ ”فیروز بخت کا بہت
 خیال رکھنا۔ آنے پر کوئی شکایت سننے میں نہ آئے۔“
 آخر میں اتالیق کو ہدایت کی۔ ”دیکھ، خبردار جو گلنار یا
 کسی اور سے نفی پیدا کی۔ تیرا کام یہ ہے کہ دو تین سال بعد
 جب میں واپس آؤں تو فیروز بخت کو پڑھا لکھا اور شائستہ
 پاؤں کیونکہ اس کو بڑی ذمے داریاں سنبھالنا ہیں۔“

اتالیق کی خواہش کی ذمے داری گلنار کے سپرد کی گئی۔
 داؤد احمد آباد روانہ ہو گیا کیونکہ اس کا کاروبار یہ تھا
 کہ چھپا ہوا کپڑا چھینٹ، رومال اور نینے کے تھان سورت کی
 بندرگاہ سے طلح فارس کے ملکوں کو بھجوائے۔ اس کے
 کارندے یہ کام اس کی عدم موجودگی میں انجام دیتے رہتے
 تھے لیکن اس کاروبار کی نگرانی تو بہر حال اسی کو کرنا تھی۔ وہ
 چلا گیا اور اس کے جاتے ہی گلنار نے سکھ کی سانس لی۔

فیروز بخت ایک بار پھر خود کو تنہا اور بے یار و مددگار
 محسوس کرنے لگا۔ خدمت گار زیادہ ولیر تھا اور وہ فیروز بخت
 کی ہمت بندھا تا رہتا تھا۔ گلنار اکثر فیروز بخت کے پاس پہنچ
 جاتی اور اس کے خدمت گار اور اتالیق کو جھڑکتا شروع
 کر دیتی۔ اس طرح دو تین ماہ کے اندر ہی اس نے یہ اثر قائم
 کر دیا کہ اس حویلی میں گلنار ہی سب کچھ ہے اور اس سے
 اختلاف مول لے کر کوئی شخص رہ نہیں سکتا۔ لیکن خدمت گار
 پر یہ تاثر نہیں قائم ہوسکا کیونکہ وہ اس حویلی کی فضا اور اس کے
 ہر فرد سے اچھی طرح واقف تھا لیکن داؤد کی عدم موجودگی میں
 فیروز بخت کی حمایت کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ گلنار بھی خدمت
 گار ہی کو سب سے زیادہ خواہ کرنے کی کوشش کرتی۔

تین ماہ بعد گلنار نے اتالیق کی اجرت کی ادائیگی
 روک دی۔ اتالیق کچھ دن تو اجرت کے بغیر ہی اپنا کام کرتا
 رہا لیکن پھر تنگ آ گیا اور فیروز بخت سے پوچھا۔ ”میں

دوسروں کو بھی پریشان کرے گی اور اس کا سب سے زیادہ
 نشانہ فیروز بخت بنے گا۔“

اس کی بہن بیوہ تھی اور اتنی جلدی رشتہ نہیں مل سکتا
 تھا۔ اس نے اپنی اس فکر کا ذکر تاجر برادری میں کیا اور کئی
 تاجروں نے گلنار سے شادی کرنے کی خواہش کی لیکن یہ
 رشتے داؤد کو ناپسند تھے۔ داؤد اب رک بھی نہیں سکتا تھا،
 اس لیے اس نے گلنار کی شادی کا مسئلہ مستقبل پر چھوڑ دیا اور
 جانے سے پہلے اپنی بہن کو سمجھایا کہ میری عدم موجودگی میں
 فیروز بخت کے ساتھ کوئی ایسا سلوک نہ کرنا جو میری مرضی
 کے خلاف ہو۔

گلنار نے پھر اصرار کیا۔ ”بھائی! میں کہتی ہوں آپ
 شادی ضرور کر لیں کیونکہ اپنا خون اپنا ہوتا ہے۔“
 داؤد نے جواب دیا۔ ”لیکن گلنار تو یہ کیوں نہیں
 سوچتی کہ شادی کے بعد کئی بچے ہوں گے جن میں لائق بھی
 ہوں گے اور نالائق بھی۔ سبھی نالائق نکل سکتے ہیں اور یہ
 نالائق اولاد میری ہر چیز کو تباہ و برباد کر دے گی۔ جانکاد،
 دولت اور کاروبار کے جسے بخرے ہوں گے۔ نالائق اولاد
 مجھے اور خاندان کو ذلیل کر دے گی۔ اس لیے میں شادی
 نہیں کروں گا۔“

گلنار نے وہی رٹ لگائی۔ ”خاندان کا نام کیسے چلے
 گا، نسل کس طرح قائم رہے گی؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”کیسا خاندان اور کس کی نسل؟
 فیروز بخت کو اپنے باپ کا نام تک معلوم نہیں۔ اس لیے اس کا
 باپ میں ہوں۔ اپنی ولدیت کے خانے میں وہ میرا نام
 لکھے گا، میری نسل فیروز بخت سے چلے گی۔“

گلنار کی سمجھ میں داؤد کی باتیں ذرا بھی نہیں آ رہی
 تھیں۔ بولی۔ ”بھائی! یہ ایسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ فیروز
 بخت کے باپ کی جگہ آپ کا نام لکھا جائے۔ اس سے آپ
 کی نسل چلے گی؟ یہ کیسی بے گئی اور بے سرو پا باتیں کر رہے
 ہیں آپ؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”گلنار! میری بہن، نسلیں
 بادشاہوں کی چلتی ہیں یا ان لوگوں کی چلتی ہیں جو غیر معمولی کام
 کر گزرتے ہیں۔ عامیوں کی حیثیت ہی کیا جو ان کی نسل اور
 نام چلے۔ عامیوں سے ان کی زندگی ہی میں کون واقف ہوتا
 ہے جو ان کی اولاد کو ان کے نام سے پہچانا جائے گا۔ میرے
 بعد اگر لوگوں نے کچھ یاد رکھا تو یہی یاد رکھیں گے کہ فیروز
 بخت میرا بیٹا ہے۔“

گلنار نے منہ بنا کر پوچھا۔ ”اگر فیروز بخت نے

ہیسوں کے بغیر اپنا کام کس طرح جاری رکھوں؟ آخر میرا اپنا کتبہ بھی تو ہے۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”استاد محترم! میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں کیونکہ میں اس حویلی میں زبردستی رہ رہا ہوں اور مجھے نہیں معلوم کہ میں کب تک یہاں رہ سکوں گا۔ اس لیے آپ جو مناسب سمجھیں کریں۔“

اتالیق نے سکوت اختیار کیا اور کچھ دیر سوچتا رہا پھر کہا۔ ”اچھا میں اس شری عورت سے ایک بار بات کروں، اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔“

یہاں خدمت گار بھی موجود تھا، بولا۔ ”بات چار چھ ماہ کی ہوئی تو آدمی جمیل بھی سکتا تھا لیکن مالک کی واپسی دو تین سال بعد ہوگی، اس لیے ان مشکلات پر کسی نہ کسی طرح قابو پانا ضروری ہے۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں خود کو اس حویلی کے لائق نہیں سمجھتا اور داؤد تاز نے میرے بارے میں جو فیصلہ کیا ہے، میں نے اس پر بھی تک صدقِ دل سے یقین نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ میں اس حویلی سے چپ چاپ فرار ہو جاؤں اور آپ دونوں بھی اسی طرح اپنے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ کر لیں۔“

اتالیق نے نرمی اور محبت سے کہا۔ ”برخوردار! حیرا فیصلہ بچکانہ ہے۔ میں اس سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ میں پہلے اس شری خاتون سے بات کروں گا اور وہ جو جواب دے گی، اس کی روشنی میں کوئی فیصلہ کروں گا۔“

ان تینوں میں صلاح مشورے جاری تھے کہ حویلی کے جاسوس خدمت گاروں نے گلنار کو خبر کر دی کہ فیروز بخت، اتالیق اور خدمت گار تینوں مل کر گلنار کے خلاف کسی قسم کی سازش میں مشغول ہیں۔ گلنار گرجتی ہوئی کمرے میں گئی اور تینوں کو خوب لٹاڑا اور فیروز بخت کو حکم دیا کہ اب تو نوکروں کی طرح کام کرے گا تو یہاں رہ سکتا ہے۔ اس کی فضول باتوں سے بے زار ہو کر اتالیق نے تلخ مسکراہٹ سے کہا۔ ”خاتون! آپ خود ہی بولے جا رہی ہیں، کسی اور کو بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہیں۔ کچھ میری بھی تو سنیں، میں آپ سے ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

گلنار نے ٹھک کر کہا۔ ”تو کیا ضروری باتیں کرے گا مجھ سے؟ میں خود تجھے یہ حکم دے رہی ہوں کہ تو آئندہ اس حویلی میں قدم نہیں رکھے گا کیونکہ اب حویلی میں تیری ضرورت باقی نہیں رہی۔“

اتالیق نے بھی بے رخی سے جواب دیا۔ ”محترم

خاتون! میں اس حویلی میں آپ کا بلا یا ہوا نہیں آیا ہوں۔ مجھے داؤد تاجر نے فیروز بخت کے لیے رکھا تھا اور اب وہی مجھے جواب بھی دے سکتا ہے۔“

گلنار نے جنونی کیفیت میں چیخ کر کہا۔ ”اگر تجھے داؤد نے رکھا تھا تو وہی تیری اجرت بھی دے گا۔“

اتالیق نے بڑے گل سے کہا۔ ”خاتون! آپ میری باتیں بھی سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ اس لڑکے پر مجھے آپ کے بھائی داؤد نے متعین کیا ہے اور اسی کے حکم پر میں علیحدگی اختیار کروں گا۔ میں آپ کو اس سے زیادہ حیثیت نہیں دے سکتا کہ آپ داؤد کی بہن ہیں، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔“

گلنار نے اتالیق کو قہر بھری نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ”تو یہ بات ہے تب پھر اب داؤد کے پاس ہی جا اور فیروز بخت، اس منحوس کو بھی اپنے ساتھ ہی لیتا جا۔ اب اس حویلی میں نہ تو قدم رکھے گا اور نہ ہی فیروز بخت رہے گا۔ اگر تجھ کو اس سے ہمدردی ہے تو اس کو اپنے ساتھ ہی لے جا۔“

اتالیق غصے میں کھڑا ہو گیا۔ ”دیکھیے خاتون! اپنی زبان کے بے جا استعمال سے گریز کیجئے ورنہ میں بھی بادشاہ تک پہنچ سکتا ہوں اور اس کے بعد جو کچھ ہوگا، اس کی ذمے داری آپ پر ہوگی۔“

گلنار کچھ ڈری، نرمی سے بولی۔ ”اچھا، اب آپ تشریف لے جائیں۔“

اتالیق نے جواب دیا۔ ”اس وقت تو میں چلا جاؤں گا لیکن میری آمد و رفت جاری رہے گی اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک آپ کے بھائی داؤد واپس نہیں آجاتے۔“

گلنار نے کہا۔ ”لیکن یہ سوچ کر تشریف لائیے گا کہ میں آپ کو کچھ نہیں دوں گی۔“

اتالیق نے جواب دیا۔ ”بہتر ہے، دیکھا جائے گا۔“ اتالیق کے جاتے ہی گلنار خدمت گار پر برس پڑی، بولی۔ ”اور دیکھ میں تجھے ایک بار پھر سمجھا رہی ہوں کہ توجھ ہو جا۔ مجھے بس اس کا خیال آتا ہے کہ تو اس گھرانے کا منشی خدمت گار ہے۔ تو نے اس حویلی میں آنکھ کھولی اور یہیں ہوش سنبھالا۔ اب یہ بات تجھ کو کسی طرح بھی زیب نہیں دیتی کہ اس حویلی کا ٹھک کھائے اور اسی سے خداری کرے۔“

خدمت گار نے جواب دیا۔ ”گلنار بی بی! میں نے کوئی خداری نہیں کی۔ میں نے آپ کے بھائی کا حکم مانا ہے اور اس کی ایمان داری سے عمل کی ہے۔ اگر آپ اس کو

فیروز بخت نے شکستہ دلی سے کہا۔ ”لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اس ظالم عورت کا مقابلہ کروں۔“
 خدمت گار نے جواب دیا۔ ”لیکن ہمت ہارنے سے کام نہیں چلے گا، ہمت تو کرنا ہی پڑے گی۔“
 اسی وقت حمد آ گیا، بے رخی سے بولا۔ ”اب تو یہاں سے چلا جا کیونکہ یہاں کی خدمت میرے ذمے کر دی گئی ہے۔“
 خدمت گار نے نرمی سے سمجھایا۔ ”دیکھ حمد! تو اس معاملے میں نہ پڑ، تو اپنے مالک کے مزاج سے واقف ہے۔ اگر تو نے گلزار بی بی کا حکم مان لیا تو تجھے یہ بات بھی جانتا چاہیے کہ مالک کے آنے پر تیرا براحشر ہوگا۔“
 حمد نے جواب دیا۔ ”دوست! تو ہی بتا میں کیا کروں؟ مالک تو آئے گا ڈھائی سال بعد..... اس دوران اگر میں گلزار بی بی کا حکم نہ مانوں گا تو یہ میرا برا حال کر دیں گے۔“
 خدمت گار نے کہا۔ ”میرے پاس اس کا بھی حل ہے۔“
 حمد نے پوچھا۔ ”وہ کیا بتا تو سکی؟“

خدمت گار نے جواب دیا۔ ”دیکھ پہلے میری ایک بات ذرا غور سے سن لے، اس کے بعد کچھ کرنا۔ پہلی بات تو یہ کہ مالک شادی وادی نہیں کرے گا اور اسی وجہ سے اس نے اسے اپنا بیٹا بنایا ہے۔ گویا ہم سب کے مستقبل کا مالک یہ لڑکا ہے۔ ہمیں اپنے مستقبل کے لیے اس کا خیال رکھنا ہوگا، اس کی خدمت کرنا ہوگی اور خدا نخواستہ اس لڑکے کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو اس سے دو مختلف سمتوں سے بربادیاں وارد ہو سکتی ہیں۔ ایک تو مالک کی طرف سے اور دوسری بادشاہ کی طرف سے کیونکہ استاد محترم ایک بااثر شخص ہیں اور یہ امر طے شدہ ہے کہ اگر فیروز بخت کو کوئی نقصان پہنچا تو استاد محترم اس معاملے کو بادشاہ تک لے جائیں گے۔ بعد میں اس کا کچھ بھی نتیجہ نکلے، میں نہیں جانتا۔“
 حمد بھی پریشان ہو گیا، تنگ آ کر پوچھا۔ ”دوست! تو ہی بتا پھر میں کیا کروں؟“

خدمت گار نے جواب دیا۔ ”تو یہ کر کہ بہ ظاہر تو فیروز بخت سے بری طرح پیش آ لیکن اندر ہی اندر اس کا خاص خیال رکھ اور اس طرح ڈھائی تین سال گزار دے۔“
 حمد نے فیروز بخت کی طرف دیکھا۔ ”کیوں میاں صاحبزادے! آپ کا کیا خیال ہے؟“
 فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے، مجھے تو آپ لوگوں کی طرف سے جو مشورہ ملے گا، میں اس پر عمل کروں گا بس۔“
 حمد نے کہا۔ ”اچھا میرے دوست! اب تو فوراً چلا

خدا رسی کہتی ہیں تو یہ مجھ پر اس طرح ہے۔“
 گلزار پاگل ہو رہی تھی۔ بچتی ہوئی خدمت گار کے سر پر چڑھ گئی۔ ”بس اب تو اپنی زبان بند کر لے، میں زیادہ بگو اس نہیں سن سکتی۔ تو وہی تنگ حرام ہے جس نے اس نا جائز لڑکے کی خاطر فخر ٹال لیا تھا۔“
 فیروز بخت تھملا کر کھڑا ہو گیا۔ ”بس اب اور کچھ نہ کہیے گا۔ میں اس حویلی کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں گا۔“
 گلزار نے اس کو دو اداؤں شانوں سے پکڑ لیا۔ ”تو نہیں جائے گا تو اس حویلی میں اس دن تک رہے گا جب تک میرا بھائی داؤد واپس نہ آ جائے۔“ پھر خدمت گار سے کہا۔ ”میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اب تیغ بچائے حمد، فیروز بخت کے پاس رہے گا۔ تو حویلی کے دوسرے کام کرے گا۔“
 خدمت گار تھملا کر بولا۔ ”گلزار بی بی! یا تو میں فیروز بخت کے پاس رہوں یا اس حویلی کو چھوڑ دوں گا۔“
 گلزار نے جانتے ہوئے کہا۔ ”میں جا کر حمد کو بھیج رہی ہوں تو چھٹی کر اور کل تک یہ فیصلہ کر لے کہ تجھے میری شرائط پر حویلی میں رہنا ہے یا یہاں سے چلے جانا ہے؟“
 گلزار چلی گئی لیکن خدمت گار اپنی جگہ کھڑا رہا۔ فیروز بخت رو رہا تھا۔ اس نے خدمت گار سے کہا۔ ”تو اس حویلی میں رہ میں کہیں اور چلا جاتا ہوں۔“

خدمت گار نے بڑے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے تو لگوں میں یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر اس حویلی میں رہوں گا تو مالک کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے رہوں گا ورنہ آپ کے ساتھ نکل جاؤں گا۔“
 فیروز بخت نے عاجزی سے کہا۔ ”میں ایک بد قسمت لڑکا ہوں۔ میری بد قسمتی کا اثر تم پر اور استاد محترم پر بھی پڑ رہا ہے، اس لیے تم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ میرا ساتھ چھوڑ دو۔“

خدمت گار نے جواب دیا۔ ”نہیں، ہماری بہتری اسی میں ہے کہ آپ کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ اپنے مالک کے مزاج سے میں خوب واقف ہوں۔ وہ آدمیوں کے پچھاننے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ انہوں نے میرے سپرد جو خدمت کی ہے تو وہ جانتے تھے کہ میں ان کے حکم کی ہر حال میں تعمیل کروں گا۔ اسی طرح انہوں نے آپ کی عظیم و تربیت پر جو استاد لگایا ہے، مالک اس سے بھی اچھی طرح واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ حالات کچھ بھی ہوں، استاد اپنا کام جاری رکھیں گے۔ آپ ہمت نہ ہاریں ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔“

جا۔ میں دعویٰ کروں گا جس کا تو نے مشورہ دیا ہے، خدا میری مدد کرے۔“

خدمت گارہم کو چھوڑ کر گنار کے پاس چلا گیا تو حمد نے ہاتھ جوڑ کر فیروز بخت کو سمجھایا۔ ”چھوٹے مالک! اگر میں کسی وقت آپ کو ڈانٹوں، پشکاروں یا کوئی نازیبا سلوک کروں تو مجھے معاف کر دینا کیونکہ اس حویلی میں مجھے اپنی عزت آبرو کا خیال رکھنا ہے۔ بڑی سوزی عورت سے پالا پڑا ہے۔“

فیروز بخت نے بے بسی سے جواب دیا۔ ”بھائی! اگر تم مجھے مار بھی لو گے تب بھی میں خاموش رہوں گا کیونکہ میرا اس حویلی میں تم دونوں کے علاوہ ایک بھی حمایتی نہیں۔“

فیروز بخت کا دماغ الجھنوں میں گھرا معلوم نہیں کیا کچھ سوچنے میں مشغول تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا اور سوچتے ہی سوچتے سو گیا۔

☆☆☆

حمد نے یہ راز اختیار کی کہ جب بھی گنار کو آتے دیکھتا، فیروز بخت کے خلاف سخت رویہ اختیار کرتا اور اس کو ایسی ایسی سنا تا کہ فیروز بخت یہ جاننے کے باوجود کہ یہ سب دکھاوے کے لیے ہے برداشت نہ کر پاتا اور رونے لگتا لیکن گنار کے جاتے ہی حمد معافی مانگ لیتا اور فیروز بخت کھل جاتا۔ اتالیق کی آمد و رفت جاری تھی اور وہ کسی مطالبے کے بغیر فیروز بخت کی حلیم و تربیت میں مشغول تھا۔ گنار یہ تماشا بڑی بے چینی سے دیکھ رہی تھی۔ اس بے چینی اور الجھن میں ایک سال کھل گیا۔ فیروز بخت بھی خامسا بدل گیا۔ اب اس میں پہلے کے مقابلے میں سمجھ بھی زیادہ آگئی تھی اور حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت بھی بڑھ گئی تھی۔

گنار ڈر رہی تھی کہ اگر اس کا بھائی داؤد واپس آ گیا تو اسے کیا جواب دے گی اور اس کی بڑی بے عزتی ہو جائے گی۔ اس لیے اس نے خوب اچھی طرح غور و فکر کر کے دو لاکھ عمل پر خود کو آمادہ کیا۔ پہلا لاکھ عمل یہ تھا کہ اس کو مشہدی کی بیوی کے حوالے کر دیا جائے اور دوسرا تھا اس کا ہمیشہ کے لیے قصہ پاک کر دینا چاہیے۔ اس نے فجر کے بعد مشہدی کی بیوی کو طلب کیا۔ اس کو کچھ رقم دی اور کہا۔ ”جس طرح بھی ممکن ہو، فیروز بخت کو اپنے ساتھ لے جا اور میرا بیچا چھڑا۔“

مشہدی کی بیوی نے جواب دیا۔ ”بی بی! اگر میرا شوہر بھی میرے ہی جیسا ہوتا تو آج یہ بد بخت اس حویلی کے بجائے میرے اپنے گھر میں ہوتا لیکن وہ میری مخالفت کرتا ہے۔ کہتا ہے فیروز بخت کو حویلی میں رہنے دو۔“

گنار نے سختی سے کہا۔ ”لیکن میں نے اس سے یہ

اندازہ لگایا ہے کہ تم دونوں میاں بیوی فیروز بخت کو حویلی میں داخل کر کے میری دولت، جائیداد اور کاروبار پر قبضہ کرنا چاہتے ہو لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“

مشہدی کی بیوی نے دونوں ہاتھ کان پر رکھے۔ ”میری تو یہ، میں نے تو یہ سوچا تک نہیں۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

گنار نے جواب دیا۔ ”میں نے جو کچھ کہا ہے، خوب سوچ بچ کر کہا ہے۔ میں تجھے اس کا بہت اچھا سبق دے سکتی ہوں لیکن میں ایسا اس لیے نہیں کروں گی کہ میں غریبوں کی آہ نہیں لوں گی۔ اب تو اس کو اپنے ساتھ لے جا۔ اگر تو اس کو اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہوگئی تو میں تجھے بالائے مال کروں گی۔“

مشہدی کی بیوی نے جواب دیا۔ ”اچھا بی بی! آپ مجھے فیروز بخت کے پاس لے چلیے، میں ابھی بات کیے گئی ہوں۔“

گنار اس کو ساتھ لے کر فیروز بخت کے پاس چلی گئی۔ اس وقت حمد و فیروز بخت کے لیے کھل لے گیا تھا اور فیروز بخت سیب کی ایک قاش منہ میں رکھ چکا تھا۔ حمد نے گنار کو خلاف توقع آتا دیکھا تو فیروز بخت کی طرف بڑھا اور سامنے رکھی ہوئی سیب کی طشتری اٹھائی اور فیروز بخت کے گال پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ برا بھلا کہتے ہوئے بولا۔ ”میں یہ پوچھتا ہوں کہ میری لائسی میں یہ سیب کس نے پہنچا دیا ہے تیرے پاس؟ جو کچھ منہ میں ہے ٹھوک دے ورنہ میں گلا دبا کر نکالوں گا تیرے حلق سے۔“

فیروز بخت نے سیب کی قاش پوری طرح چبائے بغیر ہی اگلی اور کوئی جواب نہیں دیا۔

حمد نے اس کا گلا پکڑ لیا اور اس کو دبانے لگا، بولا۔

”کیا تو نے میری بات سنی نہیں؟ میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

فیروز بخت نے منہ کھول کر دکھا دیا۔ ”یہاں تو کچھ بھی نہیں۔ اگر یقین نہیں آتا تو خود دیکھ لے۔“

حمد نے طش میں کہا۔ ”میں تیرا منہ کیوں دیکھوں، میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ آخر یہ سیب کس طرح آئے، پہنچا۔ منہ کس نے؟“

فیروز بخت کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس کا نام لے، آخر کہہ دیا۔ ”میں نہیں جانتا کہ یہاں کون لایا۔ یہ سیب مجھے تو یہاں رکھے ہوئے مل گئے تھے۔ میں سمجھا کہ میرے ہی لیے رکھے گئے ہیں۔“

حمد نے اس کی مرمت شروع کر دی، بولا۔ ”میں نے یہ مار بھی تیرے لیے ہی اٹھا رکھی ہے، لے لے یہ بھی لے لے۔“

ہزار، فیروز بخت کو پیٹنے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔
ظاہر مشہدی کی بیوی کو دیکھ کر اسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھ
لیا تو نے اپنی آنکھوں سے کہ اس حویلی میں تیری اولاد کی کیا
عزت ہے؟“

مشہدی کی بیوی نے جواب دیا۔ ”ہاں دیکھ لیا، یہ اس
کا مستحق بھی ہے۔“ پھر فیروز بخت سے پوچھا۔ ”اونا چھارج
بتا، اب تیرے کیا ارادے ہیں؟ اگر تو میرے ساتھ چلا چلے
تو تیری جان اس مار پیہا اور وصول دھپے سے چھوٹ جائے
گی ورنہ نہیں جوتے کھا تارہ۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”میں مار کھالوں گا مگر ہوں گا
اسی حویلی میں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا کیونکہ میں نے یہ
فیصلہ کر لیا ہے کہ جیوں گا تو اسی حویلی میں اور اگر مردوں کا تو
اسی حویلی میں۔“

مشہدی کی بیوی نے فیروز بخت کا گریبان پکڑ کر
کھسینا بولی۔ ”چل میرے ساتھ ورنہ اپنی جان اور تیری
جان ایک کر دوں گی۔“

فیروز بخت نے مشہدی کی بیوی کو دھکا دے کر گرا دیا،
بولی۔ ”او ظالم عورت! وہ دن گئے جب میں تیرے ظلم سہ لیا
کرتا تھا۔ خبردار جو میرے جسم کو ہاتھ لگایا۔“

مشہدی کی بیوی کا ٹون کھول گیا۔ تیزی سے اٹھ
کھڑی ہوئی بولی۔ ”حویلی میں حرام کی کھا کھا کر بڑی
طاقت آگئی ہے۔ تو نے دھکا دے کر مجھے گرا دیا۔ میں اس کا
بدلوں کی۔“

وہ سچ فیروز بخت پر ہل پڑی۔ حمد نے مشہدی
کی بیوی کو دھکا دے کر الگ کر دیا۔ ”بی بی! اب اس پر اتنا
ظلم بھی نہ کر، میں اس کو پہلے تنہا بہت مار چکا ہوں۔ اب تجھے
نہیں پیٹنے دوں گا۔“

گنار شیرنی کی طرح پھر کر حمد کے سر پر پہنچ گئی۔
غضب ناک آواز میں کہا۔ ”تھو! ان دونوں کے جھگڑے
میں تو کیوں پڑ رہا ہے؟“

حمد نے جواب دیا۔ ”بی بی! آپ مائیں یا نہ مائیں،
یہ بڑی زیادتی ہے۔ آپ اس عورت کو حویلی سے نکال دیں
ورنہ کوئی ناخوشگوار واقعہ ہو جائے گا تو آپ اس کو سنبھال نہیں
سکیں گی۔“

گنار کچھ ڈری، پوچھا۔ ”کیا ناخوشگوار واقعہ ہو جائے گا؟“
حمد گنار کو ایک طرف لے گیا۔ سرگوشی میں سمجھایا۔
”بی بی! اتالیق کی تعلیم و تربیت نے لڑکے میں ہمت اور
سرکشی پیدا کر دی ہے اور مجھے صاف نظر آ رہا ہے کہ مشہدی کی

بیوی کا کام تمام ہو جائے گا۔ اگر خدا نخواستہ میرا اندیشہ
درست نکلا تو آپ مشہدی کی بیوی کی لاش کو کہیں چھپاتی
پھریں گی۔“

گنار نے کہا۔ ”تیرے اندیشے درست ہیں۔ یہ لڑکا
تو میرے لیے مصیبت بن گیا ہے۔ تو ہی بتائیں اس سے
کس طرح نجات حاصل کروں؟“

حمد نے جواب دیا۔ ”پہلے مشہدی کی بیوی کو حویلی
سے رخصت کر دیجیے، اس کے بعد میں کوئی مشورہ دوں گا۔“

گنار فوراً مشہدی کی بیوی کے پاس پہنچی اور اسے حکم
دیا۔ ”اے عورت! اب تو یہاں سے چلی جا کیونکہ فیروز
بخت کے حور بتا رہے ہیں کہ اب یہ اس حویلی سے نکس
جائے گا اور اب میں بھی اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ فیروز بخت
کو سہیں رہنے دیا جائے۔ یہ ہمارا کیا لیتا ہے اگر یہاں رہنے
سے اس کی زندگی بچتی ہے تو بننے دتی جائے۔ اب میں بھی اس
کی مخالفت سے باز آتی ہوں۔“

مشہدی کی بیوی حیران و پریشان گنار کی شکل دیکھتی
رہ گئی۔ فیروز بخت۔ غموں سے چور گنار کی زبان سے
اوردی آمیز کلمات سن کے بے اختیار ہو گیا اور گنار کے
پاؤں پکڑے۔ ”گنار میری مالک! میں آپ کا کس زبان
سے شکر یہ ادا کروں۔ میں قسم کھا کر یقین دلا سکتا ہوں کہ میں
کوئی کمین نہیں ہوں۔ میرا ضمیر کہتا ہے کہ میرے والدین
شریف تھے کیونکہ میں اپنے کسی محسن کے لیے ہمیشہ اچھے
جذبات محسوس کرتا ہوں۔ میں آپ کے احسانات کا بدلہ
اپنی زندگی تک سے اتارنے کی صلاحیت اور ہمت رکھتا
ہوں۔ آپ مجھے آزما کر تو دیکھیں۔“

گنار نے مشہدی کی بیوی کو گھور کر دیکھا اور سختی سے
حکم دیا۔ ”تو ابھی تک یہیں موجود ہے؟ تو جاتی کیوں نہیں؟
میں کہتی ہوں تو اپنا ایک لٹو ضائع کیے بغیر چلی جا یہاں سے۔
اب یہ نہیں اس حویلی میں رہے گا۔“

مشہدی کی بیوی لرزتی، کاہتی چلی گئی لیکن اب اسے
گنار پر بھی غصہ آ رہا تھا۔

اب گنار نے پیٹیرا بدلا اور فیروز بخت کے سر پر ہاتھ
پھیرتے ہوئے بولی۔ ”فیروز بخت! میں اپنے کیے پر نام
ہوں۔ مجھے معاف کر دے۔“ پھر حمد سے کہا۔ ”وہ سب کی
طشتری کہاں رکھا آیا تو ذرا لے لو آ۔ مجھے تو یہ بھوکا لگ رہا ہے۔“
فیروز بخت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، وہ جذبہ
احسان مندی سے مغلوب ہو کر گنار سے چمٹ جانا چاہتا تھا
لیکن اپنے کتر ہونے کے احساس سے وہ ایسا نہیں کر سکا۔

آنسوؤں سے لبریز آنکھیں لہو بھر کے لئے اوپر اٹھائیں۔
گنار کے چہرے پر ڈال کر پھر جھکائیں۔ گلوگرفٹہ آواز میں
کہا۔ ”میری حسنا! میری مالکہ! میں آپ کا کس زبان سے
شکر یہ ادا کروں؟ میں اس کا کوئی معاوضہ تو نہیں دے سکوں گا
لیکن اس طرح میں آپ کا بے دام غلام ضرور ہو گیا ہوں۔“
گنار نے آہستہ آہستہ اس کی پشت چھتھپائی اور کہا۔
”فیروز بخت! جو کچھ ہوا ہو گیا۔ اب تجھ پر کوئی زیادتی نہ
ہوگی۔ اب میری آنکھیں کھل چکی ہیں اور ابھی ابھی میں نے
فیصلہ کر لیا ہے کہ تیرے لیے جو کچھ بھی کر سکتی ہوں، ضرور
کروں گی اور یہی میرا لقا رہے گا۔“
فیروز بخت، گنار کے سامنے کھڑا روتا رہا اور گنار اس
کو تسلیاں اور دلا سے دیتی رہی۔

☆☆☆

پوری حویلی رات کی سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔
فیروز بخت اپنی بیداری قسمت پر سوچ سوچ کر لطف اندوز
ہو رہا تھا۔ سدا کی ناکامیوں کا شکار دل بہت خوش تھا اور فیروز
بخت کو اپنا روشن اور تابناک مستقبل اپنے سامنے کھڑا دکھائی
دے رہا تھا۔ ابھی تک جس سے اسے دکھ پہنچا تھا، ان کے نام
بار بار ذہن کی سطح پر ابھر ابھر کر غائب ہو رہے تھے۔ وہ
سوچ رہا تھا کہ وہ جس دن بھی دادو کے کاروبار، دولت اور
جائیداد کا مالک بنے گا، گنار کی وقاداری کا حلف ضرور اٹھائے
گا۔ اس کی ذہنی سطح پر وہ نام بھی ابھر رہے تھے جنہوں نے
اس کو ستایا تھا اور وہ اس کے انتقام کے سحق تھے۔ کبھی دل کہتا
ان سے بدلہ ضرور لینا اور کبھی اندر سے یہ آواز لگاتا کہ معاف
کر دے بھول جا۔ دوسری طرف گنار بہت بے چین تھی اور
خالی دماغ میں معلوم نہیں کیا کیا آرہا تھا۔ حمدو، گنار کی خواب
گاہ میں چوری سے داخل ہوا۔ فیروز بخت کا پرانا خدمت گار
حمدو کو خواب گاہ میں جاتے دیکھتا رہا۔ وہ حمدو کی جرات اور
بے باکی پر حیران تھا۔ وہ گنار کی خواب گاہ کے پاس ہی
برآمدے میں اس طرح بیٹھ گیا کہ ایک ستون سے آڑ لپے
ہوئے تھا اور رات کی سیاہی اس کی پردہ پوشی کر رہی تھی۔ وہ
یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ حمدو اندر کتنی دیر رہتا ہے۔

گنار، حمدو کو دہشتے ہی مسہری سے نیچے آگئی اور
مضطربانہ سوال کیا۔ ”حمدو! تو آگیا؟ میں تو تیرا انتظار ہی
کر رہی تھی۔“

حمدو نے جواب دیا۔ ”ہاں میں آ تو گیا ہوں لیکن ڈر
رہا ہوں کہ کہیں کسی نے آتے ہوئے دیکھ نہ لیا ہو۔ اگر کسی
نے دیکھ لیا تو آپ کی بڑی بدنامی ہوگی اور میرا حویلی میں

اعتبار ٹھہ جائے گا۔“
گنار نے کہا۔ ”لیکن دن میں آزادی سے بات کرنا
مشکل ہے۔ مجھے کسی پر اعتبار نہیں رہا، حویلی کی فضا کدھر
ہوگئی ہے۔“

حمدو نے جواب دیا۔ ”اس میں کیا شک، فیروز بخت کا
خدمت گار سب سے زیادہ ناقابل اعتبار ہے کیونکہ اس نے
مجھ سے جس قسم کی باتیں کی ہیں، اگر میں ان کا تفصیل سے
ذکر کروں تو آپ جوش غضب سے دیوانی ہو جائیں گی۔“

گنار نے ایک تپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
کہا۔ ”حمدو! اس پر بیٹھ کر باتیں کر اور تجھے قسم ہے کہ مجھ سے
کوئی بات چھپائیں۔ سب کچھ صاف صاف بتا دے۔“

حمدو بے لکھی سے تپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کے پاس ہی
گنار بھی بیٹھ گئی۔ دونوں پاس پاس اس طرح بیٹھے تھے کہ
آقا اور غلام کا امتیاز باقی نہ رہا۔ گنار نے بڑی بے چینی سے
کہا۔ ”ہاں تو اب بتا دو کون سی باتیں ہیں جو تو مجھ سے کرنا
چاہتا ہے؟“

حمدو نے جواب دیا۔ ”گنار بی بی! میں آپ کو ایک
مشورہ دینا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ آپ فیروز بخت کے خلاف
کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جس سے بعد میں شرمندہ ہونا
پڑے کیونکہ فیروز بخت کبھی بے یار و مددگار تھا مگر اب نہیں
ہے۔ اگر اس حویلی میں اس کو کچھ ہو گیا تو یہ سمجھ لیجئے کہ ایک
قیامت اٹھ کھڑی ہوگی۔ بات بادشاہ تک پہنچ جائے گی۔“

گنار نے کہا۔ ”یہ بات تو میں خود بھی سمجھ چکی ہوں لیکن
حمدو میں یہ قطعی فیصلہ کر چکی ہوں کہ فیروز بخت ہم میں نہیں رہے
گا۔ اگر یہ یہاں رہ گیا تو میں اسے اپنی ہار سمجھوں گی۔“

حمدو نے جواب دیا۔ ”بی بی! آپ فیروز بخت سے
خوشگوار تعلقات رکھیں۔ اس سے اچھا سلوک کریں تاکہ وہ
آپ کو اپنا ہمدرد اور بہی خواہ سمجھنے لگے کیونکہ میں نے تجربے
سے ایک بات سیکھی ہے۔ آپ اپنے ذہن کو غی الا اعلان
نفرت سے زیر نہیں کر سکتیں، ہاں اس سے محبت آمیز سلوک
کر کے اگر اس کو غافل کر دیں گی تو اس کا بہ آسانی قلع قمع
کر سکیں گی۔“

گنار نے بے چینی سے ٹھلٹھا شروع کر دیا۔ بالکل
بھوکی شیرینی کی طرح ٹھکانا لہجے میں بولی۔ ”حمدو! میں کچھ
نہیں جانتی۔ اب میں اس جھگڑے کو ختم کر دینا چاہتی
ہوں۔ میں اس بد بخت کا قصہ پاک کر دینا چاہتی ہوں۔ اگر
اس سلسلے میں تو میری مدد کر سکتا ہے تو کدورتہ میں کسی اور کا
انتقام کرتی ہوں۔“

گلنار نے حمزہ کے گال پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ "تو کیا کہہ رہا ہے، کچھ سمجھ بھی رہا ہے؟" حمزہ نے گال سہلاتے ہوئے منہ بنا کر کہا۔ "میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، خوب سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں اور میری آپ سے درخواست ہے کہ میں نے جو کچھ کہا اس کو دیکھنے کی کوشش کیجیے۔"

گلنار نے جواب دیا۔ "میں فیروز بخت کو اس لیے دفعان کرنا چاہتی ہوں کہ وہ میرے خاندان کا نہیں۔ تو اس حویلی کا ملازم ہے اور خدا کی شان کہ تو اتنی بڑی بات سوچ رہا ہے۔ میں تجھے قتل کر دوں گی۔ تو نے بہت بڑی گستاخی کی ہے۔ تو اسی وقت نکل جا میری خواب گاہ سے، ورنہ میں تجھے....."

حمزہ نے بات کاٹ دی، بولا۔ "میں خواب گاہ سے نہیں نکلوں گا کیونکہ میں یہاں خود سے نہیں آیا ہوں۔ آپ نے مجھے بلا یا تھا اس لیے میں آ گیا۔ آپ معاملے کی نزاکت پر غور کیجیے۔ اگر اس وقت ہم دونوں نے شور مچا دیا تو سوائی گھس کی ہوگی؟ یہ بھی تو سوچیے۔"

گلنار نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔ "میں کہتی ہوں تو یہاں سے نکل جا، میں فیروز بخت کو نہیں قتل کر دوں گی میں تجھ سے کوئی کام نہ لوں گی کیونکہ تو موقع پرست اور امین الوقت ہے۔"

حمزہ ذرا بھی پریشان نہیں تھا، بڑے اطمینان سے بولا۔ "میں نے کہہ جو دیا کہ میں یہاں سے اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک اپنا مطلب حاصل نہ کر لوں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ میں اس کا چرچا نہیں کروں گا۔ بالکل اسی طرح راز رکھوں گا جس طرح فیروز بخت کے قتل کا راز رہے گا۔"

گلنار اسے دھکے دے کر نکال دینا چاہتی تھی لیکن ہاتھ لگاتے ہوئے ہچکچاتی تھی۔ دانت چکچکا کر بولی۔ "میں شور کر کے خدمت گاروں کو بلا لوں گی کہ تو میری اجازت کے بغیر میری خواب گاہ میں گھس آیا ہے۔"

حمزہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ "آپ جو چاہیں کریں، مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن آپ جو کرنا چاہتی ہیں، اس کا اعلان کر کے مجھ سے نہیں جیت سکتیں۔ اب ہم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ ہم دونوں فیروز بخت کے معاملے میں ایک جھوٹا کر لیں۔ میں آپ کے خدمت گار کی طرح فیروز بخت ہی کو نہیں جس کو کہیں گی ٹھکانے لگا دوں گا لیکن شرط یہی ہے کہ آپ بھی میری خواہش پوری کرتی رہیں۔"

گلنار کھسپا رہی تھی، بولی۔ "تو بڑی جرأت کر رہا ہے۔ اگر یہ بات مشہور ہوگی اور بھائی داؤد کو بھی اس کا علم

حمزہ نے کچھ نہیں دیکھا سے کہا۔ "میں آپ کا یہ کام کر سکتا ہوں لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا آپ کچھ بیٹھی ہیں۔ اور آپ کو یہ بات بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ اگر آپ نے اس راز میں کسی اور کو شریک کیا تو چند پریشانیاں اور مول لے لیں گی۔"

گلنار نے جواب دیا۔ "میں کچھ نہیں جانتی، میں اس لڑکے سے زیادہ دونوں تک مفاہمت نہیں کر سکتی۔"

حمزہ نے کہا۔ "لیکن آپ کو اپنی مرضی کے خلاف یہ سب کرنا پڑے گا۔ ویسے یہ کام میں انجام دے سکتا ہوں مگر اس کے لیے آپ کو بھی کچھ کرنا پڑے گا۔"

گلنار نے تڑپ کر جواب دیا۔ "تو کچھ نہ کچھ کی بات کر رہا ہے، میں یہ کہہ رہی ہوں کہ میں اپنی مقصد برآری کی خاطر سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار ہوں۔"

حمزہ نے ادھر ادھر دیکھ کر اٹار کی طرف دیکھا اور اپنی نظریں جھکا لیں۔ آہستہ سے پوچھا۔ "پھر میں عرض کروں؟" گلنار نے تیزی سے کہا۔ "کہہ کہہ، سوچنا کیا ہے؟"

حمزہ نے کہا۔ "یہ کام جو آپ مجھ سے لینا چاہتی ہیں، بڑا خطرناک ہے اور میں نے تو ابھی دیکھا کہ مزہ بھی نہیں اٹھایا۔"

"کیا مطلب.....؟" گلنار اس کے قریب آنکھڑی ہوئی۔ "تو کہنا کیا چاہتا ہے، صاف صاف کہ۔"

حمزہ گھبرا رہا تھا مگر کوئی جذبہ اس کی ہمت افزائی بھی کر رہا تھا۔ بولا۔ "بی بی اسپدھی کی بات تو یہ ہے کہ میری تو ابھی تک شادی بھی نہیں ہوئی، اگر میں اس پر خطر کام میں پھنس گیا اور پھر کیفر کردار کو پہنچا دیا گیا تو میری ساری حسرتیں دل کی دل میں رہ جائیں گی۔"

"مطلب بیان کر؟"

"میں مضبوطی چاہتا ہوں، تحفظ کا خواہش مند ہوں۔"

گلنار نے کہا۔ "تو منصوبہ بنا، دولت میں خرچ کروں گی۔" حمزہ نے دک رک کر کہا۔ "دولت پر مجھے اعتبار نہیں ہے۔ میں آپ کے دل میں وہ جذبہ ٹھول رہا ہوں جو کسی برے وقت میں میری حفاظت کر سکتا ہے جس پر میں اعتماد کر سکتا ہوں۔"

گلنار نے درشت لہجے میں کہا۔ "صاف صاف بات کیوں نہیں کرتا، آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

حمزہ نے بڑی بے حیائی سے کہا۔ "بی بی امیں آپ کی محبت چاہتا ہوں۔ میری ابھی تک شادی نہیں ہوئی اور آپ بیوہ ہو چکی ہیں۔ مجھے عورت کی ضرورت ہے اور آپ کو ایک مرد کی....."

خدمت گار نے جواب دیا۔ "ناگ تو نہیں آئے لیکن میں نے حمزہ کی واہسی کا بڑا انکار کیا۔ جب وہ آپ کی خواب گاہ سے دیر تک نہیں نکلا تو میں نے اسے بھگانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا۔"

گنار ایک دم چراغ پا ہو گئی، چیخی ہوئی بولی۔ "کیا قیامت ہے، بھائی داؤد کیا گئے کہ خدمت گار تک شیر ہو گئے۔"

وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔ خدمت گار گھبرا گیا۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ بھاگ کھڑا ہو لیکن بھاگنے سے پہلے ہی دوسرے خدمت گار بھی وہیں کھینچے گئے اور خدمت گار کو بھاگنے کا موقع ہی نہ ملا۔ ان میں حمزہ سب کے آخر میں آیا۔ کسی خدمت گار نے پوچھا۔ "بات کیا ہے؟"

گنار نے فیروز بخت کے خدمت گار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "خدا کے لیے اس مردود سے میرا بیچھا چھڑاؤ، یہ رات کے ستانے میں میری خواب گاہ میں کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب میں اسے ایک پل بھی حویلی میں رہنے نہیں دوں گی۔"

خدمت گار فیروز بخت کے خدمت گار پر تھپٹے۔ ان بھینٹنے والوں میں حمزہ بھی تھا۔

فیروز بخت کا خدمت گار نہیں سمجھانے لگا۔ "بھائیو! میری بات تو سن لو پہلے۔ میں نے گنار بی بی کی خواب گاہ کا دروازہ نہیں تھپتھپایا تھا۔ یہ مجھ پر الزام لگا رہی ہیں۔ یہ مجھ پر تہمت لگائی جا رہی ہے۔ واقعہ اس کے برعکس ہے اور مجھے تو اس کو دہراتے ہوئے بھی شرم محسوس ہو رہی ہے۔"

حمزہ نے آگے بڑھ کر خدمت گار کو پکڑ لیا اور دوسرے خدمت گاروں سے کہا۔ "بھائیو! یہ حویلی کی عزت کا معاملہ ہے۔ گنار بی بی نے جو کچھ کہا، کیا اس سے ہمیں نیرت نہیں آئی؟ یہ تو بڑے شرم کی بات ہے۔"

خدمت گار نے حمزہ کو دھکا دے کر خود کو چھڑانے کی کوشش کی، بولا۔ "کیا یہ غلط ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو اس خواب گاہ میں گھسا تھا؟"

حمزہ ہنس دیا، مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔ "دوستو! ذرا اس کی بدحواسی تو ملاحظہ فرمائیے یعنی میں اس خواب گاہ میں تھا گویا۔"

گنار بدستور چیخے جا رہی تھی۔ "میں تم سب کو حکم دیتی ہوں کہ اس کو خوب خوب پیٹو اور ادھ مٹا کر کے حویلی سے باہر نکال دو۔"

گنار کے حکم کی اس طرح تعمیل ہوئی کہ خدمت گار

ہو گیا تو کچھ پتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟"

حمزہ نے جواب دیا۔ "معاذات شوق میں انجام و انجام نہیں سوچا جاتا۔ اگر میں آپ کے وصل کا مزہ چکھ لوں تو اس کے بعد میں ہر وقت اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے پر آمادہ و تیار نظر آؤں گا۔"

"میں بھری کھوں گی کہ تو اپنی حد سے بڑھ رہا ہے ذرا ہوش میں آ۔"

حمزہ نے جواب دیا۔ "پہلے تو میں ہوش میں تھا لیکن جب سے اس ڈراب گاہ میں آیا ہوں، اپنے ہوش و حواس گنوا چکا ہوں۔"

گنار نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "میں کس مصیبت میں پھنس گئی تھی کہ وہاں آؤں لے کر؟"

حمزہ نے جواب دیا۔ "گنار بی بی! افسوس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، آگے بڑھیے اور معاملہ پکا کر لیجیے۔"

لیکن ان وقت فیروز بخت کے خدمت گار نے دروازہ سے پردے تک دی اور پھر تواتر سے دستک دیتا رہا، وہ سرگوشی میں کہہ رہا تھا۔ "گنار! دروازہ کھولے، مالک واپس آ گئے۔"

اس آواز اور آواز کے مفہوم نے گنار سے زیادہ حمزہ کو پریشان کر دیا۔ تیزی سے دروازہ کھلا اور حمزہ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف فرار ہو گیا۔ حمزہ اتنی تیزی سے بھاگا تھا کہ اس کو یقین تھا کہ خدمت گار اسے نہیں پہچان سکا ہوگا۔

گنار شرمائی شرمائی کمرے کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی، پوچھا۔ "کون ہے، ستار، فیروز بخت کے خدمت گار؟ کون آ گیا؟ کہاں آ گیا؟"

خدمت گار گنار کے قریب چلا گیا۔ اس نے کمرے سے آنے والی ہلیم روشنی میں گنار کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن صاف نہیں دیکھ سکا۔ خدمت گار کو ایک موقع ہاتھ آ گیا تھا، پوچھا۔ "گنار بی بی! یہ حمزہ آپ کی خواب گاہ میں کیوں آیا تھا؟"

گنار نے انکار کر دیا۔ "میری خواب گاہ میں حمزہ آیا تھا؟ یہ کس نے کہا یا تم سے؟"

خدمت گار نے جواب دیا۔ "گنار بی بی! مکرے نہیں، میں نے اس کو داخل ہوتے بھی دیکھا تھا اور چوروں کی طرح فرار ہوتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔"

گنار بہت چڑچڑی ہو رہی تھی، پوچھا۔ "بھائی داؤد کہاں ہیں؟"

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”مجھ کو کچھ نہیں معلوم۔“
گنار نے شرما کر کہا۔ ”آج اس نے میری خواب گاہ
کے در پر دستک دی۔ اس کی نیت خراب تھی اور خدا نے مجھ کو
بال بال بچالیا۔“

فیروز بخت نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”سب پھر اس
کے ساتھ جو کچھ ہوا خوب ہوا۔ وہ اسی سلوک کا مستحق تھا۔“
گنار بڑی دیر تک اس سے من من کر باتیں کرتی
رہی۔ فیروز بخت اب خود کو حویلی کا اہم ترین فرد دیکھنے لگا تھا
اور جب گنار نے اس سے درخواست کی کہ وہ اس رات اس
کی خواب گاہ میں رہ جائے تو اس کو اپنے لیے بڑی عزت اور
فخر کی بات سمجھ کر وہ رک گیا۔

کافی رات گئے گنار کی خواب گاہ پر پھر دستک ہوئی۔
فیروز بخت ابھی تک جاگ رہا تھا۔ دستک کی آواز پر اٹھ کر
بیٹھ گیا۔ گت۔ ابھی جاگ رہی تھی لیکن اس نے سونے کی
اداکاری کی اور وہ دستک پہ دستک دینے والے کو پہچان گئی
تھی۔ گنار نے اشارے سے فیروز بخت کو سمجھایا کہ کسی کو بھی
میری بابت کچھ بھی نہ بتایا جائے۔

فیروز بخت نے دروازے سے کان لگا کر دریافت
کیا۔ ”کون ہے اور آپ اتنی رات گئے کس سے ملنے آئے ہیں؟“
باہر سے حمد نے جواب دیا۔ ”جناب! میں حمد بول
رہا ہوں۔ دروازہ کھولے، میں چند باتیں کر کے واپس چلا
جاؤں گا۔“

گنار نے اشارے سے فیروز بخت کو سمجھایا کہ حمد
سے پوچھئے وہ مجھ سے کس قسم کی باتیں کرے گا اور یہ کہ اس
وقت میں خواب گاہ میں نہیں ہوں۔

جب فیروز بخت نے حمد سے یہ سب کچھ کہا تو وہ برا
مان گیا، بولا۔ ”فیروز بخت! تم میرے ساتھ اچھا سلوک
نہیں کر رہے ہو۔ حالانکہ میں نے تو ایک دن اور ایک بار بھی
کوئی کام تم سے نہیں لیا اور نہ آئندہ کوئی کام لینے کا ارادہ ہے
اور میں نے تمہارا خیال ہی رکھا ہے۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”اس وقت خواب گاہ
میں گنار بی بی تشریف نہیں رکھتیں۔ جب آئیں گی تو تمہارا
پیغام انہیں پہنچا دوں گا۔“

حمد نے کہا۔ ”ان سے کہہ دینا کہ میں نے خدمت
گار کی اتنی پٹائی کروادی ہے کہ وہ ہمتوں اپنے پیروں سے
نہیں چل سکتا۔“

حمد تو یہ کہہ کر چلا گیا مگر گنار کو چہن نہیں ملا۔ فیروز بخت
سے کہا۔ ”فیروز بخت! میں تجھ کو اپنے قریب ہی رکھوں گی اور

کے پہلا تھوڑے تھوڑے رسید کیا اور اس کے بعد دوسرے
خدمت گار برس پڑے۔ خدمت گار ستار نے بھی ان کا
مقابلہ کرنا چاہا لیکن دو چار ہاتھ مارنے کے بعد دوسروں کی
مار سے بے دم ہو کر گر گیا۔

گنار برابر ہی تھی۔ ”اس نے میری عزت آبرو کا
ذائقہ اڑایا ہے۔ مجھ پر تہمت لگائی ہے اور خراب نیت سے
میری خواب گاہ پر دستک دی تھی۔ میں تو اس کو نہیں معاف
کر سکتی، میں اس کا خون پی جاؤں گی۔“

حمد نے گنار کو سمجھایا۔ ”نہیں گنار بی بی! اسے ادھ
موا کر کے حویلی کے باہر پھینک دو دیجیے۔ اس نے جو کچھ کیا، اس
کے ہم سب گواہ ہیں اور اس نے جو کچھ کرنا چاہا تھا، اس کے
پس منظر اور مقصد سے بھی آگاہ ہیں۔ اس لیے اس کی قدمی
خدمات کے پیش نظر حویلی سے نکلوا کر یہ حکم دے دیجیے کہ
آئندہ یہ کہیں نظر نہ آئے ورنہ بہت برا انجام ہوگا۔“

گنار نے اپنی خواب گاہ میں دائیں جاتے ہوئے
کہا۔ ”تم لوگ جو مناسب سمجھو کرو کیونکہ میرا دماغی توازن
درست نہیں ہے اور میں جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی ایسا
ویسا قدم نہ اٹھاؤں تو مجھے اس کی تنگ خواری کے پیش نظر
بعد میں افسوس ہوگا۔“

خدمت گار ستار اتنا پٹ چا تھا کہ مزاحمت کی طاقت
ہی نہ رہی تھی۔ شور و غل سن کر فیروز بخت بھی وہاں پہنچ گیا اور
اس نے اپنے خدمت گار کو ادھ موا جو دیکھا تو بے ہمت
ہو گیا۔ بے اختیار اس پر جھک گیا اور بڑے کرب سے
پوچھا۔ ”تم لوگ اسے کیوں مار رہے ہو؟ اس کا گناہ؟“

حمد نے فیروز بخت کو آغوش میں سمیٹ کر ایک
طرف کر دیا، بولا۔ ”چھوٹے مالک! آپ نہ پڑیے اس
معاظے میں۔ اس نے ایک ایسا گناہ کیا ہے کہ اگر مالک
یہاں ہوتا تو قتل کر دیتا۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”لیکن یہ تو بہت شریف
انسان ہیں۔“

اس وقت خواب گاہ کا دروازہ کھلا اور اندر سے گنار
نکل۔ فیروز بخت کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لے گئی اور دروازہ
دوبارہ بند کر لیا۔

فیروز بخت کو اپنی مسہری پر بٹھاتے ہوئے کہا۔
’فیروز بخت! تو خود بھی جانتا ہے کہ اس حویلی کا وارث تو ہے
اور بھائی داؤد نے تجھے اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ اس نطق سے میں
تیری اور اس حویلی کی عزت و آبرو ہوں، کیا تجھ کو معلوم ہے
کہ آج تیرے خدمت گار نے میرے ساتھ کیا کیا؟“

حمزہ نے پوچھا: "ستارہ کو؟ اس ستارہ کو جو رات آپ کی خواب گاہ میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔"

گنار تھلا گئی، بولی: "ہاں اسی ستارہ کو اور یہ میں کسی اور سے بہتر جانتی ہوں کہ میری خواب گاہ میں کون داخل ہوا تھا اور کس کے کیا ارادے تھے؟"

حمزہ نے جواب دیا: "اجھا تو کسی اور نے بھی آپ کی خواب گاہ میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی اور کوئی داخل ہو بھی گیا تھا۔"

گنار کا اشتعال بڑھتا جا رہا تھا، بولی: "حمزہ! میں حکم دے رہی ہوں اس کی تعمیل کرو ورنہ میں تیرے خلاف بھی کوئی سخت قدم اٹھا سکتی ہوں۔"

حمزہ چلا گیا، فیروز بخت نے پوچھا: "کیا آپ بھی میرے استاد محترم کے پاس چل رہی ہیں؟"

گنار نے جواب دیا: "ہاں، تیرے ساتھ میں بھی چلوں گی۔"

چلتے چلتے فیروز بخت نے پوچھا: "کیا یہ بات درست ہے کہ کسی اور نے بھی آپ کی خواب گاہ میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی اور کوئی داخل بھی ہو گیا تھا؟"

گنار تھریوں پر مٹل ڈال کر ایک دم کھڑی ہوئی: "فیروز بخت! خدا رب، تم اپنی حد میں رہو میں اپنے ذاتی معاملات میں مداخلت برداشت نہیں کر سکتی۔"

فیروز بخت ڈر کر چپ ہو گیا۔ وہ دونوں ایک ساتھ اتالیق کے پاس پہنچے، اتالیق احتراماً کھڑا ہو گیا۔ گنار نے اتالیق سے کہا: "استاد محترم! اگر میں یہیں رہوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

اتالیق نے جواب دیا: "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

گنار نے اتالیق سے کہا: "استاد محترم! دادو کی عدم موجودگی میں، میں بڑی مشکلات میں پھنس گئی ہوں۔ کچھ آپ ہی مشورے دیں۔"

اتالیق نے جواب دیا: "محترم خاتون! مشکلات آسمان سے نہیں آتیں۔ آدمی کی اپنی کوتاہی اور غلطیاں، مشکلات کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔"

گنار نے کہا: "اجھا پہلے آپ فیروز بخت کو پڑھالیں، اس کے بعد باتیں کروں گی آپ سے۔"

اتالیق فیروز بخت کی پڑھائی میں مشغول ہو گیا۔ سہ پہر کو حمزہ نے بھی گنار کو مطلع کیا کہ زخمی ستارہ کہیں چلا گیا ہے تلاش کے باوجود نہیں مل سکا۔

گنار نے جواب دیا: "جب تک ستارہ نہ جائے تو

راتوں کو اس خواب گاہ میں سلاؤں کی تاکہ مجھے ڈرنے لگے۔"

فیروز بخت کو رہ رہ کر اپنے خدمت گار کی رکیک حرکت پر غصہ آ رہا تھا لیکن وہ کربھی کیا کر سکتا تھا۔ خاموش رہا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ آئندہ وہ اپنے خدمت گار کی حمایت نہیں کرے گا اور گنار کے دامن میں پناہ لے گا۔

صبح حالات معمول پر تھے۔ خدمت گار کی پٹائی پر وہ دقیق طور پر خوش ہو گئی تھی کیونکہ اس وقت حمزہ کی خواب گاہ میں موجودگی کے راز پر پردہ ڈالنا مقصود تھا لیکن سب کچھ ہو چکنے کے بعد جب اس نے یک سوئی سے سوچا تو اس کو حمزہ سے خوف محسوس ہونے لگا۔ حمزہ کی جسارتیں ایک دم ظاہر ہوئی تھیں۔ اب اس کے سامنے کئی مسئلے تھے۔ ایک مسئلے نے کئی مسئلے پیدا کر دیے تھے۔ پہلے فیروز بخت مسئلہ بن گیا تھا اور اس مسئلے پر قابو پانے کے لیے جب اس نے دوسروں کا تعاون حاصل کیا اور انتہائی قدم اٹھانا چاہا تو چند نئے مسئلے اٹھ کھڑے ہوئے اور اب اصل مسئلہ تو بس منظر میں چلا گیا اور حمزہ ایک نیا مسئلہ بن کر سامنے آ گیا تھا۔ اب اس پر قابو پانے کے لیے دماغ سوزی کرنا پڑ رہی تھی۔ پہروں کے غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ فیروز بخت سے الجھنا یا اس مسئلے پر سرکھپانا ابھی بات نہیں ہے، پہلے حمزہ کا بندوبست کیا جائے۔

گنار نے ہیلوں ہی خیالوں میں تمام خدمت گاروں کا جائزہ لیا تو ان میں سب سے زیادہ وفادار اور سچا فیروز بخت کا خدمت گار ستارہ ہی نظر آیا۔ اس نے اسے حویلی میں دوبارہ بلوانے کا فیصلہ کر لیا۔ دن کی روشنی میں حمزہ، فیروز بخت کے پاس آیا اور مطلع کیا کہ آپ کا اتالیق آیا ہے۔

اس نے گنار سے بھی نظریں ملانا چاہیں لیکن گنار نظریں چراگنی اور کہا: "فیروز بخت کے ساتھ میں بھی چلوں گی۔"

حمزہ نے کہا: "آپ وہاں کیوں جائیں گی؟ فیروز بخت کی خدمت پر تو مجھے متعین کیا گیا ہے، میں جاؤں گا آپ یہیں رہیں۔"

گنار نے برا مان کر سختی سے کہا: "فیروز بخت کی خدمت پر ستارہ کو متعین کیا گیا تھا اس کو ہٹا کر میں نے تجھے متعین کر دیا تھا۔ اب میں ہی تجھ کو ہٹا بھی سکتی ہوں اور دوسری بات یہ کہ تو میری مرضی اور میرے فیصلوں پر رائے زنی کرنے والا کون ہے؟"

حمزہ نے تری سے کہا: "آپ مالک ہیں جسے جو چاہیں حکم دیں۔"

گنار نے حکم دیا: "ستارہ کہاں ہے اس کو بلا لا۔"

پہا کر بڑی غلطی کی۔ اگر وہ مل جائے تو میں اس کی مدد سے حالات پر قابو پا سکتی ہوں۔“
 اتالیق نے جواب دیا۔ ”اس کی تلاش کوئی مسئلہ نہیں۔ میں تلاش کروادوں گا۔“
 گلنار نے پوچھا۔ ”میں بھائی داؤد کو کس طرح بلواؤں؟“

اتالیق نے جواب دیا۔ ”داؤد کو بھی میں ہی بلواؤں گا کیونکہ تجار کی اندرون ملک آمدورفت تو جاری ہی رہتی ہے۔ کسی نہ کسی سے آپ کا پیغام داؤد تک پہنچا دیا جائے گا۔“
 گلنار نے زیوار کی ڈھلتی ہوئی دھوپ کی طرف دیکھا۔ سہ پہر ہو چکی تھی، شام بھائی چلی آ رہی تھی اور اسے شام کی آمد سے وحشت ہو رہی تھی۔ اس نے اتالیق سے درخواست کی کہ وہ چند یوم اس حویلی میں رہ جائے لیکن اتالیق کا یہ عذر تھا کہ وہ شاہی خاندان کے چند بچوں کو پڑھاتا ہے اور وہاں جانا بہت ضروری ہے۔ اگر وہاں جانا ضروری نہ ہوتا تو وہ اس حویلی میں رہ بھی سکتا تھا۔
 اتالیق چلا گیا اور گلنار، فیروز بخت کو اپنے ساتھ لے کر کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

حویلی کی پرسکون فضا میں سرگوشیاں گونج رہی تھیں۔ خدمت گار آپس میں گلنار کی بابت باتیں کر رہے تھے۔ اس نے حمد کو ستار کی تلاش میں روانہ کیا ہے، اس ستار کی تلاش میں جو رات کی تار کی میں گلنار کی خواب گاہ کا درگھنٹا ہا تھا۔ اب گلنار اس کے لیے بے چین تھی۔ خدمت گاروں کو ایک نیا موضوع ہاتھ آ گیا تھا۔۔۔۔۔ انہیں یقین تھا کہ ستار گلنار میں کسی قسم کی انہام و عنیم موجود ضرور ہے ورنہ اس کے چلے جانے کے بعد یہ بڑبڑ کیوں؟ اس کی تلاش کیا معنی رکھتی ہے؟
 فیروز بخت بھی حیران تھا کہ اس ڈھیل اور نالائق ستار کو دوبارہ کیوں بلوایا جا رہا ہے۔ وہ اس سلسلے میں کسی سے کوئی بات نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ بات گلنار کو سخت ناگوار گزرتی تھی۔ جب تک وہ مشہدی کے پاس رہا، اس قسم کے حالات سے کبھی واسطہ نہ پڑا تھا۔ وہاں مشہدی کی بیوی کی سچ کلامیاں اور زیادتیاں تھیں۔ اب جو قسمت نے یاوری کی اور اس حویلی میں داخل کر دیا تو یہاں کا ماحول مشہدی کے گھر سے زیادہ برا نظر آیا۔ یہاں تو اس کی آزادی چھین گئی تھی۔ ایک ایسے مستقبل کی امید میں اسے دھوکے کے گرداب میں قید کر دیا گیا تھا۔

☆☆☆

بھی اس حویلی سے باہر رہے گا۔“
 حمد اس حکم سے پس و پیش میں پڑ گیا۔ گلنار اس کی ذہنی پریشانی اور اس کے ارادوں کو چہرے کے تاثرات میں تلاش کرتی رہی۔
 حمد نے آہستہ سے پوچھا۔ ”اور فیروز بخت کی خدمت میں کون حاضری دے گا؟“

گلنار نے جواب دیا۔ ”فیروز بخت میرے ساتھ رہے گا اور اس کی خدمت میں بھی وہی شخص رہے گا جس کو میں پسند کروں گی۔“
 حمد، گلنار کی برہمی دیکھ کر سامنے سے مل گیا۔ اتالیق نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”محترم خاتون! میں آپ کے بھائی داؤد کے بیٹی خواہوں اور مداحوں میں سے ہوں۔ اس شریف انسان نے کبھی کبھی مجھ سے ذاتی مشورے بھی لیے ہیں۔ آپ کے اور حویلی کے معاملے میں، میں نے ہمیشہ اس کو یہی مشورہ دیا کہ بیوہ بہن کو اتنی بڑی حویلی میں تنہا مت چھوڑو، جس کا وہ یہ جواب دیتا کہ یہ سارے خدمت گار پشتی ہیں اور وہ انہیں الگ نہیں کر سکتا لیکن خاتون! شرع اور اسلام کی رو سے ان پشتی نوجوان خدمت گاروں میں تیرا رہنا جائز نہیں ہے۔ بیٹوں کا حال خدا کو ہی معلوم ہے لیکن ہم نادان اور ضعیف البیان انسان حالات اور تجربوں ہی سے سیکھتے اور خود کو بناتے بگاڑتے ہیں۔“

گلنار نے کہا۔ ”اب میں اپنے خدمت گاروں سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں کیونکہ وہ میرے خلاف سازشوں میں مشغول ہیں۔“
 اتالیق نے فیروز بخت کی طرف اشارہ کیا۔ ”خاتون! آپ اس کو اپنا سمجھیں اور اس پر اعتماد کریں۔ جس دن آپ اس پر اعتماد کرنے لگیں گی اور اسے اپنا اور اپنے خاندان کا مسئلہ نہیں بنا لیں گی اس دن آپ کو سکون مل جائے گا اور خدمت گار بھی سچ ہو جائیں گے۔ خاتون! یہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ دھواں وہیں سے اٹتا ہے جہاں آگ ہوتی ہے۔ سازشیں بھی وہیں ہوتی ہیں جہاں کا ماحول اور ماحول کے افراد سازشی ہوتے ہیں۔“

گلنار نے پوچھا۔ ”پھر اب میں کیا کروں استاد محترم؟“
 اتالیق نے جواب دیا۔ ”آپ فوراً ہی اپنے بھائی کو بلو لیجئے اور بھائی کے آنے تک ہر اس خدمت گار کو نکال باہر کریں جو حویلی کی سازشوں میں حصہ لے رہا ہو۔“

گلنار نے آہستہ سے کہا۔ ”افسوس کہ میں نے ستار کو

سے تو اتنا ہی واقف ہے جتنا میں، گلزار بی بی۔ پھر میں نے دوسرے ساتھیوں کی مدد سے گلزار بی بی کے حکم ہی پر مارا پینا بھی تھا اور بی بی ہی کے حکم پر میں نے تجھے حویلی کے باہر پھینکا اور یا تھا اور پھر انہی بی بی کے حکم پر میں تجھے تلاش کر کے حویلی میں دوبارہ لے آیا۔ اب اس سے زیادہ تابعداری اور کیا ہو سکتی ہے۔“

یہ باتیں فیروز بخت بھی سن رہا تھا۔ اب وہ اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ اصل بات ابھی راز تھی۔ ستار نے کہا۔ ”بھائی حمدو! میں تجھے گناہ گار نہیں ٹھہرا رہا۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو کچھ کہتا تھا پاؤں بچا کر۔ وقاداری میں بڑی بچت ہے اب اگر مالک داد نے مجھ سے یہ پوچھا کہ خواب گاہ والے واقعے میں تو نے کیا دیکھا تھا تو میں یہی کہوں گا کہ میں نے حمدو کو داخل ہوتے دیکھا اور خواب گاہ سے تو اس وقت نکل جب میں نے دستک دی۔ اس سے زیادہ میں ایک بات بھی نہ کہوں گا، خواہ کچھ بھی ہو جائے۔“

حمدو نے پوچھا۔ ”گلزار بی بی ناراض ہیں، اب میں کیا کروں؟“

ستار نے جواب دیا۔ ”تو کوشش کر کہ گلزار بی بی سے دور دور رہے۔“

حمدو نے پوچھا۔ ”اگر انہوں نے مجھے حویلی سے نکال دینا چاہا؟“

ستار نے جواب دیا۔ ”میں تجھے نہیں جانے دوں گا اور کسی بھی طرح روکے رکھوں گا۔“

حمدو نے مضطربانہ پوچھا۔ ”بھریہ وعدہ؟“

”ہاں ہاں وعدہ، میں نے کہہ دیا۔“

”کیا میں فیروز بخت کی خدمت میں موجود رہوں؟“

ستار نے جواب دیا۔ ”نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ فیروز بخت کے پاس میں رہوں گا۔“

حمدو سرد آہ بھر کے بولا۔ ”واہ ری قسمت..... کیسی مصیبت میں پھنسا دیا تو نے۔“

جب وہ چلا گیا تو ستار، فیروز بخت کو اس کے اپنے کمرے میں لے گیا اور پوچھا۔ ”میری عدم موجودگی میں آپ کہاں، کس کے پاس رہتے تھے؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”گلزار بی بی کے پاس کیونکہ انہوں نے خود ہی اپنے پاس رکھ لیا تھا۔“

”آپ کے ساتھ ان کا سلوک کیسا رہا؟“

”بہت اچھا، مجھے پہلے جیسی گلزار کہیں نظر نہیں آئیں۔“

ستار نے کہا۔ ”فیروز بخت! میرے چھوٹے مالک،

کئی دن بعد حمدو واپس آ گیا۔ اس کے ساتھ زخمی ستار بھی آ گیا تھا۔ ”مدونے کئی خدمت گاروں کی موجودگی میں طنزاً کہا۔ ”گلزار بی بی! جس ستار کے لیے آپ پریشان تھیں، اسے میں نے بڑی مشکل سے پایا ہے۔“

گلزار آگ بگولا ہو گئی۔ اپنے کمرے سے مرحوم باپ کا بید اٹھالائی اور حمدو پر پل پڑی۔ وہ دیوانگی میں چیخ رہی تھی۔ ”میں اس زلیل حمدو کو جان سے مار دوں گی، میں اسے قتل کروں گی۔“

حمدو بھاگا نہیں، بڑے تحمل سے مار کھاتا رہا اور شروع سے آخر تک اس کی کوشش یہی رہی کہ گلزار کے بید کی ضرب اپنے ہاتھوں پر روکتا رہے۔ وہ مار کھا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”گلزار بی بی! میں نے اس حویلی کا نمک کھایا ہے۔ اگر آپ مجھے جان سے بھی ماردیں گی تب بھی میں نہیں بولوں گا اور اپنی جان دے دوں گا۔“

زخمی ستار لنگڑاتا ہوا بیچ میں آ گیا، بولا۔ ”گلزار بی بی! میں کیجیے، اسے سزا دے دیجیے۔“

گلزار اپنے کمرے میں چلی گئی اور اسے اندر سے بند کر کے روئے گئی۔

ستار کے علاوہ دوسرے خدمت گار آپس میں کہنے لگے۔ ”ہمیں ان معاملوں میں نہیں پڑنا چاہیے کیونکہ گلزار بی بی آج کل بہت زیادہ غصے میں رہتی ہیں۔“

ستار نے جواب دیا۔ ”تم لوگ معاملات کو سمجھنے کی کوشش کرو اور اس قسم کی چہ میگوئیاں مت کرو۔“

حمدو نے بھی ستار کی تائید کی، بولا۔ ”مار تو میں کھا رہا تھا اور تم لوگ کیوں پریشان ہو رہے ہو؟“

ایک اور خدمت گار بولا۔ ”ہمیں واقعی پریشان نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ہمیں معلوم تو کچھ بھی نہیں اور پریشان خواہ خواہ ہوتے ہیں۔ اب ہمیں چپ ہو جانا چاہیے اور کسی کے معاملے میں کوئی دخل نہیں دینا چاہیے۔“

جب سارے خدمت گار چلے گئے اور حمدو اور ستار رہ گئے تو ستار نے حمدو کو بھایا۔ ”حمدو! تو جس راستے پر چل نکلا ہے، وہ بہت خطرناک ہے۔“

حمدو نے جواب دیا۔ ”بھائی ستار! میں نے تو تجھے پہلے ہی سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں بالکل بے گناہ ہوں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ گلزار بی بی میرے ذریعے ایک خطرناک کام کروانا چاہتی تھیں بس اس کی منصوبہ بندی کے لیے خود ہی اپنی خواب گاہ میں بلا لیا تھا اور ہزار رازداری کے باوجود جس سے تو واقف ہو گیا تھا اور پھر جو کچھ ہوا اس

...

...

...

...

...

...

...

...

...

...

یہ گلنار بی بی کا دوسرا روپ تھا۔ کیا آپ نے اس روپ میں خلوص اور محبت کی جھلک دیکھی؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”مجھے تو خلوص اور محبت کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آیا۔“

ستار نے کہا۔ ”آپ مجھ پر اعتبار کیجیے صرف مجھ پر کیونکہ یہاں کوئی بھی قابل اعتماد نہیں لیکن ظاہر یہی کیجیے کہ آپ سب پر اعتبار کرتے ہیں۔ آپ کی نظر میں کوئی بھی مشتبہ یا غیر محترم نہیں۔“

فیروز بخت نے احسان مندی سے جواب دیا۔ ”جو تو کہے گا میں اس پر عمل کروں گا۔“

اور ستار ایک بار پھر فیروز بخت کی خدمت میں مصروف ہو گیا۔ حویلی میں جو ہنگامے اتفاقہ برپا ہوئے تھے، ان کی وجہ سے فیروز بخت محفوظ ہو گیا تھا۔ خوش قسمتی نے فیروز بخت کو پیچھے ہٹا کر گلنار کے مقابلے میں حمد کو کھڑا کر دیا تھا۔ فیروز بخت کی تعلیم اور تربیت کا کام بڑی آسانی اور سکون سے جاری تھا۔

حمد کا کاٹھا گلنار کے دل میں ہر وقت کھٹکتا رہتا تھا۔ اس کا حویلی میں رہنا گلنار کے حق میں خطرناک تھا۔ اس لیے وہ ہر وقت اس فکر میں رہتی کہ کسی طرح اس کو صاف کر دیا جائے۔ حمد کو صاف کر دینا اتنا مشکل کام نہیں تھا، اس کے نتائج البتہ خطرناک تھے۔ حمد حویلی سے نکل کر گلنار کے خلاف بری بری باتیں کر سکتا تھا اور اس کی زبان کو تالا لگانا گلنار کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ ستار سے مشورہ لینا چاہتی تھی لیکن اس لیے نہیں لے رہی تھی کہ ستار کی قربت اور گنگلو سے کوئی نیا مسئلہ نہ اٹھ کھڑا ہو اس لیے وہ خاموش رہی لیکن حمد..... نے ہانکل ہی قطع تعلق کر لیا تھا۔ درحقیقت حمد وہ اب بھی اس تاک میں تھا کہ کسی طرح گلنار سے بات کرے۔ وہ تنہائی میں روتا رہتا اور جب خدمت گار سامنے رونے کا سبب پوچھتے تو وہ جواب دیتا کہ میں نے اس کا گھر نمک کھایا ہے اور اب میں اسی گھر میں اپنے اعتبار کا جنازہ اٹھتے نہیں دیکھ سکتا۔ گلنار بی بی مجھ سے ناراض ہیں اور میں ان کی ناراضی کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکتا۔

جب حمد کو کوئی اور موقع نہ ملا تو اس نے فیروز بخت کی چابلی شروع کر دی اور کسی طرح یہ بتانے میں کامیاب ہو گیا کہ گلنار کی بیٹی بیٹی باتوں پر یقین نہ کرے کیونکہ گلنار نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ کوانہ کسی طرح فیروز بخت کو ختم ضرور کروادے گی۔

فیروز بخت سخت پریشان ہو گیا۔ وہ اس جہنم کے سے

بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن ستار اس کی اس طرح دل جوئی کرتا کہ وہ پھرتا پھرتا جو تا اور حالات کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ حمد ستار کی خوشامد کرتا کہ گلنار سے معافی دلوادے۔ وہ اکثر روتا رہتا تھا۔

دوسری طرف ملک کے حالات بھی بدل رہے تھے۔ ہمایوں کا انتقال ہو چکا تھا۔ بیرم خاں نے یہ مقام کلانور چودہ سالہ اکبر کی تاج پوشی کرانے کے اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا اور مسجدوں کے خطبوں اور نکال کے سکوں میں اکبر کا نام شامل کر دیا گیا تھا۔ آئمہ مساجد خطبوں میں اکبر کا نام لے کر دعائیں دے رہے تھے۔ بیرم خاں اکبر کا اتالیق اور سرپرست تھا اور اکبر اعظم ابھی صرف اکبر بادشاہ تھا۔ ملک کے مختلف حصوں میں بغاوتیں سر اٹھ رہی تھیں اور بیرم خاں ان باغیوں کے سرکینے میں مشغول تھا۔ بادشاہ ابھی تک دہلی نہیں آیا تھا لیکن دہلی والے بادشاہ کا انتظار ضرور کر رہے تھے۔ فیروز بخت کا اتالیق بہت پریشان تھا کیونکہ شاہی خاندان میں انتشار پھیلا ہوا تھا اور کچھ پتا نہ تھا کہ بیرم خاں کی سرپرستی کیا رنگ اختیار کرتی ہے۔ چودہ سالہ اکبر خود حکومت کرنے کے لائق ہوتا بھی ہے یا بیرم خاں خود ہی اقتدار سنبھال لیتا ہے۔

شاہی خاندان بیرم خاں کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ان حالات میں اتالیق دوسرے درد کھ رہا تھا اور اسے داؤد کی واپسی کا انتظار تھا۔ اس نے کئی تاجروں کے ذریعے خط بھی لکھے اور داؤد کو حویلی کے حالات لکھ بیجے۔ داؤد نے کئی ماہ بعد ان خطوط کے جوابات روانہ کر دیے۔ ان میں ایک خط گلنار کے نام بھی تھا۔ اس نے اتالیق کو جو خط لکھے تھے، ان کا مضمون ایک تھا، الفاظ جدا جدا۔ ہر خط میں بس اس بات پر زور دیا تھا کہ فیروز بخت کی تعلیم و تربیت بھرپور ہونا چاہیے کیونکہ اس کو جس مقصد کے لیے تیار کیا جا رہا ہے، وہ اس کا متقاضی ہے کہ فیروز بخت میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ دوسری طرف گلنار کے خط میں لکھا تھا۔

”گلنار! کیا میں نے تجھ پر زور نہیں دیا تھا کہ تو شادی کر لے لیکن تو نے تساہل اختیار کیا اور اس مسئلے کو میری واپسی تک کے لیے ملتوی کر دیا لیکن اتالیق کے خطوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے تیری شادی نہ کر کے سخت غلطی کی ہے۔ میں تیری پریشانیوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ حویلی کے خدمت گار مسئلہ بنے ہوئے ہیں لیکن میں ان کی بابت کوئی سخت حکم اس لیے نہیں دے رہا ہوں کہ وہ بدقسمتی خدمت گار ہیں۔ میں ان کو اپنے کاروبار میں لگا سکتا

ہوں لیکن انہیں اس وقت تک کاروبار میں لگانا ٹھیک نہیں ہے جب تک کہ میں خود ان کی نگرانی اور تربیت نہ کروں۔ مجھے یاد ہوگا کہ میں نے یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ اتنے خدمت گاروں کو تو قابو میں کس طرح رکھے گی اور یہ کہ حویلی کے نظم و نسق کو تو کس طرح چلائے گی۔ تو، تو نے زور دھور سے یہ بات کہی تھی کہ عورتوں نے تو ملکوں اور قوموں پر حکومت کی ہے تو کیا میں چند خدمت گاروں کو قابو میں نہیں رکھ سکوں گی اور ایک حویلی کا نظم و نسق نہیں چلا سکوں گی؟ چنانچہ اب تجھے اندازہ ہوا کہ یہ کتنا دشوار ہے۔

جس کے ماں باپ کا کوئی پتا نہیں تھا اور وہ ایک بار پھر بہت کر کے فیروز بخت کی تباہی کے درپے ہو گئی۔ حویلی میں یہ افواہ گشت کر رہی تھی کہ داؤد کا خط آیا ہے اور اس میں خدمت گاروں کے بارے میں خاص ہدایات دی گئی ہیں۔ حمد و ذر رہا تھا کہ کہیں اس کے خلاف تو کچھ نہیں لکھ دیا گیا لیکن جب اس کو یہ بتایا گیا کہ حویلی کے خدمت گار اتالیق کے حوالے کر دیے گئے ہیں تو وہ کسی حد تک مطمئن ہو گیا کیونکہ اتالیق کو شیشے میں اتار لینا اس کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔

”گنار! فیروز بخت کا خاص خیال رکھنا اور اس کی تعلیم و تربیت میں کوتاہی نہ کرنا۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تو نے اس کے خلاف کوئی کاڈ آرائی نہ کی ہو۔ اگر خدمت گاروں کی مدد سے کسی قسم کی کاڈ آرائی کی گئی تو اس کا لازمی نتیجہ نکلے گا کہ خدمت گار نافرمانی اور سازش میں مصروف ہو جائیں گے اور تیرے رازوں میں شریک ہو کر تجھ سے مراعات اور مفادات حاصل کرنے لگیں گے۔ رہا فیروز بخت کا مسئلہ تو اس پر تجھے یقین رکھنا چاہیے کہ اس بارے میں، میں نے جو فیصلہ کر لیا ہے وہ بدل نہیں جاسکتا اور یہ کہ اگر آج تو نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا اور اس کے ساتھ زیادتیوں کی گئیں تو اس کا شہیادہ بھی تجھی کو بھگتنا پڑے گا کیونکہ کل جب فیروز بخت جوان ہو جائے گا اور میرے کاروبار، دولت اور جائیداد کا انتظام اس کے ہاتھ میں چلا جائے گا تو اس دن وہ آج کی زیادتیوں کا بدلہ ضرور لے گا۔“

گنار نے ستار کو اعتماد میں لینے کی کوشش کی لیکن وہ باتوں میں آنے والا آدمی نہیں تھا۔ حمد بہت ہوشیار آدمی تھا اور موقع کی تلاش میں تھا۔ گنار اس سے اب بھی خفا تھی لیکن اس خفگی میں پہلے جیسی شدت نہیں رہی تھی۔ خدمت گاروں میں ایک یہ افواہ بھی موجود تھی... کہ ستار اور گنار میں کوئی خاص تعلق ضرور ہے۔ اس تعلق کی ٹوہ میں ہر کوئی تھا اور ان دونوں کو پکڑنے کی فکر میں تھا۔ فیروز بخت کو اپنے کام سے کام تھا، وہ کسی معاملے میں دخل نہیں دینا چاہتا تھا۔

”میں اگر بہت جلدی آیا تب بھی ایک سال لگ جائے گا کیونکہ مجھے لیٹھ کے تھان رہنے ہوئے کپڑوں کے تھان چیمنٹ اور رومال وغیرہ کی بہت بڑی مقدار فلج کے ملکوں کو روانہ کرنا ہے اور یہ کام بڑا وقت چاہتا ہے۔ اس دوران تو اتالیق کی مدد سے اپنے مسائل پر قابو پاسکتی ہے۔ میں نے اسے لکھ دیا ہے کہ وہ حویلی کے خدمت گاروں پر حاکی کرے۔ تو اگر مناسب سمجھے تو اتالیق کے کہنے کو اپنی حویلی ہی میں بلا کر رکھ لے۔“

رمضان آیا تو سبھی صوم و صلوات میں لگ گئے۔ گنار بھی پانچوں وقت کی نماز کے بعد یہی دعائیں مانگتی۔ ”خدا بھائی داؤد کے دل و دماغ کو بدل دے اور وہ شادی کر لے تاکہ جائزہ رٹ پیدا ہو جائے۔“

گنار نے اس خدا کا مفہوم کسی کو بھی نہیں بتایا۔ وہ اتالیق کی مداخلت بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اتالیق سے کہہ دیا کہ بھائی داؤد کی ہدایت کے بموجب وہ خدمت گاروں پر حاکی کر سکتا ہے لیکن اس کے اپنے معاملوں میں دخل دینے آنا کوئی ضرورت نہیں۔ فیروز بخت کے سلیطے میں اس کے ارادے نہیں بدلے تھے۔ وہ اب بھی ایک ایسے لڑکے کو اپنے بھائی کا وارث بنانے پر تیار نہیں تھی

حمد ہر نماز کے بعد یہ دعا مانگتا۔ ”خدا یا مجھے ان مشکلات سے نکال دے اور گنار بی بی کے دل و دماغ کو میری طرف مائل کر دے۔“ ستار کی دعا تھی۔ ”خدا یا انسانی شر سے ہر ایک کو محفوظ رکھ اور انہیں صراطِ مستقیم دکھا۔“ لیکن ان دعاؤں کا اثر کہیں بھی ظاہر نہیں ہو رہا تھا کیونکہ داؤد اب بھی شادی پر تیار نہیں تھا اور اس نے بدستور فیروز بخت ہی کو اپنی دولت اور کاروبار وغیرہ کا وارث بنا رکھا تھا۔ گنار اب بھی حمد پر مائل نہیں تھی اور بدستور بیزار تھی۔ فیروز بخت بدستور آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھا ہوا تھا اور داؤد کے بارے میں جو دعائیں مانگتی تھی وہ دعائیں مانگنے سے پہلے ہی قبول ہو چکی تھی۔

ستار کی دعا بھی نامقبول تھی کیونکہ بشر کا شر اس کے نام ہی میں موجود تھا۔ اس کو شر سے الگ کس طرح کیا جاسکتا تھا اور رہا اس کا صراطِ مستقیم پر چلنا تو یہ صراطِ مستقیم کے مفہوم ہی سے واقف نہیں تھا تو اس پر چلنا کس طرح؟ سہری میں جب خدمت گار روزے کی نیت باندھنے

گنار نے جواب دیا۔ "میں اس لیے معاف نہیں
 روں گی کہ تو نے اس رات جو کچھ کیا تھا، وہ ایسا نہیں ہے
 کہ معاف کر دیا جائے۔"

حمود نے گنار کے قدموں میں جھک کر پاؤں پکڑنا
 چاہے۔ لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی اور حمود کو ڈانٹا۔ "حمود! میں کہتی
 ہوں تو یہاں سے چلا جا ورنہ میں تجھے وہ سبق دوں گی کہ
 زندگی بھر یاد رکھے گا۔"

حمود بھی اڑا رہا، بولا۔ "گنار بی بی! جب آپ نے
 بید سے میری پٹائی کی تھی تو میں اپنی جگہ سے ہلاکت نہیں تھا
 اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس دن اگر آپ مجھے جان
 سے بھی مار دیتیں تو میں اب تک نہ کرتا اور مر جاتا۔ چنانچہ
 آج بھی میں اس وقت تک یہاں سے نہیں ٹلوں گا جب تک
 آپ مجھے معاف نہیں کر دیں گی۔"

گنار نے تذبذب سے کہا۔ "لیکن تو نے جو گستاخی کی
 تھی، اس کی سزا تجھے ملنی چاہیے نہ کہ معاف کر دیا جائے۔"
 حمود جواب دینے ہی والا تھا کہ فیروز بخت آ گیا اور
 آتے ہی بڑے ادب سے سلام کیا۔ گنار نے کندہ پیشانی
 سے سلام کا جواب دیا اور حمود سے کہا۔ "اس وقت تو چلا جا،
 پھر کسی وقت آنا پھر بات کروں گی۔"

حمود کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور وہ فوراً چلا گیا۔
 فیروز بخت نے گنار کو جس انداز میں کھڑے دیکھا
 تھا، اس سے ناقابل فہم شکوک سے پیدا ہو گئے تھے۔ ہوشیار
 گنار نے بھی فیروز بخت کے تردد کو کچھ کچھ سمجھ لیا۔ وہ بیٹھ گئی
 اور مسکراتے ہوئے فیروز بخت کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔
 فیروز بخت بیٹھ گیا۔

گنار نے پوچھا۔ "فیروز بخت! تو بہت دیر میں آیا،
 خیریت تو تھی، کہاں رہ گیا تھا؟"

فیروز بخت نے جواب دیا۔ "استاد محترم کے پاس
 رک گیا تھا ورنہ میں سب سے پہلے حاضر ہوتا۔"
 گنار نے کہا۔ "عید کی خوشیاں مبارک۔ تو کتنا خوش
 قسمت ہے کہ والدین کا کہیں پتا نہیں۔ بچپن میں مشہدی نے
 سہارا دے دیا اور قسمت نے زیادہ زور مارا تو اس حوصلی میں
 داخل کر دیا اور اب اور زیادہ مزے آرہے ہیں۔"

فیروز بخت کو گنار کی باتوں میں طعن و طنز کی رمق
 محسوس ہوئی۔ وہ اس کا کوئی جواب دے سکتا تھا لیکن وہ
 جانتا تھا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ گنار نے پوچھا۔ "کیا تجھ کو
 معلوم ہے کہ میرے پاس بھائی داؤد کا خط آیا ہے؟"
 فیروز بخت نے جواب دیا۔ "نہیں، مجھے نہیں معلوم۔"

سے پہلے کھانے پینے میں مشغول ہوتے تو حمود اپنی کوشھری
 سے گنار کی خواب گاہ کی روشنی پر نظریں جمائے رہتا اور
 ٹھنڈی سانسیں بھرتا رہتا۔ کئی بار اس نے ارادہ کر لیا کہ کچھ
 بھی ہو، وہ گنار کی خواب گاہ میں کھس جائے گا اور اس کے
 قدموں پر سر رکھ کر معافی مانگ لے گا لیکن جب اس کے
 نتائج پر نظر کرتا تو سہم جاتا اور اپنے ارادے سے باز آ جاتا۔
 آخر اس نے ایک بار پھر ستار کا سہارا لیا اور اس کی خوشامد کی
 کہ وہ گنار سے معافی دلوادے تاکہ وہ داؤد کے آنے پر
 عتاب کا نشانہ نہ بنے۔

رمضان کے بعد عید کی نماز پڑھ کر جب خدمت گار
 حویلی میں واپس آئے تو روایت کے مطابق ان سب نے
 باری باری گنار کو سلام کیا اور عید کی مبارک باد پیش کی۔ سب
 سے پہلے اتالیق پہنچے اور اس نے گنار کو سلام کرنے کے بعد
 عید کی مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا۔ "گنار! میں نے
 نماز کے بعد تیرے لیے بطور خاص دعا مانگی کہ تو اپنے مقصد
 میں کامیاب ہو۔"

گنار نے جواب دیا۔ "استاد محترم! اگر میں اپنے
 مقصد میں کامیاب ہوں تو آپ کو نوازدوں گی۔"
 خدمت گاروں میں ستار کے بعد حمود بھی پہنچا اور
 نہایت ادب سے سلام کیا۔ گنار نے منہ پھیر لیا۔ ستار وہیں
 موجود تھا۔ اس نے ستارش کی۔ "گنار بی بی! اس کو معاف
 کر دیجیے۔ یہ اپنی سزا ڈھنچے چکا ہے۔"

گنار نے ستار کو بھی جھڑک دیا۔ "تو خاموش رہ، اس
 کی ستارش نہ کر۔"

ستار باہر نکل گیا لیکن حمود ڈھٹائی سے بیٹھا رہا۔
 خاموشی کی وجہ سے گنار کو شبہ گزرا کہ شاید دونوں چلے گئے۔
 اس نے جیسے ہی منہ پھیرا تو حمود کو تنہا کھڑا دیکھ کر گھبرا گئی۔
 پوچھا۔ "تو یہاں کیوں کھڑا ہے؟ چلا کیوں نہیں جاتا؟"

حمود نے جواب دیا۔ "گنار بی بی! میں نہیں جاؤں گا۔"
 گنار نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "تو کیوں نہیں جاتے
 گا یہاں سے؟"

حمود نے جواب دیا۔ "کیونکہ یہ موقع بڑی مشکل
 سے ملا ہے مجھے۔"

گنار نے بے مروتی سے کہا۔ "میں تجھے حکم دیتی ہوں
 کہ تو چلا جا یہاں سے ورنہ میں کسی کو آواز دے کر بلا لوں گی۔"
 حمود نے بڑے ہذبائی لہجے میں کہا۔ "آپ مجھے
 معاف کر دیجیے کیونکہ جب تک آپ معاف نہیں کریں گی،
 میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"

کر رہی تھی۔ وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھی اور فیروز بخت کو شانوں سے پکڑ لیا۔ بولی۔ ”میں تجھے کس طرح یہ یقین دلاؤں کہ میں تیری ہمدرد ہوں، تیرا بھلا چاہتی ہوں۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”مجھے آپ کی ہر بات پر یقین ہے۔ میں آپ کے خلوص پر شبہ کرنے کی ہمت تک نہیں کر سکتا۔“

گنار نے اسے سینے سے لگا لیا، بولی۔ ”آ، میرے سینے سے لگ جا اور مجھے اچھی طرح سمجھنے لے کیونکہ میں تجھے اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔ چھوٹا بھائی۔ تو میرا بھائی ہے، میرا چھوٹا پیارا بھائی۔ خبردار جواب تو نے کسی قسم کی مغائرت برتی۔ اس حویلی میں اس طرح رہ جس طرح میں رہتی ہوں اور بھائی داؤد رہتے ہیں کیونکہ یہ تیری حویلی ہے اور بھائی داؤد کی حویلی ہے۔“

وہ گنار کے سینے سے چمٹا ہوا ایک عجیب سی لذت محسوس کر رہا تھا۔ اس کے رگ و پے میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی گنار کا رعب بھی طاری تھا، خوف بھی طاری تھا اور اس رعب اور خوف نے اس کی ساری لذت، ساری خوشی اور سارا کیف ہوا کر دیا۔

گنار نے اس کی پیشانی کا بوسہ لیا، بولی۔ ”فیروز بخت! تو کافی عرصے سے اس حویلی میں رہ رہا ہے۔ ایک بات تو بتا؟“

اس نے کہا۔ ”پوچھیے۔“

گنار نے پوچھا۔ ”جب تو مشہدی کے پاس رہتا تھا تو کیا سارا دن گھر ہی میں گزارتا تھا، گھر سے باہر نہیں نکلتا تھا؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں گھر سے نکلتا کیوں نہیں تھا۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلتا کودتا تھا۔“

گنار نے کہا۔ ”لیکن جب سے تو اس حویلی میں آیا ہے، میں نے تو تجھے ایک بار بھی حویلی سے باہر جانے نہیں دیکھا۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں حویلی میں آنے کے بعد ایک بار بھی باہر نہیں گیا۔“

”بھلا کیوں؟ کوئی خاص سبب؟“

اس نے جواب دیا۔ ”سبب تو کوئی خاص نہیں لیکن حویلی کے باہر واقعی نہیں گیا۔“

”حالانکہ تجھے باہر جانا چاہیے۔“

”ہاں جا، تو چاہیے۔“

گنار نے اس کو اپنے پاس ہی بٹھا کر بے تکلفی سے کہا۔ ”جہاں تک حویلی سے باہر نہ جانے کا تعلق ہے، میں اس کے سبب سے واقف ہوں۔“

گنار نے کہا۔ ”بھائی! داؤد نے اپنے خط میں یوں تو بہت کچھ کہا ہے لیکن اس میں تیرے بارے میں بہت کچھ ہے۔“

فیروز بخت یہ پوچھتے ہوئے ڈرا کہ اس میں میرے بارے میں کیا کچھ لکھا ہے۔ اسے شبہ تھا کہ کہیں خط میں اس کے خلاف تو لکھ کر نہیں آگیا کچھ۔ اس نے پوچھا تو کچھ بھی نہیں بس سوالیہ نظروں سے صورت دیکھتا رہ گیا۔

گنار نے اس کی پریشانی اور بے یقینی محسوس کر لی، بولی۔ ”تو پریشان نہ ہو، خط میں تیرے خلاف ایک لفظ بھی نہیں، بس ہر جگہ یہی ہدایت موجود ہے کہ تیری تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی جائے کیونکہ بھائی داؤد کے بعد بھی کوسب کچھ سنبھالنا ہے۔“

فیروز بخت نے شکر گزار نظروں سے گنار کی طرف دیکھا اور آنکھیں جھمکائیں۔

گنار نے کہا۔ ”فیروز بخت! میں تجھے یقین دلا رہی ہوں کہ میں تیری ہمدرد ہوں اور بہت ممکن ہے کہ یہاں کے بعض سازشی عناصر تجھے ورغلائیں کہ میں تیری دشمن ہوں اور تیری جان کے ورپے ہوں۔“

فیروز بخت نے انکساری سے جواب دیا۔ ”مجھے آپ کے خلوص پر اعتماد اور بھروسا ہے۔“

گنار نے کہا۔ ”نہیں، میں تجھ سے یہ نہیں کہتی کہ تو مجھ پر بھروسا کر۔ فیروز بخت! میں اپنی طبیعت اور مزاج کے بارے میں ایک بات بتا دیتا چاہتی ہوں۔ وہ یہ کہ میں بڑی حساس اور جذباتی ہوں۔ جب آدنیایا اس حویلی میں آیا تھا تو میں نے تیری بڑی مخالفت کی تھی اور یہ بھی درست ہے کہ اس میں تیری جان کے ورپے آئے لیکن آہستہ آہستہ مجھے عقل آگئی اور میں اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ مجھے تیری مخالفت نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اگر میں اس وقت تبہ سے اچھا سلوک کروں گی تو کل تو میرا سہارا بنے گا۔ میں تیری دشمن نہیں ہوں۔ اب میں تیری ہمدرد اور یہی خواہ ہوں۔ فیروز بخت! میں دل کی بری نہیں ہوں۔“

گنار کی باتوں نے فیروز بخت کا دل جیت لیا۔ وہ حیران تھا کہ اتنی اچھی اور مہربان عورت کے بارے میں حویلی کے لوگ کیسی کیسی باتیں کرتے رہے ہیں۔ گنار نے داؤد کے خط کی عبارت کے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دیا تھا۔ وہ اگر کچھ... نہ بتاتی تو فیروز بخت کو کچھ بھی معلوم نہ ہوتا۔ اس نے احسان مندانہ نظروں سے گنار کی طرف دیکھا اور فرط جذبات سے آنکھوں میں آنسو آگئے۔ گنار اس کی دلی کیفیات کا اندازہ لگانے کی کوشش

چلنے ہی نہ دیتی تھی اور فیروز بخت کا یہ حال تھا کہ گنار کے
مقا۔ پہلے میں اب اتالیق کی بھی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی تھی۔
اتالیق، فیروز بخت کی سردمہری سے نالاں تھا اور اس کے
انداز و اطوار سے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ شاید اب فیروز
بخت کو اتالیق کی ضرورت ہی نہیں رہ گئی تھی۔

اس دوران میں ایک تاجر حویلی میں آیا اور گنار سے
کہا کہ میں احمد آباد جا رہا ہوں، اس لیے داؤد کے نام کوئی
پیغام ہو تو دوے دو، پہنچا دوں گا۔ گنار نے جواب دیا۔ "میں
پیغام زبانی نہیں دوں گی، میرا مخط لیتا جا۔" اس کے بعد
فیروز بخت سے کہا۔ "ایک خط تو بھی لکھ دے تاکہ بھائی
داؤد کو تیری لیاقت کا علم ہو جائے۔"

فیروز بخت اپنا خط لکھنے لگا اور گنار اپنا خط۔

گنار نے اپنے خط میں لکھا تھا۔ "بھائی داؤد! آپ
میری طرف سے ذرا بھی پریشان نہ ہوں کیونکہ میں نے
بگڑے ہوئے معاملات کو سنوار لیا ہے اور سچیدہ گتھیوں کو
سٹھکانا لیا ہے۔ آپ نے میری شادی کے بارے میں جو کچھ
لکھا ہے، اس سے میں اتفاق کرتی ہوں لیکن میں یہ نہیں مان
سکتی کہ مجھے اتنی جلدی شادی کر لینا چاہیے۔ مجھے آپ کی
بجلیت واپسی کا بھی انتظار نہیں، جب مناسب سمجھیں آجائیں
لیکن نندا کے لیے بجلت میں معاملات کو بنا زبردستی چھوٹے گا۔"

"فیروز بخت کی بابت آپ نے جو کچھ لکھا ہے، میں
اس سے اتفاق کرتی ہوں اور آج کل اس پر بہت توجہ دے
رہی ہوں۔ جو کچھ کہہ رہی ہوں اس کے ثبوت میں فیروز
بخت کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط بھی روانہ کر رہی ہوں۔"

"آج کل میں بھول نہیں پوری جو کانٹے کا ٹنا پڑ
جائیں، میں جو کچھ پوری ہوں خدا اس کا اجر ضرور دے گا۔
بھائی داؤد! میں فیروز بخت کی مخالف نہیں بلکہ اب تو اس کی
سب سے زیادہ ہمدرد اور بہنی خواہ ہوں لیکن میرے بھائی
میں ایک بات پھر کہوں گی، وہ یہ کہ بھائی آپ شادی ضرور
کریں اور اس سے جا کر اولاد پیدا کریں۔ اپنا خون اپنا ہی
ہوتا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کو یہ دکھا دوں گی کہ
مستعدان، ہوشیاری، ذہانت اور تدبیر میں کسی سے کم نہیں
ہوں۔ جو عورتیں اپنی قوم یا ملک پر حکومت کریں، ان کو
جتنی بگڑاؤ دی جائے کم ہے لیکن اپنی حویلی پر میں شاندار
حکومت کروں گی۔"

دوسری طرف فیروز بخت نے جواب میں لکھا
تھا۔ "گنار بی بی مجھ پر اتنی زیادہ مہربان ہیں کہ میں کیا بیان
کروں۔ پہلے میں حویلی میں بند رہا کرتا تھا لیکن اب میں

فیروز بخت نے پوچھا۔ "اس کا کیا سبب ہے آپ
کے نزدیک؟"

گنار نے جواب دیا۔ "اس کا سبب ہے تیرا تکلف،
تیرا کتر ہونے کا احساس۔ تو آج تک خود کو حویلی کا آدمی نہیں
سمجھتا رہا۔ تو خود کو حویلی کا ایک ایسا شخص سمجھتا رہا ہے جو بطور
مہمان فروکش ہے شاید اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

فیروز بخت نے کہا۔ "آپ کا خیال درست ہے
کیونکہ جب تک آپ مجھے اس حویلی کا ایک فرد نہ مان لیتیں،
میں اپنے آپ کو مہمان سے زیادہ کس طرح سمجھ لیتا۔"

گنار نے بڑی محبت سے کہا۔ "اچھا میرے پیارے
بھائی اب میں کہتی ہوں کہ تو اس حویلی کا ایک فرد، محض ایک
فرد نہیں، خاص فرد، بھائی داؤد کے بعد اہم ترین فرد ہے۔
اب میری خواہش ہے کہ تو اس حویلی میں آزادی سے رہ۔
اس حویلی میں بھی اور حویلی کے باہر کی دنیا بھی دیکھ۔ ان
خدمت گاروں پر حکم پلا اور ان کے ساتھ دہلی کے بازاروں
اور خاص خاص جگہوں کی سیر کر۔ کاروباریوں، بیوپاریوں
سے ملاقاتیں کر اور انیائے تجارت کا مشاہدہ کر کیونکہ حویلی
میں رہنے کا یہ مطلب ہے کہ کنوئیں کا مینڈک بنا رہے گا۔ تو
سیاح بن جو گھاٹ گھٹ کا پانی پی کر بلا کا تجربہ کار ہو جاتا
ہے۔ جسے دنیا شناسی اور مردم بینی آ جاتی ہے۔"

فیروز بخت کا حال ہی کچھ عجیب تھا۔ اسے احساس
ہو رہا تھا کہ اس پر دنیا اتنی مہربان بھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ عید
اس کے لیے واقعی پیام عید لے کر آئی تھی۔

☆☆☆

حمد و شائش بوش اپنی خدمات انجام دے رہا تھا
کیونکہ اس کو معاف کر دیا گیا تھا۔ وہ حویلی میں گنار کی
تعریفیں کرتا پھر رہا تھا۔ ستار بھی خوش تھا کہ گنار نے اس کی
سفارش کا خیال کیا تھا۔ اتالیق اس پر حیران تھا کہ گنار،
فیروز بخت پر بہت مہربان ہو گئی تھی۔ وہ اکثر و بیشتر فیروز
بخت کی بابت اتالیق سے سوال و جواب کرتی رہتی۔ فیروز
بخت اب خاصا سمجھدار ہو چکا تھا۔ اب اس نے گنار کی
ہدایت پر حویلی کے باہر نکلنا شروع کر دیا تھا۔ ستار اس کے
ساتھ ہوتا۔ ایک گھوڑے پر فیروز بخت ہوتا اور دوسرے پر
ستار۔ ستار اس بات پر حیران تھا کہ یہ نو دس سالہ لڑکا
گھڑسواری خوب کر لیتے۔ کبھی کبھی یہ دونوں دریائے جمن
کے کنارے نکل جاتے اور کشتیوں کے ادھر ادھر جانے کے
منظر سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔

اتالیق اس سیر و تفریح کے خلاف تھا لیکن گنار اس کی

باتیں کرنا چاہتی ہیں؟“
گنار نے جواب دیا۔ ”دیکھ حمدو! میں تجھ پر اعتبار اب بھی نہیں کرتی۔“
حمدو کے ہاتھ ست پڑ گئے، پوچھا۔ ”مجھ پر اعتبار کیوں نہیں کرتیں آپ..... اس کی وجہ؟“
گنار نے جواب دیا۔ ”اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے اپنا اعتبار خود ہی گنوا دیا۔“

حمدو نے بڑے کرب سے گنار کی طرف دیکھا، کہنے لگا۔ ”جب آپ نے مجھے معاف ہی کر دیا ہے تو اب اس ذکر کو نہ پھینڈیے۔ میں شرمندہ ہو جاتا ہوں۔ ایک غلطی تھی جو سرزد ہوئی تھی۔“

گنار نے کہا۔ ”اول تو میں ابھی تک تیری توبہ سے مطمئن نہیں ہوں اور اگر میں مطمئن ہو بھی جاؤں تو کیا تو اس کا مزید یقین دلا سکتی ہے؟“

حمدو نے جوش و خروش سے جواب دیا۔ ”آپ مجھ سے کوئی کام لے کر دیکھیے۔ میں آپ کو مطمئن کرنے کے لیے اپنی جان تک کی بازی لگا سکتا ہوں۔ میں اب ایسی کوئی دوسری غلطی نہیں کروں گا اور پہلی غلطی کے کفارے میں کسی دن جان گنوا کے دکھا دوں گا۔“

گنار چپ ہو گئی اور حمدو کے ہاتھ نکلر چنے میں ست پڑ گئے۔ دونوں ہی کسی سوچ میں پڑ گئے۔

حویلی کے خدمت گار دور سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ آخر دیر بعد گنار ہوش میں آئی اور حمدو کو مخاطب کیا۔ ”حمدو! آج کل میں فیروز بخت سے کس طرح پیش آ رہی ہوں؟“
حمدو نے جواب دیا۔ ”بہت اچھی طرح، بڑی محبت سے۔“
گنار نے پوچھا۔ ”تیرا کیا خیال ہے، ایسا کیوں ہے؟ کیا میں فیروز بخت کو اپنے بھائی داؤد کی جائداد، دولت اور کاروبار کا وارث ماننے پر آمادہ ہو گئی ہوں؟“

حمدو نے حند بذب ہو کر جواب دیا۔ ”اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ اس پر مہربان کیوں ہوتیں یا پھر یہ ہوگا کہ مالک داؤد نے آپ کو کوئی خط بھیجا ہوگا جس میں یہ ہدایت ہوگی کہ آپ فیروز بخت سے اچھی طرح پیش آئیں۔“

گنار نے جھڑک دیا۔ ”الحق کہیں کا، جب میں نے بھائی داؤد کی زبان کا احترام نہیں کیا تو ان کے خط کا کیا احترام کروں گی۔“

حمدو نے حیرت سے پوچھا۔ ”تب پھر آپ فیروز بخت پر اتنی مہربان کیوں ہیں؟“

گنار نے بڑے مزے میں جواب دیا۔ ”اس لیے

حویلی سے باہر بھی نکلنے والا ہوں۔ گنار بی بی کی مہربانوں اور شفقتوں سے میں حویلی کا انتہائی اہم فرد سمجھا جاتا ہوں۔“
”جب آپ تشریف لائیں گے تو مجھ کو بالکل بدلا ہوا پائیں گے۔ ستار پر غلوں کی خدمت گار ہے، اسی طرح حمدو بھی۔ دوسروں کا مجھے کوئی تجربہ نہیں۔ حویلی میں چھوٹے موٹے ہنگامے تو ہوتے رہتے ہیں لیکن ان سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

اتالیق نے لکھا۔ ”داؤد! میں نہیں جانتا کہ تو کب تک وہاں آ رہا ہے لیکن حویلی کے رنگ ڈھنگ بتا رہے ہیں کہ یہاں کوئی بڑا طوفان آنے والا ہے۔ فیروز بخت ان دنوں پڑھائی پر توجہ نہیں دے رہا ہے۔ گنار نے اسے گھومنے پھرنے کی آزادی دے دی ہے۔“

”میں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ کسی کو اپنا دشمن نہیں بنائیں گے لیکن کسی کی زندگی بھی تباہ نہیں ہونے دیں گے۔ آپ فیروز بخت کو لکھ دیں کہ تعلیم و تربیت کے اکتساب میں تساہل اور کاہلی سے کام نہ لے ورنہ پچھتائے گا۔“

ان تینوں کے خط چلے گئے اور حویلی میں حسب معمول زندگی ہو گئی۔

ستار، فیروز بخت کے ساتھ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر چلا گیا۔ اتالیق ہزار ہو کر اپنے گھر چلا گیا۔ اس سکون اور سنانے میں گنار نے حمدو کو بلایا اور اس سے ایک کھلی جگہ پر باتیں کرنے لگی۔

حمدو کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اب وہ پھر گنار کے پاس آزادی سے آنے جانے لگا تھا۔ خدمت گاروں میں مختلف قسم کی سرگوشیاں جاری تھیں۔ گنار نے حمدو کو اشارے سے بلایا لیکن اس بار وہ حمدو کے ساتھ بند کمرے میں نہیں بیٹھی بلکہ چھوٹی سی چوکی پر برآمدے ہی میں بیٹھ گئی۔ حمدو اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

گنار نے کہا۔ ”حمدو! کیا تو کوئی ایسا کام نہیں نکال سکتا کہ تو میرے سامنے بیٹھ کر وہ کرتا رہے اور میں تجھ سے باتیں کرتی رہوں؟“

حمدو مارے خوشی کے دیوانہ ہو گیا، بولا۔ ”مجھ سے باتیں کیجیے گا؟ میں اس ایک کام کے لیے ہزاروں کام نکال سکتا ہوں۔“

گنار نے کہا۔ ”تب نہر جلدی کر، باتیں نہ بنا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

حمدو بہت سارے چاؤں نکال لایا اور ان سے مٹی نکلنے کے کلوے چننے لگا، بولا۔ ”اب بتائیے، آپ کون سی

حمد و تملک کر بولا۔ "میرا دل بالکل صاف ہے۔ میری نیت میں کوئی فتور نہیں۔ بس میں آپ سے باتیں کرتے کرتے ذرا بہک جاتا ہوں اور کچھ نہیں۔"

گنار نے جواب دیا۔ "بس یہ تیرا بہک جانا ہی برا ہے۔" حمد اچانک چپ ہو گیا اور پھر بولا۔ "آپ کی مرضی، آپ مجھ سے کام لیں یا نہیں۔ اب میں کچھ بھی نہیں کہوں گا۔"

گنار نے حمد کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں رکا۔ اس کے چلے جانے کے بعد گنار دیر تک یہ جائزہ لیتی رہی کہ حمد کی نیت صاف ہے یا اس کا شبہ درست ہے لیکن حمد نے بات بڑھانے کے بعد اچانک ختم کر دی تو اس سے گنار خاصی پریشان ہو گئی۔

فیروز بخت ستار کے ساتھ مہرولی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔ اسے اپنے اوپر اور اپنے حالات پر یقین نہیں تھا۔ گنار کی تسلیاں اسے خواب و خیال لگتی تھیں۔ اتالیق کی مہربانیاں بہلاوا معلوم ہوئی تھیں اور ستار کی وقاداریاں ناپائندار اور عارضی لگ رہی تھیں۔ وہ حالات کی سفاکیوں کی وجہ سے یقین کی دولت سے محروم ہو گیا تھا۔

جب وہ مہرولی سے واپس آیا تو گنار کی تیز نظریں اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ وہ حمد کو فیروز بخت سے دور رکھنا چاہتی تھی کیونکہ اس کو حمد پر زیادہ اعتبار نہیں تھا۔ گنار نے فیروز بخت کو اپنے پاس بلا لیا اور اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگی۔ فیروز بخت نے اس کا تاثر یہ لیا کہ شاید خواجہ بختیار کاکی کے مزار پر مانگی جانے والی دعا کا اثر اتنی جلدی ظاہر ہو رہا ہے۔

اتالیق خدمت گاروں کی حاکمی کے فرائض انجام دینے لگا تھا لیکن گنار کے آگے اس کی زیادہ نہ چلتی تھی۔ اتالیق بھی اپنا وقت گزار رہا تھا کیونکہ نیا بادشاہ ابھی تک دہلی نہیں آیا تھا اور اتالیق ان غیر یقینی حالات میں معلق ہو کر رہ گیا تھا۔ گنار نے اتالیق کے سپرد ایک اور کام کر دیا۔ اس نے اتالیق سے کہا کہ وہ اب فیروز بخت کو نظری تعلیم کے ساتھ عملی تعلیم بھی دے۔

چنانچہ اتالیق فیروز بخت کے ساتھ انسانوں میں آنے جانے لگا۔ وہ آدمیوں کے مختلف ہجوم میں فیروز بخت کو لے جاتا اور ان کی نفسیات اور عادات کی بات بتاتا اور مشاہدے کرواتا۔ وہ فیروز بخت کو حکماء میں لے گیا اور اسے یہ بات محسوس کروائی کہ طبیب، جس کو انسانی امراض کے علاج کا علم

کہ تو نے مشورہ دیا تھا۔" حمد نے حیرت سے پوچھا۔ "میں نے مشورہ دیا تھا، کیا مطلب؟"

گنار نے کہا۔ "اس کا ایک ہی مطلب ہے۔ تو نے ہی مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں فیروز بخت کو دوست بن کر نقصان پہنچاؤں کیونکہ دشمن بن کر ٹھکانے لگانے میں بڑے خطرات ہیں لیکن اگر دوستی کے پردے میں دشمنی کی جائے تو بڑا مزہ آتا ہے۔ اب بس یہی کر رہی ہوں۔ میں نے فیروز بخت کو اپنے اعتماد میں لے لیا ہے اور اب میں جانتی ہوں کہ جو چاہوں کر سکتی ہوں۔"

حمد کو یاد آیا کہ اب اس قسم کا کوئی مشورہ دیا تو تھا۔ گنار بولتی رہی۔ "اب وہ وقت آ گیا ہے کہ فیروز بخت کا کام تمام کر دیا جائے لیکن میں اسے حویلی میں نہیں مارنا چاہتی اور یہ بھی نہیں چاہتی کہ اسے زہر سے ہلاک کیا جائے۔" حمد نے تردد سے پوچھا۔ "آپ کو جو کچھ کہنا ہے، تذبذب سے نہ کیجیے۔"

گنار کہتی رہی۔ "اس معاملے میں ستار پر اعتبار نہیں کر سکتی کیونکہ اس کی سنگدلانہ وقاداری میری لیے مصیبت ہے۔ اس معاملے میں، میں تجھ سے مدد چاہتی ہوں، تیری اعانت کی طالب ہوں۔"

حمد نے ذرا بیخبر بدلا، بولا۔ "میں نے کہا تو دیا کہ میں آپ کی خاطر اپنی جان تک دے سکتا ہوں لیکن میں اپنی جان اس وقت دے سکتا ہوں جب مجھے معلوم ہو جائے کہ میرا جان و بنا آپ کے دل پر اثر انداز ہوگا اور آپ میری قربانی کا کوئی مطلب لیں گی۔"

گنار چونک پڑی، حمد پھر بہک رہا تھا۔ تیوریاں بدل کر پوچھا۔ "میرے دل پر کیا اثر چاہتا ہے تو اور تیری قربانی کا کیا مطلب لینا چاہیے مجھے؟ میں تیرا مطلب نہیں سمجھی؟"

حمد نے ذرا احتیاط سے کام لیا، سنبھل کر جواب دیا۔ "میرا ان باتوں سے کوئی خاص مطلب نہیں ہے بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ جب میں آپ کی یہ خطرناک خدمت انجام دے چکوں تو اگر میں کسی مصیبت میں گرفتار ہونے لگوں، اس وقت آپ میرے لیے بڑھ چڑھ کر کچھ کر گزریں اور میں اپنی جان سے....."

گنار نے بات کاٹ دی۔ "اب فضول باتیں نہ کر۔ تیرا دل صاف نہیں ہے اور میرا خیال ہے کہ تیری نیت میں اب بھی فتور موجود ہے۔ جب تک تو پاک صاف نہ ہو جائے، میرا تجھ سے اس قسم کی باتیں کرنا فضول ہے۔"

اتالیق کے نظری اور عملی علوم کا درس جاری تھا اور گنٹار کے سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے۔
صبح سورج ابھی زیادہ اونچا نہیں پہنچا تھا کہ اتالیق فیروز بخت کو اپنے ساتھ لے کر منڈی چلے گئے تاکہ اس کا مشاہدہ بھی کروا دیا جائے۔ اس کے جاتے ہی گنٹار نے حمد کو طلب کیا اور اس سے کہا۔ ”آج تجھ کو میرے کمرے اور خواب گاہ کی صفائی کرنی ہے اور یہ صفائی میں اپنی گمرانی میں کرواؤں گی۔“

حمد نے جواب دیا۔ ”میں آپ کا خدمت گار ہوں۔ مجھ سے جو کام چاہیں لیں، میں بے چون و چرا انجام دوں گا۔“
گنٹار نے اسے کام سے لگا دیا۔ اس کے بعد بولی۔ ”اس دن تو مجھ سے ناراض کیوں ہو گیا تھا؟“
حمد نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ”آپ مجھ پر اعتبار جو نہیں کرتیں۔“

گنٹار نے کہا۔ ”کس نے کہہ دیا کہ میں تجھ پر اعتبار نہیں کرتی۔ میں تجھ پر اتنا اعتبار کرتی ہوں کہ اس حویلی میں تجھ سے زیادہ کوئی اور مستحضر نہیں۔“

حمد نے نظریں ملانے بغیر کام کرتے ہوئے پوچھا۔ ”لیکن میں اس پر کیسے یقین کر دوں؟“

گنٹار نے جواب دیا۔ ”اس طرح کہ اب میں تجھ سے اپنا خاص کام لینے والی ہوں جس کی میں ابھی تک منصوبہ بندی کرتی رہی ہوں اور اس کام کے بارے میں تیرے علاوہ کوئی اور کچھ بھی نہیں جانتا۔“

حمد نے کہا۔ ”میں نے آپ سے کہہ جو دیا کہ میں آپ کی خاطر اگر اپنی جان بھی گنوا دوں گا تو مجھے افسوس نہیں ہوگا۔“
گنٹار نے بڑی سستی خیر لہجے میں پوچھا۔ ”تو، تو تیار ہے؟“
حمد نے جواب دیا۔ ”بالکل، آپ جب چاہیں آزمائیں۔“

گنٹار نے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میرا منصوبہ سن لے اور اس کو اچھی طرح سمجھ بھی لے۔“

حمد کو ہاتھ رک گیا، بولا۔ ”بتائیے؟“
گنٹار نے لجاجت سے کہا۔ ”اگر تو میرا یہ کام کر دے گا تو میں تجھ سے وعدہ کرتی ہوں کہ تجھ کو اس حویلی میں ایک ایسا خاص مقام دوں گی کہ دوسرے رشک کریں گے۔“

حمد نے کہا۔ ”کام بتائیے؟“
گنٹار نے باہر نکل کر دیکھا کہ وہاں کوئی اور تو موجود نہیں ہے اور جب ادھر سے مطمئن ہو گئی تو بولی۔ ”دیکھو حمد! میں یہ کسی حال میں بھی گوارا نہیں کر سکتی کہ فیروز بخت بھائی

آتا ہے، وہ کس طرح انسانوں کی جبین کا تباہ ہے۔ اس نے دنیا دار مشائخ کی خانقاہوں کی سیر کروائی کہ دیکھو کس طرح تارک الدینا دکاندار اپنی دکانیں چلا رہے ہیں۔ اس نے بازاروں میں گھمایا پھر پایا کہ دیکھو تجارت میں کس طرح شریفانہ انداز میں ڈکیتیاں ہو رہی ہیں۔ اتالیق نے فیروز بخت کو نصیحتیں کرتے ہوئے بتایا۔ ”فیروز بخت! دنیا کے جملہ علوم کی تحصیل کا مقصد خوشحالی اور مردم شناسی ہے۔“

فیروز بخت نے پوچھا۔ ”استاد محترم! یہ دنیا شناسی اور مردم شناسی کس علم سے حاصل ہوتی ہے؟“

اتالیق نے جواب دیا۔ ”فیروز بخت! تجربے، غورو فکر اور عقل سے اور ان کو جملہ علوم سے ملتی ہے۔ اگر تو نے خود میں غورو فکر مشاہدے اور عقل سے کام لینے کی عادت ڈال لی تو بہت جلد اس لائق اور جائے گا کہ مردم شناسی میں ماہر ہو جائے۔ تو ایک بات، ہمیشہ ذہن نشین رکھ کہ ہر انسان جو تجھ سے مخاطب ہوگا، اپنا باتوں سے اپنا تعارف کرواتا رہے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ تو سمجھنے میں کوتاہی کر جائے۔“
فیروز بخت نے کہا۔ ”استاد محترم! میں نے جن حالات میں ہوش سنبھالا ہے اس میں، میں نے مایوسی کے علاوہ کچھ نہیں پایا۔ آپ مجھ کو کوئی ایسی نصیحت کیجیے جو زندگی بھر میری راہنمائی کرے۔“

اتالیق نے کہا۔ ”میری بات توجہ سے سن۔ اگر تجھ سے کوئی یہ پوچھے کہ دنیا میں اچھی بات کیا ہے تو، تو جواب دے گا کہ دوسروں پر اعتبار کرنا کیونکہ دوسروں پر اعتماد و اعتبار کے بغیر دنیا آگے نہیں بڑھ سکتی لیکن اگر کوئی تجھ سے یہ پوچھے کہ دنیا کی سب سے اچھی بات کیا ہے تو اس کا جواب ہوگا کہ کسی پر اعتبار نہ کرنا کیونکہ دنیا میں انسان نے زبردست نقصان اعتبار اور اعتماد ہی سے اٹھائے ہیں۔“

اتالیق کی یہ نصیحت اس نے گہرے دل میں باندھ لی۔
اتالیق تو یہ نصیحت کر کے کنارہ کش ہو گیا لیکن فیروز بخت کو پریشان اور غمگین میں جلا کر دیا۔ کچے اور تاپختہ ذہن نے اس کے دل و دماغ پر گنٹار کا اعتماد بڑھا دیا تھا لیکن اس نصیحت کے بعد گنٹار کا اعتماد بھی اٹھ گیا۔ وہ بڑی مشکل میں تھا کہ اگر وہ گنٹار کا اعتماد نہ کرے اور عدم اعتمادی ظاہر کرے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟

اب فیروز بخت میں بڑی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ وہ گنٹار سے بہت کم ربط و ضبط رکھتا اور اگر بھی گنٹار سے بولتا ہی پڑ جاتا تو بڑے اعتبار آمیز لہجے میں بات کرتا اور اپنی کوئی بات سچ نہ بتاتا۔

جو کچھ ہوگا، ہو جائے گا۔“
گننار نے اس دن اس کا بڑا خیال رکھا۔ یہاں تک کہ دوپہر کا کھانا بھی اپنے ساتھ ہی کھلایا۔
اس دن حمد و شام کو فیروز بخت کے پاس پہنچ گیا اور بڑی بے تکلفی سے پوچھا۔ ”چھوٹے مالک! حیرت تو ہے۔ آج کل آپ بہت زیادہ گھوم پھر رہے ہیں؟“
فیروز بخت نے حمد کو سرسری نظروں سے دیکھا اور بڑی خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ ”حمدو! آؤ بیٹھو، کہاں سے آرہے ہو؟“

حمد نے جواب دیا۔ ”آج میں نے حویلی کے ایک بڑے جیسے کی صفائی کی۔ بہت زیادہ تھک گیا ہوں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ آپ کے پاس بیٹھ کر اچھی اچھی باتیں کر کے دل بہلا لوں۔ اس طرح مکان بھی اتر جائے گی۔“
فیروز بخت نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”ضرور، ضرور مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

گننار بھی پاس موجود تھا۔ حمد سے کہا۔ ”کیا باتوں کے لیے تجھے اور کوئی نہیں ملا؟ چھوٹے مالک سے باتیں کرنا مناسب نہیں ہے کیونکہ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے استاد محترم فرما رہے تھے کہ بڑے آدمیوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ چھوٹوں کو منہ لگائیں کیونکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر چھوٹوں سے بے تکلف ہوا جائے تو وہ سر چڑھ جاتے ہیں اور کام سچ نہیں کرتے۔“

فیروز بخت ان دونوں کے بحث و مباحثے میں دلچسپی لینے لگا۔ حمد نے سختی سے کہا۔ ”بھائی ستار! تم ہم دونوں کے درمیان سنا فرت کے بیچ نہ ڈالو۔ چھوٹے مالک کا مزاج دوسرے مالکوں جیسا نہیں ہے اس لیے میں یہاں باتیں کرنے آجاتا ہوں۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”میرے قلمیں اور ہمدرد دوست تو فکر نہ کرو اور استاد کی بات کا برا نہ مان کیونکہ یہ جھڑکیاں میں خود بھی نفوٹھی کھا سکتا ہوں اور اس لیے کھا سکتا ہوں کہ جھڑکیاں دینے والے کی نیت پر میں شبہ نہیں کر سکتا۔“

حمد کے دل پر اس جواب نے وہ اثر کیا کہ اس کا دل لرز گیا۔ اس نے جھک کر فیروز بخت کے پاؤں پکڑ لیے اور معافی مانگتے ہوئے بولا۔ ”چھوٹے مالک! میں آپ کی تسلی اور شرافت کا دل سے قائل ہوں۔ کیا آپ میرے ساتھ روشن چراغ دہلی کے حزار پر چلنا گوارا کریں گے؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں آپ کے ساتھ روشن چراغ دہلی کے حزار پر چلوں گا اور ان کی کرامات اور

کی دولت اور جائیداد اور کاروبار کا مالک بن جائے۔ میں بار بار یہ کہہ چکی ہوں کہ میں فیروز بخت کو کسی کی جائز اولاد ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ گر مجھے اس کے ماں باپ کا علم ہوتا تو میں اس کی ذرا بھی مخالفت نہ کرتی اور بھائی داؤد کی ہر چیز اس کے حوالے کرنے میں مسرت و انبساط محسوس کرتی لیکن یہ جانتے ہوئے کہ فیروز بخت معلوم نہیں کس کا بیٹا ہے، میں اپنی یا بھائی داؤد کی ایک چیز بھی اسے نہیں دوں گی۔“
حمد نے کہا۔ ”آپ اپنا مطلب بیان کیجیے۔“

گننار نے جواب دیا۔ ”میں فیروز بخت کو اپنی راہ سے ہٹا دینا چاہتی ہوں اور یہ کوئی ایسا کام نہیں ہے جسے تو نہ کر سکے۔“

حمد نے بڑی بے چارگی سے کہا۔ ”آپ حکم دیں گی تو یہ کام چنگی بھاتے ہوئے گا۔“

گننار نے برا سامنہ بنا کر کہا۔ ”بس اسی بات سے میں چپتی ہوں کہ تو باتوں میں منظر مراتب کا کوئی خیال نہیں رکھتا۔“
حمد نے سختی سے بیچنے کے لیے کام کی بات شروع کر دی۔ ”مجھے کام بتائیے، میں ابھی اس کی تیاری شروع کر دیتا ہوں اور اللہ نے چاہا تو پچھتے عشرے میں تکمیل کو پہنچا دوں گا۔“

گننار بولی۔ ”میں یہ چاہتی ہوں کہ فیروز بخت کا کام حویلی سے باہر نہیں اور تمام کیا جائے۔“

حمد نے پوچھا۔ ”پھر کہاں اور کس طرح؟“
گننار نے جواب دیا۔ ”یہ میں کیا بتاؤں گی۔ یہ تو، تو خود سوچے گا۔“

حمد سوچ میں پڑ گیا کچھ سوچتا رہا پھر پوچھا۔ ”کیا میں آپ سے یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ جب فیروز بخت کا جھگڑا چکا دیا جائے گا اور حویلی میں آپ ہی آپ ہوں گی تو اس وقت میں کیا ہوں گا؟ میری کیا حیثیت ہوگی؟“

گننار نے ناراضی سے کہا۔ ”پھر وہی بے نکا سوال۔ اس سوال کا جواب مستقبل پر چھوڑ دے۔ مجھ پر اور مستقبل پر۔ میں تم سے بااصرار یہ کہوں گی تو جب تک یہ کام نہ کر لے مجھ سے یہ سوال نہیں کرے گا۔“

حمد چپ ہو گیا۔ گننار نے کہا۔ ”میں نے فیروز بخت کو ادھر ادھر بھیجتا شروع کر دیا ہے۔ تو اپنا کام کہیں بھی کر سکتا ہے جا کر۔“

حمد نے جواب دیا۔ ”آپ فکر نہ کریں۔ آج رات تک میں یہ منصوبہ تیار کر لوں گا اور پھر چند دنوں کے اندر ہی

واقعات سنوں گا۔ مجھے بزرگانِ دین کے حرار پر جا کر بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے۔“

ستار نے اپنے طور پر کہا۔ ”لیکن چھوٹے مالک آپ کو اپنے اتالیق کی بات مان لینا چاہیے۔“

فیروز بخت نے تہرکی پروا کیے بغیر بے سوچے سمجھے حمد سے کہا۔ ”میں نے کہہ تو دیا کہ ضرور چلوں گا اور استاد محترم اگر ناراض ہوں گے تو میں انہیں سمجھا لوں گا۔“ ستار حیران فیروز بخت کی صورت دیکھتا رہ گیا۔

حمد نے کہا۔ ”کوئی جلدی نہیں ہے، کل تو نہیں پرسوں کے بعد سکی۔ بزرگانِ دین کے مزاروں پر جانے سے بگڑے کام بن جاتے ہیں اور آدمی کی دنیا اور آخرت سنور جاتی ہے۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”اس دوران میں استاد محترم سے جانے کی اجازت بھی لے لوں گا۔“

حمد نے تشویش سے پوچھا۔ ”اگر استاد نے اجازت نہ دی تو؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”استاد محترم فرماتے ہیں کہ میں اپنی ذات میں اعتماد پیدا کروں، خود اعتمادی بحال کروں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ مجھے کبھی کبھی تنہا بھی چھوڑ دیا جائے۔“

ستار اور حمد، فیروز بخت کی عاقلانہ باتیں سن کر حیران رہ گئے اور اتالیق کی محنت کا شرم دیکھ کر دل ہی دل میں اسے داد دینے لگے۔

حمد کے چلے جانے کے بعد ستار نے فیروز بخت کو سمجھایا۔ ”چھوٹے مالک میں آپ سے عمر میں بڑا ہوں اور آپ اتالیق کی محنت کی وجہ سے علم و فضل میں بڑھ گئے ہیں لیکن میں اپنی جہالت اور نادانی کے باوجود آپ کو سمجھاؤں گا کہ آپ حمد پر زیادہ بھروسہ نہ کیجیے گا کیونکہ گلزار بی بی کا دل آپ کی طرف سے اب بھی صاف نہیں ہے اور حمد و گلزار بی بی کا خاص آدمی ہے۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”استاد محترم نے مجھے ایک بڑے کام کی بات بتائی ہے۔ وہ یہ کہ اعتماد کرنا اچھی بات ہے اور اعتماد نہ کرنا اس سے بھی زیادہ اچھی بات ہے۔ چنانچہ اب میں استاد محترم کے اس قول پر عمل کر کے دنیا کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

ستار لا جواب ہو گیا لیکن وہ فیروز بخت کو یہ سمجھانے پر مصر تھا کہ وہ حمد پر اعتبار نہ کرے۔ اس نے اس کام میں اتالیق کی مدد لینا چاہی۔ اتالیق کہیں گیا ہوا تھا اور کچھ پتا نہ

تھا کب تک واپس آئے گا۔ اس دوران اس نے یہ تماشا دیکھا کہ فیروز بخت کو گلزار نے بلا لیا اور اس کو بڑی محبت سے اپنے پاس بٹھالیا۔ گلزار نے فیروز بخت کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کہا۔ ”فیروز بخت! مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ اب تو نظم و عقل کی باتیں کرنے لگا ہے۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”ان میں آپ کی دعاؤں اور استاد محترم کی جانفشانی کا بڑا دخل ہے۔“

گلزار نے کہا۔ ”وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس حویلی کے لیے یہ ضروری ہے کہ تو ہر طرح لائق فائق ہو جائے۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میرا لائق فائق ہونا... بیکار تھا اگر آپ کی مرضی بھی شامل حال نہ ہوتی۔“

گلزار نے پوچھا۔ ”میں نے سنا ہے کہ استاد محترم تمہیں خود اعتمادی اور اعتماد ذات بحال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”ہاں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ کسی انسان سے خود اعتمادی اور اعتماد ذات چھین لی جائے تو گویا اس کا سب کچھ چھین لیا گیا اور اگر کسی انسان کے پاس خود اعتمادی اور اعتماد ذات کے سوا کچھ بھی نہیں تو اس کے پاس سب کچھ ہے۔“

گلزار اس کی غرومندانہ باتیں سن کر ڈانواں ڈول ہو گئی اور ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ فیروز بخت کو زندہ رکھا جائے لیکن یہ لگاتی جذبہ فوراً کا فور ہو گیا۔ گلزار نے کہا۔ ”میں تو سپردِ می سادی ایک بات جانتی ہوں۔ بھائی واؤڈ کا کاروبار تجھے سنبھالنا ہے۔ دولت اور جائیداد کا انتظام تجھے کرنا ہے۔ اب اگر تجھ میں اتنی صلاحیت موجود نہیں ہوگی کہ تو کسی کے مشورے اور رائے کے بغیر اپنا کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ آہستہ آہستہ چالاک لوگ تجھ پر، تیری عقل اور تیری رائے پر، تیرے فیصلوں پر حاوی آ جائیں گے اور پھر جو کچھ تیرے پاس ہوگا، وہ دوسروں کے حصے میں چلا جائے گا۔“

”بے شک، بے شک۔“ فیروز بخت نے کہا۔ ”آپ بجا فرماتی ہیں۔“

گلزار نے کہا۔ ”اگر تجھے مجھ پر اعتماد ہے تو پھر اتالیق کے بعد دوسرا درجہ مجھے دے اور میں جو کچھ کہوں، اس پر غور کر اور جب تو اس سے متعلق ہو جائے تو اس پر عمل کر۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں آپ پر اعتبار کرتا ہوں۔ آپ کی شفقت، آپ کی محبت پر بھروسہ کرتا ہوں اور یہ حقیقت ہے کہ میں آپ کو اتالیق کے بعد کا نہیں ان

کے مساوی درجہ دیتا ہوں اور یہ ناممکن ہے کہ آپ مجھے کوئی مشورہ دیں اور اس پر عمل نہ کروں۔“

گنار نے کہا۔ ”فیروز بخت! وہ استاد محترم ہوں یا کوئی اور..... تیرا وہ بھائی دادو اور میرے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں۔“
گنار نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ حمد تجھے کہیں لے جانا چاہتا ہے؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”آپ نے صحیح سنا ہے۔ وہ مجھے روشن چراغ دہلی کے مزار پر لے جانا چاہتا ہے۔“

گنار نے کہا۔ ”لیکن اس کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ تجھ کو اعتماد ذات کی بھائی کے لیے ہر کام کسی کے سہارے کے بغیر انجام دینا چاہیے۔ روشن چراغ دہلی، بختیار کاٹی، نظام الدین اولیا غرضیکہ تجھے جہاں بھی جانا ہے، تمہا جا اور ہر معاملے میں خود ٹھیلے کرنے کی عادت ڈال۔ تو استاد محترم سے کہہ دے کہ کچھ دنوں کے لیے وہ تجھے جہاں چھوڑ دیں۔“

فیروز بخت گنار سے اتنا متاثر تھا کہ اب گنار کے مقابلے میں اتالیق بھی کچھ نہیں تھا۔ جواب دیا۔ ”میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے کہ اب میں آپ کے مشوروں کو ترجیح دوں گا اور استاد محترم کے مشوروں پر عمل کرنے میں تساہل سے کام لوں گا۔“

گنار نے کہا۔ ”لیکن ایک بات کا خیال رہے کہ تو جو قدم بھی اٹھائے، اس سے مجھے مطلع ضرور کر دیا کر۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”ضرور، ضرور۔“
پھر گنار، فیروز بخت سے دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔

☆☆☆

دادو کا ایک اور خط آ گیا۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ عنقریب واپس آ جائے گا اور گنار سے یہ بھی خواہش کی تھی کہ وہ ایک خط فیروز بخت سے بھی لکھوا کر روانہ کرے۔

لیکن حیرت کہا بات یہ تھی کہ اس بار اتالیق کو کوئی خط بھی نہیں لکھا تھا۔ اتالیق کو آنسوں بھی ہوا لیکن وہ اس کی شکایت کس سے کرتا۔ گنار نے فوراً ہی اس کا جواب دے دیا اور اس میں فیروز بخت کی بڑی تعریف کی۔ اس نے لکھا کہ فیروز بخت میں بلا کی خود شناسی آگئی ہے اور وہ ایسی باتیں کرنے لگا ہے کہ عمل حیران رہ جاتی ہے۔ وہ اعتماد ذات بحال کرنے کی کوششیں کر رہا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا

کہ بھائی دادو جب آؤ گے اور فیروز بخت کو دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ کیونکہ یہ دس گیارہ سالہ لڑکا بڑی عالمانہ اور فلسفیانہ باتیں کرنے لگا ہے۔ میں نے فیروز بخت کو بہت پہلے ہی کیوں نہیں پہچان لیا تھا۔ میں آپ کی مردم شناسی کی قائل ہو گئی ہوں۔“

گنار نے ایک خط فیروز بخت سے بھی لکھوایا۔ فیروز بخت نے اپنے خط میں لکھا۔

”میرے محسن! میرے عظیم کرم فرما! میں آپ کا کس طرف شکر یہ ادا کروں۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں بار بار آپ کی خدمت اور اطاعت میں اپنی جان دیتا رہوں، تب بھی میں آپ کے احسان عظیم کی ادائیگی سے قاصر رہوں گا۔“

”میں اپنے اتالیق کا بھی شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھ میں نظری اور عملی علوم کی منتقلی میں جو محنت کی ہے، وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی اور خاص کر جب میں اپنے حالات اور ایام پر غور کرتا ہوں جب حویلی میں گنار بی بی میری مخالفت پر کمر بستہ تھیں اور انہوں نے استاد محترم کی ادائیگی بھی روک لی تھی۔ استاد محترم اس وقت بھی مجھ سے دور نہیں رہے اور اپنا کام جاری رکھا جس کے لیے میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ ہی کی نیت صالح نہ ہوتی تو یہ استاد محترم میرے لیے شاید بھی نہ کر سکتے۔ انہوں نے مجھے خود شناسی، خدا شناسی اور مردم شناسی کے بے مثال درس دیے ہیں۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ میں کسی پر اعتبار یا اعتماد نہ کروں کیونکہ دنیا کے عظیم دھوکے اور بے مثال فریب اعتماد ہی کی وجہ سے کھائے جاتے ہیں۔“

اس کے بعد اس نے گنار کی تعریفیں کیں۔ ”گنار بی بی سے بارے میں، میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے پہلے مجھے پہچانا نہیں تھا لیکن پھر جیسے ہی پہچان لیا، وہ مجھ پر مہربان ہو گئیں۔ میں ان سے زیادہ کسی اور کو خود پر مہربان نہیں پاتا۔ اگر وہ مجھ پر مہربان نہ ہوتیں تو میں آج یہ نہ ہوتا جو اپنے خط میں نظر آ رہا ہوں۔“

لیکن جب یہ خط گنار نے پڑھا تو اس نے بڑی نرمی سے فیروز بخت کو حکم دیا کہ اپنے خط سے اتالیق کے ذکر والا حصہ حذف کر دے کیونکہ اتالیق نے جو کچھ کیا، وہ اس کا ایک ایسا فرض تھا جس کا معاوضہ دیا گیا ہے اور جو چیز معاوضے سے خریدی گئی ہو اس کا احسان ماننا یا شکر یہ ادا کرنا کیا تھی۔ چنانچہ فیروز بخت نے اتالیق کا ذکر حذف کر دیا اور خط کو نقل کر کے دوبارہ گنار کے حوالے کر دیا۔

اب گنار حویلی میں تنہا وہ ذات تھی جس کا کوئی مد مقابل

فیروز بخت نے کہا۔ ”آپ مجھ سے اس قسم کی باتیں نہ کریں۔“
 اتالیق نے کہا۔ ”میری بات سمجھنے کی کوشش کر۔ سوچ اور غور کر کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔“
 فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”آپ نے مجھ کو یہ درس دیا ہے کہ میں کسی پر اعتبار نہ کروں۔ چنانچہ میں اس پر عمل کر رہا ہوں اور اب میں کسی پر بھی اعتبار نہیں کرتا جس میں آپ کی ذات بھی شامل ہے۔“
 اتالیق غصے سے بے قابو ہونے لگا، کہا۔ ”تو گستاخی کر رہا ہے۔“

”میں کوئی گستاخی نہیں کر رہا۔“
 اتالیق نے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ ”فیروز بخت! میں تیرا ہمدرد ہوں، استاد ہوں۔ تجھے میری باتوں پر تو اعتبار کرنا ہی پڑے گا کیونکہ میں تیرا اتالیق تیرا استاد ہوں۔“
 فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”استاد محترم! گستاخی معاف۔ آپ نے مجھے تعلیم و تربیت دے کر کوئی احسان نہیں کیا کیونکہ میں نے آپ سے یہ چیز قیمت دے کر حاصل کی ہے۔ میں نے آپ کو آپ کی اتالیقی اور استاد کی معاوضہ دیا ہے۔ جب کوئی چیز معاوضہ ادا کر کے حاصل کی گئی ہو تو اس پر دکاندار کا احسان کیسا؟“

اتالیق کا سر چکرانے لگا، بڑے دکھ سے پوچھا۔ ”یعنی تو مجھ کو ایک دکاندار اور خود کو ایک گاہک سمجھتا ہے؟“
 فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”بے شک، میں اس سے زیادہ سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں۔“
 اتالیق نے کہا۔ ”تب پھر میں آج کے بعد اس حویلی میں قدم نہ رکھوں گا۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”استاد محترم! آپ کو اس وقت تک آتے رہنا ہے جب تک چچا داؤد واپس نہ آجائیں کیونکہ وہی آپ کو مجھ پر مشہور کر کے گئے تھے۔“
 اتالیق نے غصے میں کہا۔ ”فیروز بخت! مجھ سے فضول باتیں نہ کر، اب میں تجھ سے کوئی بات نہ کروں گا۔“
 فیروز بخت نے ذرا ادب سے کہا۔ ”گلنار بی بی کی باتیں ایک طرف لیکن میں اب بھی اپنے دل میں آپ کی عزت محسوس کرتا ہوں۔“

اتالیق نے پوچھا۔ ”گلنار تجھ کو کیا سبق دیتی ہے؟“
 فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”وہ کہتی ہیں کہ میرا گلنار اور چچا داؤد سے زیادہ کوئی بھی ہمدرد نہیں۔ یہ کہ میں کسی پر بھی بھروسہ نہ کروں کیونکہ فیصلے مجھے کرنے ہوں گے،

نہیں تھا۔ اتالیق اور ستار کی قدر و قیمت خاک میں ملا دی گئی تھی۔ اب یہ دونوں فیروز بخت کی نظر غرض کے بندے تھے۔ اس تبدیلی کو اتالیق اور ستار یکساں محسوس کر رہے تھے لیکن بولتے ہوئے گھبراتے تھے۔ اتالیق پریشان تھا کہ کہیں ساری محنت پر پانی نہ بھر جائے۔ وہ اب بھی فیروز بخت کے سامنے کام کی باتیں کرتا رہتا تھا لیکن اب ان باتوں میں پہلے جیسا زور نہیں تھا۔ اس تبدیلی کو فیروز بخت بھی اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔ ستار بھی کڑھ رہا تھا لیکن اس کا علاج سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ حمد نے بھی کئی بار پیشی پیشی باتیں کیں مگر ان باتوں کا فیروز بخت پر کوئی اثر نہ ہوا۔

ایک دن صبح صبح اتالیق حویلی میں داخل ہوا تو اس نے فیروز بخت کو کھین جانے کے لیے تیار دیکھا۔ فیروز بخت نے اتالیق کو دیکھتے ہی بے پردائی سے کہا۔ ”استاد محترم! آج میں آپ کو وقت نہیں دے سکوں گا کیونکہ میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔“
 اتالیق کو غصہ آ گیا۔ ”فیروز بخت! یہ تو بول رہا ہے؟“
 ”ہاں استاد محترم! یہ میں بول رہا ہوں۔ کوئی خاص بات؟“
 ”نہیں، یہ تو نہیں بول رہا۔ آواز تیری ہے مگر بول کوئی اور رہا ہے۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”استاد محترم! یہ آج آپ کسی باتیں کر رہے ہیں۔ ان سچیدہ باتوں کا میں مطلب نہیں سمجھا؟“
 اتالیق نے جواب دیا۔ ”میں نے جس فیروز بخت کو تعلیم و تربیت دی ہے، وہ مجھ سے یوں بے تکلفی سے بات نہیں کر سکتا۔“

فیروز بخت نے ہنس کر کہا۔ ”اچھا تو یہ بات ہے لیکن استاد محترم! میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے آپ کو اذیت پہنچے۔“

اتالیق نے فیروز بخت کو دونوں شانوں سے پکڑ لیا اور اسے ہلاتے ہوئے بولا۔ ”فیروز بخت! میں نے تجھ سے کیا کہا تھا؟ کیا میں نے تجھ سے یہ بات نہیں کہی تھی کہ دوسروں پر اعتبار کرنا اچھی بات ہے مگر کسی پر اعتبار نہ کرنا اس سے بھی اچھی بات ہے۔“

”ہاں، مجھے آپ کا یہ قول اچھی طرح یاد ہے استاد محترم۔“
 ”پھر تو نے اس پر عمل کیا؟“
 ”ہاں، میں اس پر عمل بھی کر رہا ہوں۔ کیا کوئی خاص بات ہے جسے آپ کو بتانا چاہیے تھا؟“

اتالیق نے ذرا غصے میں جواب دیا۔ ”تیرا داغ جلد ٹھکانے آجائے گا۔ اگر تو نے میرے اس قول کو حرز جاں نہ بنایا تو خدا ہی جانے تیرا کیا حشر ہوگا۔“

نو عمری میں ہی وہ وہ تماشے دیکھے ہیں کہ انسانوں سے نفرت ہونے لگی ہے۔ میں سکون چاہتا ہوں اور ایک ایسی زندگی کا طالب ہوں جس میں کمزور فریب، ریاکاری، عیاری اور انسانوں کی دل آزاری کے پہلو نہ ہوں۔ مجھے انسانوں کے شر سے پناہ دیجیے۔“

جب وہ یہ دعا مانگ رہا تھا تو اس کے پاس ہی دوسرے لوگ بھی فاتحہ پڑھنے میں مشغول تھے۔ چاروں طرف بارہ دور تھے اور اس کے ستون سنگ خارہ کے تھے۔ داخلے کا دروازہ ایک ہی تھا جو جنوب میں واقع تھا۔ فیروز بخت نے دروازے کے پاس چند آدمی کھڑے دیکھے جو اسی کی طرف دیکھ رہے تھے اور ان کے چہرے رومالوں میں چھپے ہوئے تھے۔ فیروز بخت فاتحہ پڑھ کر اور دعا مانگنے کے بعد جب درگاہ سے باہر نکلنے لگا تو رومالوں سے چہروں کو چھپائے ہوئے لوگوں نے اسے روک لیا۔ ایک نے پوچھا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”فیروز بخت..... کیوں کیا بات ہے؟“ ان میں جو سب سے زیادہ طاقت ور نظر آتا تھا، اس نے فیروز بخت کا بازو پکڑ لیا اور بولا۔ ”اگر فیروز بخت تیرا ہی نام ہے تو ادھر آ میرے ساتھ تاکہ میں تجھے بتاؤں کہ ہم کون ہیں۔“ یہ پانچ آدمی تھے۔ انہوں نے فیروز کو درمیان میں لے لیا اور درگاہ سے باہر نکل آئے۔ درگاہ کے باہر والان کے چہرے پر بہت سارے لوگ بیٹھے اور لینے ہوئے تھے۔ پیٹھے ہوئے لوگوں میں حمد بھی نظر آیا۔ فیروز بخت نے حمد کو آواز دی۔ ”حمد! ذرا میرے پاس تو آ۔“ پھر اپنے آس پاس موجود آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”معلوم نہیں، یہ کون لوگ ہیں اور معلوم نہیں کہاں اور کیوں مجھے لے جا رہے ہیں۔“

حمد اپنی جگہ سے اٹھا تو اس کے ساتھ دو دوسرے آدمی بھی اٹھے لیکن حمد کے قریب آنے سے پہلے ہی طاقتور اجنبی نے، فیروز بخت کو ڈانٹ دیا۔ ”یہ آدمی ہمارا کیا کر لے گا؟ تو اسے کیوں زحمت دے رہا ہے؟“

حمد اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ فیروز بخت کے قریب پہنچا اور انہی سے سختی سے پوچھا۔ ”تم لوگ کون ہو اور میرے چھوٹے مالک کو کیوں اور کہاں لے جا رہے ہو؟“

طاقتور اجنبی نے جواب دیا۔ ”فیروز بخت میرے مرحوم بھائی کی نشانی ہے۔ میں ایک مدت سے اس کی تلاش میں تھا۔ شہدی نے بتایا کہ اس نے میرے پیچھے کوتا جرداؤد کرمانی کے حوالے کر دیا ہے۔ میں اس کی تلاش میں داؤد کی

کاروبار میں سنبھالوں گا، دولت اور جائیداد میرے تصرف میں ہوگی۔“

اتالیق نے آہستہ سے کہا۔ ”ان اللہ وانا الیہ راجعون، میں گنہگار کی عصمت کا کیا کروں؟ بس یہی کہوں گا کہ تو نے اس طرح لوگوں پر اظہار کرنا شروع کر دیا تو توتاہ و برباد ہو جائے گا۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”اور مجھ سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ میں اپنا ہر کام خود انجام دوں۔ اس کے علاوہ میں دہلی اور دنیا کو کسی کے ساتھ نہیں، خود تنہا چل پھر کر دیکھوں گا اور اس وقت بھی روشن چراغ دہلی کے مزار پر تنہا جا رہا ہوں۔“

”فیروز بخت! میں تجھے قسم دیتا ہوں کہ تو اب بھی ہوش میں آ جا کیونکہ میرے علاوہ یہاں کوئی بھی ایسا نہیں جو تجھے بے لوث مشورہ دے۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”استاد محترم! اس وقت تو میں چراغ دہلی کے مزار پر جا رہا ہوں، واپسی پر بات کروں گا۔“ اتالیق نے ہمدردی سے کہا۔ ”خدا تجھے راہ راست دکھائے۔“

ان دونوں کی باتیں سنا رہی سن رہا تھا لیکن وہ ان کے سامنے نہیں تھا، اچانک سامنے آ کر بولا۔ ”استاد محترم! آپ چھوٹے مالک کی باتوں کا برا نہ مانیے گا۔ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اپنی دانست میں درست کہہ رہے ہیں کیونکہ ان کی اپنی ذات ادھوری اور ناقص ہے۔ گناہی بی بی بھی تو کوئی چیز ہیں۔“

فیروز بخت نے دونوں سے کہا۔ ”آپ دونوں باتیں کریں۔ میں دوپہر کے بعد آپ دونوں سے باتیں کروں گا۔ اس وقت تک اجازت دیجیے۔“

فیروز بخت چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی اتالیق اور ستار سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ فیروز بخت، چراغ دہلی کے مزار پر جا چکا تھا۔

☆☆☆

فیروز بخت نے گھوڑے کو ایک درخت سے باندھ دیا اور خود چراغ دہلی کے روضے میں چلا گیا۔ وہاں اس نے فاتحہ پڑھی اور بڑی دیر تک دعائیں مانگتا رہا۔ اس کا دل بھر آیا اور کپکپاتی آواز میں بولا۔ ”حضرت چراغ دہلی! لوگ کہتے ہیں کہ آپ انسانوں کی دعاؤں کو پاب اجابت تک پہنچانے کا وسیلہ بنا جاتے ہیں۔ اس خوش خبری نے مجھے آپ کے در تک پہنچایا ہے۔ میں ایک عاجز، بے نوا لڑکا آپ کے توسط سے استغاثت چاہتا ہوں۔ میں مردم شناسی، خود شناسی اور خدا شناسی کا طالب ہوں۔ میں نے اپنی اس

حویلی پہنچا تو معلوم ہوا کہ فیروز بخت روشن چراغِ دل کی درگاہ گیا ہوا ہے۔ چنانچہ ہم لوگ اسے تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آگئے اور خدا کا شکر ہے کہ آخر اسے پالیا۔
حمود نے پوچھا۔ ”تو اب تم لوگ میرے چھوٹے مالک کو کہاں لے جاؤ گے؟“

ہو رہے تھے۔ وہ درگاہ کے باہر والان کے چبوترے پر سر جھکا کر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگا پھر آپ ہی آپ مسکرایا اور آہستہ سے کہا۔ ”خس کم جہاں پاک۔“
اپنے دونوں ساتھیوں کو حکم دیا۔ ”اب تم دونوں بھی جا سکتے ہو۔ کل کسی وقت حویلی آ جانا اور اپنا معاوضہ لے جانا۔“
درگاہ کے چند آدمی حمود کے پاس آئے اور پوچھا۔

اجنبی نے جواب دیا۔ ”جنہم میں۔ تو یہ سوال کرنے والا کون ہے اور میں اس سوال کا جواب کیوں دوں تجھے؟“
فیروز بخت نے کہا۔ ”میں تیرا بھتیجا نہیں ہوں اور میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گا۔“

”بھائی! یہ معاملہ کیا تھا؟“
پہلے تو حمود گھبرایا لیکن پھر حواس کو مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ ”صاحبان! اس لڑکے کو ہمارے مالک نے پالا تھا لیکن اب وہ جبکہ دس گیارہ سال کا ہو چکا ہے تو اس کا چچا اسے چھین کر لے گیا۔“

اجنبی نے سختی سے کہا۔ ”تو میرے ساتھ کیوں نہیں جائے گا؟ میں تجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“
فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”تو مجھے زبردستی کیسے لے جائے گا اپنے ساتھ؟ میں تجھے نہیں جانتا اور پھر اگر میں واقعی تیرا بھتیجا ہوں تو اب تک تو کہاں تھا؟“
حمود نے سختی سے کہا۔ ”میرے چھوٹے مالک کو چھوڑ دے ورنہ میں زبردستی چھڑا لوں گا۔“

”کی نے پوچھا۔ ”کہاں لے گیا؟“
اس نے جواب دیا۔ ”کیا پتا کہاں لے گیا؟“
لیکن اجنبی لوگوں میں سے ایک آواز آئی۔ ”لیکن ہمیں معلوم ہے کہ فیروز بخت کہاں گیا اور اس کو کون لے گیا؟“
حمود نے گھبرا کر آواز کی طرف دیکھا تو اتالیق اور ستار کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ حمود کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

اجنبی مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔ ”تو زبردستی چھڑالے گا اس کو، میرے نتیجے کو؟ سبحان اللہ! تو ابھی ہم سے واقف نہیں ہے اس لیے ایسی بات کہہ رہا ہے۔“ پھر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ ”جھگڑنے کی کوئی ضرورت نہیں، فیروز بخت کو لے کر نکل چلو لیکن اگر کوئی مزاحم ہو تو اس کا سر چل دو۔“

”ہم نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتا اور میں نے تو چھوٹے مالک کو ان موذیوں سے چھڑانے کی بھی کوشش کی تھی۔“
اتالیق نے پوچھا۔ ”کیا تو یہاں فیروز بخت کے ساتھ آیا تھا؟“

یہ کہہ کر اجنبی نے فیروز بخت کو دھکا دے کر اپنے ایک ساتھی کے حوالے کر دیا۔ فیروز بخت لڑکھڑاتا ہوا اس سے جا لگرایا۔ اس نے فوراً ہی فیروز بخت کو دبوچ لیا اور پھر یہ پانچوں آدمی فیروز بخت کو زبردستی کھینچتے گھسیٹتے والان سے باہر لے چلے۔

”نہیں، مجھے تو یہاں گلنار بی بی نے بھیجا تھا کیونکہ فیروز بخت اکیلا آ رہا تھا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ تو فیروز بخت سے دور دور رہ کر اس کی نگرانی کر، چنانچہ میں گلنار بی بی کے حکم کی تعمیل میں یہاں تک آ گیا تھا۔“

حمود اپنے دونوں ساتھیوں کو لے کر مزاحم ہوا لیکن اجنبی نے گوار یا تخر کی مدد لیے بغیر ہی ان تینوں پر جھپٹ کر کون اور گھونسوں سے بد P اس کر دیا۔ حمود اور اس کے دونوں ساتھی پریشان اور خوار ہو کر منتشر ہو گئے اور چوٹا چلاتا شروع کر دیا۔ ”لوگو! بچاؤ! یہ بد معاش ہمارے چھوٹے مالک کو پکڑے لیے جا رہے ہیں۔ خدا کے لیے ہماری مدد کرو۔“

اتالیق نے طنز کیا۔ ”سبحان اللہ! جب تک فیروز بخت اغوا نہیں ہوا تھا، وہ چھوٹے مالک کہلاتا تھا لیکن اس کے جاتے ہی اب وہ محض فیروز بخت رہ گیا ہے۔ اس سادگی پر قربان جاسیے کہ جرم کو چھپانے کی جتنی کوشش کی جا رہی ہے، وہ اتنا ہی ظاہر ہو رہا ہے۔“

لوگ ادھر ادھر سے دوڑنے لگے لیکن پانچوں اجنبی اتنے چست اور چالاک تھے کہ فیروز بخت کو گھوڑے پر بٹھا کر ایک طرف فرار ہو گئے۔ حمود اور اس کے دونوں ساتھی شور ہی کرتے رہ گئے۔ حمود نے کچھ دور تک ان کا پچھا بھی کیا لیکن پھر واپس آ گیا۔ اب اس کے ہوش و حواس درست

ستار نے حمود کو ملامت کی۔ ”حمود! تو نے بڑا غلط کام کیا ہے، تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“
حمود رو ہانسا ہو گیا۔ ”آپ دونوں میری بات پر یقین کیوں نہیں کرتے؟ میں خود پریشان ہوں کہ آخر گلنار بی بی کو جواب کیا دوں گا۔“

اور چلے گئے۔

☆☆☆

حمود جیسے ہی حویلی میں داخل ہوا، اس نے گلزار کو مضمطرہ نہ ادھر ادھر ٹھیلے دیکھا۔ حمود نے سامنے جاتے ہی پوچھا۔ ”مزاج معطلی؟“
گلزار نے ہنسی بھنی آواز میں پوچھا۔ ”کبخت! فیروز بخت کہاں ہے؟“

حمود نے ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی میں کہا۔ ”وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا۔“

گلزار نے فرط خوشی میں پوچھا۔ ”سچ؟“

حمود نے جواب دیا۔ ”میں بالکل سچ عرض کر رہا ہوں۔“

گلزار نے بے اختیار کہا۔ ”حمود! تو نے وہ کام کیا ہے کہ اس کی جتنی داوڑی جائے کم ہے۔ میں کس زبان سے تیرا شکر یہ ادا کروں۔ تو نے اس حویلی اور میرے خاندان پر احسان عظیم کیا ہے۔۔۔۔۔ احسان عظیم۔ اس احسان کا اجر آسان نہیں ہے۔ آج میں بہت خوش ہوں، بے انتہا خوش۔“

حمود نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ خود پر قابو پائیے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر حویلی کے کسی خدمت گار نے آپ کی یہ باتیں سن لیں تو غضب ہو جائے گا۔ اندر چلیے وہیں باتیں ہوں گی۔“

گلزار نے سرشاری میں کہا۔ ”حمود! اس وقت میں بے حد خوش ہوں اور کسی سے بھی خوفزدہ ہونے کو تیار نہیں۔ اگر تو بقیہ باتیں اندر چل کر کرنا چاہتا ہے تو چل، اندر چل کر ہی کر لیں گے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت میں اتنی خوش اور نڈر ہوں کہ کسی سے بھی خوفزدہ ہونے کو تیار نہیں۔“

حمود نے جواب دیا۔ ”خوفزدہ ہونے کو تو میں خود بھی تیار نہیں ہوں لیکن ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا ہے جس سے میں بہت زیادہ خوف زدہ ہوں۔“

گلزار اسے اپنے کمرے میں لے گئی اور پوچھا۔ ”ہاں تو اب بتا تو کس بات سے خوف زدہ ہے؟“

حمود نے جواب دیا۔ ”جب میں نے فیروز بخت کو پانچ بد معاشوں کے حوالے کیا تو وہیں ایک طرف سے اتالیق اور ستار بھی نمودار ہو گئے۔“

گلزار نے گھبرا کر پوچھا۔ ”وہ دونوں کہاں سے آ گئے؟ انہیں کس نے خبر دی تھی؟“

حمود نے جواب دیا۔ ”مجھے کچھ نہیں معلوم، میں کیا بتاؤں۔“

گلزار نے التجا آمیز پیرائے میں کہا۔ ”حمود! کیا تجھے

اتالیق نے کہا۔ ”پریشان تو ہم دونوں ہیں اور یہ سوچ رہے ہیں کہ آج کل میں جب داؤد آئے گا تو ہم دونوں اسے کیا جواب دیں گے۔ ہمارے پاس تو کوئی مستقل عذر بھی نہیں اور پھر اس عذر کو داؤد مانتے ہی کیوں لگا۔ رہ گئیں گلزار بی بی تو ہم دونوں جانتے ہیں کہ وہ تجھ سے فیروز بخت کے بارے میں کوئی جواب طلب کریں گی ہی نہیں کیونکہ یہ جو کچھ ہو ہے، اس میں وہ شروع سے آخر تک شریک رہی ہیں۔“

حمود نے ذرا اگڑ کر پوچھا۔ ”یہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں کیا آپ گلزار بی بی کے سامنے بھی کہہ سکتے ہیں؟“

اتالیق نے سختی سے جواب دیا۔ ”گلزار بی بی تو کیا جس کے سامنے بھی کہہ، کہہ سکتا ہوں کیونکہ میں اس حویلی کا ملازم نہیں رہا جس میں تیری گلزار بی بی رہتی ہیں۔“

ستار نے کہا۔ ”اور آج سے میں نے بھی اس حویلی کو خدا حافظ کہہ دیا ہے۔“

حمود گھبرایا کہ اب کیا ہوگا؟ کیونکہ یہ دونوں ہی کسی حد تک اس سازش سے آگاہ معلوم ہوتے تھے جو گلزار نے فیروز بخت کے سلسلے میں تیار کی تھی۔ اس نے نرمی سے کہا۔ ”استاد محترم! اگر آپ یہ دیکھتے ہیں کہ فیروز بخت کے ساتھ میں نے کچھ کیا ہے تو آپ مجھے سزا دلوا سکتے ہیں۔ میں بالکل بے قصور ہوں۔“

”کون خطا کار و کون بے خطا ہے، اس کا فیصلہ تو داؤد کی موجودگی میں ہو گا لیکن تو نے یہ جو کچھ کیا ہے، اچھا نہیں کیا۔“ اس کے بعد ستار سے کہا۔ ”ستار! تو بھی خطا کار ہے۔ تجھے فیروز بخت کو تباہ نہیں آنے دینا چاہیے تھا۔“

ستار نے کہا۔ ”اگر میں فیروز بخت کے ساتھ ہوتا بھی تو اس سے کیا فرق پڑ جاتا۔ وہ پانچ تھے اور ہم دو۔ ہم ان پانچ کا کس طرح مقابلہ کر سکتے تھے۔“

اتالیق نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”یہ جو کچھ ہوا، بہت برا ہوا۔ میں تو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔“

حمود نے ان دونوں کی خوشامد کی۔ ”آپ دونوں حویلی تک چلیں گے؟“

اتالیق نے طنزاً کہا۔ ”اب ہم دونوں وہاں کس کے پاس اور کیا لینے جائیں گے؟“

حمود نے بڑی کوشش کی کہ وہ ان دونوں کو بھی حویلی لے جائے لیکن اتالیق اور ستار اس پر کسی طرح بھی راضی نہ ہوئے۔

حمود حویلی چلا گیا اور اتالیق اور ستار ایک ساتھ کہیں

روپوشی ملحقہ کمرے میں رہے گا۔ میں نہایت ہوشیاری سے تجھے کھانا پانی پہنچاتی رہوں گی۔ پھر جب میں تجھے باہر نکلنے کا حکم دوں گی تو فوراً باہر آجائے گا اور اس دوران اپنی گمشدگی کی ایک داستان بھی تیار کر لے گا۔“

چنانچہ گلنار، حمد کو اپنے ساتھ لے کر اس کمرے میں چلی گئی۔ اس کمرے میں گلنار کا سامان رکھا ہوا تھا۔ لحاف، چادریں، تکیے اور معلوم نہیں کیا کیا کچھ۔ گلنار نے ایک بوسیدہ سے تخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تخت تیرے آرام کے لیے ہے لیکن خبردار جو اس سے زیادہ تجاؤز کیا۔ تیرے کھانسنے یا پھینکنے تک کی آواز نہیں آنا چاہیے کیونکہ چھینک یا کھانسی سے تو پکڑ لیا جائے گا اور سارا کھیل بگڑ جائے گا۔“

حمد اس کمرے میں بند ہونے کے خیال ہی سے گھبرا رہا تھا لیکن پھر کچھ سوچ کر راضی ہو گیا۔ گلنار نے حمد کو اس کمرے میں چھوڑا اور نسلی کے چند کلمات ادا کر کے اپنے کمرے میں واپس چلی آئی۔

اسی دن سے حمد کی تلاش بھی شروع ہو گئی۔ گلنار نے فیروز بخت اور حمد کی گمشدگی کی خبر عام کر دی۔ حویلی کے خدمت گاروں نے ان کی تلاش شروع کر دی۔ جن لوگوں نے حمد کو حویلی میں واپس آتے دیکھ لیا تھا، ان سے یہ کہنا پڑا کہ وہ فیروز بخت کے اغوا کی خبر دینے آیا تھا۔ اس کے بعد اس کی تلاش میں خود بھی نکل گیا۔

شام کو اتالیق اور ستار بھی حویلی میں داخل ہوئے اور گلنار سے ملاقات کی۔ گلنار ان دونوں پر برس پڑی۔ ”جب فیروز بخت کو اغوا کیا گیا تو تم لوگ بھی وہیں موجود تھے پھر تم دونوں نے فیروز بخت کو آزاد کیوں نہیں کروایا؟ تم دونوں نے یہ تمک حرامی کیوں کی؟“

اتالیق کا چہرہ سرخ ہو گیا، بولا۔ ”گلنار بی بی! یہ آپ کس قسم کی زبان استعمال کر رہی ہیں؟ آئندہ احتیاط کریں ورنہ میں آپ کا لحاظ نہیں کروں گا۔“

گلنار نے بدستور تلخ لہجے میں کہا۔ ”میں ادب لحاظ کی قائل بھی نہیں۔ فیروز بخت کے اغوا میں تم دونوں کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے ورنہ اس غریب کی کسی سے کوئی دھمکی نہیں۔“

اتالیق نے کہا۔ ”ہم دونوں کا ہاتھ؟ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ آپ اپنے ہوش و حواس میں تو ہیں؟“

گلنار نے غصے میں جواب دیا۔ ”میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم دونوں اپنے ہوش میں ہرگز نہیں۔ اب میں تم دونوں کا ادب لحاظ بالکل

یقین ہے کہ فیروز بخت کا کام تمام کر دیا گیا ہوگا؟“

”مجھے پورا یقین ہے۔“

”اور کیا تجھے یہ یقین ہے کہ اتالیق اور ستار کسی منصوبے کے بغیر چائیک اپاں پہنچ گئے تھے؟“

”نہیں، مجھے یہ یقین نہیں ہے۔“

گلنار نے حمد کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”اگر تجھے یہ یقین نہیں ہے تو یہ بی بی بتا کہ یہ دونوں مجھے کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟“

حمد نے جواب دیا۔ ”میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ نے یہ کام میرے سپرد کیا تھا، میں نے اسے کر دیا۔ بس، اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔“

گلنار نے زور دے کر سوال کیا۔ ”میں جو پوچھ رہی ہوں، اس کا جواب دے کیونکہ اگر کوئی گزیر ہوئی تو اس میں ہم دونوں ہی پکڑے جائیں گے۔ اس لیے اس مسئلے پر ہمیں اسی وقت غور و فکر کر لینا چاہیے۔“

حمد نے بے رخی سے کہا۔ ”گلنار بی بی! میں نے کہہ خود دیا کہ یہ جو کچھ ہوا ہے، آپ کے حکم اور آپ کی خواہش پر ہوا ہے، اس لیے مجھے بچانا آپ کا فرض ہے اور اگر آپ مجھے بچانے میں ناکام رہیں تو پھر اپنے دفاع میں، میں خود کوئی قدم اٹھاؤں گا اور میرے اس قدم سے آپ کو فائدہ ہوگا یا نقصان، میں کچھ نہیں جانتا۔“

گلنار نے کہا۔ ”اچھا، تب پھر تو ایک کام کر۔ تو کچھ دنوں کے لیے حویلی سے غائب ہو جا پھر پتے عشرے میں اس طرح واپس آ جانا گویا۔ تمہیں بھی اغوا کر لیا گیا تھا۔ اس دوران تو اپنے اغوا کی ایک فرضی داستان بھی گھڑ سکے گا۔“

حمد نے جواب دیا۔ ”لیکن میں جاؤں کہاں؟ میرا تو کوئی ٹھکانا بھی نہیں۔“

گلنار فکر میں ڈوب گئی، بڑی دیر تک سوچتی رہی۔ حمد اس کی پریشانی سے خوش ہوتا رہا۔ اس نے فکر تو دو کی زخم خوردہ گلنار کے ایک اور چرکا لگایا، بولا۔ ”میں جہاں بھی چھپوں گا پکڑا جاؤں گا کیونکہ میں ایک عام آدمی ہوں اور کسی عام آدمی کے پاس ہی چھپ سکوں گا۔“

گلنار اٹھ کر ملحقہ کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ ”میں ابھی آتی ہوں۔ جب تک میں واپس نہ آ جاؤں تو یہیں رہے گا، کہیں جائے گا نہیں۔“

وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور حمد گلنار کی پریشانی پر دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئی اور حمد سے سرگوشی میں کہا۔ ”حمد! تو دوران

نہیں کروں گی اور تمہیں حکم دیتی ہوں کہ فیروز بخت کو جہاں کہیں چھپایا ہے، اسے واپس لے آؤ۔ اور اب تو حمد کی بابت بھی نہیں بتانا پڑے گا کہ اسے کہاں چھپایا ہے کیونکہ وہ بھی غائب ہے۔“

ستار نے غصے میں تھملاتے نل کھاتے ہوئے کہا۔ ”گنار بی بی! آپ ہم دونوں پر شک ہی کر رہی ہیں تو ہمارا اس حویلی میں رہنا فضول ہے۔“

اتالیق نے کہا۔ ”اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہمیں ان دونوں کے انخواہ سے فائدہ بھی کیا پہنچے گا؟“

گنار نے جواب دیا۔ ”فائدے یا نقصان کی بات تو مجھے معلوم نہیں۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ تم دونوں بھائی داؤد کی نظر میں مجھے خوار کرنے کے لیے ایسا کر رہے ہو۔ تم دونوں کے دل میں ایسی کوئی بات ہے تو وہ فضول ہے۔ آخر کار تم دونوں ہی کو ذلیل و خوار ہونا پڑے گا اس لیے تم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ فیروز بخت اور حمد کو واپس لے آؤ۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تم دونوں کو رسوا نہیں کروں گی اور تم پر کسی قسم کا الزام نہیں آنے دوں گی لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تم دونوں بھی میرا ساتھ دو۔“

اتالیق نے برا سامنہ بنایا۔ ”اگر آپ مجھے ذلیل و خوار کرنا چاہتی ہیں تو ایسا کرنا آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ میں نے جب آپ بار کہہ دیا کہ فیروز بخت کے انخواہ میں میرا کوئی ہاتھ نہیں اور حمد کہاں چلا گیا، میں کچھ بھی نہیں جانتا تو ان دونوں کے دریافت حال میں آپ کی طرف سے اتنا اصرار کیوں؟“

گنار نے کہا۔ ”صرف اس لیے کہ تم دونوں فیروز بخت کی حمایت اور ہمدردی میں پیش پیش تھے۔“

اتالیق نے جواب دیا۔ ”ہاں، ہم دونوں واقعی پیش پیش تھے لیکن بعد میں آپ کی مہربانیاں دیکھ کر میں خاموش ہو گیا تھا۔ شاید یہ ستار بھی خاموش ہو گیا تھا.....“

گنار نے بات کا ٹنڈی۔ ”پھر یہ دونوں ملے کہاں گئے؟“

اتالیق نے جواب دیا۔ ”میں نے فیروز بخت کو انخواہ ہوتے دیکھا ہے لیکن وہ انخواہ کر کے کہاں لے جایا گیا ہے، میں نہیں جانتا۔“ پھر آہستہ سے کہا۔ ”اور گنار بی بی! اس وقت میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ اگر فیروز بخت نہ ملا تو میں اس حویلی میں قدم نہیں رکھوں گا۔ میں تو فیروز بخت کا اتالیق تھا۔ جب حویلی میں وہی نہیں رہا تو پھر میں یہاں آء جا کر کیا کروں گا۔ میری یہاں کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی۔“

گنار نے کہا۔ ”ایسی بات نہیں ہے، آپ دونوں کو

اس قسم کی باتیں نہیں سوچنا چاہئیں۔ میں تو اس لیے پریشان ہوں کہ بھائی داؤد کو کیا جواب دوں گی؟ اور میں تم دونوں کو اس لیے روک رہی ہوں کہ تمہیں بھائی داؤد کے روبرو میری بے گناہی کی گواہی دینا ہوگی۔ میں تو دن رات یہ دعا کرتی ہوں کہ کسی طرح حمد واپس آجائے کیونکہ وہ بھی میرا اہم گواہ ہے۔“

ستار کو مجبوراً رکنا پڑا لیکن اسے یہ ڈر تھا کہ کہیں اس سے کوئی ایسا سلوک نہ کرے جس سے ستار کو کوئی ناقابل تلافی نقصان پہنچ جائے۔ اتالیق اپنے مسئلے کو ستار سے الگ رکھنا چاہتا تھا کیونکہ گنار بار بار یہ کہتی تھی کہ ستار اپنا مسئلہ اتالیق سے گڈلے کیوں کرتا ہے جبکہ ستار حویلی کا پیشگی خدمت گار ہے اور اتالیق کو عارضی طور پر رکھا گیا تھا۔

اتالیق نے جاتے جاتے کہا۔ ”میں وقتاً فوقتاً آتا جاتا رہوں گا اور اس دوران گنار بی بی کو فیروز بخت کی تلاش جاری رکھنا چاہیے۔“

اتالیق کے جاتے ہی گنار نے ستار کی بڑی خبر لی۔ گنار نے زیادہ تند و تیز لہجے میں کہا۔ ”تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں نے شروع شروع میں تو فیروز بخت کی کچھ مخالفت کی تھی لیکن بعد میں، میں اس سے ہمدردی کرنے لگی تھی۔ اگر میں فیروز بخت کے خلاف کچھ کرتی تو ان ابتدائی دنوں میں ہی کر گزرتی۔“

ستار، گنار کے فضول سوال و جواب اور صفائی سے عاجز آ گیا، بولا۔ ”آپ نے فیروز بخت کے خلاف کبھی کچھ سوچا بھی ہوگا لیکن میں نے تو بھی ایسا خیال تک نہ کیا کیونکہ میں اپنے مالک کا تابعدار ہوں۔“

گنار نے سختی سے کہا۔ ”میں تمہ سے زیادہ باتیں کر کے خود کو ذلیل نہیں کروں گی۔ اب اپنی کٹھری میں جا اور اس وقت تک اپنی صورت نہ دکھا جب تک میں خود نہ بلاؤں۔“

ستار چلا گیا لیکن اس کے چہرے پر غم و غصے کی جھلک نمایاں تھی۔

☆☆☆

حمد کو نہایت احتیاط سے ضروریات زندگی پہنچادی جاتیں۔ جب اس طرح چار دن گزر گئے تو حمد نے گنار سے پوچھا۔ ”گنار بی بی! مجھے کب تک یہاں بند رہنا پڑے گا؟“

گنار نے کہا۔ ”بس چند دن اور تجھے یہاں کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟“

حمد نے جواب دیا۔ ”پریشانی تو کوئی نہیں، سوائے قید

نہائی کی اذیت کے۔ تنہائی و سکوت سے میں تنگ آ گیا ہوں۔“

گلنار نے ہنس کر کہا۔ ”میرے پاس اس کا علاج بھی ہے۔ اول تو دو دن اور صبر، اس کے بعد میں تجھے حویلی کے باہر پہنچا دوں گی۔ تو ادھر ابھر گھوم پھر کر واپس آ جائے گا اور اپنے اخوا کی کوئی فرضی کہانی بنا کر حویلی میں دوبارہ رہنے لگے گا۔ ان دو دنوں میں جب بہت زیادہ دل کھرائے تو میرے کمرے کے دروازے پر آہستہ آہستہ دستک دے لیا کر۔ میں دروازہ کھول کر تجھے اندر بلا لوں گی اور آہستہ آہستہ باتیں کر کے تیری پریشانی کا علاج کر دیا کروں گی۔“

حمزہ نے خوش ہو کر کہا۔ ”گلنار بی بی! آپ کتنی اچھی ہیں۔“
گلنار نے حمزہ کی باتوں کا کوئی اثر لیے بغیر پوچھا۔
”اچھا، تو ایک بات تو بتا۔ فیروز بخت کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟ کیا وہ جہنم رہید ہو چکا ہوگا؟“

حمزہ نے جواب دیا۔ ”گلنار بی بی! میں نے فیروز بخت کا جو حشر کیا ہے، اس کے نتیجے میں وہ یا تو قتل کیا جا چکا ہوگا یا پھر اپنے آبائی وطن ایران جا چکا ہوگا کیونکہ میں نے اسے ایسے ایرانیوں کے حوالے کر دیا ہے جو ایک عرصے سے اسے تلاش کرتے پھرتے ہیں اور ان کے تیر بتاتے تھے کہ وہ فیروز بخت کو ٹھکانے لگا دینے کی غرض سے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔“

گلنار نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔ ”لیکن میں تجھ سے حقیقی اور قطعی جواب چاہتی ہوں۔ میں فیروز بخت کے کیفر کردار تک پہنچ جانے کا قطعی یقین چاہتی ہوں۔“
حمزہ نے جواب دیا۔ ”آپ اس پر قطعی یقین کر لیں۔“
لیکن گلنار کو حمزہ کے ان جوابات نے تشویش میں ڈال دیا اور وہ ایک بار پھر فکر مند ہو گئی۔

اسی دن، رات کو جب حویلی میں فانوس، قندیلیں اور شمعیں روشن ہو گئیں۔ خدمت گاروں کی کونٹھریاں بدم دیوں کی شمشاہٹ سے دہر دہر ہونے لگیں تو گلنار حویلی کا جائزہ لینے کے لیے اپنے کمرے سے باہر نکلے۔ اس کے حصے کو مردانے اور خدمت گاروں کی کونٹھریوں سے ایک لمبی دیوار علیحدہ کرتی تھی۔ یہ دیوار شرفا غر با حویلی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتی تھی۔ شمالی حصے میں زمان خانہ تھا اور جنوبی حصے میں مردانہ کمرے اور خدمت گاروں کی کونٹھریاں تھیں۔ اسی حصے میں حویلی کا پھاٹک بھی تھا۔ زمانہ اور مردانہ حصوں کے سامنے وسیع وعریض مگن تھے۔ حویلی کو دو حصوں میں تقسیم کر دینے والی دیوار کے بڑے حصے میں جالیوں بنی ہوئی تھیں اور ان جالیوں سے دوسری طرف اچھی طرح دیکھا

جاسکتا تھا۔
نصف رات تک گلنار کمرے میں بدلتی رہی۔ اب وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھی کہ فیروز بخت کا حشر کیا ہوا۔ وہ چپکے سے باہر نکلے اور حدِ قاصل کی دیوار کے پاس کھڑی ہو کر جالیوں کے اس پار خدمت گاروں کی کونٹھریوں کا جائزہ لینے لگی۔ کونٹھریوں کے اندر سے ہلکی ہلکی روشنی بھاٹک رہی تھی۔
بقیہ حصے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ جالیوں کے پاس سے ہٹ کر گلنار نے آسمان کی طرف دیکھا اور پرچاند کا گھٹن پتا نہیں تھا لیکن آسمان کا دامن تاروں سے بھرا تھا۔ گلنار نے طرف سے خوف و دہشت کی سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔ ہوا کی سنناہٹ میں غنڈرات کی آہٹیں تھیں۔ اس نے ایک بار پھر جالیوں کے اس پار مردانہ حصے کا جائزہ لیا۔ اس حصے کی نگرانی اور نگہداشت سردست ستار کے ذمے تھی۔ گلنار اس کمرے کے قریب والی جالیوں کے پاس گئی اور جہاں شمعیں روشن تھیں، اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ستار کے کمرے کا جائزہ لیا لیکن کچھ نظر نہیں آیا۔ یہاں بھی ہر طرف سناٹا اور سکوت طاری تھا۔ جب گلنار کو ہر طرح یہ اطمینان ہو گیا کہ اس پاس کوئی موجود نہیں ہے تو وہ اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ اچھی وہ پیشی بھی نہیں تھی کہ حمزہ والے دروازے سے دستک کی آواز سنائی دی۔ گلنار نے اپنے ہونٹ دروازے سے چپکا دیے، پوچھا۔ ”کیا بات ہے حمزہ؟“

دوسری طرف سے حمزہ نے جواب دیا۔ ”دروازہ کھولے۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔“
گلنار نے ذرا تاثر اختیار کیا، پوچھا۔ ”یہ دل کیوں گھبرا رہا ہے؟ خیریت تو ہے؟“
حمزہ نے جواب دیا۔ ”گلنار بی بی! مجھ پر رحم کیجیے اور دروازہ کھول دیجیے ورنہ میں چیخ چیخ کر رونا شروع کر دوں گا۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ اگر کچھ دیر دروازہ اور نہ کھلا تو میں مر جاؤں گا۔“

گلنار اس دھمکی سے ڈر گئی اور دروازہ کھول دیا۔ حمزہ تیزی سے کمرے میں داخل ہو کر فرش پر ڈھیر ہو گیا اور اس کی پتلیاں چڑھ گئیں اور سینہ لوہار کی دھونگی کی طرح پھولنے دہنے لگا۔ گلنار اس پر جھک گئی اور گھبرا کر پوچھا۔ ”حمزہ! یہ تجھے کیا ہو گیا؟ لمبیعت کو اپنے قابو میں رکھ، ہوش میں آ۔“
اس کے بعد وہ ایک پیالے میں پانی لے آئی اور حمزہ کے منہ پر چند چھینٹے دے کر حلق میں چند قطرے ٹپکا دیے۔
حمزہ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھت کی طرف دیکھا اور ہڈیانی آواز میں پوچھا۔ ”کیا زمین گھوم رہی ہے؟“

ارے یہ چھت میرے اوپر کیوں آئی جا رہی ہے؟“
گنار نے اپنے آنچل سے ہوا دینا شروع کر دی اور اسے تسلی دی۔ ”حمرو! ہوش میں آ۔ نہ زمین گھوم رہی ہے اور نہ ہی چھت اوپر آئی جا رہی ہے۔ میری طرف دیکھ اور دل کو قابو میں رکھ۔“

حمرو نے دیوانہ وار گنار کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اپنے اوپر گر لیا اور زبردستی سینے سے لگا کر سہے ہوئے بچے کی طرح بولا۔ ”گنار! مجھے ڈر لگ رہا ہے، میرا دل قابو میں نہیں ہے۔ خدا کے لیے مجھے اپنے سینے سے لگائے رکھ۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے، میں سر جاؤں گا۔“

گنار سب کچھ بھول کر اپنے آپ کو چھڑوانے لگی۔ ڈانٹتے ہوئے بولی۔ ”حمرو! یہ تو کیا کر رہا ہے؟ یہ جانتا ہے کہ اس کا کیا انجام ہوگا؟ تو تپاں کر دیا جائے گا، چھوڑ دے مجھے۔“ لیکن حمرو کی گرفت معمولی نہیں تھی، اس نے اور زیادہ جکڑ لیا۔ عالم سرخوشی میں بولا۔ ”گنار! اب خطرے اور خوف کی بات نہ کر۔ اب میں صبر نہیں کر سکتا۔ مزید برداشت میرے بس میں نہیں۔“

گنار نے بڑی زور کا دھکا دیا اور طنزاً کہا۔ ”تو یہ تیرا مکر تھا شاید۔“

حمرو نے جواب دیا۔ ”صرف مکر نہ کہہ گنار..... مگر عاشقی کہہ کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔“

گنار نے اس کا ہاتھ دانتوں میں دبایا لیکن ابھی وہ چاب نہیں سکی تھی کہ حمرو نے دھمکی کی۔ ”گنار! اگر تو نے مجھے کاٹا تو یہ بات ابھی طرح ذہن نشین کر لے۔ میں چٹخ چٹخ کر رونا شروع کر دوں گا اور اب تک جو کچھ بھی ہو چکا ہے، اس سے پوری حویلی کو مطلع کر دوں گا۔“

گنار سہم گئی، بولی۔ ”لیکن تو نے تو مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ تو ایسی غلطی نہیں کرے گا۔“

حمرو نے جواب دیا۔ ”اگر میں یہ وعدہ نہ کرتا تو تیرا دوبارہ اعتبار کس طرح حاصل کرتا۔“

اب حمرو زیادہ بے تکلف ہو رہا تھا۔ وہ گنار کو آغوش میں لیے ہوئے اٹھا اور آتی سے کہا۔ ”گنار! اگر تو نے اب بھی جھپٹھ سے کام لیا تو تو ہی نقصان اٹھائے گی۔ میرا کچھ بھی نہ جائے گا اور میں یوں بھی اپنی جان تجھ پر قربان کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔“

گنار بڑی طرح حمرو کی گرفت میں آچکی تھی۔ اس نے ایک بار پھر خود کو چھڑوانے کی کوشش کی لیکن حمرو نے اسے پوری قوت سے دبوچے رکھا اور اس کو اپنی آغوش میں

جکڑے ہوئے گنار کی مسہری تک لے گیا۔ گنار نے عاجزی سے پوچھا۔ ”حمرو! تو یہ کیوں نہیں سوچتا کہ اس سے تجھے حاصل کیا ہوگا؟ میری شادی تو تجھ سے ہو نہیں سکتی۔“

حمرو نے جواب دیا۔ ”نہ ہو شادی، میں خود بھی جانتا ہوں کہ میری شادی نہیں ہو سکتی لیکن گنار! آدی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے میرا بھی یہی حال ہے۔ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں اور اپنے دل میں یہ طے کر چکا ہوں کہ میں اپنی آتش شوق کو آب وصال سے بجھاؤں گا ضرور۔ اس کے بعد میرا جو حشر بھی ہو، پر دانا نہیں کیونکہ یہ سودا ان داموں میں بھی سستا ہے۔“

اب وہ دونوں مسہری پر پاس پاس بھڑے ہوئے لیٹے تھے۔ گنار کو اس سے سخت کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔ حمرو نے ایک ہاتھ سے گنار کی زلفیں چہرے پر سے ہٹائیں۔ ”گنار! تیرے چہرے پر زلفوں کا سایہ یوں لگتا ہے گویا چاند بدلیوں میں چھپ گیا۔“

گنار نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اس وقت اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا اور اسے رہ رہ کر اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے بڑی ندامت سے کہا۔ ”حمرو! میں نے تجھے راز دار بنا کر اور تیرے سپرد ایک نازک کام کر کے سخت غلطی کی ہے..... زندگی کی بدترین غلطی اور تو میری کمزوریوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔“

حمرو نے جواب دیا۔ ”میں نے کہہ جو دیا کہ میں نے تیرے وصال کی خاطر اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا۔ اگر میں اب جان سے بھی ماریا جاؤں گا تو مجھے اپنی جان کے زیاں کا افسوس نہیں ہوگا۔“

گنار نے پوچھا۔ ”اگر میں تجھے یہ یقین دلاؤں کہ میں بھائی داد کے آنے پر اس سے یہ درخواست کر دوں گی کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں اور اس طرح تجھے اپنا شوہر بنانا چاہتی ہوں جس طرح تم نے فیروز بخت کو اپنا بیٹا بنالیا تھا تو مجھے یقین ہے کہ وہ الکار نہیں کریں گے۔“

حمرو نے کہا۔ ”یہ تجویز بھی بڑی اچھی ہے۔ اگر تو اپنے اس منصوبے میں کامیاب ہوگی تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔“

گنار نے کہا۔ ”اگر تو میری اس تجویز سے متفق ہے تو ذرا صبر سے کام لے اور اس کام کو جاترہ ہونے دے۔“

حمرو نے ہنس کر جواب دیا۔ ”اب میں اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں کہ تو اتنی آسانی سے مجھے بے وقوف بنالے۔ میں اس موقع کو تو کسی طرح ضائع کرنے پر تیار نہیں۔ میں نے جو

ازادہ کر لیا ہے اس کی بجلی کیے بغیر میں باز نہیں آؤں گا۔“
گنار نے بڑی بے بسی سے کہا۔ ”لیکن حمدو! یہ بڑی زیادتی ہے۔ یہ مجھ پر ظلم ہے اور تو میری کمزوریوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔“

حمدو نے جواب دیا۔ ”یہاں کمزوریوں سے کون فائدہ نہیں اٹھاتا۔ کیا تو نے میری کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی؟“

گنار رو ہانسی ہو گئی، بولی۔ ”حمدو! اگر تو باز نہ آیا تو میں رو دوں گی۔“

حمدو نے ہنسی بھنی ہنسی آواز میں ذرا سختی سے کہا۔ ”میں نے کبھی خود یا کہ میں باز نہیں آؤں گا کیونکہ میں نے اپنے مقصد کی حصول یابی کی خاطر بڑا صبر کیا ہے، بڑی ذہنی سہمی ہیں۔“

اس کے بعد حمدو نے اس کی پیش نہ چلنے دی۔ کچھ دیر تو گنار نے مزاحمت کی لیکن پھر وہ بھی بے بس ہو گئی۔

☆☆☆

حمدو اب بھی گنار کی قید میں تھا۔ اس رات اس نے جو کچھ کیا وہ ایسا نہیں تھا جسے گنار یہ آسانی بھلا دیتی۔ حمدو دوبارہ اس کمرے میں اس لیے داخل ہوا تھا کہ اسے اب یہ یقین ہو گیا تھا کہ گنار اس کے قابو میں آ چکی ہے اور وہ اسے یہ آسانی اپنی خواہش کے مطابق کام میں لایا کرے گا لیکن گنار نے اسے کمرے میں بند کرتے ہی واضح کر دیا۔ ”تو نے جو کچھ کیا، اچھا نہیں کیا۔ تجھے اس کی سزا ضرور ملے گی۔“

حمدو کے سینے چھوٹا گئے، بولا۔ ”گنار! اگر تو نے کچھ کہا سنا تو اس کا انجام پہلے ہی سوچ لیتا۔“
گنار نے جواب دیا۔ ”میں انجام کو اچھی طرح سوچ چکی ہوں اس لیے میں کسی سے بھی نہیں ڈرتی۔ تو نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے، میں اس کی سزا ضرور دوں گی۔ اگر تو نے اب نکل بھاگنے کی کوشش کی تو میں اس کی بھی خبر گیری کروں گی اور تجھے بھاگنے نہیں دوں گی۔“

حمدو اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا۔
رات کے پچھلے پہر حمدو نے پھر دستک دی اور رورو کر یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس کا دل بیٹھا جا رہا ہے، دروازہ کھول دے لیکن گنار اس کے فریب میں نہیں آئی۔

حمدو نے اسے ایک بار پھر دھمکی دی کہ اب میں چھ چھ کر رونا شروع کر دوں گا جس سے دوسرے خدمت گاروں کو بھی میری موجودگی کی خبر ہو جائے گی۔

اس دھمکی کا گنار پر واپاں اثر ہوا لیکن پھر جلد ہی اپنی

حالت پر قابو پالیا، بولی۔ ”حمدو! میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اب میں ہر ذلت برداشت کر لوں گی لیکن دوبارہ قہر بذلت میں نہیں کروں گی۔ تو جتنا بھی شور کرنا چاہے کہ میں دروازہ نہیں کھولوں گی اور جب تیرا شور سن کر خدمت گار مجھ سے کچھ پوچھیں گے تو میں ان سے کہہ دوں گی کہ تو حویلی والوں کی نظروں سے بچتا بچاتا اندر آ گیا تھا اور میں نے اس کمرے میں تجھے اس لیے بند کر دیا ہے جب تک بھائی داؤد واپس نہیں آتے۔ وہی تیرا فیصلہ کریں گے۔“

حمدو نے معاملے کی سنگینی کا اندازہ لگایا تو لرز گیا۔ اس نے ایک بار پھر خوشامد کی۔ ”گنار! مجھے معاف کر دو۔ تم مجھے دن کے اجالے میں نکال دو۔ میں خاموشی سے کھین چلا جاؤں گا اور آئندہ تجھے پریشان نہیں کروں گا۔“

گنار نے جواب دیا۔ ”حمدو! تیرا اعتبار اٹھ گیا میرے دل سے۔ اب تو میں تیری کسی بات کا بھی اعتبار نہیں کروں گی۔“

حمدو سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ ”گنار! مجھ پر رحم کر۔“

گنار نے بے رحمی سے کہا۔ ”میں رحم نہیں کروں گی کیونکہ تم تو ان پر کیا جاتا ہے جو دوسروں پر بھی رحم کرتے ہیں۔“

حمدو نے زور زور سے دروازہ پینٹنا شروع کر دیا اور چیخا۔ ”میں دروازہ توڑ دوں گا۔ اگر دروازہ نہ کھلا تو میں قیامت کھڑی کر دوں گا۔ میں ہنگامہ کر دوں گا۔“

رات کے ستانے میں حمدو کا شور و غل پوری حویلی میں گونج گیا۔ ستار اور دوسرے خدمت گار بیدار ہو گئے۔ گنار نے بوکھلائے ہوئے انداز میں دروازہ کھول دیا اور تاکید کی۔ ”خبردار جو تو نے مزید شور و غل کیا۔ میں ابھی تجھ سے بات کرتی ہوں۔ میرا خیال ہے حویلی کے سبھی لوگ بیدار ہو چکے ہیں۔“

حمدو نے گنار کو پکڑ لیا۔ اس وقت وہ یاگل ہو رہا تھا۔ گنار کو گدی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور کہا۔ ”چالاک عورت! کیا تو اب بھی دھوکا دے سکتی ہے؟ اب میں تیرے داؤ میں نہیں آؤں گا۔“

گنار نے چمڑوانے کی کوشش کی، بولی۔ ”حمدو! مجھے چھوڑ دے، دیکھ مجھے باہر آئیں محسوس ہو رہی ہیں۔ ستار اور دوسرے خدمت گار بیدار ہو چکے ہیں اور شاید وہ پریشانی کے لیے ادھر آنے کی کوشش کریں گے۔“

حمدو نے قاتحانہ شان سے کہا۔ ”تو نے میرے ساتھ جو زیادتی کی ہے، اس کا جواب تو یہی ہے کہ ان معاملات

خدمت گار کچھ دیر تو چپ چاپ وہیں کھڑے رہے اس کے بعد واپس گئے اور حویلی کے مختلف حصوں میں گھوم پھر کر شور و غل کا سبب جاننے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ گلنار اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہاں حمزہ ایک کونے میں بیٹھا ہوا بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے گلنار کو دیکھتے ہی سوال کیا۔ ”کہا وہ لوگ واپس چلے گئے؟“ ”ہاں، واپس چلے گئے لیکن میں نے ان کے چہروں کے تاثرات سے یہی اندازہ لگایا ہے کہ انہیں میری بات کا یقین نہیں آیا ہے اور انہیں شبہ ہے کہ شور و غل زنان خانے ہی سے بلند ہوا تھا۔“

حمزہ نے کہا۔ ”ان کا شبہ درست ہے۔ انہیں زنان خانے میں داخل ہو جانا چاہیے تھا۔“ گلنار بہت افسردہ ہو رہی تھی۔ حمزہ اپنی جگہ سے اٹھا اور گلنار کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے چہرے کو اپنے سامنے کر لیا، بولا۔ ”گلنار! تو کتنی ہی موقع شناس اور عقل مند کیوں نہ ہو لیکن میرے معاملے میں تو نے حماقت اور کم عقلی کا ثبوت دیا ہے۔ آ میری آغوش میں آ جا اور تمام اندیشے اپنے دل و دماغ سے نکال دے۔“

گلنار نے جواب دیا۔ ”حمزہ! جب میں تجھے یہ یقین دلا رہی ہوں کہ داؤد بھائی کے آنے پر تجھ سے شادی کر لوں گی تو، تو پریشان کیوں ہو رہا ہے؟“ حمزہ پر دیوانگی طاری تھی، گلنار کو زبردستی چمٹا لیا، بولا۔ ”گلنار! میں جو کچھ آج حاصل کر سکتا ہوں اس کی حصولیابی کل پر کیوں چھوڑوں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ تو جو کچھ کہہ رہی ہے، وہ محض فریب ہے۔ میں اس پر کس طرح یقین کر لوں۔“

گلنار کے دل میں برے برے خیالات آرہے تھے۔ اس کے عزائم خطرناک ہو رہے تھے۔ اس نے کمرے میں رکھی ہوئی تلوار اور پیش قبض پر نظر میں ڈالیں اور دل میں ارادہ کر لیا کہ موقع پاتے ہی وہ حمزہ کو ہلاک کرنے کی کوشش کرے گی۔ اگر اس میں کامیاب ہوئی تو ٹھیک ورنہ پھر دیکھا جائے گا۔

حمزہ نے گلنار کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے تلوار اور پیش قبض کی طرف دیکھا اور گلنار کو چھوڑ کر تلوار اور پیش قبض پر قبضہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”گلنار! کیا خیال ہے؟ کیا تو ان ہتھیاروں سے کوئی کام لینا چاہتی تھی؟“ اس کے بعد اس نے دونوں ہتھیاروں کو کھڑکی کے باہر پھینک دیا اور کہا۔ ”ان کا یہاں کیا کام؟“

سبھی کو مطلع کر دیا جائے۔“ گلنار نے گدگدائی چہرے کی کوشش کی اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں حمزہ کے ہاتھوں میں بیوست کر دینا چاہیں۔ دوسری طرف ستار اور دوسرے خدمت گار حیدر فاضل پر کھڑے پکار پکار کر پوچھ رہے تھے۔ ”گلنار بی بی! کیا بات ہے؟ یہ شور و غل کیسا تھا؟ یہ کون کون کچھ رہا تھا؟ کیا یہ آپ کی طرف شور ہو رہا تھا؟“

گلنار نے سرگوشی میں کہا۔ ”حمزہ! خدا کے لیے مجھے چھوڑ دے ورنہ یہ سب یہاں آ جائیں گے اور ہم دونوں رسوا ہو جائیں گے۔“

حمزہ نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ ”کیا میں نے پہلے ہی تجھے اس خطرے سے آگاہ نہیں کر دیا تھا؟“ گلنار نے کہا۔ ”اس وقت تو چھوڑ دے، باقی باتیں ہوتی رہیں گی۔ پہلے میں ان لوگوں کو واپس تو کراؤں۔“ حمزہ نے کچھ سوچ کر گلنار کو چھوڑ دیا اور دھمکی دی۔ ”میں تجھے چھوڑ دے دے رہا ہوں لیکن زیادہ چالاک سے کام نہ لینا ورنہ اس کا اس سے زیادہ برا انجام ہوگا۔“ گلنار نے بڑی بے بسی سے کہا۔ ”اچھا، اب تو خاموشی سے بیٹھ جا۔ میں ان لوگوں سے باتیں کر کے واپس آتی ہوں۔ خدا کے لیے اب چپ بی رہنا ورنہ بڑی رسوائی ہوگی۔“

گلنار، حمزہ کو اپنے کمرے میں چھوڑ کر حویلی کی درمیانی دیوار کے پاس چلی گئی۔ وہاں ستار اور دوسرے خدمت گار اس کا انتظار کر رہے تھے۔ گلنار نے جماعتی لے کر یہ جتانے کی کوشش کی گو یادہ نیند سے اٹھ کر آئی ہے۔ جاتے ہی سوال کیا۔ ”کیا بات ہے؟ تم لوگوں نے یہ کیسا شور و غل مچا رکھا ہے؟ میری تو نیند حرام ہو گئی۔“

خدمت گاروں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا، ستار نے عرض کیا۔ ”گلنار بی بی! شور و غل کی آواز تو آپ کی طرف سے آئی تھی۔“

گلنار نے ستار کا جواب ہنسی میں اڑا دیا، بولی۔ ”شور و غل میری طرف کیوں ہونے لگا؟ اپنی طرف جا کر دیکھو اور مجھے مطلع کرو کہ معاملہ کیا ہے۔“

کس میں اتنی ہمت تھی کہ گلنار سے بحث کرتا۔ وہ سب! پنا سامنے لے کر واپس چلے گئے۔ گلنار نے غصے میں... بہ آواز بلند کہا۔ ”اور دیکھو! اگر شور و غل کا سبب معلوم ہو جائے تو مجھے ضرور مطلع کر: ورنہ مجھے پریشان نہ کرنا۔ تم لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے ہو اور میری نیند خواہ مخواہ خراب کرتے ہو۔“

اسے کوئی فکر نہ تھی۔ بس وہ گنار کو اپنانے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔

حمود کو بڑی خوب صورتی سے حویلی کے باہر نکال دیا گیا حالانکہ وہ اس کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ حویلی سے نکلے ہی شہر کی خاک چھانٹنے لگا۔ اس دن دوپہر کو ایک تاجر نے داؤد کے دو خط گنار کو دیے۔ ایک خط گنار کے نام تھا اور دوسرا اتالیق کے نام۔ گنار کے خط میں لکھا تھا۔

”بیاری گنار! میں چند ماہ میں واپس آ رہا ہوں۔ جب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ تو نے فیروز بخت سے اپنی نفرت ختم کر دی ہے اور اب دن رات اس کی فلاح و بہبود کے بارے میں سوچا کرتی ہے، میں بہت خوش ہوں۔ گنار! یہ لڑکا ہم دونوں کا ساتھ دے گا۔ آج ہم دونوں اس پر احسان کریں گے، کل وہ اس کا حساب کتاب چکائے گا۔“

”جب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ فیروز بخت خاصا لائق ہو گیا ہے میں بہت خوش ہوں اور اس کی لیاقت کے مشاہدے کے لیے بے چین ہو رہا ہوں۔ دعا کرو میں جلد از جلد وطن پہنچوں اور وہ تماشے اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں جن کا ذکر تمہارے خط میں پڑھتا رہا ہوں۔ اتالیق کا خط اس کے حوالے کر دیا جائے۔“

گنار، اتالیق کا خط پڑھنے کے لیے بے چین تھی۔ اتالیق کا خط نکلا۔ یہ نسبتاً گنار کے خط سے لمبا تھا۔ اس میں لکھا تھا۔

”استاد محترم! میں آپ کی محنت کے ثمرات دیکھنے کے لیے بے چین ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ فیروز بخت عالمانہ مہارت کرنے لگا ہے۔ واللہ یہ ایک ایسی خبر ہے کہ میں اس کے بارے میں جتنا سوچتا رہوں، حیرت بڑھتی جاتی ہے۔“

”میں آپ سے منو بانہ درخواست کرتا ہوں کہ فیروز بخت کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ میں آپ کو آپ کا محنتانہ تو نہیں دے سکتا لیکن جب فیروز بخت قارئین التحصیل ہو جائے گا تو میں آپ کو نوازدوں گا۔“

”استاد محترم! مجھے آپ لوگ بہت یاد آتے ہیں۔ روز و شب کے کسی حصے میں آپ کو یاد ضرور کیا جاتا ہے۔ جب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ بہن گنار بھی فیروز بخت پر بہت زیادہ توجہ دے رہی ہے تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔“

”میں عنقریب واپس آ رہا ہوں۔ یہاں میرا دل نہیں لگ رہا۔ میں آتے ہی پہلے تو فیروز بخت کو سینے سے لگا کر

گنار نے بھانپنے کی کوشش کی لیکن حمود نے پکڑ لیا، بولا۔ ”کہاں چلیں گنار بیگم..... مجھ سے بھاگنا فضول ہے۔“ اس کے بعد اس نے گنار سے وہ سلوک کیا کہ وہ اپنے کیے پر پچھتاتی رہی۔ اب فیروز بخت کا کوئی ذکر ہی نہ ہوتا۔ حمود اپنی مطلب برآری میں مصروف تھا۔ گنار کے سینے میں انتقام کی بھٹی جل رہی تھی۔ اس نے حمود کے چہرے سے اندازہ لگا لیا کہ اگر اس نے ذرا سی بھی مزاحمت کی تو حمود اسے ذلیل بھی کرے گا اور ہلاک بھی کر دے گا۔ وہ خاموش رہی اور خود کو بالکل ہی حمود کے حوالے کر دیا۔

حمود گنار کو پوری رات روندتا رہا۔ آخر میں جب حمود کے دوسرے کمرے میں جانے کی باری آئی تو حمود نے اس میں جانے سے انکار کر دیا اور کہا۔ ”اب میں تنہا نہیں رہوں گا۔ میرے قیام کا اسی کمرے میں بندوبست ہونا چاہیے۔“ گنار نے جواب دیا۔ ”حمود! اب تو حد سے بڑھتا جا رہا ہے۔ میں تجھے اپنے کمرے میں کس طرح رکھ سکتی ہوں؟“

حمود نے نرمی سے کہا۔ ”میں اپنے قید خانے میں ایک بار پھر جا سکتا ہوں لیکن اسی صورت میں جب مجھے یقین ہو جائے کہ میں اس قید خانے سے نکل بھی سکوں گا۔“

گنار نے کہا۔ ”جب میں تجھے یہ کہہ رہی ہوں کہ بھائی داؤد کے آتے ہی میں تم سے شادی کر لوں گی تو، تو اعتبار کیوں نہیں کرتا اور میں یوں بھی نکل تجھے حویلی سے نکال دوں گی اور جب تو حویلی میں دوبارہ داخل ہوگا تو اس طرح گویا تو اغوا کرنے والوں کے چنگل سے نکل بھاگا ہے۔“

حمود نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ”سچا وعدہ؟“

”اب میں جو وعدہ اس طرح کر سکتی ہوں۔ تو نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے، میری اور پوری دنیا کی رائے میں اس کا اس سے بھر کوئی حل نہیں کہ میں تم سے شادی کر لوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اپنے ضمیر کے ہاتھوں ہمیشہ ہٹان رہوں گی۔“

حمود نے قید خانے میں جاتے ہوئے کہا۔ ”گنار! میں تم پر ایک بار پھر اعتبار کر رہا ہوں۔ اگر میرے ساتھ دھوکا کیا گیا تو میں بھی ایک ایسا قدم اٹھاؤں گا کہ دنیا عبرت حاصل کرے گی۔“

حمود اپنے کمرے میں چلا گیا اور گنار نے اسے اپنی طرف سے مقفل کر کے سکھ کی سانس لی۔

حمود کی عدم موجودگی میں گنار کا مارے نصے کے برا حال ہو گیا۔ حمود اپنے قید خانے میں جاتے ہی سو گیا۔ اب

چند بوسے دوں گا، اس کے بعد کوئی دوسرا کام کروں گا۔
 ”استاذ محترم! اگر میں اپنے اس منصوبے میں
 کامیاب ہو گیا اور فیروز بخت نے میری صحیح جانشینی کی تو میں
 اپنی زندگی کے بہترین تجربے میں شاندار کامیابی حاصل
 کر لوں گا۔ میں فیروز بخت کو یہ وصیت کروں گا کہ وہ بھی
 شادی نہ کرے اور اس طرح کسی لاوارث بچے کو پال پوس
 کر تعلیم و تربیت سے سزاوار کرنا جانشین بنائے کیونکہ میں یہ
 نہیں چاہتا کہ جس دولت، جائداد اور کاروبار کو میں نے اتنی
 جانفشانی، محنت اور نفس کشی سے قائم اور برقرار رکھا ہے، وہ
 شادی کے بعد بہت ساری اولاد میں تقسیم ہو کر ختم ہو جائے
 کیونکہ شادی سے جب اولاد پیدا ہوتی ہے، ان میں کچھ
 نالائق نکل جاتی ہیں اور ایک آدھ لائق اولاد اپنے حصے کو
 محفوظ رکھتی ہے تو بعد میں اس کی نالائق اولاد اسے ضائع
 کر دیتی ہے لیکن میں اپنے بعد یہ عمل نہیں دہرانا چاہتا۔ میں
 فیروز بخت کو ہدایت اور وصیت کروں گا کہ میری طرح وہ بھی
 زندگی بھر شادی نہ کرے اور میری طرح وہ بھی کسی لاوارث
 بچے سے میرے اس منصوبے کو زندہ اور برقرار رکھے پھر
 فیروز بخت بھی میری طرح اپنے جانشین کو یہی ہدایت اور
 وصیت کرے گا اور یہ عمل نسلوں جاری رہے گا۔ یقیناً کچھ
 لوگ یہ سوچیں گے اور آپس میں سوال کریں گے کہ اس
 عجیب و غریب عمل سے آخر مجھے کیا فائدہ پہنچے گا؟ ان کے اس
 سوال کا میرے پاس ایک ہی جواب ہے۔ ہم جو کچھ کرتے
 ہیں، ہمیں اس کے نفع و نقصان کی پروا کیے بغیر کچھ ایسے کام
 بھی کرنا چاہئیں جس سے دنیا کو کچھ عجیب و غریب نتائج
 حاصل ہوں۔ میرا یہ تجربہ بھی دنیا کو عجیب و غریب نتیجوں سے
 بھرنا دے گا۔ بس سبکا میری اس کوشش اور تجربے کا حاصل
 ہوگا کیونکہ دنیا میں انسان کا نام اس کی کسی ایسی ہی کوشش
 اور کام کے سبب زندہ رہتا ہے۔ قاجار اپنی فتوحات اور
 بادشاہ اپنی کشور کشائی سے نام زندہ رکھتے ہیں لیکن قاجار
 یا بادشاہ نہیں ہوں اگر لیے اپنا نام اس طرح زندہ رکھنے کی
 کوشش کروں گا۔

لے کر آیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ اس کو انہی
 لوگوں نے اغوا کیا تھا جن لوگوں نے فیروز بخت کو روشن
 چراغ دہلی کی درگاہ سے اغوا کیا تھا۔ یہ ایرانی لوگ تھے اور
 اسے فیروز بخت کے ساتھ ہی ایران لے جانا چاہتے تھے۔
 ان ایرانیوں نے فیروز بخت اور حمد کو اغوا کر کے پہلے تو
 انہیں غار میں قید کر دیا۔ یہاں دونوں کے ساتھ تکلیف دہ
 سلوک کیا گیا۔ ایرانی فیروز بخت کو ڈانٹتے پھنکارتے رہے
 کہ ہوش سنبھالنے کے بعد اس نے اپنے رشتے داروں کو
 حلاش کیوں نہیں کیا۔ انہوں نے فیروز بخت کے کئی طمانچے
 سپرد کیے اور کہا کہ اس کی عدم موجودگی میں ایران میں اس
 کی آبائی جائداد پر دوسروں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ فوراً ایران
 چل۔ اس کے بعد ان لوگوں نے حمد کی پٹائی کر دی کیونکہ
 فیروز بخت نے حمد کی شکایت کر دی تھی کہ خدمت گزاروں
 کے دوران حمد نے فیروز بخت کو بہت ستایا تھا۔ حمد نے یہ
 بھی بتایا کہ ان لوگوں نے اسے بھوکا پیاسا رکھا اور کئی دن
 سونے نہیں دیا۔ آخر میں وہ لوگ خود حمد کو جنگل میں بھٹکنے
 کے لیے چھوڑ کر ایران چلے گئے اور وہ اس نامعلوم اور گمنام
 جنگل میں کئی دن بھٹکتا رہا۔ حمد نے جنگل میں بھٹکنے اور
 درندوں سے ڈرنے کا ایسا لرزہ خیز سماں باندھا کہ سننے
 والوں کی کپکپی چھوٹ گئی لیکن ستار نے اس کی داستان سرائی
 میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔

خدمت گاروں کے بعد وہ گلنار سے ملا اور اس کو بھی
 یہی داستان سنا دی۔ گلنار نے افسوس کرتے ہوئے پوچھا۔
 ”وہ لوگ فیروز بخت کو کہاں لے گئے؟“
 حمد نے جواب دیا۔ ”مجھے کچھ پتا نہیں لیکن میرا
 خیال ہے کہ وہ ایران چلا گیا۔“
 گلنار نے خدمت گاروں کو کام بتا کر رخصت کر دیا
 اور تہائی میں حمد سے پوچھا۔ ”تیری اس داستان کا تیرے
 ساتھیوں نے کیا اثر لیا ہے؟“
 حمد نے جواب دیا۔ ”انہیں میری باتوں کا یقین
 آ گیا ہے اور وہ سب افسوس کر رہے تھے۔“
 گلنار نے پوچھا۔ ”ستار کیا کہہ رہا تھا؟“
 حمد نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے اس پر کوئی
 خاص اثر نہیں ہوا۔“
 گلنار نے سر جھکا لیا، ذرا دیر بعد بولی۔ ”تو اس کا یہ
 مطلب ہوا کہ ستار نے تیری باتوں کا یقین نہیں کیا؟“
 ”ہو سکتا ہے، میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔“
 گلنار نے سختی سے کہا۔ ”تو اپنی اس فرضی داستان پر

”جیسا کہ میں نے لکھا ہے میں بہت جلد وطن واپس
 آ رہا ہوں اور آپ کی محنت اور کوشش کا شکر دیکھوں گا۔“
 گلنار نے اتالیق کا خط پڑھ کر بند کر کے رکھ دیا اور
 اس کا انتظار کرنے لگی۔ شام کو پریشان حال حمد بھی آ گیا۔
 خدمت گاروں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ انہیں
 حمد کے اچانک آنے سے بڑی خوشی ہوئی تھی لیکن ستار نسبتاً
 کم خوش تھا۔ وہ اپنی گمنامی کی ایک عجیب لرزہ خیز داستان

کر دیا گیا۔ اتالیق نے اس خط کو کئی بار پڑھا اور حیرت سے لیتا رہا۔ آخر میں پوچھا۔ ”کیا فیروز بخت کا کچھ پتا چلا؟“
گنار نے حمد کی داستان سنا دی، بولی۔ ”میرا خیال ہے وہ ایران چلا گیا ہے۔“

اتالیق نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ”پھر میں کیا جواب دوں گا داؤد کو۔ میں تو بہت پریشان ہو رہا ہوں۔“

گنار نے جواب دیا۔ ”اس ناگہانی افتاد کی ذمے داری مجھ پر یا آپ پر تو عائد نہیں۔ بھائی داؤد اس کا کسی کو ذمے دار قرار دینے سے رہے۔ میں انہیں سمجھا دوں گی۔“

اتالیق نے کہا۔ ”محترم خاتون! داؤد آپ کا بھائی ہے۔ آپ انہیں مجھ سے بہتر جان سکتی ہیں لیکن فیروز بخت کے معاملے میں، میں داؤد کو آپ سے بہتر جانتا ہوں۔ فیروز بخت کی گمشدگی کا ان پر برا اثر پڑے گا۔“

گنار نے بے پروائی سے کہا۔ ”ہوسکتا ہے آپ کا خیال درست ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ میں بھائی داؤد کو سمجھا لوں گی اور انہیں شادی پر آمادہ کر لوں گی۔“

اتالیق نے آہستہ سے کہا۔ ”ہوسکتا ہے لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ داؤد کو اپنا ہم خیال بنا سکیں۔ اگر ناگوار خاطر نہ ہوتیں یہ عرض کروں گا کہ اگر آپ نے اس قسم کی باتیں کیں تو داؤد کو آپ پر شک ہوسکتا ہے۔“

”کس قسم کا شک؟“
”یہ شک کہ فیروز بخت کو کہیں آپ نے تو غائب نہیں کروا دیا۔“

گنار نے مسکرا کر کہا۔ ”بھائی داؤد مجھ پر اس قسم کا شک نہیں کر سکتے اور بالقرض محال اگر انہوں نے شک کیا تو میں حمد کو پیش کر دوں گی جس کو اسی دن ان لوگوں نے اغوا کر لیا تھا اور بڑی مشکل سے جان بچا کر واپس آیا ہے۔“

ستار بھاگا ہوا آیا اور اتالیق سے کہا۔ ”استاد محترم! آپ کو بالک نے ایک خط کے ذریعے حویلی کے خدمت گاروں کی حاکمی پیش کی۔ کیا آپ اپنے اس فرض کو اب بھی انجام دے رہے ہیں؟“

اتالیق نے جواب دیا۔ ”نہیں کیونکہ میں نے داؤد کی اس خواہش کو کبھی قبول نہیں کیا۔“

ستار کچھ کہنے کے لیے بے چین تھا، بولا۔ ”تب پھر میں گنار بی بی سے کہہ رہا ہوں کہ وہ حمد پر سختی کریں کیونکہ وہ بڑی بے تکی باتیں کرتا پھر رہا ہے۔“

گنار کے ہوش دھواں جاتے رہے، گھبرا کر پوچھا۔ ”وہ کیا کہہ رہا ہے؟“

اڑا رہے گا اور اسے اپنے ذہن میں سختی سے بٹھائے رکھے گا تاکہ اگر ہزار بار بھی مجھ سے پوچھا جائے تو یہی سب کچھ دہراتا رہے۔“

حمد نے جواب دیا۔ ”میں نے اسے اچھی طرح ذہن میں بٹھالیا ہے۔ اب اگر دس ہزار بار بھی مجھ سے پوچھا جائے تو میں اسی طرح دہراتا رہوں گا۔“

گنار نے افسردگی سے کہا۔ ”بھائی داؤد کا خط آیا ہے۔ وہ مقرب آجائیں گے۔“
”آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے؟“

گنار نے جواب دیا۔ ”مردست اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی۔“

حمد کا دل ڈوبنے لگا۔ ”کیوں، آخر کیوں؟“
گنار نے کہا۔ ”اس لیے کہ تو نے میری کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور میں نے وہ وعدہ مجبوری میں کیا۔“

حمد کو غصہ آنے لگا لیکن اب حالات دوسرے تھے اور اس غصے سے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا، بولا۔
”گنار! یہ تو تو زیادتی کر رہی ہے۔“

گنار یک دم برہم ہوئی۔ ”ادب سے بات کر۔ زبان سنبھال کر..... میں بہت کچھ برداشت کر چکی ہوں۔“
حمد نے دھمکی دی۔ ”میں اپنی فرضی داستان سے کمر بھی سکتا ہوں اور تجھے بدنام بھی کر سکتا ہوں۔“

گنار نے حمد کے رخسار پر بھرپور طمانچہ رسید کیا۔ ”اب میں تجھے قس کر واؤں گی۔ تو زبان تو کھول کر دیکھ۔ حویلی کے دوسرے خدمت گار تیرا کچھ مرگال دیں گے۔“

حمد گال سہلائے لگا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور وہ کچھ سنے بغیر باہر چلا گیا۔ بظاہر وہ بازی ہار چکا تھا اور اس کا کوئی امکان نہیں نظر آتا تھا کہ ہاری ہوئی بازی کو جیت میں بدل دے۔

گنار نے اسی وقت ستار کو بلا کر ہدایت کر دی کہ حمد پر خاص نظر رکھی جائے اور اس کو زمان خانے کی طرف نہ آنے دیا جائے۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کر دی کہ حمد کو فرار نہ ہونے دیا جائے اور اگر ضرورت پڑے تو اس کو چند ماہ کے لیے قید کر دیا جائے۔ ستار، گنار کے احکام پر حیرت زدہ نہیں تھا، بڑی گرم جوشی سے عرض آیا۔

”ہم خدمت گاروں میں سب سے زیادہ بد طبیعت حمد ہے۔ میں نے تو کبھی اس پر اڑا بار کیا ہی نہیں۔“
”کئی دن بعد اتالیق آیا تو اس کا خط اس کے حوالے

ستار نے ایک ایک کر جواب دیا۔ "نی بی اوہ ایسی باتیں ہیں کہ میں انہیں دہرائیں نہیں سکتا۔"
 اتالیق نے سوالیہ نظروں سے گلنار اور ستار کو باری باری دیکھا۔ گلنار نے اتالیق سے کہا۔ "استاد محترم! اب آپ جاسکتے ہیں۔ دو چار دن بعد تشریف لائیں، میں بعض ضروری امور پر بات کروں گی۔"

اتالیق بے چوں و چرا اٹھ کر چلا گیا۔ ستار کا رہا۔ جب اتالیق نظروں سے اوجھل ہو گیا تو گلنار نے ستار کو حکم دیا۔ "تو استاد محترم کے پیچھے پیچھے جا اور دیکھ کہ کہیں حمدوان سے کوئی بات تو نہیں کرتا۔"

ستار فوراً چلا گیا اور کچھ دیر بعد واپس آ کر بتا دیا کہ حمدوان نے اتالیق سے کوئی بات نہیں کی۔ گلنار نے ستار کو اپنے پاس بٹھالیا اور نرمی سے پوچھا۔ "ہاں تو اب بتا، حمدوان کس قسم کی باتیں کر رہا ہے؟"

ستار نے ذر، رک رک کر جواب دیا۔ "وہ معلوم نہیں کیا کچھ کہہ رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فیروز بخت کو آپ نے غائب کر دیا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اسے کسی نے بھی اغوا نہیں کیا تھا، وہ آپ کی خواہش پر خود ہی روپوش ہو گیا تھا۔"
 گلنار گھبرا گئی، بولی۔ "حمدوان اسی وقت میرے پاس لے آئے، میں اس سے پوچھوں گی کہ وہ یہ کیا بکواس کر رہا ہے۔"

ستار گیا اور حمدوان کو بلا لایا۔ نظروں ہی نظروں میں نہ جانے کیا باتیں ہو گئیں کہ جیسے ہی گلنار نے پوچھا۔ "حمدوان! تو یہ کیا بکواس کرتا پھر رہا ہے؟"

حمدوان نے ہنس کر پوچھا۔ "کیسی بکواس؟ میں تو کچھ بھی نہیں کہہ رہا۔"

گلنار نے ستار سے کہا۔ "تو ہی بتا یہ کیا کہہ رہا تھا۔"

ستار نے جواب دیا۔ "یہ آپ کے سامنے مکر رہا ہے اس لیے میں کیا بتاؤں، کہ یہ کسی بکواس کر رہا تھا۔"

گلنار نے غصے میں کہا۔ "تم دونوں دفع ہو جاؤ۔ میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔"

ستار اور حمدوان اب ساتھ مڑے، ستار آگے تھا اور حمدوان پیچھے۔ حمدوان نے جاتے جاتے مڑ کر گلنار کی طرف دیکھا۔ گلنار نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ ستار کو چھوڑ کر واپس آ جا۔

چنانچہ وہ ستار کے پاس واپس آ گیا۔ گلنار نے حمدوان کو دوبارہ اس کے ساتھ قید خانے میں پہنچا دیا، شرارت آمیز مسکراہٹ سے بولی۔ "تیری سزا سبکی ہے کہ یہاں پھر سے قید ہو جا۔"

حمدوان نے پوچھا۔ "میں کب تک یہاں قید رہوں گا؟"

گلنار نے بڑی ادا سے کہا۔ "تو تو یوں بھی میرا قیدی ہے، اس لیے تیرا یہ سوال فضول ہے۔"
 حمدوان نے کہا۔ "نہیں، اس سے کام نہیں چلے گا۔ میرے سینے میں آگ لگ رہی ہے اور پورے جسم میں کوئی شے کیف و سرور کی طرح بہ رہی ہے۔ میں اس سے کلو خاصا چاہتا ہوں۔"

گلنار نے جواب دیا۔ "تو بڑا شاطر انسان ہے۔ ذرا صبر کر میں اس کا علاج بھی کر دوں گی۔"

گلنار نے جلدی جلدی بناؤ سنگار کیا اور سجا کے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ حمدوان دوبارہ اس کے سامنے آیا تو گلنار دلہن کی طرح اس کے سامنے کھڑی تھی۔ حمدوان نے اس کو آغوش میں لے لیا، بولا۔ "گلنار! خدا کی قسم تو میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

گلنار نے جواب دیا۔ "میری سمجھ میں تو نہیں آیا۔ تو نے یہ جو لوگوں میں اول فول کیا ہے، اس کا عام اثر کیا دیکھا؟"

حمدوان نے کہا۔ "میں نے اس پر غور ہی نہیں کیا اب تک، پھر اس سوال کا کیا جواب دوں۔"

گلنار نے کہا۔ "بہر حال تو جو کچھ کر رہا ہے، اچھا نہیں کر رہا۔ میں چاہتی تھی تو ذرا صبر سے کام لے لیکن تو صبر نہیں کر سکتا اور بے صبری کا جو نتیجہ نکلے گا تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔"

حمدوان نے اپنا مشغلہ جاری رکھا، بولا۔ "میں فکر نہیں پالتا اور یہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں نے آپ کی خاطر اپنی زندگی کو بیچ کر دیا ہے۔ میں موت سے بھی نہیں ڈرتا۔ اگر آپ کے لیے میری زندگی بھی ختم ہو جائے تو میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔"

گلنار نے آکٹاہٹ سے کہا۔ "میں تیری زندگی کا خاتمہ کیوں چاہنے لگی؟"

حمدوان نے جواب دیا۔ "یہ بات تو میں خود بھی نہیں جانتا لیکن تو نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔"

گلنار نے کہا۔ "اچھا، اب فضول باتیں بند کر اور مجھ سے وعدہ کر کہ آئندہ اس طرح زبان نہیں کھولے گا۔"

حمدوان نے جواب دیا۔ "میں یہ وعدہ تو کر لوں گا لیکن تو بھی وعدہ کر کہ مجھے پریشان نہیں کرے گی اور اپنا وعدہ پورا کرے گی۔"

گلنار نے کہا۔ "اب میں بار بار کیا وعدہ کروں۔ ایک بار کر چکی ہوں، کیا وہ کافی نہیں ہے۔ اور تو یہ کیوں نہیں سوچتا کہ میں کوئی معمولی عورت تو نہیں جو ایک بار وعدہ کر کے پھر جائے۔"

ستارہ دو قدم آگے بڑھا اور مسکرا کر جواب دیا۔ "میں تم سے تم نہیں ہوں، خاصا خوش ہوں اور یہ خاموشی بھی زیادہ دیر کے لیے نہیں ہے۔"

داؤد واقعی بہت تھکا ہوا تھا۔ وہ ایک مسہری پر دراز ہو گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے گلنار بھی پہنچ گئی اور پوچھا۔ "بھائی داؤد! احمد آباد میں آپ کا کیا حال رہا؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "احمد آباد میں اچھا حال رہا۔ سوائے اس کے کہ میں تم لوگوں سے بہت دور ہوں۔"

گلنار نے جب یہ دیکھا کہ داؤد کی حالت زیادہ خراب ہو رہی ہے تو اس نے اس کو سوجانے کا زبردستی حکم دیا۔ داؤد تھوڑی دیر میں واقعی سو گیا۔ کئی گھنٹے سو تا رہا۔ اس دوران گلنار کا دماغ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ساڑھے چھ گھنٹے بعد داؤد بیدار ہو گیا۔ اس نے چند ساعتوں کے بعد حکم دیا۔ "ارے تم لوگوں نے تو مجھ سے کچھ مانگا ہی نہیں۔"

گلنار نے بڑے استغنا سے جواب دیا۔ "میں جو موجود ہوں۔ کسی تیسرے کو اس معاملے میں کچھ بولنے کی ضرورت نہیں اور بھائی داؤد! میں یہ ناپسند کرتی ہوں کہ آپ اپنے خدمت گاروں سے بے تکلف ہو جائیں۔ انہیں اگر کچھ دینا بھی ہے تو وہ میں دونوں کی کیونکہ آپ کی بہ نسبت میں زیادہ بہتر جانتی ہوں کہ خدمت گاروں سے کس طرح پیش آنا چاہیے۔"

داؤد مسکرانے لگا، ہنس کر بولا۔ "بہتر ہے، میں میری مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کروں گا۔" پھر ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

"بہن گلنار! کیا بات ہے، یہ فیروز بخت ابھی تک غائب ہے؟ آخر وہ آیا کیوں نہیں، بات کیا ہے؟"

گلنار نے کسی قدر پس و پیش سے جواب دیا۔ "بھائی! آپ پریشان نہ ہوں ذرا صبر و تحمل اختیار کریں۔"

داؤد نے ستارہ کو بلا کر حکم دیا۔ "تو بھاگ کر جا اور استاد محترم کو بلا لا۔"

ستارہ فوراً بھاگا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ داؤد نے گلنار سے کہا۔ "جب میں نے خط پڑھا کہ فیروز بخت علمی مہاجے میں حصہ لینے لگا ہے تو میں بہت خوش ہوا کیونکہ علمی مہاجے میں حصہ لینا مذاق نہیں ہے۔"

گلنار نے نظریں جھکا لیں، بولی۔ "بھائی! آپ نے اپنے ایک خط میں مجھے شادی کرنے کا مشورہ دیا تھا، کچھ یاد ہے آپ کو؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "ہاں، اچھی طرح یاد ہے، کیوں؟ کیا کوئی نوجوان پسند آ گیا؟"

خندو نے کہا۔ "میں بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں کیونکہ میں نے تجھ سے جو عہد کیا، پورا کیا۔"

گلنار کا شاطر دماغ اس وقت بھی منصوبہ بندی میں مصروف تھا۔ اس نے معلوم نہیں کیسے کیسے منصوبہ بنا ڈالے۔ وہ حمد سے بیزار تھی لیکن اپنی کمزوری کی وجہ سے بے عذرگی اختیار کیے ہوئے تھی۔

☆☆☆

جیسے تیسے وقت گزرتا رہا۔ حمد نے اپنی زبان قابو میں کر لی تھی۔ گلنار اس کی خواہشات پوری کرتی رہی۔ اتالیق کی آمد و رفت جاری رہی۔ ستارہ حورو اور گلنار کے معاملات سے آگاہ ہو چکا تھا لیکن اپنی زبان بند کیے ہوئے تھا۔ دوسرے خدمت گار بھی آپس میں کچھ عجیب سی سرگوشیاں کرنے لگے تھے۔ آخر وہ دن دن بعد داؤد بھی آ گیا۔ خدمت گاروں کی فوج نے داؤد کا شاندار استقبال کیا اور گلنار بھائی کو دیکھتے ہی اس کے سینے سے لگ کر زار و قطار رونے لگی۔ حمد کا رویہ ان سب سے الگ اور محتاط تھا۔ اتالیق قافلے کے پڑاؤ سے داؤد کے ساتھ حویلی تک آیا تھا۔

داؤد بہت تھکا ہوا تھا۔ اس نے اتالیق سے کہا۔ "استاد محترم! آپ جا سکتے ہیں کیونکہ میں بہت تھکا ہوا ہوں اور آرام کرنا چاہتا ہوں۔" پھر ذرا ذہن پر زور دیا اور پوچھا۔ "اور ہاں، وہ فیروز بخت کہاں ہے، وہ تو کبھی نظر ہی نہیں آ رہا ہے؟"

اتالیق نے جواب دیا۔ "آپ بہت تھکے ہوئے ہیں، ذرا آرام فرمائیں پھر حاضر ہو جاؤں گا اور فیروز بخت کو بھی پیش کر دیا جائے گا۔" اتالیق نے یہ کہہ کر گلنار کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

داؤد نے پوچھا۔ "فیروز بخت اس وقت کہاں ہے اور وہ میرے پاس کیوں نہیں آیا؟"

لیکن اتالیق کوئی جواب دے بغیر ہی چلا گیا۔ داؤد نے گلنار سے پوچھا۔ "گلنار! بات کیا ہے، فیروز بخت کہاں ہے؟"

گلنار نے جواب دیا۔ "سفر کی مکان آپ کے چہرے سے جھلک رہی ہے۔ اس وقت تو آپ آرام کے سوا... کچھ سوچیں ہی نہیں۔ فیروز بخت کہاں جائے گا وہ بھی مل لے گا، آرام سے فرصت پانے کے بعد۔"

ان کے سامنے ستارہ بھی کھڑا تھا، داؤد نے بڑے پیار سے بلایا اور پوچھا۔ "ستارہ! تیرا کیا حال ہے؟ خیریت تو ہے تو خاصا تم صبر نظر آ رہا ہے؟"

گلنار نے کہا۔ ”ہاں لیکن میں اس نوجوان کا ابھی ذکر نہیں کروں گی۔“

داؤد نے پوچھا۔ ”کیوں؟ آخر یہ تامل کیوں؟“

گلنار نے ہا۔ ”بھائی! میری سمجھ میں آپ کی یہ بات ابھی تک نہیں آئی کہ آپ نے ایک ایسے لڑکے کو اپنا بیٹا کیوں بنالیا جس کے والدین کا کوئی پتا نہیں؟“

داؤد ایک دم سنجیدہ ہو گیا، بولا۔ ”گلنار! ایسی باتیں نہ کر مجھ سے۔“

گلنار نے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”بس لیے کہ تو بڑے تکبر کی بات کرنے لگتی ہے اس طرح۔“

گلنار نے ہا۔ ”بھائی! اگر فیروز بخت کی بابت یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کسی ایسے والدین کا لڑکا ہے جو ہمارے خدمت گاروں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے تو آپ کے احساسات کیا ہوں گے؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”گلنار! میں الحمد للہ مسلمان ہوں اور مسلمانوں میں ہندوؤں کی طرح طبقات نہیں ہوتے۔“

گلنار نے پوچھا۔ ”کیا ستار اور دوسرے خدمت گار ہمارے برابر کے ہیں؟ کیا ہم ان کے آقا نہیں ہیں؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”میں نے کہا جو دیا کہ اسلام میں طبقات نہیں ہیں۔ ستار، حمزہ اور دوسرے خدمت گار مسلمان ہونے کی وجہ سے ہمارے بھائی ہیں۔“

گلنار نے نظریں نیچی کر لیں، بولی۔ ”شاید اسی لیے آپ فیروز بخت کو اپنا بیٹا سمجھتے ہیں۔“

”بے شک، حیرت انگیز خیال درست ہے۔“

گلنار نے آہستہ سے کہا۔ ”اور اگر میں یہ کہوں کہ میں نے اپنے لیے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا ہے جو معاشرے میں کوئی بڑا مقام نہیں رکھتا تو آپ کیا کہیں گے؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”میں کیا کہوں گا، کچھ بھی نہیں کیونکہ میں معاشرے میں بڑے پھولے کا زیادہ قائل نہیں ہوں۔“

گلنار نے مزید تشریح چاہی۔ ”بھائی! اگر آپ کو کسی طرح یہ معلوم ہو جائے کہ فیروز بخت ہمارے کسی خدمت گار کا بیٹا ہے تو آپ کے کیا احساسات ہوں گے اور آپ کس حد تک اپنے موجودہ فیصلے پر قائم رہیں گے؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”گلنار! میں نے فیروز بخت کو بیٹا بنایا ہے اس لیے میں اس کے خاندانی پس منظر اور حسب نسب میں کوئی دلچسپی نہ لوں گا۔ مگر تو یہ بتا کہ تو مجھ سے بار بار ایک ہی بات کیوں کرتی ہے؟ اس سے تیرا مقصد کیا ہے؟“

گلنار نے آہستہ سے کہا۔ ”بھائی! میں نے حمزہ کو پسند لیا ہے، میں حمزہ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

داؤد سناٹے میں آ گیا۔ کچھ دیر چپ چاپ گلنار کا چہرہ دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ ”یہ تو کیا کہہ رہی ہے گلنار؟“

گلنار نے جواب دیا۔ ”مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکی۔ اب میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔“

داؤد خاموش ہو گیا اور گلنار کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ ”اس پر میں غور کروں گا اور سوچوں گا کہ یہ کام ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔“

گلنار نے کہا۔ ”اس میں ایسی کون سی دشواری ہے۔ جب آپ خاندانی پس منظر اور حسب نسب کے قائل ہی نہیں، تب پھر اس کام میں کیا پیچ ہو سکتی ہے؟“

داؤد نے موضوع بدل دیا، پوچھا۔ ”لیکن تو نے ابھی تک فیروز بخت کو مجھ سے نہیں ملوایا۔ اس میں کیا مسئلہ یا دشواری ہے؟ کیا فیروز بخت اس حویلی میں موجود نہیں ہے؟“

گلنار نے شہنشاہی جواب دیا۔ ”بھائی! آپ کو تارکی میں رکھنا مناسب نہیں رہے گا۔ اگر آپ فیروز بخت کے بارے میں ساری تفصیل استاد محترم سے سن لیں تو زیادہ مناسب ہے۔“

داؤد نے ستار کو حکم دیا۔ ”استاد محترم کو بلا، میں ان سے مشورہ کروں گا۔“

ستار چلا گیا۔ داؤد نے گلنار کو حکم دیا۔ ”گلنار! تو میرے سامنے سے چلی جا کیونکہ تیری باتوں نے میرے دل و دماغ کو مشتعل کر دیا ہے اور مجھے خود معلوم نہیں کہ میں کیا کر بیٹھوں گا۔“

گلنار فوراً ہی چلی گئی۔ داؤد بے چینی سے ٹپکتے ٹپکتے حویلی کے ایک ایک کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ گلنار کے کمرے میں بھی گیا اور گلنار کے ملحق کمرے میں بھی۔ وہ معلوم نہیں کیا تلاش کر رہا تھا۔ آخر اس نے ایک رومال پالیا۔ یہ رومال لے کر وہ گلنار کے پاس پہنچا۔ گلنار بہت سہمی ہوئی تھی۔ داؤد کے ہاتھ میں رومال دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

داؤد نے پوچھا۔ ”گلنار! یہ رومال کس کا ہے؟“

گلنار کانپ رہی تھی، بولی۔ ”میں نہیں جانتی۔“

داؤد نے پوچھا۔ ”یہ ملحقہ کمرے کس کا ہے؟“

گلنار نے جواب دیا۔ ”میرا لیکن میں اس میں رہتی نہیں ہوں۔“

داؤد کے لہجے میں کچھ اور سختی آ گئی۔ ”میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس کمرے میں کسی اور کا زرمکن ہے یا نہیں؟“

گلزار نے جواب دیا۔ ”نہیں یہاں کسی اور کا گزر تقریباً ناممکن ہے۔“

داؤد نے گرج کر پوچھا۔ ”اگر یہاں کسی اور کا گزر ناممکن ہے تو پھر تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ رومال کس کا ہے؟“

گلزار کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ ”میں نہیں جانتی کہ یہ رومال کس کا ہے۔“

داؤد نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ رومال کس کا ہے۔ یہ رومال اس شخص کا ہے جس سے تو شادی کرنا چاہتی ہے۔ ہاں، اب بتا کہ فیروز بخت کہاں ہے؟“

گلزار کا پورا جسم لرز گیا۔ وہ گڑگڑا کر بولی۔ ”بھائی! میں بے گناہ ہوں۔“

داؤد نے اس سے سختی سے کہا۔ ”میں یہ نہیں پوچھ رہا کہ تو گناہ گار ہے یا بے گناہ، میں تو تجھ سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ فیروز بخت کہاں ہے؟ اور یہ سمجھ کر تجھ سے یہ سوال کر رہا ہوں کہ میں جانتا ہوں کہ تو اس سوال کا جواب دے سکتی ہے۔“

”بھائی!“ گلزار تقریباً نیم بے ہوش ہو گئی اور بستر پر گر گئی۔ داؤد اسے اس کے حال پر چھوڑ کر چلا گیا۔

☆☆☆

اتالیق اور ستار ایک ساتھ حویلی میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے نو عمر بادشاہ اکبرؒ کے محل سرا کی عورتوں کی سواری تھی۔ داؤد کو جب یہ بتایا گیا کہ بادشاہ دہلی میں آچکا ہے اور بادشاہ کی مشاطا نہیں ایک خاص مقصد سے دہلی کے گھروں اور حویلیوں کا جائزہ لیتی پھر رہی ہیں تو وہ پریشان ہو گیا۔

محل سرا کی خواتین میں سے ایک نے پوچھا۔ ”اس حویلی کا مالک کہاں ہے؟“

ایک خدمت گار نے ان عورتوں کو داؤد کے پاس پہنچا دیا۔ یہ تین عورتیں تھیں اور صورت شکل سے بڑی تیز طرار نظر آتی تھیں۔ ان کے ساتھ دو شاعی پیادے بھی تھے۔ داؤد نے خواتین سے پوچھا۔ ”محترم خواتین! یہ معاملہ کیا ہے؟“

اتالیق ان میں سے ایک خاتون کو جانتا تھا کیونکہ شاعی خاندان کے جن بچوں کو پڑھاتا تھا، وہاں یہ خاتون بھی نظر آتی رہی تھی۔ اتالیق نے بھی اس خاتون سے وہی سوال کیا، جو داؤد کو چکا تھا۔ ”خاتون! آپ کی تشریف آوری کا مقصد..... یہ معاملہ کیا ہے؟“

خاتون نے ایک شان استغنا سے پوچھا۔ ”اس حویلی میں کتنی عورتیں رہتی ہیں اور کتنی لڑکیاں؟“

داؤد نے کہا۔ ”اس حویلی میں بس ایک عورت رہتی ہے اور وہ ہے میری بہن گلزار۔ اس کو عورت کہیے یا لڑکی کیونکہ عمر زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ لڑکی سمجھی جائے گی لیکن بیوہ ہونے کی وجہ سے اسے عورت کہیں گے۔“

عورت نے کہا۔ ”میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔“

داؤد نے پوچھا۔ ”آخر کیوں؟ آپ اسے کیوں دیکھنا چاہتی ہیں؟“

اتالیق نے داؤد کے کان میں کہا۔ ”آپ شاعی خاتون سے اس قسم کا سوال نہ کیجیے۔ آپ کے سوال کا جواب میں معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

داؤد بہت پریشان تھا۔ عورت نے سختی سے کہا۔ ”کیا تو نے میری بات نہیں سنی؟ میں تیری بہن کو دیکھنا چاہتی ہوں اور خبردار جو تو نے لیت و لعل سے کام لیا۔“

داؤد ان عورتوں کو لیے ہوئے گلزار کے پاس چلا گیا۔ گلزار بہت دیر سے رو رہی تھی جس سے اس کا چہرہ تھما گیا تھا۔ ان عورتوں نے گلزار کو خوب اچھی طرح دیکھا اور داؤد سے پوچھا۔ ”کیا یہ بیوہ ہے؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”ہاں، یہ بیوہ ہے۔ میں نے ایک بار کہہ جو دیا۔“

اتالیق نے پوچھا۔ ”یہ معاملہ کیا ہے؟“

عورت نے جواب دیا۔ ”نو عمر بادشاہ جلال الدین اکبر دہلی میں تشریف لائے ہیں۔ ان کی دل بستگی کے لیے حسین عورتوں اور لڑکیوں کی تلاش ہو رہی ہے چنانچہ دہلی کے معززین میں سے عورتوں اور لڑکیوں کا انتخاب تیزی سے عمل میں آ رہا ہے۔“

داؤد کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اتالیق بہوت، ایک ایک کی شکل دیکھتا رہ گیا۔ اس نے عورت سے پوچھا۔ ”آپ نے گلزار کو دیکھا؟ کیا فیصلہ کیا آپ لوگوں نے؟“

عورت نے جواب دیا۔ ”ہمارے فیصلے کا علم تو بعد میں ہوگا لیکن یہ لڑکی اس وقت تک حویلی میں رہے گی جب تک تم لوگوں کو ہمارے فیصلے کا علم نہ ہو جائے۔“

داؤد نے جواب دیا۔ ”لیکن اس کا تو رشتہ طے ہو چکا ہے۔“

عورت نے جواب دیا۔ ”فیصلے سے پہلے رشتہ بھی نہیں ہوگا۔“

عورتیں دیکھ کر واپس چلی گئیں۔ داؤد نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اتالیق سے کہا۔ ”استاد محترم! میں بہت پریشان ہوں۔“

اتالیق نے جواب دیا۔ ”داؤد! پریشان ہونے کی

چند آدمیوں نے فیروز بخت کو اغوا کر لیا۔ اغوا کی واردات کے وقت محمد بھی وہیں موجود تھا۔

داؤد نے آگ بگولا ہوتے ہوئے گنار سے پوچھا۔ ”کیا یہ درست ہے؟“

گنار خوف سے کانپ رہی تھی۔ داؤد نے اتالیق سے کہا۔ ”ہاں اور آگے..... پھر کیا ہوا؟“

اتالیق نے جواب دیا۔ ”اغوا کے وقت میں اور ستار دونوں ہی وہاں موجود تھے اور فیروز بخت کے اغوا کا منظر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔“

داؤد نے گرج کر پوچھا۔ ”میں پوچھتا ہوں فیروز بخت کہاں ہے؟“

اتالیق نے جواب دیا۔ ”اس کا صحیح پتہ یا تو محمد کو ہوگا یا پھر محترم خاتون گنار کے پاس۔“

گنار نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتی کہ فیروز بخت کہاں ہے۔ ہاں، اگر محمد، فیروز بخت کے موجودہ پتے سے واقف ہے تو اس سے پوچھا جائے۔“

داؤد نے ایک خدمت گار سے کہا۔ ”جا، محمد کو بلا لا۔“

کچھ دیر بعد محمد بھی آگیا۔ داؤد نے گرج دار آواز میں پوچھا۔ ”ہاں محمد! اب تو بتا کہ فیروز بخت کو کن لوگوں نے اغوا کیا اور تجھے کس نے اغوا کر لیا تھا؟“

محمد نے جواب دیا۔ ”اتے چند ایرانیوں نے اغوا کیا تھا۔ انہوں نے مجھے بھی اغوا کر لیا تھا لیکن میں پہ مشکل نکل بھاگا۔“

داؤد نے گنار کے کمرے سے ملحق کمرے سے ملنے والے رومال کو دکھا کر پوچھا۔ ”اب یہ بتا کہ یہ رومال کس کا ہے؟“

محمد نے رومال پہچان لیا، بولا۔ ”یہ میرا رومال ہے مگر یہ آپ کو کہاں سے ملا؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”جہاں تجھے اغوا کر کے قید کر دیا گیا تھا۔“

گنار کے لیے اب ہر بات ناقابل برداشت تھی۔ خوف زدہ آواز میں بولی۔ ”بھائی رحم..... بھائی ہمدردی۔“

محمد نے کہا۔ ”میں نے جو کچھ بھی کیا، گنار بی بی کے حکم پر کیا۔“

”مردود! یہ بتا، فیروز بخت کہاں ہے؟“ داؤد نے چیخ کر سوال کیا۔

محمد نے جواب دیا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔“

داؤد نے طنزاً گنار کو مخاطب کیا۔ ”تو اسی لیے محمد سے شادی کرنا چاہتی تھی؟ بول؟“

کوئی ضرورت نہیں ہے، اللہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔“ داؤد نے کہا۔ ”ان گورتوں کی غیر متوقع آمد نے میرے جذبات اور عزائم کا گلا گھونٹ دیا ہے۔“

اتالیق نے جواب دیا۔ ”میں نے کہہ جو دیا کہ اس میں بھی اللہ کی بہتری ہی ہوگی ہمارے لیے۔“

داؤد بیٹھ گیا، بولا۔ ”استاد محترم! آپ بھی بیٹھ جائیں۔ میں آپ کی موجودگی میں گنار سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

اتالیق نے جواب دیا۔ ”ہاں، باتیں کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن وہ کچھ اس طرح ہوں کہ گنار کی بہت زیادہ بے عزتی تہ ہو جائے۔“

داؤد نے کہا۔ ”اسی خیال سے میں ستار کو ذرا دور رکھ رہا ہوں۔“

اس کے بعد داؤد، اتالیق اور گنار تینوں ایک جگہ بیٹھے اور داؤد نے گنگو کا آغاز کیا۔ داؤد نے گنار سے کہا۔ ”ہاں تو گنار! استاد محترم تیرے سامنے موجود ہیں۔ اب بتا، فیروز بخت کہاں ہے؟“

گنار نے بڑی بے بسی سے اتالیق کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”استاد محترم! آپ تو عینی شاہد ہیں، بتائیے فیروز بخت کے ساتھ کیا ہوا؟“

اتالیق نے کہا۔ ”کیا میں سب کچھ صاف صاف بتا دوں؟“

گنار نے جواب دیا۔ ”ہاں، آپ سب کچھ صاف صاف بتا دیجیے۔“

اتالیق نے کہا۔ ”محترم خاتون! میں جو کچھ بتاؤں گا، اس میں آپ کا واس بھی محفوظ نہیں رہے گا۔“

گنار پریشان تو ہوئی لیکن ہمت کر کے جواب دیا۔ ”آپ اس کی پروا نہ کریں۔“

اتالیق نے داؤد کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”فیروز بخت کو گنار نے کبھی بھی پسند نہیں کیا اور انہوں نے اسے مختلف تدبیروں سے دفع کر دینا چاہا لیکن ناکام رہیں۔ طرح طرح کی سازشیں اور جوڑ توڑ اور میری اور ستار کی وجہ سے ناکامیاں۔ یہ بڑی لمبی داستان ہے لیکن گنار کو اپنی ہر سازش اور جوڑ توڑ میں شرمندگی اٹھانا پڑی اور آخر کار انہوں نے محمد کو اپنا شریک کار بنا لیا۔ انہوں نے محمد کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ حویلی کے باہر کسی بھی طرح فیروز بخت کا کام تمام کر دے۔ اس کے لیے انہوں نے فیروز بخت کو تنہا سبر و تفریح کے لیے باہر بھیجا شروع کر دیا پھر جب فیروز بخت ایک دن روشن چراغ دہلی کے مزار پر گیا تو

داؤد نے حمد سے پوچھا۔ ”میں تجھ سے پوچھتا ہوں فیروز بخت کہاں چلا گیا؟“

حمد نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتا۔“

اتالیق نے کہا۔ ”داؤد! فیروز بخت کا پتا یہ کیا پتائے گا؟ اس کا پتا مجھ سے پوچھ۔“ اس کے بعد ستار کو بلوا کر حکم دیا کہ فیروز بخت کو حاضر کیا جائے پھر داؤد سے کہا۔ ”جناب والا! جب میں نے یہ بات محسوس کرنی کہ اب فیروز بخت کی خیر نہیں ہے تو میں نے ستار کی مدد سے حمد کی سازش کے متوازی سازش تیار کی اور اس کی اور اس کے ساتھیوں کی موجودگی میں فیروز بخت کو اغوا کروالیا اور وہ ابھی تک میری تحویل میں ہے۔“ پھر ستار کو حکم دیا۔ ”فیروز بخت کو حاضر کیا جائے۔“

کچھ ہی دیر بعد ستار نے فیروز بخت کو حاضر کروا دیا جو ان سب کے سامنے آتے ہی چلنے لگا۔ داؤد اپنی جگہ سے اٹھا اور فیروز بخت کو گلے لگا لیا، پوچھا۔ ”فیروز بخت! تو خیریت سے تو ہے؟“

فیروز بخت بہت خوش تھا، جواب دیا۔ ”میرے آقا! میں خیریت سے بھی ہوں اور خوش بھی۔“

داؤد نے کہا۔ ”میں تیرا آقا نہیں، باپ ہوں۔ میں نے تجھے مسمیٰ کر لیا ہے۔“

گنار نیم مذہوشی میں فیروز بخت کو دیکھ رہی تھی اور لرز رہی تھی۔ حمد ذرا بھی خوفزدہ نہیں تھا۔ گنار سے پوچھا۔ ”گنار! جو کچھ ہوتا تھا ہو پکا۔ اب تو یہ بتا کہ تو اپنے وعدے پر کہاں تک قائم ہے؟“

داؤد نے ہنرک دیا۔ ”حمد! اپنی اوقات میں رہ اور مجھ سے بات کر۔ یہ تو کس وعدے کی بات کر رہا ہے؟“

حمد نے جواب دیا۔ ”گنار نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔“

داؤد نے ستار سے کہا۔ ”حمد کو قید کر دے، یہ دیوانہ ہو چکا ہے۔“

حمد نے جواب دیا۔ ”اب تو میں گنار کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

ستار نے حمد کو اپنے طاقتور بازوؤں کی گرفت میں لے لیا، اتنی دیر میں چند اور خدمت گار آگئے اور ان سب نے مل جل کر ستار کی مدد کی اور حمد کو ایک کونہری میں قید کر دیا گیا۔

حمد کے قید کیے جانے کے بعد داؤد نے گنار سے پوچھا۔ ”اب تو کیا کہتی ہے گنار؟“

گنار اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی، بولی۔ ”بھائی!

سجدہ

کراہیہ دار نے مالک مکان سے شکایت کی کہ ”آپ کے مکان کی چھت کی لکڑیوں سے اکثر آوازیں نکلتی رہتی ہیں، مہربانی فرما کر اس کی مرمت کروا دیجیے۔“

مالک مکان نے جواب دیا۔ ”پریشانی کی بات نہیں دراصل چھت کی لکڑیاں اپنے پروردگار کی یاد میں مشغول رہا کرتی ہیں۔“

کراہیہ دار نے جواب دیا۔ ”وہ تو ٹھیک ہے مگر میں ڈرتا ہوں کہ آپ کی چھت ڈگر کرتے کرتے کسی دن سجدۃً الہیٰ میں مصروف نہ ہو جائے۔“

مرسلہ: محمد صفدر محادیہ، خانیوال

مجھ پر رحم کیجیے۔ میں نہیں جانتی کہ میں کیا چاہتی ہوں۔“
داؤد نے اتالیق کی طرف دیکھا۔ ”استاد محترم! آپ کیا فرماتے ہیں؟“

اتالیق نے جواب دیا۔ ”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ جب تک جلال الدین اکبر کے حرم سرا سے کوئی جواب نہ آجائے، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

داؤد نے گنار کو سخت ست کہا، بولا۔ ”میں تیرے خلاف کیا قدم اٹھاؤں لیکن تو نے جو کچھ کیا ہے اچھا نہیں کیا۔ کیا تو یہ نکتہ بھول گئی تھی کہ معلم المملکت کو اس کے حسد نے ذلیل و خوار کر دیا تھا؟“

گنار نے بے بسی سے جواب دیا۔ ”بھائی! میں بہت شرمندہ ہوں، مجھے معاف کر دیجیے۔“

داؤد نے فرط جوش میں گنار کو سینے سے لگا لیا، بولا۔ ”تو نے جو کچھ کیا، میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بہن اگر حرم سرا کی خواتین اس حویلی میں نہ آگئی ہوتیں تو میں تیرے کرتوتوں پر تجھے قتل کر دیتا لیکن تو خوش قسمت ہے اور شاید بسی عمر لے کر آئی ہے۔“

اتالیق نے سرگوشی میں کہا۔ ”جو کچھ ہوا اسے بھلا دینا چاہیے۔“
داؤد نے جواب دیا۔ ”میں خود بھی بھلا دینا چاہتا ہوں لیکن میرا دماغ ہنسنار ہا ہے، اس کا میں کیا کروں؟“
”انتظار اور صرف انتظار۔ خدا جو کچھ کرے گا، بہتر ہی کرے گا۔ کیا تو اس پر ایمان نہیں رکھتا؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں گلزار کو اپنی پھوپھی سمجھتا ہوں اور حویلی کے جس ماحول میں وہ رہ رہی ہیں، ان میں بھی کچھ ہو سکتا تھا۔ میں انہیں بے گناہ سمجھتا ہوں۔“
داؤد نے حیرت سے کہا۔ ”لیکن اس نے تیرے ساتھ زیادتیاں کی ہیں۔“

”بے شک۔“ فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں ناندان اور رشتوں سے محروم ہونے کی وجہ سے گلزار پھوپھی کے رشتے کی قدر کرتا ہوں، جو مجھے خوش قسمتی سے میرا آگیا ہے۔“
داؤد نے کہا۔ ”تو اپنا مافی الضمیر کھل کر بیان کر۔“
فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”گلزار پھوپھی کو پشیمانی اور شرمندگی کی اذیت سے بچایا جائے۔“

داؤد نے فیروز بخت کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اٹھ کر زبان خانے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”استاد محترم! آپ میرا انتظار کیجیے۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ فیروز بخت سے کہا۔ ”تو بھی یہیں رہو اور میرا انتظار کر۔“

داؤد سیدھا گلزار کے پاس پہنچا۔ وہ مسہری پر شال اوڑھے لیٹی ہوئی تھی۔ داؤد کے قدموں کی آہٹ سن نہیں سکی تھی، وہ کچھ دیر ساکت کھڑا گلزار کو دیکھتا رہا پھر آہستہ سے پکارا۔ ”گلزار!“

گلزار نے گھبرا کر اپنے چہرے سے شال ہٹائی اور بھائی کو سامنے کھڑا دیکھ کر بیٹھ گئی۔ آنسو پونچھتی ہوئی بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”بھائی! تشریف رکھیے۔“

داؤد مسہری پر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تو رورہی تھی؟“

گلزار نے جواب دینے کے بجائے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی نظروں سے بھائی کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

داؤد نے کہا۔ ”گلزار! میں تجھ پر سخت برہم تھا یہاں تک کہ میں تیرے گل پر آمادہ ہو گیا تھا۔“

گلزار نے جواب دیا۔ ”بھائی! اگر آپ مجھے قتل کر دیتے تو میں خوشی محسوس کروں گی کیونکہ میں جو اذیت جھڑا رہی ہوں، وہ موت کی اذیت سے کہیں زیادہ ہے۔“

داؤد نے کہا۔ ”لیکن اب میں تجھے نہیں مار سکتا۔ ابھی ابھی فیروز بخت نے مجھ سے کہا ہے کہ میں رشتوں کا احترام کروں اور تجھے شرمندگی اور ندامت سے نجات دلاؤں۔“

گلزار نے ایک بار پھر بھائی کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

داؤد نے کہا۔ ”اس لیے اب تجھے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر تو کہے تو میں تجھے محمد سے وابستہ کر دوں۔“

اتالیق کے سمجھانے بھجانے سے داؤد کو ہوش آ گیا اور اس نے مسائل درپیش سے اس طرح پیچھا چھڑایا کہ فیروز بخت سے باتیں شروع کر دیں۔ فیروز بخت اس کی توقع سے کہیں زیادہ باشعور اور پڑھا لکھا لگا۔

☆☆☆

حمد و قید میں اول قول بک رہا تھا۔ داؤد نے اسے جس کوٹھری میں قید کیا تھا، وہ حویلی کے آخری سرے پر زبان خانے کی طرف گئی۔ اس احتیاط کی وجہ سے حمد کی اول قول خدمت گاروں کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ داؤد کی خواہش پر اتالیق بھی حویلی ہی میں رہنے لگا تھا۔ داؤد کی نظر میں اتالیق اور فیروز بخت کی بڑی عزت تھی۔ ستار کی وفاداری بھی خاصا عزت کی مستحق قرار پائی تھی۔ وہ گلزار کی صورت سے بیزار تھا۔

شاہی مشاہد اور خواجہ سرا، امراء اور شرفاء کے گھروں میں بادشاہ کے لیے لڑکیاں اور عورتیں تلاش کرتے پھر رہے تھے جس سے دہلی میں ہلچل مچ گئی تھی۔ داؤد نے اتالیق سے مشورہ لیا۔ ”استاد محترم! گلزار میرے لیے دردِ سر بن گئی ہے۔ میں بار بار یہی کہوں گا کہ اگر شاہی مشاہد اور خواجہ سرا گلزار کو دیکھ نہ گئے ہوتے تو میں اسے قتل کر کے لاش جمنائیں بہا دیتا۔ اب آپ مشورہ دیجیے کہ میں کیا کروں؟“

اتالیق نے جواب دیا۔ ”داؤد! میں نے حیرانک کھایا ہے اس لیے میں تجھے کوئی ایسا مشورہ نہیں دوں گا جو تیری تباہی اور بربادی پر منتج ہو۔ حالات پر نظریں رکھ اور وقت کا انتظار کر۔“

داؤد نے کہا۔ ”میں حمد کو قتل کر سکتا ہوں لیکن یہ قتل مجھے تباہ و برباد بھی کر سکتا ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ میں معاشرتی مسادات کی پردا کیے بغیر گلزار کی شادی حمد سے کر دوں اور حمد کو اپنے کاروبار میں شریک کر لوں۔“

اتالیق نے داؤد کو نیچے سے اوپر تک دیکھا اور ایسا لگا گویا اسے داؤد کی داغی صحت پر شبہ ہوا ہو، بولا۔ ”تو یہ کسی باتیں کر رہا ہے؟ بادشاہ کے فیصلے کا انتظار کر، اس کے بعد اس قسم کی باتیں سوچا جاسکتی ہیں۔“

فیروز بخت نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ ”میں جانتا ہوں کہ اتنے بڑے اور نازک مسئلے پر میرا زبان کھولنا مناسب نہیں ہے لیکن میں خود کو اس خاندان کا ایک اہم فرد سمجھتے کی وجہ سے بولنے پر مجبور ہوں۔“

داؤد نے اجازت دی۔ ”نہیں، تو بول سکتا ہے آخر کو میرا جانشین ہے۔“

گلنار نے جواب دیا: ”بھائی! اس کا نام مت دیجیے۔ اس نے جو کچھ کیا اور جس قسم کی باتیں کر رہا ہے، وہ اسکی نہیں ہیں کہ کوئی شریف عورت اسے پسند کرے۔“

داؤد نے کہا: ”لیکن اس کی زبان کس طرح بند کی جائے؟“

گلنار نے جواب دیا: ”اسے میں قتل کر سکتی ہوں کیونکہ اس کمین کی زبان اس کی سوت ہی بند کر سکتی ہے۔“

داؤد نے کہا: ”اسے تو قتل کرے یا میں، بات ایک ہی ہے۔ حمد کو قتل اس حویلی کے لیے عذاب بن سکتا ہے۔ اس وقت اور زیادہ رسوائیاں ہوں گی اور یہ باتیں بازاروں، گلیوں اور گھروں میں پھیل جائیں گی۔ اس لیے حمد کو قتل اس سوہان روح مسئلے کا حل نہیں ہے۔“

گلنار نے داؤد کا ہاتھ پکڑ کر اپنے چہرے پر رکھ لیا۔

”بھائی! میں بہت پریشان ہوں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟“

داؤد نے اسے تسلی دی: ”مت رو گلنار، مت رو۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس وقت میں یہی جانتا چاہتا تھا کہ تو حمد کو کس حد تک پسند کرتی ہے۔ اب جبکہ تو نے اسے مسترد کر دیا ہے تو میں اس مسئلے کو بہ آسانی حل کر سکوں گا۔“

گلنار سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ داؤد نے اسے تسلی دی، کہا: ”میں حمد کے پاس جا رہا ہوں۔ تو انتظار کر دیکھ خدا کیا کرتا ہے۔“

داؤد، گلنار کو روتا ہوا چھوڑ کر حمد کے پاس چلا گیا۔

حمد کی کوشخری میں بالکل خاموشی تھی۔ داؤد نے دستک دی اور کئی دستکوں کے بعد اندر سے حمد کی آواز آئی: ”کون؟“

داؤد نے جواب دیا: ”میں ہوں اور تجھ سے ضروری باتیں کرنے آیا ہوں؟“

حمد نے اکھڑ لہجے میں کہا: ”ضروری باتیں؟ کون کرے گا؟ تو؟ کہاں کرے گا؟ باہر ہی سے یا اندر آ کر؟“

داؤد نے جواب دیا: ”اگر تو چاہے تو میں اندر بھی آسکتا ہوں۔“

حمد نے بگڑے تیور سے کہا: ”تجھے مجھ پر اعتبار ہے؟“

داؤد نے جواب دیا: ”میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ گلنار کی شادی تجھ سے کر دوں کیونکہ میں طبقاتی امتیاز اور معاشرتی اونچ نیچ کا قائل نہیں ہوں۔ میں تجھے آج ہی آزاد کر دوں گا لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ کام عزت و اہتمام سے ہو اور اس کی یہی صورت ہے کہ تو اپنی زبان بند رکھے

اور گلنار کو اپنی عزت و آبرو سمجھے۔“

حمد خوشی سے پاگل ہو گیا، بے اختیار پوچھا: ”سچ؟“

داؤد نے جواب دیا: ”میں بہت سوچ سمجھ کر بات کرتا ہوں حمد۔ میں نے غصے میں تجھے قید کر دیا تھا لیکن جب غصہ اتر گیا اور میں نے مسئلے کی نزاکت اور اہمیت پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا، جس کا ابھی ابھی اظہار کیا ہے۔“

حمد نے بے چینی سے کہا: ”تو کیا فیصلہ کیا آپ نے؟“

داؤد نے قفل کھول دیا اور کوشخری میں داخل ہوتے ہوئے کہا: ”آ، میرے سینے سے لگ جا کیونکہ اب میرا دل تجھ سے صاف ہو چکا ہے اور اس میں ذرا سی بھی کدورت باقی نہیں رہی۔“

حمد کا خوشی سے برا حال ہو رہا تھا، پوچھا: ”پھر میں کب تک امید کروں؟“

داؤد نے جواب دیا: ”یہ کام بہت جلد ہو گا لیکن اس کی بنیادی شرط یہی ہے کہ تو اپنی زبان بند رکھے گا اور حویلی کے خدمت گاروں سے میل جول نہیں رکھے گا۔“

حمد نے جواب دیا: ”پھر میں کہاں رہوں گا؟ کیونکہ اگر میں خدمت گاروں میں اٹھوں تو ان سے باتیں بھی کروں گا اور جب باتیں کروں گا تو معلوم نہیں کیسی کیسی باتیں زبان سے نکل جائیں۔“

داؤد نے جواب دیا: ”میں تجھے اتالیق کے گھر بھیج دوں گا، وہ تجھے بڑی عزت سے رکھے گا۔“

حمد اس عزت افزائی سے اور زیادہ خوش ہوا، بولا: ”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

حمد کے اس انداز بے نیازی اور شان استغنا سے داؤد کو غصہ تو بہت آیا لیکن ضبط سے کام لیا اور خاموش رہا۔

داؤد نے کہا: ”استاد محترم سے میں اسی وقت بات کیے لیتا ہوں۔ وہاں رہنے کے سارے اخراجات میں برداشت کروں گا۔“

حمد نے پوچھا: ”کیا میں گلنار سے ملاقات کر سکتا ہوں؟“

داؤد نے جواب دیا: ”نہیں کیونکہ جب ایک بات طے پا چکی ہے تو یہ بات شرافت اور اخلاق سے بعید ہے کہ ہونے والی دلہن کو اس کے شوہر سے شادی سے پہلے ہی ملا دیا جائے۔“

حمد نے کہا: ”چلیے یہی سہی۔ میں بھی ملاقات پر اصرار نہیں کروں گا۔“

داؤد حمد کو لیے ہوئے اتالیق اور فیروز بخت کے پاس پہنچا اور فیروز بخت سے کہا: ”فیروز بخت! میں نے

تیری بات مان لی اور اب میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ حمزہ کی شادی گلنار سے کروں۔“

فیروز بخت نے پوچھا: ”کیا گلنار پھول کی شادی حمزہ سے کر دی جائے گی؟“

اس اعلان نے فیروز بخت اور اتالیق دونوں ہی کو حیرت زدہ کر دیا۔ داؤد نے کہا: ”اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں، فیروز بخت نے مجھے رشتوں کے احترام کا درس دیا تھا۔ میں نے اس احترام میں یہ عجیب و غریب فیصلہ کر دیا ہے۔“

داؤد نے جواب دیا: ”کچھ پتا نہیں لیکن میں نے اس سے محض وعدہ کر لیا ہے۔“

اتالیق نے کہا: ”بڑی خوشی کی بات ہے مگر.....“
داؤد نے بات کاٹ دی، بولا: ”اب اگر مگر کی کوئی معجائز نہیں اور یہ کہ میں نے جب ایک فیصلہ کر دیا تو کسی اور کو اس فیصلے میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ میرا اپنا مسئلہ تھا، اسے میں ہی حل کر سکتا تھا اس لیے میں نے حل کر دیا۔“
اب کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اتالیق نے عاجزی سے کہا: ”میرے لیے کوئی حکم؟“

فیروز بخت خاموش ہو گیا۔ داؤد نے اتالیق کو اتنی رقم پہنچا دی جس سے حمزہ کی شان و شوکت قائم ہو سکے اور یہ سب کچھ دو دن کے اندر اندر ہو گیا۔ پانچویں دن بادشاہ کی دوسری کئی مشاطا میں اور دو خواجہ سرا حویلی میں داخل ہوئے اور داؤد سے کہا: ”ہمیں بادشاہ نے اس لیے بھیجا ہے کہ گلنار کو دیکھ کر فوراً ہی یہ فیصلہ کر دیں کہ وہ بادشاہ کے لائق ہے یا نہیں۔“

داؤد نے جواب دیا: ”ہاں، حمزہ چند ماہ آپ کے ساتھ رہے گا کیونکہ اس رشتے کی بات کے بعد وہ حویلی کے خدمت گاروں کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔“
اتالیق نے کہا: ”بسر و چشم مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“
داؤد نے مزید کہا: ”حمزہ آپ کے ساتھ شان و شوکت سے رہے گا اور شان و شوکت کے اخراجات میں برداشت کروں گا۔“

داؤد اسی انتظار میں تھا۔ وہ ان سب کو نہایت تپاک سے گلنار کے پاس لے گیا۔ ایک مشاطہ نے گلنار کو دیکھتے ہی صدائے آفرین بلند کی۔ ”سبحان اللہ، بادشاہ اسے ضرور پسند فرمائیں گے۔“

اتالیق نے یہ اختیار کہا۔ ”سبحان اللہ، ماشاء اللہ۔“
حمزہ اسی وقت اتالیق کے ساتھ کر دیا گیا اور وہ چپ چاپ حویلی سے رخصت ہو گیا۔ ستار اور دوسرے خدمت گار حمزہ کو اتالیق کے ساتھ جاتے دیکھ کر تذبذب اور حیران رہ گئے۔ کچھ معلوم نہ ہونے کے باوجود ایک بات ان کی سمجھ میں آگئی تھی، وہ یہ کہ حمزہ کو بڑی عزت سے جاتے دیکھا گیا تھا۔
ان دونوں کے جاتے ہی فیروز بخت نے دے بے لہجے میں کہا: ”گستاخی معاف، میں نے آپ سے کتنا رشتوں کے احترام کی بات کی تھی مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ آپ گلنار پھول کی شادیاں حمزہ سے کر دیں۔“

دوسری نے تائید کی۔ ”میں اتفاق کرتی ہوں۔“
تیسری نے کہا: ”یہ ایک بہترین اتفاق ہے کہ اس لڑکی کے انتخاب میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔“ پھر دونوں خواجہ سراؤں سے پوچھا: ”تم دونوں کا کیا خیال ہے؟“
دونوں نے متفقہ طور پر کہا: ”ہم دونوں بھی تم تینوں سے اختلاف نہیں کر سکتے۔ یہ ایک بہترین انتخاب ہے اور اسے شادی حرم سرا میں ہی ہونا چاہیے۔“

داؤد نے جواب دیا: ”فیروز بخت! تو ابھی نا تجربہ کار ہے۔ افسوس کہ میں حمزہ کی ناشائستہ زبان کو دو طریقوں سے بند کر سکتا تھا۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ میں اسے قتل کر دوں اور دوسرا طریقہ یہ تھا کہ اس سے گلنار کی شادی کا وعدہ کر لوں۔ چنانچہ میں نے دوسرے طریقے پر عمل کیا اور میں بہت خوش ہوں کہ اس طرح میں حمزہ کی زبان کو قفل لگانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔“

اس کے بعد داؤد سے کہا: ”ہم تیری بہن گلنار کو نوجوان بادشاہ جلال الدین اکبر کے حرم سرا میں لے جانا چاہتے ہیں۔“

داؤد نے جواب دیا: ”اس ملک میں جو کچھ بھی ہے، بادشاہ کا ہے۔ گلنار بھی بادشاہ کی ہے۔ آپ لوگ بھروسہ شوق لے جائیں۔“

لیکن جب گلنار کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے داؤد سے دبی زبان میں کہا: ”بھائی! ظاہر ہے میں مجبور اور بے بس ہوں اور کوئی بھی فیصلہ اپنی مرضی سے نہیں کر سکتی۔ پہلے میں آپ کی ملکیت تھی اور اب بادشاہ کی تحویل میں جا رہی ہوں اور کس کی مجال ہے جو بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی کرے۔ آپ کی بھی ایک بلائیں جائے گی اور آپ اطمینان کی سانس لے سکیں گے۔“

داؤد نے جواب دیا: ”بہن! یہ بات نہیں ہے۔ پہلے بھی میں تیری مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اب بھی مجھے تیری مرضی کا پورا پورا پاس و لحاظ ہے لیکن یہ بادشاہ کا حکم ہے اور ہم بادشاہ کے حکم کے خلاف شاید سوچ

حمود حویلی سے نکل کر اسلحہ فروشوں کے بازار پہنچا۔ وہاں سے تیر کمان خرید کر ادھر ادھر مارا مارا پھرنے لگا پھر ویرانے میں جا کر تیر اندازی کی مشق کرنے لگا۔ وہ زمین سے فضا میں اڑتے ہوئے پرندوں کو نشانہ بناتا۔ دل کو لگی ہوئی تھی۔ انتہائے شوق میں یہ کام کھنتوں کرتا رہا۔ وہ فضا میں چھوڑے ہوئے تیروں کو تلاش کر کے واپس لاتا اور پھر مشق جاری کر دیتا۔ اس نے پورا دن اسی کام میں صرف کر دیا اور رات گزار کر دوسرے دن پھر یہی کام شروع کر دیا۔ اس نے یہ عمل پانچ دن جاری رکھا اور نشانہ لگانے میں مہارت حاصل کر لی۔

بازاروں میں یہ خبر گرم تھی کہ نوجوان بادشاہ، حضرت نظام الدین اولیا کے مزار کی زیارت کو جانے والا ہے۔ بادشاہ کی زیارت کرنے والے چھتوں اور اونچی اونچی جگہوں پر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ حد یہ تھی کہ درختوں پر آدمی یوں نظر آتے تھے گویا شاخوں سے آدمی پیدا ہو رہے تھے۔ اتالیق نے داؤد سے درخواست کی۔ ”کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں اور بادشاہ کی زیارت کر لیں۔“

داؤد نے جواب دیا۔ ”استاد محترم! میں بادشاہ کے اس عمل سے خوش نہیں ہوں کہ وہ امراء اور شرفاء کی بیوی بیٹیوں کو اپنی مرضی سے حرم سرا میں داخل کر لے۔ گلزار میری بہن ہے اور وہ جس طرح اور جن حالات میں حرم سرا میں داخل کی گئی ہے، اس سے میری غیرت کو لکا را گیا ہے۔ اگر بات بادشاہ کی نہ ہوتی تو میں دیکھتا کہ اسے حویلی سے کون لے جاسکتا ہے۔“

اتالیق نے آہستہ سے کہا۔ ”داؤد! اپنے خیالات اور جذبات کا یوں بر ملا اظہار نہ کر۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ معاملہ بادشاہ کا ہے۔ اگر تیری یہ بات بادشاہ کے کانوں تک پہنچ گئی تو سوچ لے کہ اس کا کیا انجام ہوگا۔“

داؤد نے جواب دیا۔ ”اب میں دہلی میں نہیں رہوں گا کیونکہ اس واقعے کے بعد میں لوگوں سے نظریں ملانے کے لائق نہیں رہ گیا۔“

اتالیق کے چہرے پر ٹکٹیں پڑ گئیں، پوچھا۔ ”داؤد! تو، تو گلزار کی شادی حمود سے کر دینے والا تھا۔ بادشاہ کی حرم سرا، حمود سے تو اچھی ہی ہے۔“

داؤد نے جواب دیا۔ ”استاد محترم! آپ تو سمجھدار انسان ہیں، کیا آپ کو یہ یقین ہے کہ میں اپنی بہن گلزار کی شادی واقعی حمود سے کر دیتا؟“

گلزار نے ڈبڈبائی آنکھوں سے پوچھا۔ ”میں حرم سرا میں چلی جاؤں گی..... پھر پھر..... کیا ہوگا؟ پھر میں آپ سے کس طرح ملوں گی؟ حویلی کیسے آسکوں گی؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”گلزار! میں کچھ بھی نہیں جانتا کہ تیرے حرم سرا میں چلے جانے کے بعد کیا ہوگا؟ شاید حویلی میں آنے جانے کی اجازت مل جائے یا شاید میں خود حرم سرا میں تجھ سے ملنے کے لیے داخل ہوسکوں۔ بہر حال میں کچھ نہیں جانتا کہ تیرے حرم سرا میں داخل ہو جانے کے بعد کیا ہوگا۔“

مشاطہ عورتیں اور خواجہ سرا جلدی کر رہے تھے۔ گلزار بھائی کے گلے لگ گئی اور زار و قنار رو نے لگی۔ شاعی عورتوں اور خواجہ سراؤں نے گلزار کو داؤد کے سینے سے الگ کیا اور اسے لے کر شاعی حرم سرا روانہ ہو گئے۔

فیروز بخت بھی با چشم پریم گلزار کو جاتے دیکھتا رہا اور خود بھی رو دیا۔ یہ خبر بڑی تیزی سے مشہور ہو گئی کہ گلزار کو بادشاہ کے حرم سرا میں داخل کر دیا گیا ہے۔ اتالیق بھی بھاگا بھاگا آیا اور داؤد کو تسلیاں دینے لگا لیکن حمود کا حال ان سب سے مختلف تھا۔ اس نے آتے ہی داؤد سے کہا۔ ”مجھ پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ بھائی داؤد! آپ پر بھی اور مجھ پر بھی۔“

داؤد کو حمود کے لب و لہجے اور بے تکلفی پر بہت غصہ آیا لیکن برداشت کر گیا۔

حمود نے پھر زبان کھولی۔ ”آپ لوگ بادشاہ کے اس ظلم کو برداشت کر سکتے ہیں لیکن میں خاموش نہیں رہوں گا۔ میں اس کا بدلہ لوں گا، بادشاہ سے بدلہ لوں گا۔“

اتالیق اور داؤد نے ایک ساتھ حمود کو دیکھا۔ بادشاہ سے انتقام حمود لے گا۔ ان دونوں کو حمود کے دماغی توازن بگڑ جانے کا شبہ ہونے لگا۔ حمود بار بار ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔ ”میں اس ظلم کو برداشت نہیں کروں گا۔ میں بادشاہ سے انتقام لوں گا۔ بادشاہ کو اس کے ظلم اور زبردستی کی سزا دوں گا۔“

پھر داؤد سے درخواست کی۔ ”بھائی داؤد! مجھے کچھ رقم درکار ہے۔“

داؤد نے پوچھا۔ ”کتنی رقم؟“

”بس اتنی کہ میں چند دنوں تک آگرے میں رہ سکوں۔“

داؤد نے اسے خاصی رقم دے دی۔ وہ دل ہی دل میں خوش تھا کہ اب حمود آگے چلا جائے گا اور اس طرح اس کا پیچھا چھوٹ جائے گا۔

☆☆☆

ہوں، اس نوجوان کے ارادے اچھے نہیں ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ یہ کوئی ناسیدھا قدم اٹھائے گا۔ اگر اس نے ایسا کیا اور بعد میں تحقیق اور تفتیش سے اس کا تعلق اس حویلی اور مجھ سے ثابت ہو گیا تو ہمارا کیا حشر ہوگا؟ کچھ اس پر بھی غور کیا؟“

حمرونے جواب دیا۔ ”میں جو کچھ کروں گا، اس میں آپ لوگوں کا نام نہیں لیا جائے گا۔“

حمرد کی باتیں چسپ کر ستار نے بھی سن لیں، جب وہ باہر نکلا تو ستار نے اسے سمجھایا۔ ”حمرد! کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اس پر اچھی طرح غور ضرور کر لینا۔“

حمرونے بے نیازی سے جواب دیا۔ ”میری عقل تم سب سے زیادہ ہے اس لیے مجھے کسی کا مشورہ نہیں چاہیے۔“

حمرد نظام الدین اولیا کے مزار کی طرف چل پڑا، ترکش شانے پر تھی اور کمان ہاتھ میں لے لی۔

حمرد کے چلے جانے کے تھوڑی دیر بعد داؤد، اتالیق اور فیروز بخت بھی بادشاہ کی زیارت کو چل کھڑے ہوئے۔ ان لوگوں نے پرانے قلعے کے پاس آدمیوں کا جھگ سا دیکھا۔ بادشاہ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے وہ ایک دوسرے پر چڑھے جارہے تھے۔ بادشاہ ہاتھی پر سوار تھا اور دور ہی سے نظر آ رہا تھا۔ حمرد ان سب سے الگ تھلک اس مسجد کے زیر سایہ بیٹھ گیا جسے ماہم بیگم نے تعمیر کرایا تھا۔ مسجد سے ملحق مدرسہ تھا اور مسجد اور مدرسے کے ساتھ ساتھ مکانات کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ یہاں بھی لوگوں کا ہجوم تھا۔ حمرد کو معلوم تھا کہ بادشاہ کی سواری یہیں سے گزرے گی۔ بادشاہ کے محافظوں نے شاہی ہاتھی کو اپنے بچ میں لے رکھا تھا۔ حمرونے بادشاہ کو دیکھا، ترکش میں سے تیر نکال کر چلے میں رکھا اور بادشاہ کا نشانہ لیا۔ چونکہ ہاتھی حرکت میں تھا اس لیے حمرد کو نشانے کا رخ آہستہ آہستہ تبدیل کرنا پڑا۔ ایک جگہ ہجوم کی وجہ سے شاہی سواری چند ثانیوں کے لیے رک گئی۔ حمرد کے چہرے پر خوشی اور فتح مندی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے بادشاہ کے سینے کا نشانہ لے کر تیر کو پوری قوت سے چھوڑ دیا۔ تیر سنسنا تا ہوا سینے کے بجائے بادشاہ کے بازو میں بیوست ہو گیا۔ بادشاہ کی سسکی نکل گئی اور محافظین میں ہلچل مچ گئی۔ بادشاہ نے محفوظ ہاتھ سے زخمی شانہ پکڑ لیا، خون کی دھار بہنے لگی اور سرخ سرخ خون سے لباس رنگین ہونے لگا۔ بادشاہ کے خدام نے ہاتھی کو بٹھایا اور یہ مشکل تیر کو شانے سے نکال دیا۔ اس کے بعد خون آلود لباس کو اتار کر روٹی کی قبا پہنا دی گئی۔

حمرد کو مجمع نے پکڑ لیا تھا۔ اس ہلچل نے اتالیق اور

اتالیق نے کہا۔ ”تو نے اعلان تو یہی کیا تھا اور نہ تیری نیت کا حال تو خود جانتا ہوگا یا خدا جانتا ہوگا۔“

داؤد نے کہا۔ ”میں نے حمرد کی زبان بندی کے سلسلے میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ پہلے تو شادی کا لالچ دے کر اسے آپ کے پاس رکھوں گا، اس کے بعد اسے اپنی تجارت میں شامل کر کے سفر پر بھیجوں گا اور راستے میں کرائے کے آدمیوں کے ذریعے قتل کروا دوں گا۔“

اتالیق حیران ہو کر داؤد کی صورت دیکھا رہ گیا۔ ستار نے خبر دی کہ حمرد ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ داؤد نے ناگواری سے اجازت دی۔ ”اسے حاضر کر۔“

تھوڑی دیر بعد حمرد کو داؤد اور اتالیق کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ ترکش پشت پر تھی اور کمان کا ندھے سے لٹک رہی تھی۔ حمرد کی صحت جواب دے گئی تھی اور حلقوں میں گھسی ہوئی آنکھیں وحشت ناک لگ رہی تھیں۔

داؤد نے پوچھا۔ ”ہاں بھائی حمرد! کیسے آتا ہوا؟“

حمرد نے جواب دیا۔ ”بھائی داؤد! سنے نوجوان بادشاہ نے امراء اور شرفاء کی بیو، بیٹیوں کے ساتھ جو روش اختیار کی ہے، کیا وہ شریفوں اور غیرت مندوں کے لیے لٹکار سے کم ہے؟“

داؤد نے کہا۔ ”بھائی حمرد! وہ بادشاہ ہے اور اس ملک میں جو کچھ بھی ہے بادشاہ کی ملکیت ہے اور کسی کی یہ مجال نہیں کہ وہ بادشاہ کے کسی ایسے حکم پر ناک بھوں سکیڑے۔“

حمرونے حیرت سے پوچھا۔ ”بھائی داؤد! یہ آپ کہہ رہے ہیں؟ حالانکہ آپ کی بہن گلنار شاہی حرم سرا میں زبردستی داخل کر دی گئی ہے۔ آپ برداشت کر سکتے ہیں لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔“

داؤد نے کہا۔ ”اگر تو برداشت نہیں کرے گا تو کیا کرے گا؟“

حمرونے جواب دیا۔ ”میں کیا کروں گا، یہ تو میں ابھی نہیں بتاؤں گا لیکن شام تک پورے دہلی کو یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ میں نے کیا کر دیا۔ میں ایک خطرناک انسان ہوں اور یہ جانتا ہوں کہ کس سے کس طرح نمٹا جائے۔“

اتالیق اور داؤد آپ دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

حمرونے ان دونوں کو دعوت دی۔ ”اگر آپ دونوں وہ تماشا دیکھنا چاہتے ہیں تو شاہی جلوس میں شامل ہو جائیں۔“

اتالیق نے پوچھا۔ ”تو کیا کرے گا؟ میرا خیال ہے اب تو چلا جا۔“ پھر داؤد کو مخاطب کیا۔ ”جہاں تک میں سمجھتا

میرا اصل نام فولاد ہے کیونکہ میرے مزاج کی سختی فولاد سے کسی طرح کم نہیں۔“

ایک دوسرا امیر بولا۔ ”سوال جواب مت کر۔ بادشاہ کے حکم کی تعمیل ہونی چاہیے۔“

امیر نے اصرار سے پوچھا۔ ”میں تجھ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اگر اس سازش میں کوئی بڑی شخصیت شامل ہے تو اس کا نام لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے بادشاہ تجھے معاف کر دے اور اس شخص کو مزا مل جائے۔“

بادشاہ نے جلاو بیچ دیا۔ اس نے آتے ہی امراء کو ہٹا دیا۔ ”حملہ آور کے علاوہ ہر شخص یہاں سے ہٹ جائے گا، ورنہ وہ بھی اس کا شریک سمجھا جائے گا۔“

حمرد کو گھیرے میں لینے والے کائی کی طرح چھٹ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے جلاو اور حمرد کے علاوہ وہاں کوئی بھی نہیں رہ گیا۔ اتالیق، داؤد اور فیروز بخت دور سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ جلاو نے حمرد سے پوچھا۔ ”اے بد بخت انسان! مجھے تیرے قتل پر مامور کیا گیا ہے۔ تجھ پر کوئی مقدمہ نہیں چلا۔ جہم نے تجھے بادشاہ کو تیرے زخمی کر دینے کے جرم میں پکڑا ہے۔ تیرا اور تیرا کمان تیرے پاس موجود ہے۔ ان حالات میں یہ میرا فرض ہے کہ تجھ سے یہ معلوم کروں، تو اقراری مجرم ہے یا نہیں؟“

حمرد نے حقارت سے جواب دیا۔ ”تیرے سپرد جو کام کیا گیا ہے، اسے انجام دے اور تفصیلات میں مت جا۔“ جلاو نے کہا۔ ”تیری ہاں یا نہیں سے میرا ضمیر مطمئن ہو جائے گا۔“

حمرد نے طنزاً پوچھا۔ ”تو ضمیر کی بات کر رہا ہے۔ یعنی تو تیرے پاس اب بھی ضمیر ہے، کیا واقعی؟“

جلاو نے جواب دیا۔ ”اس میں طنز کی کیا بات ہے۔ ضمیر کس کے پاس نہیں ہے۔ میں بادشاہ کے حکم کی تعمیل کر دیتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میرا ضمیر مجھے پریشان نہیں کرتا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں تجھ سے ایسا سوال ہرگز نہیں کرتا۔“

حمرد نے کہا۔ ”میں نے بادشاہ کو قتل کر دینا چاہا تھا لیکن افسوس کہ ناکام رہا یا یہ بھی ممکن ہے کہ میرے تیر کا زخم بادشاہ کو جہنم واصل کر دے کیونکہ میرا تیر زہرا لود تھا۔“ جلاو نے ڈر کر کہا۔ ”خبردار جو مزید کچھ کہا۔ تو بادشاہ کی شان میں تاگفتہ یہ الفاظ ادا کر رہا ہے۔“

حمرد نے اسی طرح درشت لہجے میں کہا۔ ”وہ تیرا بادشاہ ہوگا، میری نظر میں تو وہ ایک ظالم انسان ہے جو دوسروں کی بہو،

داؤد کو لڑا دیا۔ فیروز بخت اٹک سہا ہوا تھا۔

بادشاہ کے ہم رکاب، امراء نے بادشاہ سے خیریت پوچھی اور حکیم عین الملک گیلانی بادشاہ کے زخم کو دھونے اور دوا میں لگانے لگا۔

ایک امیر نے بادشاہ کو مشورہ دیا۔ ”حضور والا! حکم دیں تاکہ مجرم سے سوالات کر کے سازش کا پتا چلا یا جائے۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”کیا قائل پکڑا گیا؟“ امیر نے جواب دیا۔ ”حضور! اسے قائل نہ کہیں، حملہ آور کہیں کیونکہ نصیب دشمنان وہ اپنے ناپاک ارادے میں ناکام رہا ہے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”سوال و جواب کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس وقت وہ جن لوگوں کے نام لے لے گا، اگر ان میں میرے خاص خاص امراء کا نام محض دشمنی کی وجہ سے لے لیا تو ان وفاداروں کے خلاف میں شک میں مبتلا ہو جاؤں گا۔“

ایک دوسرے امیر نے پوچھا۔ ”پھر اس کے لیے کیا حکم ہے؟“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”اسے کسی پرسش کے بغیر ہی قتل کر دیا جائے۔“

جن لوگوں نے حمرد کو پکڑ رکھا تھا، اتالیق، داؤد اور فیروز بخت بھی وہاں پہنچ گئے۔ حمرد نے ان کی طرف اس طرح دیکھا گویا انہیں جانتا نہ ہو۔ امراء بادشاہ کا حکم لے کر حمرد کے پاس پہنچے اور ایک امیر نے اپنے طور پر سوال کیا۔ ”اے بد بخت! تو نے کیا کیا؟“

حمرد نے ہنس کر جواب دیا۔ ”میں نے جو کچھ کیا ہے جا، بادشاہ سے جا کر پوچھ۔ تیرے سوال کا صحیح جواب وہی دے سکتا ہے۔“

امیر نے پوچھا۔ ”لیکن تو نے یہ کیوں کیا؟“ حمرد نے جواب دیا۔ ”اس کا بہترین جواب ان امراء اور شرفاء سے ملے گا جن کی بہو، بیٹیوں بلکہ بیویاں تک زبردستی حرم سرا میں داخل کر دی گئیں۔“

داؤد گھبراہٹ میں یہ کہنے والا تھا کہ حمرد سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن اتالیق نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور سرگوشی میں کہا۔ ”خبردار جو تو نے زبان کھولی، خاموشی ہی میں نجات ہے۔“

امیر نے پوچھا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“ حمرد نے جواب دیا۔ ”لوگ مجھے حمرد کہتے ہیں لیکن

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریٹریوم ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر پو پو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ٹیوں اور بیویوں سے اپنا حرم آباد کرتا ہے۔“
جلاد، بادشاہ کے خلاف بائیں سن کر کانپا جا رہا تھا،
بولتا۔ ”اچھا تو کلمہ پڑھ لے اور خدا سے اپنے گناہوں کی
معافی مانگ لے۔“

حمود نے آسمان کی طرف دیکھا اور دعا مانگی۔ ”اے
میرے اللہ! تو عالم کو کیڑا کر دار تک پہنچا، باب عرش کو وا
کر دے تاکہ مظلوموں کی آہیں کسی روک ٹوک کے بغیر
تیرے عرش سے ٹکرائیں۔“

جلاد نے تلوار فضا میں لہرائی اور حمود کی گردن پر سید
کر دی۔ وارا تباہر پورا اور نپا سلا تھا کہ تلوار ایک طرف سے
داخل ہو کر دوسری طرف نکل گئی اور حمود کا سر لڑھک کر اس
کے اپنے ہی قدموں میں آ گیا۔ بے سر کالا شہ پھڑکنے لڑھکنے
لگا جس سے اس کا اپنا ہی سر ٹکرا کر ادھر ادھر ہونے لگا۔
فیروز بخت کی جان نکل گئی۔ اتالیق نے اس کے منہ پر
ہاتھ رکھ دیا، بولا۔ ”لڑکے! یہ کیا غضب کر رہا ہے، ہوش
دجو اس میں رہ۔“

داؤد نے منہ نہیر لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں
کہا۔ ”اس کی موت کا مجھے افسوس ہے۔“

کچھ دیر بعد بادشاہ ہاتھی پر سوار ہو کر شاہی محل روانہ
ہو گیا۔ مجمع بھی منتشر ہو گیا۔ داؤد، اتالیق اور فیروز بخت
اپنی حویلی کی طرف چل دیے۔ راستے میں اتالیق نے
کہا۔ ”حمود آدمی کیسا تھا کیوں نہ رہا ہو لیکن اپنے آخری
لمحات میں اس نے جس شرافت اور دیانت کا ثبوت دیا ہے،
اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔“

داؤد نے بھی تائبی کی، بولا۔ ”ہاں اگر وہ چاہتا تو ہمارا
نام لے سکتا تھا۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”اس سے ہمیں ایک بات معلوم
ہوتی کہ جس طرح معظم الملکوت ایک ذرا سی غلطی پر شیطان
بن سکتا ہے، اسی طرح ہمیں نہ کا شیطان لھائی ایمان اور دیانت
سے رکھ ملائک اور فخر انسان بن سکتا ہے۔“

حویلی میں داخل ہوتے ہی داؤد نے اعلان کر دیا۔
”اب میں دہلی میں نہیں رہوں گا۔ میں احمد آباد، گجرات یا
سورت کہیں بھی نکل ہو جاؤں گا اور دہلی کا کاروبار ختم
کر دوں گا۔“

اتالیق نے پوچھا۔ ”یہاں رہنے میں کون سا امر مانع ہے؟“
داؤد نے جواب دیا۔ ”استاد محترم! میرے ساتھ جو
کچھ ہوا ہے اس سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ اول تو
میں اس رسوائی سے گھبرار ہا ہوں جو بہن گلنار کے حرم سرا میں
داخلے سے ہوتی رہے گی۔ دوسرے اس خوف سے کہ کہیں
کسی اسی طرح بادشاہ کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ حمود اس حویلی
کا خدمت گار تھا اور اس نے گلنار کی وجہ سے اتنا بڑا جرم کیا
تھا تو میرا کیا ہوگا؟“

اتالیق نے پوچھا۔ ”مجھے کیا کرنا چاہیے؟“
داؤد نے جواب دیا۔ ”آپ بھی میرے ساتھ چل
سکتے ہیں۔ میں آپ کو زندگی بھر کے لیے فکری معاش سے ...
بے فکر کروں گا۔“

اتالیق کسی سوچ میں پڑ گیا، کچھ دیر بعد
بولتا۔ ”افسوس کہ میں دہلی نہیں چھوڑ سکتا۔“
فیروز بخت نے خوشامد کی۔ ”استاد محترم! آپ اپنے
فیصلے پر نظر ثانی کر لیجیے۔“

اتالیق نے جواب دیا۔ ”میں اپنا وطن دہلی نہیں چھوڑ
سکتا۔“

داؤد نے کہا۔ ”تب پھر اس حویلی میں آپ اپنے
خاندان کے ساتھ رہیے۔“

اتالیق نے بھیجی بھیجی ہنسی سے جواب دیا۔ ”داؤد!
میں ایک غریب آدمی ہوں، یہ حویلی میرے لیے ہاتھی سمیت
ہوگی اور میں ہاتھی نہیں پال سکتا۔“

اتالیق نے وہ رات حویلی میں گزاری۔ بعد میں جن
خدمت گاروں نے داؤد کے ساتھ جانا گوارا کیا، ان میں
سار تہا تھا۔ جیہ کو چھٹی دے دی گئی۔

ہ نے سے پہلے داؤد اور فیروز بخت گلنار سے ایک
بار مل لینا چاہتے تھے لیکن جب رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی
گئی تو معلوم ہوا گلنار کو آگرے روانہ کر دیا گیا ہے اور وہ
آگرے کے حرم سرا میں پہنچا دی گئی ہے۔ داؤد کے دل میں
گلنار کی محبت تھی۔ ایک ماں کی کوکھ میں رہنے والے بھائی،
بہن اچانت اس طرح بچھڑ گئے تھے کہ دوبارہ کہیں ملنے کا
امکان ہی ختم ہو گیا تھا۔

(جاری ہے)

کہانی کے قاری بھائی



کامیاب مفتوح

طاہر حباوید معنل

عورت کی رضا اور ساتھ کے بغیر جنگیں تو جیتی جاسکتی ہیں مگر... دل نہیں۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ماجرا تھا جب ایک انا اور دو بیمار کے مصداق ایک ہی چہرہ ان دونوں کی آنکھوں میں خواب بن کر اتر گیا تھا لیکن... کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ اس خواب کی تعبیر کس کے حق میں سیدھی اور کس کے لیے الٹی ثابت ہونے والی تھی۔

پہیلی کی صورت الجھا دینے والی ایک
دوشیزہ کا قصہ

جی اور تاب ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں کی آنکھوں سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔ دونوں کے بالائی جسم عریاں تھے۔ دوپہر کی چمکی دھوپ میں دونوں کے بازوؤں کی پھلیاں چمک رہی تھیں اور وہ

یہ ایک بالکل ویران جگہ تھی۔ یہ ایک چھوٹے سا سڑکا جزیرہ تھا۔ زمین ریشمی اور نیم گرم تھی۔ چاروں طرف گنا جھاڑ جھکاڑ تھا۔ اس جھاڑ جھکاڑ میں سے کہیں کہیں سمندر کے نیلگوں پانی کی جھلک بھی نظر آ جاتی تھی۔



Copied from web

ایک دوسرے پر جھپٹنے کے لیے بالکل تیار تھے۔
 جدید طرز کے زرد خیمے میں بیٹھی ہوئی بابرہ نے...
 بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس کے ہونٹ خشک ہونے لگے تھے،
 اس نے منزل واٹر کی بوتل سے دو گھونٹ پانی پیا اور اپنی
 آنکھوں سے اٹکتی ہوئی بے چینی کو چھپانے کے لیے گہرے
 رنگ کے سن گلاز لگائے۔ وہ تیس چوبیس سال کی ایک
 خوب روڑی تھی۔ اس نے ایک لمبی کڑھائی دار قمیص اور جینز
 پہنی ہوئی تھی۔ جمی اور ناب دوپہرے ہوئے ساندوں کی
 طرح ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے۔ دونوں جیسے
 لگا ہوں ہی لگا ہوں میں ایک دوسرے کو تول رہے تھے۔
 دونوں نے بازو پھیلا رکھے تھے اور اپنے پاؤں کو بڑے
 محتاط انداز میں حرکت دے رہے تھے۔ پھر ایک لڑائی
 شروع ہوئی۔ پہلا وار جمی نے ہی کیا۔ وہ بجلی کی سی تیزی
 سے بھٹکا اور اس نے ناب کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر اسے پشت
 کے بل ریت پر گرانا چاہا مگر ناب نے اپنی ٹانگیں پھیلا کر
 اور زور لگا کر خود کو گرنے سے بچایا۔ اس کے ساتھ ہی اس
 نے گھٹنے کا بھر پور وار جمی کی پسلیوں پر کیا اور پھر اس کے منہ
 پر جوڑی ٹھوکر سید کر کے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ جمی لڑکھڑاکر
 کئی قدم پیچھے چلا گیا۔ آپ سیکٹھ کے اندر اس کی ناک سے
 خون رسنا شروع ہو گیا۔ پہلے وار کی کامیابی کے بعد ناب
 نے پھرتی سے دوسرا وار کیا اور جمی کے منہ پر ٹانگ مارنا
 چاہی۔ اس مرتبہ جمی نے نود کو بچایا اور پھر ایک چنگھاڑ کے
 ساتھ اپنے حریف سے لپٹ گیا۔ اس نے ناب کی توانا
 گردن اپنے مضبوط بازو میں دیوچ لی تھی، دوسری طرف
 ناب نے اپنے بازوؤں کا شگوفہ جمی کی کمر کے گرد کس دیا۔
 دونوں پوری طاقت سے ایک دوسرے کو دھکیلنے لگے، بالکل
 جیسے دو ساندوں نے ایک دوسرے میں سینک پھنسا لیے
 ہوں اور اب جسم و جاں کی اپری توانائی سے ایک دوسرے کو
 دھکیل کر کسی گہری کھائی میں گرا دینا چاہتے ہوں۔ بابرہ اب
 بے چینی کے عالم میں کھڑی ہو چکی تھی۔ وہ بار بار اپنے خشک
 ہونٹوں پر زبان پھیرتی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان
 دونوں میں سے کون یہ خونی مقابلہ جیتے گا اور اس خیمے میں
 اس کا "دلہا" بنے گا..... اس کے جسم و جاں کا مالک۔
 شاید یہ وہی منظر تھا جو دئے زمین پر روز اول سے بار
 بار دہرایا جاتا رہا ہے۔ چہند پرند سے لے کر اشرف
 مخلوقات تک سب ذی نفس اس منظر کا حصہ رہے ہیں۔ اگر
 واضح الفاظ میں یہ بات کہی جائے تو شاید یوں ہوگی..... ایک
 ماہ کے لیے دونوں کا گمراؤ..... جو ہمیشہ سے جاری ہے۔

اوقیانوس کے اس دیران جزیرے پر ایک تنہا خیمے
 کے سامنے دلکش بابرہ کے رو برد جو کچھ ہو رہا تھا، اس کے
 بارے میں جاننے کے لیے ہمیں تین چار ماہ پیچھے جانا پڑے
 گا۔ یہ کہانی جولائی کی اس حسین شام کو شروع ہوئی تھی جب
 جمی یعنی جمیل اور نائل عرف ناب آئیں کریم کھانے کے لیے
 ایک آئیں کریم پارلر میں گئے تھے۔ یہ دونوں نوجوان
 دوست، ہوانا کے ہی رہائشی تھے۔ دونوں کے آباء کا تعلق
 پاکستان سے تھا اور دونوں کی فیملیوں پر یا ساتھ برس سے
 گویا بائیں رہائش پذیر تھیں۔ دونوں کا تعلق یہاں کے خوش
 حال کاروباری گھرانوں سے تھا۔ دونوں غیر شادی شدہ تھے
 اور تقریباً یکساں تعلیم یافتہ بھی تھے۔ شکل و صورت کے لحاظ
 سے بھی کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی تھی۔
 ہاں نائل کے خدو خال میں سخی اور مردانہ پن نسبتاً زیادہ نظر
 آتا تھا۔ اس کی ٹھوڑی کے نیچے ایک پرانے زخم کا قوس نما
 نشان بھی تھا، تاہم یہ نشان اس کے چہرے کی دلکشی کو کسی طور
 متاثر نہیں کرتا تھا۔ جمیل کے چہرے کے نقوش نسبتاً چمکے
 تھے۔ دونوں دراز قد اور نہایت ورزشی جسم کے مالک تھے
 اور یہ بھی اتفاق تھا کہ دونوں نے کالج کے زمانے میں ایک
 ہی انسٹیٹیوٹ سے مارشل آرٹ کی ٹریننگ بھی حاصل کی
 تھی..... کئی کوچوں اور گلوبوں وغیرہ میں ہونے والی لڑائیوں
 مار کٹائیوں کے لیے تربیت حاصل کرنا اکثر نوجوانوں کا شوق
 تھا۔ جمیل اور نائل بھی ایسی مارا ماری میں کافی طاق تھے۔ کئی
 مواقع پر وہ مقامی اور غیر مقامی پھڈے بازوں کے ساتھ
 نہایت کامیابی سے نمٹ چکے تھے۔
 جولائی کی اس خوشگوار شام کو جب وہ دونوں اس
 آئیں کریم پارلر میں داخل ہوئے تو انہیں ہرگز معلوم نہیں تھا
 کہ یہاں جمی ایک پھڈا ان کا منتظر ہے۔ بہر حال اس
 پھڈے کا تعلق لڑائی مار کٹائی سے نہیں، حسن و عشق سے تھا۔
 جمی اور ناب نے پارلر کی ایک میز پر ایک حسین لڑکی کو اپنے
 میل اور فی میل دوستوں کے ساتھ بیٹھے اور باتیں کرتے
 دیکھا۔ وہ جب ہنستی تو ہر طرف پھول سے بکھرتے محسوس
 ہوتے تھے اور جب باتیں کرتے کرتے اپنے سیاہ ریشمی
 بالوں کو دائیں ہاتھ سے چہرے پر سے ہٹاتی تو یوں لگتا جیسے
 چاند بادلوں کے پیچھے چھپتا چھپتا پھر نمودار ہو گیا ہو۔ اس کی
 ہر ادا حیر کی طرح دیکھنے والے (حضرات) کے دل پر گنتی اور
 نیم نکل کر دیتی تھی۔ جمی اور ناب بھی اس شام ایک ساتھ ہی
 نکل ہوئے۔ تھے اور دونوں نے اپنے سینے میں اس لڑکی کے
 لیے ایک آگ۔ سی بھڑکتی محسوس کی تھی۔ یہی بات تھی کہ وہ

پاکستانی یا انڈین ہے۔۔۔ بے شک وہ ایک جھگے آکس کریم پارلر میں پیشی گئی تاہم اس کے لباس اور اس کے دوستوں وغیرہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی وہ خوش پوش لوگ۔ جنہوں نے ابھی خوش حالی اور امارت کی سیڑھیوں پر قدم نہیں رکھے ہوتے۔

”کیا کیا جائے؟“ نبی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔
”کرنا کیا ہے پکڑ کر..... شادی کر لیتے ہیں۔“ ناب نے کہا۔

”شادی تو صرف ایک سے ہو سکتی ہے۔“
”تو بھئی میں ہوں نا، اس نیک کام کے لیے۔“ ناب نے تڑت جواب دیا۔

جی نے مکا تانا۔ ”خیر دار! اس قسم کے گندے ناپاک خیال ذہن میں نہ لانا..... اب یہ لڑکی تمہارے لیے عزت کی جگہ پر ہے کیونکہ تمہارا عزیز ترین دوست اسے اپنے لیے پسند کر چکا ہے۔“

”یہی بات میں تم سے کہنا چاہتا ہوں اور بالکل انہی لفظوں میں۔“ ناب نے کہا اور جی پر جوانی وار کرنے کے لیے ایٹش ٹرے اٹھالی۔

وہ دونوں نہیں جانتے تھے کہ ہنسی مذاق کی یہ صورت حال کتنی جلد تبدیل ہونے والی ہے۔ یہ لڑکی اس طرح دونوں کے اعصاب پر سوار ہونے والی ہے کہ وہ اچھے دوستوں سے بدترین دشمنوں میں بدل جائیں گے۔

وہاں آکس کریم پارلر میں بیٹھے بیٹھے ان دونوں نے فیصلہ کیا کہ لڑکی کے کوائف معلوم کیے جائیں اور دیکھا جائے کہ وہ کس باغ کی مولیٰ ہے اور اس مولیٰ کو کس طرح اکھاڑا اور اپنی دسترس میں لایا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک نادر پدر آزاد معاشرہ تھا۔ مرد و زنان کا تعلق سماجی پابندیوں سے تقریباً آزاد تھا۔ جوڑوں کے شادی کے بغیر اکٹھے رہنے کی بات تو اب بہت پرانی ہو چکی ہے۔ مغربی معاشرے میں تو اب معاملات اس سے بھی آگے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس ماحول کا اثر یقیناً ان غیر ملکیوں پر بھی پڑتا ہے جو مغرب کے بجائے مشرق سے تعلق رکھتے ہیں اور مغربی ممالک میں آباد ہو جاتے ہیں۔ جی اور ناب بھی انہی تارکین وطن میں شامل تھے اور غالباً وہ لڑکی بھی جو بولڈ لباس پہنے ہوئے، چند میزیں چھوڑ کر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔

اگلے آٹھ دس روز میں جی اور ناب نے لڑکی کا سارا حدود اربعہ دریافت کر لیا۔ اس کے لیے انہوں نے اپنے ایک تیسرے دوست کی خدمات حاصل کی تھیں جو ایسے

کاموں میں خاصا ماہر تھا۔ لڑکی کا نام بابره معلوم ہوا۔ وہ ان کے اندازوں کے عین مطابق پاکستانی تھی..... یعنی اس کے ”بڑے“ پاکستان سے تعلق رکھتے تھے۔ لڑکی کے والدین ایک ٹریفک حادثے میں انتقال کر چکے تھے۔ اس کی صرف ایک بہن تھی جو اپنے ”منہ بولے“ خاندان کے ساتھ امریکا میں رہتی تھی۔ بابره یہاں ہوانا میں اپنی دو بھارتی فرینڈز کے ساتھ رہائش پذیر تھی اور ایک اشتہاری فرم میں جاب کرتی تھی۔ اس کا تھوڑا بہت بینک بیلنس بھی تھا۔ ذاتی بانکینگ بھی جس پر وہ آکس آتی جاتی تھی۔ ایک حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ اس کی کہیں مکملی وغیرہ بھی نہیں ہوئی تھی، نہ ہی اس کے کسی سنجیدہ بوائے فرینڈ کا کھوج ملا۔ وہ جی اور ناب کے لیے ہر لحاظ سے ایک موزوں کیس تھی۔ وہ دونوں ہی اس قابل تھے کہ اپنی شخصیت اور اپنی مالی حیثیت کے بل بوتے پر بابره کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے سکتے تھے اور یہیں سے جی اور ناب کے درمیان ایک خاموش چپقلش شروع ہو گئی۔

دو دنوں میں سے کوئی ابھی تک براہ راست بابره سے ملا نہیں تھا لیکن وہ دونوں جان چکے تھے کہ وہ اسے حاصل کر سکتے ہیں۔ جو بھی اس کی طرف قدم بڑھاتا، وہ تھوڑی سی کوشش سے اس ڈل کلاس لڑکی کو اپنے تصرف میں لے آتا لیکن سوال یہ تھا کہ اس کی طرف قدم بڑھائے گا کون؟ جی یا ناب؟

ایک موقع پر جمیل عرف جی نے بغیر اپنا نام پتا بتائے بابره سے فون پر تھوڑی سی بات کی۔ اس بات کا پتا جمیل یعنی ناب کو چل گیا۔ دونوں میں سچ جملوں کا تبادلہ ہوا کیونکہ دونوں میں یہ طے ہوا تھا کہ وہ بابره کے سلسلے میں جو کچھ بھی کریں گے باہمی مشورے سے کریں گے۔ پھر ایک دن جی کو پتا چلا کہ ناب نے بے وجہ بابره کے آفس میں جا کر اس سے ملنے کی کوشش کی ہے۔ ایک بار پھر دونوں میں سچ کلامی ہوئی۔ اس سچ کلامی کے بعد دونوں کو اپنے اپنے کچھ پرانے زخم بھی یاد آ گئے۔ یہ روزمرہ زندگی میں سامنے آنے والے چھوٹے چھوٹے اختلافات تھے جو اس نئے اختلاف کی وجہ سے اب بڑے اور سنگین دکھائی دینے لگے تھے۔ جی نے اپنی جو اسپورٹ کار ناب کو بچھلے کئی ماہ سے چلانے کے لیے دے رکھی تھی (اور جسے وہ نئے کی حالت میں ٹھونک بھی چکا تھا) اس سے واپس مانگ لی۔ دوسری طرف ناب نے اپنے ایک باکسنگ کلب میں سے جی کا شیئر یہ کہہ کر نکال دیا کہ کلب کا کاروبار گھٹانے میں جا رہا ہے۔ ایک تقریب میں ڈرنک کرتے ہوئے ناب نے جی کی ایک جرمن دوست

لڑکی سے بدتمیزی کی۔ جی بھی نشے کی حالت میں تھا، اس نے تاب سے کہا۔ ”چھوڑی تاکہ والے، اپنے ہاتھوں کو اس لڑکی سے دور رکھو۔“

دونوں ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے لیکن دوستوں نے بچاؤ کر دیا۔ بہر حال یہ سلسلہ رکنا نہیں۔ دن بدن آگے بڑھتا رہا اور اس کی بنیادی وجہ وہی خوش ادا و خوش انعام بابرہ تھی۔ اس کو شاید پتا بھی نہیں تھا کہ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے اور دو امیر زادے شکاریوں کا روپ دھار کر اس پر جھپٹنے کی تیاری کر رہے ہیں۔

دونوں کے مشترکہ دوست حیران تھے کہ دونوں کو دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہو گیا ہے۔ وہ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں رہے تھے بلکہ کسی وقت تو لگتا تھا جیسے ان کے حوالے سے کوئی سنگین واقعہ رونما ہو جائے گا۔ دونوں کے قریبی دوست نیڑی کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ یہ کو تاہ قد بڈی وہی تھا جس نے کچھ عرصہ قبل ان دونوں کے لیے بابرہ کے کوائف اکٹھے کیے تھے اور پھر ایک دن یہ باہمی تناؤ اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ تاب دندا تا ہوا جی کے آفس میں داخل ہوا اور اس سے کہا کہ وہ اکیلے میں اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ جی نے اپنے دو ملازموں کو آفس سے نکال دیا۔ تاب نے جی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور پھنکارتے ہوئے لہجے میں یولا۔ ”فیصلہ کرلو۔“

کیسا فیصلہ؟

”راستے سے ہٹ جاؤ..... یا مجھے ہٹا دو۔“

جی چند لمبے تک اسے گھورنے والے انداز میں دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے انداز میں یولا۔ ”لڑنا چاہتے ہو؟“

”لڑے بغیر اگر کوئی طریقہ ہے تو مجھے بتا دو۔“ تاب نے جوابی سوال کیا۔ اس کی آواز میں شعلے رقصاں تھے اور بازوؤں کی مچھلیاں جیسے پھڑک رہی تھیں۔

اس روز اس کمرے میں ان دونوں کے درمیان کچھ طے ہو گیا۔ یہ بہت اٹوکھا تھا لیکن جو کچھ بھی تھا، بہت سنجیدگی سے کہا اور سنا گیا تھا۔ ان دونوں نے آپس میں ایک طرح کا ”ڈاکل“ لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہی طریقہ کار جو دو افراد اپنے ناقابل حل مسئلے کے حل کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں، جو جیت جاتا ہے، وہ منزل مراد پاتا ہے، جو ہار جاتا ہے موت کا حق دار ٹھہرتا ہے۔ اس دن جی اور تاب کے درمیان سب کچھ فائل ہو گیا اور وہ طریقہ بھی طے ہو گیا جس پر عمل کرنے کے انہوں نے بابرہ سے رابطہ کرنا تھا اور اسے مقابلے کی جگہ پر اپنے ساتھ لے جانا تھا۔

وہ ایک ساتھ ہی اس سے ملے تھے اور اسے اپنے ساتھ ایک قاتلو اسٹار ہوٹل میں لٹچ کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ وہ تینوں جنب گاڑی میں ہوٹل کی طرف جا رہے تھے، بمیل نے پروگرام کے مطابق اچانک ہی بابرہ کے چہرے کے سامنے بے ہوشی والا اسپرے کر دیا تھا۔ وہ چکرا کر نشست پر گری اور چند سیکنڈ میں بے ہوش ہو گئی تھی۔

اور اب وہ تینوں ہوانا سے قریباً سو کلومیٹر دور اس چھوٹے سے گنٹام جزیرے پر موجود تھے۔ یہ بالکل... بے آباد جزیرہ تھا۔ یہاں دوسری جنگ عظیم کی چند فوجی بیرکوں کے کھنڈروں کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ شاید ہی کبھی دو چار ماہ بعد کوئی ہم جو اس طرف آتا ہو۔ بہر حال جی اور تاب یہاں تہی دست نہیں تھے۔ وہ اپنے ساتھ کھانے پینے اور رہنے سہنے کا دافر سامان لے کر آئے تھے جس میں ایک گلوڑی بچہ بھی شامل تھا۔ اپنی موٹر بوٹ انہوں نے ساحل کے گھنے درختوں میں چھپا دی تھی۔ جسمانی طاقت کی اس جنگ میں دونوں میں سے جس نے بھی جیتنا تھا، اس نے یہاں بابرہ کے ساتھ اپنی فتح کا جشن منانا تھا۔ یہاں اتنا سامان موجود تھا کہ وہ کم از کم دو ماہ تک یہاں واہمیش دے سکتا تھا۔ اب یہ واہمیش کون دے گا، اس کا فیصلہ اس لڑائی کے بعد ہونا تھا۔ بابرہ نے اس سارے معاملے میں خود کو بالکل نیوٹرل ظاہر کر دیا تھا۔ وہ یہ خونی لڑائی نہیں چاہتی تھی لیکن یہاں کچھ بھی اس کی مرضی کے مطابق نہیں ہو رہا تھا۔ ایک طویل بحث کے بعد اس نے اس بات پر آمادگی ظاہر کر دی تھی کہ ان دونوں میں سے جو بھی جیت گیا، وہ یہاں اس کے ساتھ رہنا قبول کرے گی۔

اب ہم ایک بار پھر خیمے کے سامنے کے منظر کی طرف آتے ہیں۔ جی نے تاب کی توانا گردن اپنے بازو میں جکڑ رکھی تھی، تاب اس کے نیچے رکوع کے بل جھکا ہوا تھا تاہم اس طرح جھے جھکے بھی اس نے جی کی کمر کے گرد اپنے مضبوط بازوؤں کا کھلبہ کسا ہوا تھا۔ اگر جی اس کی گردن پر دباؤ بڑھا کر اسے بے بس کرنے کی کوشش کرتا تو وہ بیچھے سے اس کی کمر کو اس بری طرح جھکے دیتا کہ وہ گردن پر گرفت نرم کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ دونوں پسینے میں نہانے تھے اور بری طرح ہانپ رہے تھے۔ بابرہ خیمے میں بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ وہ بالکل خالی ہاتھ تھی۔ فی الوقت خیمے میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں تھی جسے وہ کسی بھی طرح کسی پر حملہ کرنے کے لیے یا پھر اپنا دفاع کرنے کے لیے استعمال کر سکتی۔ وہ دونوں جو ساز و سامان بھی اپنے ساتھ لائے تھے، اس وقت

سنہری باتیں

☆ گناہ سے ہر وقت بچ، مگر تہائی میں گناہ سے خاص طور پر بچ کیونکہ اس گناہ کا گواہ خود اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔

☆ اپنی زبان کی تیزی اس ماں پر مت آزماؤ جیسے تمہیں بولنا سکھایا۔

☆ لفظ انسان کے غلام ہوتے ہیں مگر بولنے سے پہلے۔ بولنے کے بعد انسان اپنے لفظوں کا غلام بن جاتا ہے۔

☆ کوشش کرو کہ تم دنیا میں رہو، دنیا تم میں نہ رہے کیونکہ شستی جب تک پانی میں رہتی ہے تیرتی رہتی ہے لیکن جب پانی شستی میں آجاتا ہے تو وہ ڈوب جاتی ہے۔

☆ اگر کوئی محبت کرنے والا انسان آپ پر غصہ کرنا چھوڑ دے۔ تو سمجھ لو کہ آپ اس کی نظر میں اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔

☆ اگر لوگ تم سے متاثر ہو رہے ہوں تو تکبر نہ کرو شکر ادا کرو، اپنے رب کا جس نے تمہارے عیب چھپا کر تمہیں لوگوں میں معزز بنا رکھا ہے۔

☆ ہم یہ بھی نہیں جان پاتے کہ ہم کسی سے عام لوگوں کی نسبت زیادہ کس لیے وابستہ ہو جاتے ہیں بغیر کسی وجہ کے لوگوں سے کیوں پیار کرنے لگتے ہیں، ہم ان کی موجودگی میں خوش اور ان کی غیر حاضری میں اداس کیوں ہو جاتے ہیں۔ شاید کچھ رشتے وضاحت طلب نہیں ہوتے۔

مرسلہ: اختر شاہ عارف، ڈھوک جمعہ، جہلم

آپ کا نام کیا رکھوں؟

پھوں رکھوں تو بکھر جاؤ گے، دل کہوں تو ٹوٹ جاؤ گے، جان کہوں تو نکل جاؤ گے، چلو تمہارا نام لوڈ شیڈنگ رکھتے ہیں، جاؤ گے تو 2 گھنٹے بعد خود ہی واپس آؤ گے۔

مرسلہ رضوان بخوی کریزیوی، اورنگی ٹاؤن کراچی۔

موثر بوٹ میں پڑا تھا جو یہاں سے کافی فاصلے پر تھی۔ بوٹ پر فرار ہونے کا امکان بھی بعید از قیاس تھا۔ وہ موثر بوٹ کی الف ب سے بھی واقف نہیں تھی۔ درحقیقت وہ یہاں مکمل طور پر ان دونوں کے رحم و کرم پر تھی۔ وہ دونوں میں سے کسی کی طرف دار بھی نہیں تھی۔ دونوں جو کچھ کر رہے تھے، برا کر رہے تھے۔ وہ تو بس یہ چاہتی تھی کہ یہ لڑائی جلد از جلد ختم ہو جائے۔

اچانک تاب کا داؤ چل گیا۔ اس نے یکا یک جی کی کمر پر اتنا شدید دباؤ ڈالا کہ اس کی گردن پر جی کی گرفت نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ تاب نے زور مارا اور کسی بھینسے کی طرح جی کو دھکیلتا ہوا خیمے سے نکرایا۔ خیمہ ز میں بوس ہو گیا۔ بابرہ خوف سے چلاتی ہوئی باہر نکل اور دور جا کھڑی ہوئی۔ اب جی، تاب کے نیچے تھا اور وہ اپنے گھونٹوں سے اس کے چہرے کا بھرتا بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد جی نے تیزی سے پیٹرا بدلا اور تاب کی گرفت سے نکل گیا۔ دونوں ایک بار پھر کھڑے ہو گئے۔ دونوں کے چہرے خون سے لہکتے تھے۔ جی کی ناک پر زیادہ جوت آئی تھی، تاہم کسی ضرب کی وجہ سے تاب کی ناک بھی سوج گئی تھی اور معمول سے زیادہ موٹی دکھائی دینے لگی تھی۔ اس کا جیڑا قدرے چوڑا تھا اور اس کے ناتوش کی سختی کو نمایاں کرتا تھا۔ یہ جیڑا بھی ٹھوڑی کے پاس سے زخمی ہو گیا تھا۔

دونوں نے ایک بار پھر اپنے بازو پھیلا لیے اور ایک دوسرے کے گرد نیم دائرے کی شکل میں گھومنے لگے۔ دونوں ہوانا کے گلی کوچوں سے جانے پہچانے فائز تھے۔ کوئی بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ان دونوں نے قریباً پانچ منٹ مزید فائٹ کی جس نے انہیں کچھ مزید زخمی اور تڑ حال کیا۔ یہاں تو کوئی ریلگری بھی نہیں تھا جو اس لڑائی میں وقفہ دیتا یا راؤنڈ ختم ہونے کا اعلان کرتا۔

انہوں نے اپنی مدد آپ کے تحت ہی ایک وقفہ لیا اور ایک دوسرے سے قریباً تیس فٹ کی دوری پر بیٹھ کر ہانپنے لگے۔ بالکل جیسے دو چوپائے اپنی مادہ کے لیے جنگ لڑتے لڑتے بالکل تڑ حال ہو جائیں اور ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو کر ہانپنے لگیں۔

جی کا بس نہیں چل رہا تھا، ورنہ وہ خالی ہاتھوں سے ہی تاب کا پیٹ پھاڑ ڈالتا اور اس کی انتڑیاں ہوا میں اچھال دیتا۔ لڑائی کے اصولوں کے مطابق وہ دونوں کوئی ہتھیار استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ ہتھیار ان دونوں کے پاس تھا ہی نہیں۔ وہ اپنے سامان میں بھی کسی طرح کا ہتھیار لے کر نہیں آئے

قریب آنے کے لیے کہا۔ یہ تاؤ دلائے والا انداز تھا اور دوبارہ مقابلے کی دعوت تھی۔

تاب بھی اب قدرے تازہ دم ہو چکا تھا۔ وہ لیے ڈگ بھرتا، داہنی کی طرف آیا۔ تاب کو معلوم تھا کہ اسے جی کو کہاں ضرب لگانی چاہیے۔ وہ جانتا تھا کہ ایک پرانی لڑائی میں جی کے دائیں گھٹنے پر شدید چوٹ آئی تھی اور وہ اب بھی اس ٹانگ کا بھرپور استعمال نہیں کر پارہا۔ اگر وہ اس کے گھٹنے کو مزید نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا تو لڑائی کا نتیجہ اس کے حق میں نکل سکتا تھا۔ دوسری طرف جی بھی جانتا تھا کہ اس نے ہر صورت تاب کے دائیں کے سے بچنا ہے۔ یوں تو دونوں مارشل آرٹ کی شد بد رکھتے تھے، بہر حال تاب کو خاص طور سے باکٹنگ سے دلچسپی تھی۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کے طوقالی گھونٹے سے ہوانا کے کئی غنڈوں کو خاک چٹوائی تھی..... ایک بار ہمدردیوں میں زور دار لڑائی شروع ہو گئی۔

دو تین منٹ بعد ہی جی نے اچانک اڑنگا لگا کر تاب کو پشت کے بل ریت پر گرالیا اور اس کو چھاپ لیا۔ تاب کے چوڑے جڑے پر بے تحاشا گھونٹے برساتے ہوئے وہ بولا۔ ”پاسرڈ! ایک لاکھ لڑکیاں تمیں ہوانا میں۔ تجھے بس یہی نظر آتی رہی..... یہی نظر آتی رہی۔“

تاب نے اس زہریلی بات کا جواب عملی طور پر دیا۔ اس نے اچانک ہی پٹی کھائی اور پھر زور لگا کر خود کو جی کے نیچے سے نکال لیا۔ ایک چنگھاڑ کے ساتھ اس نے جی کی ناف میں ٹانگ رسید کی اور یہیں پر اسے وہ موقع بھی مل گیا جسے وہ دیر سے تلاش کر رہا تھا۔ ناف پر ضرب کھا کر جیل عرف جی آگے جھکا اور اپنے چہرے کا دفاع بھول گیا۔ تاب کا نہایت خطرناک دیاں گھونسا اس کے منہ پر پڑا اور اس کی آنکھوں میں رنگ بگنے ستارے نایج گئے۔ وہ سہارے کے لیے ہاتھ پاؤں چلاتا نیم گرم ریت پر گرا۔ اس کے کانوں میں اپنی ٹانگ نہا ہڈی ٹوٹنے کی آواز آئی تھی۔ نیل یعنی تاب جھپ کرنے والے انداز میں اس کی طرف آیا اور ایک اور گھونسا اس کے جڑے پر مارا۔ اس گھونٹے نے جی کی رہی سہی مدافعت بھی ختم کر دی۔ وہ بے ہوش ہو گیا لیکن تاب نے یہیں پر بس نہیں کیا۔ وہ مسلسل اس کے منہ پر اپنے گھونٹوں کے تھوڑے، برساتا رہا..... اور اپنی پوری تسلی کی کہ اب وہ قطعی طور پر مزاحمت کے قابل نہیں ہے۔

جی کا چہرہ خون سے رنگین ہو چکا تھا۔ وہ بے سدھ پڑا تھا۔ بے شک، اس نے زبردست مقابلہ کیا تھا لیکن کچھ بھی تھا، دونوں میں سے کسی ایک نے ہی جیتتا تھا اور یہ جیت

تھی۔ یہ لڑائی انہوں نے UFC کے کھیل کی طرح خالی ہاتھ لڑنا تھی۔ آخر میں دونوں میں سے کسی ایک کو کھل ناک آؤٹ ہو جانا تھا یا پھر کسی خطرناک داؤ میں پھنسنے کے بعد اس بات کا اشارہ دینا تھا کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے یہ مقابلہ ختم کرنا چاہتا ہے۔ یہ اشارہ ہاتھ وغیرہ ہلا کر یا پھر یوں کر دیا جاسکتا تھا۔ ہارنے والے کو خاموشی کے ساتھ یہ جگہ چھوڑ جانا تھی اور پھر پلٹ کر اس طرف نہیں دیکھنا تھا۔ جیتنے والے کو یہاں باہرہ کے ساتھ عیش و آرام۔ یہ چند منٹ گزارنا تھے۔

سوچتے سوچتے جی نے گرے ہوئے خیمے کی طرف دیکھا۔ وہاں باہرہ دوزخ آؤٹ تھی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنے چہرے کے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ دنیا بے انداز میں کچھ بول رہی تھی۔ جی نے سوچا، وہ کیا دعا مانگ رہی ہوگی۔ شاید یہ مانگ رہی ہوگی کہ لڑتے لڑتے وہ دونوں ہی مر جائیں یا نیم جان ہو جائیں اور وہ کسی طرح یہاں سے نکل جائے یا شاید وہ اس لڑائی میں خود اس کے جیتنے کی دعا مانگ رہی ہو، بے شک وہ اور تاب ہر لحاظ سے بالکل ایک جیسے تھے۔ حتیٰ کہ شکل و صورت کے اعتبار سے بھی وہ ہم پلہ ہی تھے۔ بہر حال جی کے نقوش تھوڑے سے پیچھے تھے۔ تاب کے نقوش قدرے سونے اور سخت تھے اور ان میں مردانگی کی جھلک نسبتاً زیادہ تھی۔ ممکن تھا کہ اس حوالے سے باہرہ اسے تاب پر تھوڑی سی ترجیح دیتی اور تاب کے بجائے اس کے ساتھ رہنا پسند کرتی۔

دوسری طرف تاب بھی دیکھ رہا تھا کہ باہرہ نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور دعا سنیہ انداز میں بڑبڑا رہی ہے۔ وہ کیا دعا مانگ رہی تھی؟ شاید یہ کہ ان دونوں کے ہوش ٹھکانے آجائیں اور وہ اس خون خرابے سے رک جائیں یا شاید وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے لیے کامیابی کی دعا مانگ رہی تھی۔ گاڑی میں سب انہوں نے باہرہ کو بے ہوش کیا تھا تو ابیر سے کالپ جی نے ہی باہرہ کے منہ پر مارا تھا۔ یعنی بات تھی کہ باہرہ کو یہ واقعہ یاد ہوگا۔ یہ واقعہ اس کے لیے تاب کے انتخاب کا تھوڑا سا جواز پیدا کر سکتا تھا۔ بہر حال وہ یہ بھی جانتا تھا کہ باہرہ دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی یہاں رہنے کے لیے تیار ہے۔

چند منٹ بعد جی اپنی جگہ سے اٹھا تو تاب نے بھی فوراً اٹھ جانا مناسب سمجھا۔ اگر وہ بیخار رہتا تو جی کو یہی تاثر ملتا کہ وہ ابھی تک ہانپا ہوا ہے۔ جی نے کھڑے ہونے کے بعد بڑی نفرت سے زمین پر تھوکا اور پھر اپنی دائیں ہتھیلی کو آسمان کی طرف اٹھا کر انگلیوں کے اشارے سے تاب کو اپنے

میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا واقعی تم سچ سنا چاہتے ہو؟“

”ہاں، میں سچ سنا چاہتا ہوں۔“

وہ دھیرے سے مسکرائی اور گہری سانس لے کر بولی۔

”میں وہی کہہ رہی ہوں جو میرے دل میں تھا۔ میں نے وہ دعا

تمہارے لیے مانگی تھی..... تمہاری جیت کے لیے۔“

اب کے سینے میں خوشگوار اور پُر جوش دھڑکنیں جاگ

گئیں۔ وہ مسکرایا۔ ”کیوں ہنی؟“

بابرہ نے جوس کا گھونٹ بھر کر کہا۔ ”بھئی بات یہ ہے

کہ کوئی خاص وجہ تو نہیں تھی۔ تم دونوں میں سے کسی ایک کو

دوسرے پر ترجیح دینا خاصا مشکل کام ہے۔ بس پتا نہیں

کیوں میرے دل میں آئی اور میں نے تمہارے حق میں دعا

مانگی۔ شاید ایسی کسی لڑائی کو دیکھتے ہوئے بالکل غیر جانبدار

رہنا کافی مشکل ہوتا ہے۔ دیکھنے والے کا پلڑا کسی طرف تو

تھوڑا بہت جھکتا ہی ہے۔“

”یعنی مجھے کسی خوش فہمی میں جھٹلا نہیں رہنا چاہیے۔“

وہ ہنسی اور ٹینٹ لیسپ کی روشنی میں اس کے دانت

کلیوں کی طرح دکھ اٹھے۔

بابرہ نے پُر جوش انداز میں اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

وہ اس کے خمین چہرے کے نشیب و فراز میں گم ہونے لگا۔

اگر وہ سچ کہہ رہی تھی، تو یہی بڑی بات تھی کہ کوئی خاص وجہ نہ

ہونے کے باوجود اس نے اسے جی پر ترجیح دی تھی۔

بابرہ کو اپنی بانہوں میں لے کر باب بہت خوش تھا۔

وہ اس کی رگ جاں میں اترتی جا رہی تھی۔ نشے نے اس کے

قرب کے سرور کو دو آتشہ کر دیا۔ ان کی نزدیکی بڑھتی چلی

گئی۔ بابرہ اس پر ہر طرح مہربان نظر آتی تھی۔ یہی وجہ تھی

کہ جب اس کے سر کے پھیلے حصے پر کسی وزنی چیز سے

اچانک شدید ضرب لگائی گئی تو وہ سشدر رہ گیا۔ یہ چوٹ

بابرہ کے علاوہ اور کون لگا سکتا تھا۔

یہ کیا ہوا؟ اس نے سوچا اور اس کا ذہن اتھاہ تاریکی

میں ڈوب چلا گیا۔

☆☆☆

اسے دوبارہ ہوش آیا تو وہ اسی خیمے میں چت پڑا تھا۔

اسے اندازہ ہوا کہ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ہوش میں آیا ہے۔

اس نے اپنے کی کوشش کی تو اسے پتا چلا کہ اس کے ہاتھ ہی

نہیں، دونوں پاؤں بھی ٹانگوں کی رسی سے جکڑے ہوئے

ہیں۔ وہ ٹھہ نہیں سکا۔ تب اس نے جی کو دیکھا۔ وہ بھی خیمے

کے اندر ہی موجود تھا۔ وہ بھی لیٹا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں

اب آزاد تھے۔ غالباً جو رسی کھولی گئی تھی، اسی سے اب باب

باب کے حصے میں آئی تھی۔ باب نے نلرت سے جی کے جسم

پر تھوکا۔ پھر وہ ڈنگا تا ہوا خیمے کی طرف آیا۔ سکتہ زدہ بابرہ

کے قریب ہی ٹانگوں کی ایک رسی پڑی تھی۔ وہ اسے لے کر

دوبارہ جی کی طرف بڑھا۔ اس نے احتیاط کے طور پر جی

کے بازو اور ٹانگیں رسی کی بندش میں جکڑ دیں۔

☆☆☆

یہ صبح کی شام تھی۔ اس شام سے آگے ایک پُر لطف

رنگین شب باب کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے بابرہ کے ساتھ

ٹل کر گرا ہوا خیمہ دوبارہ کھڑا کر دیا تھا۔ وہ موٹریوٹ میں

سے کھانے پینے کے دائرہ سامان کے علاوہ مرہم پٹی کی اشیا

بھی لے آیا تھا۔ اس نے اپنی چوٹیوں پر خود ہی بیٹن جی وغیرہ

کی گئی۔ کسی درد کش دوا کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ تیز دھسکی

نے اس کے رگ دے میں سرور بھر دیا اور اس کی ہر جسمانی

تکلیف کو پس منظر میں دھکیل دیا۔ ہوا نیم گرم اور خوشگوار

تھی۔ خیمے سے پندرہ بیس میٹر کی دوری پر جی ابھی تک بے

سدا پڑا تھا۔ اس کی گہری بے ہوشی اب نیم بے ہوشی میں

بدل چکی تھی اور کبھی کبھی اس کی مدھم کراہ بھی سنائی دے جاتی

تھی۔ اس کا چہرہ اسی طہیرح خون میں لہکتا ہوا تھا۔ باب کو

امید تھی کہ وہ صبح تک نمل ہوش میں آجائے گا اور.....

پروگرام کے مطابق عمل کرتے ہوئے جریرے سے نکل

جائے گا۔ اگر وہ نہ بھی نکلتا تو باب اب اس قابل تھا کہ اس

کی ایک آدھ مزید بڑی تڑکرا سے یہاں سے چلا کرتا۔

باب ایک کشن سے ٹیک لگا کر خیمے میں نیم دراز

ہو گیا۔ بابرہ نے اسے دھسکی کا گلاس پیش کیا۔ باب کی

ہدایت کے مطابق اب اس نے ایک مختصر لباس پہن لیا تھا۔

اس لباس میں وہ ہمیشہ سے زیادہ خوب صورت نظر آ رہی تھی

یا شاید اس کی وجہ وہ دھسکی تھی جو باب کے اندر مسلسل آتش

جگا رہی تھی۔ خوش اندام بابرہ کے علاوہ بھی اسے ارد گرد کی

ہر شے خوب صورت نظر آنے لگی تھی۔

”مجھے ایک بات بتاؤ ہنی۔“ باب نے بابرہ کے

بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

”کیا؟“ اس نے باب کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

”جب ہم لڑ رہے تھے، میں نے تمہیں دعا مانگتے

ہوئے دیکھا تھا۔ مجھے سچ بتانا ہنی..... میں تمہیں ایک سو

ایک فیصد گارنٹی دیتا ہوں کہ تمہارا جواب جو بھی ہوگا، میں

اس پر کسی طرح کی ناراضگی ظاہر نہیں کروں گا۔ نہ اب، نہ

پھر بھی..... مجھے بتاؤ کہ تم نے کیا ”پرے“ کی تھی؟“

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر براہ راست باب کی آنکھوں

نہ سمجھاؤ۔ صاف بتاؤ کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں اکیسویں صدی کی عورت ہوں۔ میں اس ”سوکالڈ“ سوئیر میں جیتنے والے کو اپنا آپ نہیں سوچوں گی..... اور یہ فیصلہ میں نے تم دونوں کی لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی کر لیا تھا۔ میں گائے بکری نہیں ہوں۔ میں خود کو جیت کا تحفہ کیوں بناؤں؟ کیوں نہ میں خود کسی کو جیتوں اور میں اس لڑائی میں جیتنے والے کو تو جیت نہیں سکتی تھی کیونکہ اس نے تو پہلے ہی فارغ بن کر میرے پاس آ: تھا۔ میں ہارنے والے کو جیت سکتی تھی اور ہارنے والا جی تھا۔ وہ تمہارے سامنے بے بس ہو چکا تھا اور میں نے وہی کیا جو میرے حق میں بہتر تھا۔ اب جو کچھ ہوگا، اس میں کم از کم میرا بھی ایک کردار ہوگا۔ میری بھی حیثیت ہوگی۔“

تاب کی آنکھوں میں حیرت کا دریا بہنے لگا..... وہ کچھ دیر گہری سوچ میں رہنے کے بعد شکتہ لہجے میں بولا۔ ”تو..... اس کا مطلب ہے، تم نے میرے لیے جیت کی خواہش اس لیے کی..... کیونکہ تم..... جی کے ساتھ رہنا چاہ رہی تھیں؟“

”نہیں، یہ میرے لیے زیادہ اہم نہیں تھا۔ میں نے اب تک صاف گوئی سے کام لیا ہے، اب بھی صاف گوئی سے کام لوں گی۔ میرے لیے تم دونوں ایک جیسے ہی تھے۔ میں کسی کے ساتھ بھی رہ سکتی تھی۔ بس مجھے جی، تم سے تھوڑا سا کم کرخت نظر آیا، اس لیے میں نے تمہاری جیت کے حق میں دعا مانگی۔“

تاب ہونٹوں کی طرح منہ کھولے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اکیسویں صدی کی ناقابل فہم عورت اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے ہارنے والے کو فاتح بنایا تھا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت جی اور بابرہ جزیرے سے رخصت ہو رہے تھے۔ زیادہ خون بہہ جانے سے جی بہت کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ بابرہ نے اسے زخمی ٹانگ کی طرف سے سہارا دے رکھا تھا۔ وہ موٹر بوٹ کی طرف بڑھے تو بابرہ نے چند لمحے رک کر تاب کی طرف دیکھا۔ وہ پندرہ بیس قدم چل کر واپس تاب کی طرف آئی اور سرگوشی میں بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ دو تین گھنٹوں میں تم اپنی رسیاں کھولنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ قریب دو مہینے کا راشن ہے تمہارے پاس۔ یعنی بات ہے کہ اس دوران میں کوئی نہ کوئی سیلابی اس طرف آنکھے گا اور تمہیں یہاں سے نکال لے گا۔ ہم دونوں کیوبا سے جا رہے ہیں اور توجہ رکھتے ہیں کہ تم ہمیں ڈھونڈنے میں وقت برباد نہیں کرو گے..... خدا حافظ۔“

کے ہاتھ پاؤں باز رہے گئے تھے۔ بابرہ اب پھر لمبی قمیض اور جینز میں نظر آ رہی تھی۔ وہ جی پر جھکی ہوئی تھی اور اس کی پیشانی اور ناک پر پٹی باندھ رہی تھی۔ جی کے ہونٹ کافی سوچ چکے تھے۔ اس کی ایک آنکھ بھی گہری نیلی نظر آ رہی تھی۔ وہ خاموش لیٹا تھا۔

”یہ سب کہا ہے؟ مجھے کیوں باندھا ہے تم نے؟ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟“ تاب چلایا۔

بابرہ اور جی نے اس کی طرف مطلق توجہ نہیں دی۔ جی کی پیشانی پر پٹی باندھنے کے بعد بابرہ نے اسے تھوڑا سا پانی پلایا اور کھل اس کی پنڈلیوں سے اٹھا کر سینے تک پہنچا دیا۔ تاب نے اپنی بندشوں سے زور آزمائی کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔ اسے بے حد مہارت اور مضبوطی سے باندھا گیا تھا۔

جی سے فارغ ہونے کے بعد بابرہ، تاب کی طرف آئی اور اس کے قریب ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ تاب نے دیکھا بابرہ کے پاس ہی وہ چھوٹی تھوڑی بڑی تھی جو خیمے کی بیخیں وغیرہ ٹھونسنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ یقیناً بابرہ نے اسی تھوڑی کی مدد سے تاب کے سر کے پچھلے حصے پر ضرب لگائی تھی۔ ایسا کیوں کیا اس نے.....؟ یہ سوال ایک پڑھول گوج کی طرح اس کی سماعت میں چکرار ہاتا تھا۔ پھر یہ سوال اس کی زبان پر بھی آ گیا۔ اس نے بابرہ سے پوچھا۔

”تم نے تو کچھ اور کہا تھا۔ تم نے کہا تھا، تم میری جیت چاہتی تھیں، تم نے میرے لیے دعا مانگی تھی۔“

وہ عجب انداز سے مسکرائی۔ ”میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے تمہاری جیت کی ہی خواہش کی تھی۔“

”تو پھر تم آزاد کیوں ہے اور اس کی جگہ میں یہاں کیوں بندھا ہوا ہوں؟“

”اس لیے کہ تم جیت گئے ہو۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”کیا نہیں سمجھے؟“

تاب نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔ ”جب کسی عورت کے لیے دو مردوں کے درمیان لڑائی ہوتی ہے تو جیتنے والا ہی عورت کا حق درگزر ہوتا ہے۔ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔“

”ہمیشہ سے ایسا ہوتا آیا ہوگا لیکن اب وقت بدل چکا ہے..... اور وقت کے ساتھ شاید عورت بھی بدل چکی ہے۔ یہ اکیسویں صدی ہے۔ سڑتاب! بابرہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

تاب نے ایک بار پھر بندشوں سے آزاد ہونے کے لیے زور لگایا اور ناکام ہونے کے بعد پھنکارا۔ ”تم پہیلیاں

سودائے جنوں

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

تیسرا حصا

عرصہ دراز سے صیہونی قوتیں امت مسلمہ کے عزم و حوصلے کو سبوتاژ کرنے کی سازشوں میں مصروف عمل ہیں۔ اس رہّے کائنات کا بھی کیسا انوکھا انصاف ہے۔ ہر دور میں فرعون پیدا کرتا ہے اور ہر دور کا موسیٰ بھی الگ بناتا ہے جو انہی کے درمیان رہ کر پرورش پاتا ہے اور فرعونی طاقتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ آج بین الاقوامی منظر نامہ جو داستان دل گیر سناتا ہے اس نے تمام عالم اسلام میں دکھ کی ایک لہر پیدا کی ہوئی ہے۔ حساس دلوں میں آج بھی ارض مقدس میں صیہونی یلغار ان کی چیرہ دستیوں کے خلاف نفرت و غیظ کی آگ بھری ہوئی ہے کیونکہ غاصب یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کو نذر آتش کر کے ہیکل سلیمہ کی تعمیر کرنے کی مذموم اور ناپاک سازش تیار کی تھی... جسے روکنے کے جرم میں اسرائیلی فوجیوں نے نادار اور مجبور فلسطینی عوام کو اپنی چنگیزی اور بربریت کا نشانہ بنانا شروع کیا اور فلسطینی بستیوں میں خون کی ہولی کھیلی۔ اسرائیلی سازشوں کے تانے بانے کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ آج بھی موت وہاں گلی گلی دروازوں پر دستک دیتی گھوم رہی ہے لیکن... آج بھی کچھ پاگل لوگ عصمتوں کے محافظ بنے ایک سودائے جنوں میں مہلا ہیں...

اب اس بازی کا انجام...
اجلی رنگت اور مکروہ چہروں والی شیطانی قوتوں کی بربریت کا لرزہ خیز منظر



Copied From Web



Copied From Web



ان خاتون کے پاس میرے کچھ ضروری کاغذات ہیں۔ وہ میں لینا چاہتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اس طرف اشارہ کیا تھا، جہر وہ دونوں اسرائیلی اہلکار نامہ کو لیے ایک کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔

"اس خاتون کو کسی شے کی بنا پر انگوٹری کے لیے لے جایا گیا ہے۔ تم اب اس سے نمٹ ل سکتے۔"

مرد افسر نے قدرے گھور کر عابد سے کہا تو عابد لاپلا ابالی بن سے مسکرا کر بولا۔

"اس کی انگوٹری ہوتی رہے، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ میں تو بس اس خاتون سے چند ضروری کاغذات لینا چاہتا ہوں..... جو بے ضرر ہیں ان کے لیے۔ مجھے یقین ہے انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ آپ سے میری ریکورڈسٹ ہے..... پلیز۔"

"اپنی خیر مناد مسٹر! وہ دونوں معمولی آفیسر نہیں ہیں۔ اٹلی جنس والے ہیں۔ تمہیں بھی دھر لیں گے۔" کسٹم آفیسر نے طنزیہ لہجے میں کہا تو اس کی ساتھی عورت نے قدرے بیزاری سے اپنے ساتھی افسر سے کہا۔

"جوڑی! جانے دو اسے..... اگر وہ اسے دھر لیں گے تو ہمارا کیا جاتا ہے۔"

عابد کو اجازت مل گئی، وہ تیزی سے اس جانب بڑھا۔ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے اسے اندر دھکیلتا چاہا مگر وہ بند تھا۔ عابد نے ہولے سے دستک دی۔ اس نے اپنے دانت اس قدر زور سے بھینچ رکھے تھے کہ اس کے جڑوں کی ہڈیاں ابھرتی تھیں پھر جیسے ہی دروازہ کھلا، اسے انکی دو میں سے ایک آدی نظر آیا۔ عابد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اپنے دائیں ہاتھ کا گونسا تان کر اس کی ناک پر جڑ دیا۔ وہ اس اچانک اور غیر متوقع حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ "اوج" کی کراہ نجاتی کے ساتھ وہ کئی قدم پیچھے کولڑ کھڑا کر اپنے دوسرے ساتھی سے ٹکرایا جو دوسری طرف منہ کیے نامہ سے پوچھتا تھا میں مصروف تھا۔ اپنے ساتھی کی مگر سے وہ بھی گڑ بڑا گیا۔ عابد اسے بھی سمجھنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا اور جانتا تھا کہ یہ سب کچھ موثر انداز میں اور تیزی سے کرنے کا متقاضی تھا۔ لہذا اس نے دوسرے آوی پر چھٹا درتے ہی پوری قوت سے اس کی پیشانی کمرے کی ٹھوس دیوار سے بجا دی۔ دونوں آوی نیم بے ہوش سے ہو گئے۔ نامہ سرا سیمہ بھی مگر عابد کو دیکھ کر اس کے چہرے پہ یکدم جوش کی سرخی نمودر آئی۔ عابد نے اسے رسی تلاش کرنے کو کہا اور خود بھی جلدی جلدی ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ اسے تو

دو اور دی پوائن آفیسر راجن میں ایک خاتون بھی تھی، نامہ سے مخاطب تھے۔ اس کا بیگ سا نغز مشین پر چیک ہو رہا تھا۔ ادھر انکلور کے گیٹ کے عقب سے عابد کی نظر کی نظر سے نامہ پر گئی ہوئی تھیں۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کسی بھی وقت کوئی اعصاب شکن صورت حال پیدا ہوسکتی تھی..... جس کے "نہ ہونے" کی عابد دل ہی دل میں دعا کیے مانگ رہا تھا۔

ذرا دیر بعد نامہ کو بھی کلیئر کر کے آگے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ عابد کا دل یکبارگی مسرت سے دھڑکا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ نامہ کو آگے جانے کی اجازت مل گئی تھی..... مگر پھر دوسرے ہی لمحے جیسے اس کی ساری مسرت غارت ہو گئی اور اس کا دل گھٹ کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ اس کی سانسیں بھی سینے میں اٹک کر رہ گئیں۔

قریب کھڑے دو افراد میں سے ایک نے آگے انکلور کے گیٹ کی طرف بڑھتی نامہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خاتون آفیسر سے کچھ کہا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے بلند آواز میں نامہ کو روکنے کا کہا اور پھر اشارے سے اسے واپس پلٹنے کا حکم ملا۔ عابد کا دل جیسے یکفخت کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ واپسی کے بلاوے پر نامہ کے چہرے پر جگمگاتی مسرت بھی تار یک پڑ گئی تھی۔ تاہم وہ پٹی اور کاؤنٹر کی طرف دوبارہ آئی۔

عابد شدید تذبذب کا شکار تھا۔ مذکورہ آوی جس نے بلاوہ دیا تھا، وہ یقیناً اسرائیلی سیکرٹ سروس سے تعلق رکھتا تھا۔ نامہ کو اشارے سے اس نے ہی اپنی طرف بلا دیا تھا اور پھر وہ اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ نامہ اس سے کسی بحث میں الجھ رہی تھی۔ صورت حال یکدم مخدوش ہو گئی تھی۔ عابد اگر اس نازک موقع پر نامہ کی گلو خلاصی کے لیے آگے بڑھتا تو لامحالہ اس پر "ساتھی" ہونے کا شبہ کیا جاتا اور پھر کوئی بوجہ نہ تھا کہ وہ بھی دھر لیا جاتا۔

دونوں اہلکار نامہ کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف بڑھے۔ ان کی ہڈی کو کوئی آگے نہیں بڑھا تھا جبکہ کپتان موٹی بھی ان کے لیے جتنا کر سکتا تھا، وہ اس نے کیا تھا۔ آگے یہ دونوں اپنی اپنی سمت کے حوالے کر دیے گئے تھے۔

عابد کا رواں رواں مرتعش تھا۔ اس نے فوراً ایک فیصلہ کیا اور پونٹا پہ ظاہر بے پروائی سے دوبارہ چلتا ہوا کاؤنٹر کی طرف آیا۔ دونوں افسران اسے کچھ چھتی ہوئی حیرت سے دیکھنے لگے۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

اس اطلاع پر عابد اور ناعمہ دونوں کے چہرے دھواں دھواں ہو گئے۔

☆☆☆

مجاہدین کی طرف سے آنے والی نئی کمک شہید صادق الخیر اور شہید عظیم الوزیر کی حریت پسند تنظیموں غضب خدا اور پی فرنٹ سے تعلق رکھتی تھیں۔ "غضب خدا" کی کمانڈر اب یاسر العربی کے سپرد تھی جبکہ "پی فرنٹ" میں قائم مقام خالد بن جنید تھا۔ درحقیقت "المجاہد" کی زبیرہ قیسری نے اپنے گریڈ پلان پر جانے سے پہلے بین الاقوامی قوانین کے مطابق... غضب خدا اور پی فرنٹ کو اپنی ہم سے آگاہ کر دیا تھا۔

ارض فلسطین میں یوں تو بہت سی حریت پسند تنظیمیں ہیں، تاہم قابل ذکر پی فرنٹ، المجاہد اور پی ایل ایس او (اللسطین لبرل اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن) تھیں اور یہ کئی حوالوں اور مضامینوں کے تحت عظیم الوزیر ابو جہاد کی غضب خدا کے تابع تھیں اور وہیں سے انہیں اپنی اپنی آزادانہ کارروائیوں کے لیے متعین کر دیا گیا تھا اور مذکورہ حریت پسند تنظیموں کو اب یاسر العربی کے علم میں لائے بغیر یا اس سے اپنی آئندہ کی اسرائیل کے خلاف مجاہدانہ کارروائی کے لیے اجازت لینا پڑتی تھی۔ یوں تو یہ سب اپنی کارروائیوں کے لیے آزاد تھے مگر اس کا مقصد محض یہ ہوتا تھا کہ انہیں... یہ وقت ضرورت مدد چاہیے ہو تو وہ انہیں لپیک کہہ سکیں۔

بیت صفانہ میں بھی یہی ہوا تھا۔ غضب خدا اور پی فرنٹ کی کمک پہنچنے ہی اسرائیلی فوجیوں کو پسپا ہونا پڑا اور کئی آفندی زخمی باقر کو سہارا دیے۔ بہتیریت و سلامت... المجاہد کے خفیہ ٹھکانے پہنچ گئی۔

وہاں باقر کی مزہم بیٹی کی گئی۔ لیلیٰ نے باقر کی تیار داری کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

انہیں اب اپنے ساتھیوں کی آمد کا انتظار تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ صحرائے نجف اور حوثیوں کی مہمات سے کتنے مجاہد سامحی غازی بن کر کامیاب لوٹنے والے تھے اور کتنے جام شہادت نوش کر چکے تھے، وہ ان کی کامیابی کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی اور سلامتی کی بھی دعائیں مانگ رہے تھے جبکہ اپنے میزبان سامحی عارف جیہی کی موت کا انہیں دکھ ہوا تھا۔ بیت صفانہ پر اب ہر امن ہی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ یہاں مجاہدین نے دوبارہ اپنا قبضہ بھی بحال کیا تھا۔ وقت گزرتا رہا اور جب زبیرہ لوٹی تو سب نے اس کا خیر مقدم کیا مگر زبیرہ کے چہرے پر مایوسی اور کھست خوردگی طاری رہی۔ لیلیٰ اور

نکس البیت ناعمہ کو ایک طرف پڑے تاروں کا گچھا نظر آ گیا۔ اس نے وہ اٹھایا اور عابد نے ناعمہ کی مدد سے دونوں آدمیوں کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیے اور انہیں گھسیٹ کر واش روم میں لے جا کر بند کر دیا پھر ناعمہ سے بات چیتی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہم دونوں ایک ساتھ باہر نکلیں گے تو کسی کو شبہ ہو جائے گا۔ پہلے میں نکلتا ہوں، اس کے چند منٹوں بعد ہی تم نکلتا۔" ناعمہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ عابد باہر نکلا اور... یہ ظاہر مطمئن انداز میں چلتا ہوا دوبارہ کاؤنٹر کی طرف آ گیا۔ دونوں کسٹم آفیسرز نے اسے روک لیا۔ عابد ایک آنکھ مار کر عامیانہ انداز میں بولا۔ "میرا کام تو ہو گیا، اس لڑکی کا کام بھی ہو جائے گا۔ وہ اندر دونوں کو اپنے جسم کی رشوت دینے میں مصروف ہے۔"

دونوں افسر سنی خیر انداز میں مسکرائے اور اسے آگے جانے کی اجازت دے دی۔ عابد دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھ گیا اور ناعمہ کے بھی جلد از جلد وہاں پہنچنے کی دعائیں مانگنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ناعمہ بھی اس کے ساتھ گئی، دونوں خوشی سے نہ ل تھے۔

چند لمحوں بعد دونوں کار کو شب میں سوار ہو چکے تھے۔ شب کے انگریز اٹھائے جا چکے تھے۔ اس کے بھونپتے سوگوار انداز میں بٹل نے ایک بار ہنکارا... اس کے بعد وہ کھلے پانیوں کی طرف بڑھنے لگا۔

کپتان موتی نے ان دونوں کو اپنے کیمپ میں ٹھہرایا تھا جس پر لگی گول شیشے والی کھڑکی سے دونوں حیف کی دور ہوتی بندرگاہ کی روشنیوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے دل اب بھی اس اندیشے پر دھڑک رہے تھے کہ اگر ان دونوں کسٹمر آفیسرز نے کمرے میں جا کر دونوں اسرائیلی سیکرٹ سروسز کے اہلکاروں کو ان حالت میں دیکھ لیا تو معاملہ گزربڑ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ بات انہوں نے جب کپتان موتی کو بتائی تو اس کے چہرے پر بھی تشویش کے آثار نمودار ہو گئے۔ تاہم اس نے تسلی دی کہ اگر ایسا کچھ ہوا تو وہ صورت حال سے نمٹنے کی کوشش کرے گا۔ وہ اب جہاز کی رفتار بڑھا رہا تھا۔

تاریک رات... حدنگاہ تک پھیلے سمندر میں عجیب سی بیت نامی طاری کیے ہوئے تھی۔ اندیشوں اور دوسوسوں بھر سفر جاری تھا کہ اچانک کپتان موتی بوکھلا یا ہوا۔ ان کے کیمپ میں داخل ہوا اور بولا۔

"ایک ہیلی کاپٹر حمزی کے ساتھ ہمارے شب کی طرف بڑھ رہا ہے اور ہمیں رکنے کا سگنل دے رہا ہے۔"

”مجھے باقر کی بات سے پورا اتفاق ہے۔۔۔۔۔ عزیز زبیدہ! لیلیٰ نے بھی فوراً اپنے ساتھی باقر کی تائید میں کہا۔
”محسن ہمارے لیے ایک انتہائی تربیت یافتہ کمانڈر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی ہمارے لیے اسی طرح قیمتی ہے جس طرح آپ کی۔“ اس کی بات پر زبیدہ نے ہونے سے اپنے سر کو اٹھاتی جنبش دی تھی، باقر پر جوش ہوئے کے بولا۔

”ہمیں فی الفور۔۔۔۔۔ محسن کی تلاش کے لیے کوئی قدم اٹھانا ہوگا۔“

”اور میرا خیال ہے اس کے لیے جتنے کم افراد ہوں اتنا ہی بہتر ہوگا۔“ لیلیٰ بولی۔

زبیدہ نے دونوں دلیر مجاہدوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم دونوں محسن کی تلاش کا بیڑا اٹھاتے ہو؟“
دونوں نے فوراً مستحضری کے ساتھ اپنے سروں کو اٹھاتی جنبش دی۔ ٹھیک اسی وقت ایک نیم تاریک پتھر نیچے گرتے سے زبیدہ کا ایک ساتھی اپنے ہاتھ میں ریڈیو وائر لیس سیٹ لے کر نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر خاصی تشویش کے آثار تھے، وہ زبیدہ کو یہ سمجھاتے ہوئے جلدی سے نمودار ہوا۔

”عزیزی زبیدہ! اپنی فرنٹ کے کمانڈر خالد بن عبد لان پر ہیں اور آپ سے ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔“

اس کی بات پر زبیدہ چونگی۔ اس نے فوراً ہیڈ فون کالوں سے لگا یا اور مانگ پر رابطہ کیا۔ مختصر اہل سہلا کے بعد۔۔۔۔۔ زبیدہ بڑے غور اور اچھاک سے دوسری جانب کی باتیں سنتی رہی۔ لیلیٰ اور باقر کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ دونوں دیکھ رہے تھے کہ زبیدہ کا چہرہ جوش سے سرخ پڑتا جا رہا تھا مگر ساتھ ہی اس کی کشادہ آنکھوں کی گہرائیوں میں کرب ناکی بھی ہلکورے لینے لگی تھی۔ کافی دیر تک دوسری جانب سے ساری گفتگو بے غور سننے کے بعد جب اسے جوابا بولتے پایا تو اس کی آواز میں واضح طور پر ایک رزش تھی۔

”از حد دکھ ہوا ہے سب من کر۔۔۔۔۔ یہ صیہونی اپنی ناکامی اور ہزیمت کا کوئی اظہار اس طرح بزدلانہ طریقے سے کرتے ہیں۔ اللہ پاک ارض فلسطین کے مظلوم عوام پر رحم فرمائے، آپ فکر نہ کریں عزیزم خالد! میں ابھی اور اسی وقت تل کرم پہنچتی ہوں۔۔۔۔۔ اوور اینڈ آل۔“

بات ختم کرنے کے بعد باقر اور لیلیٰ نے مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ زبیدہ پر پیش لہجے میں بولی۔

باقر اس کی وجہ یہی سمجھے تھے کہ باقی ساتھی کام آگئے تھے۔ محسن کے بارے میں باقر اور لیلیٰ نے سب سے پہلے پوچھا تھا جس پر زبیدہ نے یہی بتایا کہ وہ لاپتہ تھا۔

اگلے چند گھنٹوں کے دوران زبیدہ ان کو اپنی تیونائی ہم کی ناکامی وغیرہ کے سلسلے میں تفصیلات بتا چکی تھی۔

”عزیزی زبیدہ! ہم نے آپ کے بنائے ہوئے گریڈ پلان کے مطابق اپنا صحرائے نجف والا ہدف کامیابی سے ہالیاتھا۔“ لیلیٰ نے زبیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیونکہ ہم جانتے تھے کہ ہماری کامیاب ہم کا مطلب۔۔۔۔۔ آپ کا تیونائی والا آپریشن کامیابی سے ہمکنار کرنا تھا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ زبیدہ نے ایک ٹھکی ٹھکی سی گہری سانس لے کر کہا۔ ”مجھے تمہاری ہم کی کامیابی پر خوشی ہوئی ہے لیکن

انہوں نے بد قسمتی سے ہماری متوقع ہم ناکامی سے دوچار ہوئی۔ اگرچہ اس میں ہمارے سارے مجاہد کام آگئے اور

محسن بھی لاپتہ ہے، ہنگہ ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر میں ہمارا حملہ بھی ابتدائی مرحلہ میں کامیاب رہا تھا، جس کے نتیجے میں

ڈیوڈ اسٹار کے سربراہ جنرل آئزک فرناش کا نائب میجر ایہود شاہک اور وساد کے ڈپٹی ایڈیشنل ڈائریکٹر اشحاق

شامیر جہنم واصل ہو گئے تھے مگر ہم پھر بھی اپنے اہم ہدف کو کامیابی سے ہمکنار نہ کر سکے جس میں ہیڈ کوارٹر کی تباہی اور

جنرل آئزک فرناش کے علاوہ موساد کا باریق شمعون شامل تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بروقت اسرائیلی فوجیوں کی کمک

وہاں پہنچ گئی، وہ ہماری توقعات سے زیادہ مستعد ثابت ہوئے تھے یا پھر ہمارے اندر کوئی خامی رہ گئی تھی۔“ یہ

بتاتے ہوئے زبیدہ کا چہرہ ایک بار پھر کھست خوردہ سا نظر آنے لگا۔ اس نے دیگر تفصیلات سے بھی PLSO کی لیلیٰ

اور باقر کو آگاہ کر دیا۔

ماحول میں چند لمحوں کے لیے افسردہ سی خاموشی طاری رہی اور پھر باقر نے ہی اس سکوت کو توڑا۔ ”ماپوس ہونے کی

ضرورت نہیں عزیز زبیدہ! اس لیے کہ آپ کا مشن یوں بھی ہمارے مقابلے میں زیادہ خطرناک اور مشکل تھا۔

اسرائیل کے دو اہم یہودی شیطانوں ایہود شاہک اور اشحاق شامیر کو جہنم واصل کرنا بھی معمولی بات نہیں۔ ہم

اسرائیل کو اپنی اس تازہ مہمات سے کاری زخم لگا چکے ہیں جس کے باعث ہمارے حوصلے مزید بلند ہو گئے ہیں۔ انشاء

اللہ جلد ہی ہم بڑے شیطان جنرل آئزک فرناش اور باریق شمعون کی شہ ننگ تک بھی جا پہنچیں گے لیکن ہمیں اپنے ساتھی محسن کو ضرور تلاش کرنا چاہیے۔“

آرام دہ بستر اور پرسکون خاموش ماحول نے اسے یکدم بے چین سا کر دیا۔ آنکھ کھلنے اور رفتہ رفتہ ذہنی طور پر بیدار ہونے تک وہ اپنی آنکھوں کو گردش دینے کے دوران اپنے قرب و جوار کا جائزہ لے چکا تھا۔

اس نے خود کو ایک پرتزین کمرے میں اور دیوار چریر کے آرام دہ بستر پر پایا تھا۔ اس کے زخمی بازو اور نائنگ پر مرہم چٹی بندھی ہوئی تھی۔ زخموں کی دھن نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ جسمانی نقاہت بھی پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود اس کے دل و دماغ کی بے چینی بجائے کم ہونے کے فزوں تر ہونے لگی۔ وہ کمرے میں اکیلا تھا۔ کھڑکیوں پر خوب صورت نقش و نگار والے حریری پردے جمول رہے تھے، باہر شاید دن کا اجالا پھیلا ہوا تھا مگر شاید دانستہ کھڑکیوں سے پردے نہیں سرکائے گئے تھے۔ البتہ کمرے میں ایک بلب روشن کر دیا گیا تھا جبکہ روزوں سے سورج کی کرنیں اندر پہنچ رہی تھیں۔

محسن کچھ لمحے تو اس طرح خالی الذہنی کی حالت میں گزارا پھر اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ درد کا احساس ابھرا اور بے اختیار اس کے حلق سے کراہ خارج ہو گئی۔ وہ اسی طرح گزارا گیا۔ اب اس میں دوبارہ اپنے معزوب وجود کو جنش دینے کی سکت نہیں رہی تھی۔ اسے اب تک دیر سے دھیرے سے یاد آ گیا تھا۔ یہ بھی کہ آخر میں وہ..... بازغہ کے ہمراہ تھا، شدید زخمی ہونے کے باوجود وہ بازغہ سے ایک گن لانے کا کہہ رہا تھا جس سے وہ جزل آئزک فرناش اور باریق شمعون کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا۔ اسے کچھ پتا نہ تھا کہ مشن کا کیا بنا تھا۔ اسرائیلی فوجیوں کی تازہ کک بھی ان پر نوٹ پڑی تھی۔ اسے اپنی ساتھیوں بالخصوص الجاہد کی لیڈر زبیدہ کی لگرو تشویش ہو رہی تھی۔ جانے ان کا کیا بنا تھا۔

”مجھے یہاں لایا کون ہے؟ کس نے میری مرہم پٹی کی ہے؟“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔ اسے حلق میں کانٹے جیسے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ جی چاہا کہ وہ کسی کو پکارے مگر کچھ سوچ کر وہ ایسا نہ کر سکا۔ آخری خیال اس کے ذہن میں یہی ابھرا تھا کہ اسے یہاں لانے والی شخصیت بازغہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر ایسا تھا تو پھر وہ خود کہاں تھی اور یہ کون سی جگہ تھی؟ تب ہی اچانک اس کے پیروں کے درخبر نظر آنے والے دروازے پر آہٹ ابھری اور پھر آہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا۔ بازغہ اندر داخل ہوئی، وہ خاصی تھکی تھکی نظر آ رہی تھی مگر محسن کو ہوش میں آتے دیکھ کر اس کا کون سا گھٹنا چہرہ یکدم گل اٹھا۔

”ہماری مہمانت کے جواب میں اسرائیلیوں نے غزہ اور دیگر فلسطینی عرب بستیوں میں قیامت ڈھا دی ہے۔ ساتھ ہی ایک... خفیہ میننگ یروٹلم میں ہوئی ہے۔ مجھے ایک مہم پر تل کر بلا گیا ہے۔ جہاں غضب خدا کے باسر العربی اور خالد بن جبیر کے علاوہ دیگر اہم حریت پسند فلسطینی کمانڈر بھی موجود ہوں گے۔ مجھے تل کرم کے لیے اسی وقت لگانا ہوگا۔“

”خدا غارت کرے ان یہودی ظالموں کو..... آپ اپنا خیال رکھیے گا، عزیزی زبیدہ! اور واپسی میں ہمیں آگاہ کیجیے گا کہ اس اہم کمانڈنگ میننگ میں مزید کیا ہدایات ملی ہیں؟“ باقر نے زبیدہ سے کہا۔

”آپ اپنا خیال رکھیے گا عزیزی زبیدہ! یہودی کتے اس وقت ہم سب کی کونے کونے میں بوسو گھر رہے ہوں گے۔“ لیلیٰ نے بھی زبیدہ کے جوش سے تھمتاتے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ پر عزم ہو کے بولی۔ ”تم فکر نہ کرو، میں انشاء اللہ اسماعیلی کے ساتھ تل کرم پہنچ جاؤں گی۔ مجھے اسی وقت لگانا ہے۔ عزیزی لیلیٰ! تمہیں PLSO کی لیڈر کی حیثیت سے میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“ اس کی بات پر لیلیٰ نے فوراً مستعدی کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا۔

باقر کچھ لمبے عین سا نظر آنے لگا۔ اسے اپنے ساتھی محسن کی گمشدگی کی فکر ہو رہی تھی، بولا۔ ”محسن کی تلاش کے سلسلے میں ہمیں اپنے کسی ساتھی کو تیونائی روانہ کرنا پڑے گا۔ کیا خبر وہ کسی مدد کا شہر ہو؟“

اس کی بات پر زبیدہ نے اسے تضحی آمیز لہجے میں کہا۔ ”اللہ سے اپنی امان میں رکھے۔ تمہاری اپنی طبیعت ٹھیک نہیں، تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ میں اور لیلیٰ تل کرم سے لوٹنے کے بعد اس بارے میں بھی سوچتے ہیں۔“ محسن خاموش ہو گیا۔ زبیدہ اس کی بات کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ باقر خود محسن کی تلاش میں لگانا چاہتا تھا مگر اس کی اپنی حالت اس قابل نہ تھی۔ اس لیے زبیدہ کو اسے یہ تسلی دینا پڑی تھی۔ لیلیٰ نے بھی حوصلہ افزا انداز میں مسکرا کر باقر کا کاندھا ہونے سے تھپتھپایا تھا۔

☆☆☆

ہوش آنے پر محسن کو ماحول میں نرمابٹ کا احساس ہوا۔ اس دلیر اور جہادی مجاہد نے اپنے عنفوان شباب سے لے کر اب تک اس قدر مصائب اور سخت کوشیاں جھیلی تھیں..... کہ اس کے لاشعور تک سے آرام اور سکون جیسے احساسات کا عادی ہونا کب کا رخصت ہو چکا تھا۔ یہی سبب تھا کہ نرم

”بب..... بازخدا یہاں آؤ..... میں کہاں ہوں؟
کون سی جگہ ہے یہ؟“ عمن نے بے قراری سے پوچھا۔
بازخدا نرم مسکراہٹ کے ساتھ اس کے قریب آگئی اور
سر ہانے کے قریب بیٹھ کر ملاحت سے بولی۔

”تم یہاں ہو..... میرے گھر میں اور پریشان مت
ہونا، تم یہاں محفوظ ہو۔ کسی طبیعت ہے تمہاری اب؟“ اس
نے بڑے بجا رہتے ہوئے آخر میں پوچھا جبکہ اس کی پیشانی پر
پھیرتے ہوئے آخر میں پوچھا جبکہ اس کی بات پر عمن واقعی
پریشان ہو گیا۔ یعنی وہ..... جس جگہ کو محفوظ کہہ رہی تھی، عمن
کے لیے وہ اتنی ہی زیادہ خطرناک تھی۔ اس کے گھر سے
مراد..... اس کے یہودی باپ..... کشتر بیزناؤن کا گھر
تھا جو اس کے خون کا پیاسا تھا۔

عمن نے بازخدا کے خود پر بھکے بھکے دلکش حسین
چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پرتشوش لہجے میں پوچھا۔
”نت..... تم مجھے یہاں کیوں لائی ہو؟ یہ جاننے کے
باوجود کہ تمہارا باپ میرے خون کا کس قدر پیاسا ہو رہا ہے؟“
اس کی بات پر بازخدا حلاوت بھری محبت سے
مسکرائی۔ ”ببکی تو میری چال تھی۔“

اس کی بات پر عمن دہل کر رہ گیا مگر وہ اس کی بات کا
اصل مطلب نہیں سمجھا۔ وہ اس کی پریشانی بھانپ کر ہولے
سے ہنس پڑی۔ ”مجھ پر بھروسہ نہیں تمہیں کیا میں تمہاری
دشمن ہوں؟“ اس کے کہنے کی ادا بڑی دلفریب اور دل آرا
تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو عمن اس نازک سی گڑیا جیسی
دوشیزہ کی باتوں اور اداؤں سے شاید ضرور لطف اٹھاتا۔ وہ
سرد مہری سے بولا۔

”مجھے بتاؤ جلدی..... آگے کیا ہوا تھا؟ میرے ساتھ
کہاں ہیں؟ اور..... اور..... یہ مرہم پٹی.....“ حلق اور
ہونٹ سوکھے پڑنے کے باعث وہ آگے بولنے سے قاصر ہی
رہا۔ بازخدا نے اللہ کر ایک ٹھنڈے پانی کا گلاس بھر کے اس
کے خشک پڑنے ہوٹوں سے لگا دیا۔ ساتھ ہی دوسرے
ہاتھ سے اسے سہارا بھی دیا۔ عمن نے غٹا غٹ گلاس ایک ہی
سانس میں خالی کر دیا۔

”تمہاری پٹی میں نے کی ہے۔ بڑی مشکلوں
سے..... بازو کی کوئی تو گوشت چیر کر نکل گئی ہے لیکن تمہاری
ناٹک بری طرح گھائل ہے۔ تمہاری ران میں شاید ابھی
تک کوئی بیوست ہے۔ مجھے تو پر اپر ڈریسنگ نہیں آتی تھی
بس اناڑیوں کی طرح کر دی ہے۔“

”ہاں..... تم سچ کہہ رہی ہو۔ مجھے زیادہ درد بھی

اسی ناٹک میں ہو رہا ہے۔“ عمن بولا۔
”لیکن میرا یہاں رہنا ٹھیک نہیں..... تمہارے لیے
بھی یہ بات خطرناک ہوگی کہ تم نے ایک دشمن کو اپنے گھر
میں پناہ دے رکھی ہے۔“
”میں نے کہا نا..... تم اس کی فکر نہ کرو۔“ وہ فحشی آمیز
لہجے میں بولی۔

”پاپا یہاں نہیں ہیں۔ تمہارے جانااز ساتھیوں نے
سب کو خوب کئی کا ناچ مچایا۔ وہ سب گل ایسب جا چکے ہیں۔“
”کیا مطلب؟ کون سب؟“ عمن نے اس کی طرف
دیکھتے ہوئے پرسوج انداز میں بھوسیں سکیڑیں۔

”وہ قصائی نما انسان جنرل آئزک فرناش اور بارق
شمعون۔ پاپا بھی ان کے ساتھ گئے ہیں۔ گل ایسب میں کوئی
ہنگامی میٹنگ کال ملی ہے۔“

”میرے ساتھیوں کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہو؟“
عمن نے پوچھا۔

”مجھے افسوس ہے۔ اسرائیلیوں کی تازہ بھاری لٹک
آجانے کے باعث تمہارے سارے ہی ساتھی مارے گئے
ہیں۔ البتہ زبیدہ نای مجاہدہ زندہ نکل جانے میں کامیاب
ہو چکی ہے۔“ بازخدا نے دہلی دل کے ساتھ اسے بتایا۔

بازخدا کی بات پر عمن کا دل بھی دکھ سے بھر گیا۔ تاہم
اسے خوشی بھی تھی کہ ان کی اہم کمانڈر اور المجاہد کی
سربراہ..... زبیدہ قیصری خونی اسرائیلیوں کے جنگل سے بچ
نکلنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ پھر اسے..... اپنے دیگر ساتھی
باقر اور سیلی وغیرہ بھی یاد آنے لگے۔ وہ اپنے دل میں ان کی
سلامتی کے لیے دعا ہی کر سکتا تھا۔

بازخدا نے ایک بڑا سا باؤل اور چھ سنبھالا۔ اس نے
عمن کے لیے غذا بیت سے بھر پور ترقی خوراک بنا رکھی تھی۔
وہ چھ کے ساتھ اسے کھلانے لگی۔ عمن کھانے کے دوران.....

یہ نور بازخدا کا حسین اور مصوم چہرہ ہلکا رہا اور اندر ہی اندر اس
کے بارے میں سوچتا رہا کہ کیا یہ لڑکی پاگل ہے؟ یا پھر
یوانی.....؟ ممکن ہے کہ محض انسانیت کے نائے اور کچھ اپنی
یہودی قوم کے کالے گرتو توں کو دیکھتے ہوئے اس کا ان سے
نہ صرف دل خراب ہو گیا ہو اور وہ فلسطینیوں کے ساتھ واقعی
دلی طور پر ہمدردی رکھتی ہو۔ ایک خیال اور بھی اس کے
ذہن میں آیا تھا۔ انسانیت اور کسی چاہنے والے سے دلی طور
پر لگاؤ..... اگرچہ عمن ابھی اس بارے میں یقین سے کچھ
نہیں کہہ سکتا تھا لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ بعض مواقع پر اس
نے بازخدا کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کے جذبات کی

مقاصد کے لیے اور اور..... شاید میرے لیے بھی.....
 ایک۔ لمحے توقف کے بعد اس نے دوبارہ کہا۔
 ”یہ جگہ ایک اسٹیٹ کا درجہ رکھتی ہے۔ کسی بڑے اور
 جدید شہر کی طرح یہاں بھی ہر قسم کی سہولیات موجود ہیں۔“ محسن
 کو بازغہ کی باتوں میں نادانی کی بو محسوس ہونے لگی۔ وہ بولا۔
 ”تم یہ کیا کہہ رہی ہو بازغہ! کیا تم نہیں جانتیں کہ
 میں اسرائیلیوں کا کس قدر مطلوب ہوں؟ وہ تو مجھے دیکھتے ہی
 گولی مار دیں گے اور پھر اس طرح میرے ساتھ تم بھی ایک
 بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔“ محسن کی بات پر بازغہ کے
 عتابی ہونٹوں پر اسرار بھری مسکراہٹ نمودار ہو گئی، بولی۔

”تم بے فکر رہو..... ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں اس سلسلے
 میں ایک مربوط لائحہ عمل پہلے ہی تیار کر چکی ہوں۔“ محسن کی تسلی
 نہیں ہوئی، وہ خود کو ابھی تک غیر محفوظ سمجھ رہا تھا۔ وہ ایک عملی
 آدمی تھا۔ ہر شے کو حقیقت کی عینک سے دیکھنے کا عادی۔ یہ
 باتیں اس کی تربیت کا حصہ تھیں کہ وہ کسی ایسے شخص پر کم ہی
 بھروسہ کرتا تھا۔ بازغہ کی نیت پر اسے کوئی شبہ نہ تھا مگر بہر حال
 وہ اس کے لیے ان نازک اور خطرناک حالات میں مزید اور کیا
 کر سکتی تھی۔ اس بارے میں اسے تسلی نہیں ہو رہی تھی۔
 ”کیا سوچنے لگے تم.....؟“ اسے فکر آمیز سوچ میں
 مستغرق پا کر بازغہ نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے ہونے
 سے پوچھا۔

”میں آخر یہاں کب تک ٹھہر سکتا ہوں؟ میری اپنی
 حالت بھی کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں ہے۔“
 یہ کہتے ہوئے محسن کے چہرے پر شدید تشویش اور فکر
 کی پرچھائیاں اتر آئی تھیں۔ اسے اس قدر پریشان اور
 متفکر پا کے بازغہ کا اپنا دل بھی بھر آیا۔ وہ بڑی محبت اور
 چاہت سے محسن کے خوب رو چہرے کی طرف دیکھ کر تسلی آمیز
 بچے میں بولی۔

”میرے ہوتے ہوئے تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔
 تمہاری حالت پر خود مجھے بھی تشویش ہے۔ میں اتنی...
 بے توقف نہیں ہوں کہ تمہیں یہاں کے اسپتال میں لے جاؤں۔
 یہ شخص میری ایک پلاننگ کا حصہ ہے لیکن میں اتنا ضرور کر سکتی
 ہوں کہ اس اسپتال کے ذریعے تمہیں فرار کروا سکوں؟“
 ”وہ کس طرح.....؟“ محسن نے اس بار قدرے
 چونک کر پوچھا تو وہ گہری متانت سے بولی۔
 ”ایک مریض کے ہمیں میں..... ایمر جنسی کی صورت
 میں ایسوی لینس کے ذریعے میں تمہیں گل ایبیب یا بروہلم کے
 کسی بڑے اسپتال میں شفقت کرنے کے بہانے میں

رمتی ابھرتے دیکھی تھی مگر وہ اس بارے میں سوچنا ہی نہیں
 چاہتا تھا۔ تاہم ایک حقیقت تو اپنی جگہ تھی، جو اسے بازغہ کی
 باتوں سے محسوس ہوئی تھی کہ بازغہ نے بہر حال اپنے لوگوں
 کے کالے چہرے اور سیاہ کرتوت اپنی آنکھوں سے دیکھ
 لیے تھے۔ مجاہدین کا رویہ بھی اس نے ملاحظہ کیا تھا کہ حملے
 کے وقت انہوں نے دشمن ہونے کے باوجود عورتوں اور
 مصوم بچوں کا کس طرح خیال کیا تھا جبکہ اسرائیلیوں نے
 عرب بستیوں پر گولہ باری کی تھی، جہاں عورتیں بھی تھیں اور
 مصوم بچے بھی۔ وہ اس مصوم سی گڑیا صورت ووشیزہ کو چند
 ثانیے تک تار ہا پھر بولا۔

”مجھے اب جانا ہوگا۔ میرا یہاں رہنا ٹھیک نہ ہوگا۔“
 بازغہ لٹو پیچھے سے اس کا منہ پونچھنے لگی۔ ایسے میں اس
 کا خوب صورت اور جل چہرہ محسن کی سانسوں کے قریب تھا
 اور وہ اسے عجیب ابھی ہوئی نظروں سے سوالیہ انداز میں
 دیکھنے لگا تو بازغہ یہی ہو کے جواب دیا بولی۔
 ”باہر سخت پہرا ہے۔ تم ابھی تک ڈیوڈ اسٹار کے
 ہیڈ کوارٹر کی حدود کے اندر ہو۔ یہ رہائش گاہ ہے جہاں اس
 وقت تم موجود ہو۔ یہ ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے قریب ہی
 ہے۔ اس کے گرد بھی وسیع و عریض باؤنڈری وال ہے۔ پھر
 تم زخمی بھی ہو، کیسے نکلو گے یہاں سے؟“

”میں نکل جاؤں گا کسی نہ کسی طرح.....“ محسن نے کہا۔
 ”خدا مت کرو۔“ وہ بولی۔ ”میں نے کہا نا کہ اس
 سلسلے میں تمہیں زہرہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ
 سب سنبھال لوں گی۔ میں نے پہلے ہی سے سب سوچ رکھا
 ہے۔ سب سے پہلے اسپتال میں تمہارا علاج ہوگا۔“

محسن اس کی بات سن کر بھونچکا رہ گیا۔ اسی لمحے میں
 بولا۔ ”تم پاگل ہوئی ہو؟ میں یہاں کسی اسپتال میں ایڈمٹ
 نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے ساتھیوں کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ تم
 بس ایک احسان اور مجھ پر کرو۔ مجھے یہاں سے جانے دو۔“
 اس کی بات پر بازغہ کے مہین اور مہلج چہرے سے کرب کی رمتی
 سی ابھری۔ جیسے اسے محسن کی کسی بات پر دکھ ہوا ہو، بولی۔
 ”محسن! میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ میں جانتی
 ہوں، تم کس راہ کے مسافر ہو۔ میں تو تمہاری صدق نیت اور
 ایک سچے اور مخلص دوست کی طرح مدد کرنا چاہتی ہوں۔ تم پر
 کوئی احسان نہیں کر رہی۔ رہی بات یہاں سے نکلنے کی تو مجھ
 پر بھروسہ کرو۔ پلیز.....! اول تو خود تمہاری حالت ایسی نہیں
 ہے کہ تم اپنے بیروں پر چل سکو، پھر باہر سخت پہرا ہے۔ مجھے
 اپنی پروا نہیں، مگر تم اہم ہو۔ اپنی قوم کے لیے اور اپنے نیک

بھی تمہارے ساتھ ہوں گی۔ میری موجودگی میں سارے کام آسان ہو جائیں گے۔ کسی کو چیکنگ کی جرأت نہ ہوگی۔“ بازغہ کی بات پر محسن کو پہلی بار کچھ اطمینان محسوس ہوا۔ ساتھ ہی اسے حیرت بھی لگی کہ وہ جس نازک سی دو شیرہ کو نادان سمجھ رہا تھا، وہ کس قدر ذہانت اور چابک دستی کا مظاہرہ کر رہی تھی مگر ایک بات پر اسے اختلاف ہوا، بولا۔

”مجھے اس طرح یہاں سے فرار کروانے کے بعد تمہارا کیا ہوگا؟ بند میں تمہارے لیے بھی مصیبت کھڑی ہو جائے گی اور میں اتنا خود غرض نہیں ہوں کہ اپنی محنت کے لیے بعد میں کسی مصیبت کا سبب بنوں۔“

اس کی بات پر بازغہ کے نودمیدہ کلی جیسے حسین چہرے پر ایک ہنگ سا آکر گزر گیا۔ وہ بولی۔ ”میں تمہارے ساتھ ہرگز نہیں چلوں گی۔“ محسن اس کی بات پر بری طرح چونکا، بولا۔

”بازغہ! تمہارا آگے میرے ساتھ جانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ ہاتھ بیک ہوگا کہ تم ادھر سے ہی پلٹ جاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“

اس کی بات سن کر بازغہ کی گہری آنکھوں میں ایک عجیب نودمیدہ جذبہ بانی کلی چمکی۔ نرم دگدگان ہونٹوں پر ایک لمبے کور مزید ارتعاش ابھرا۔ جب وہ بولی تو جانے دل کے کسی عمیق ترین گوشے میں چپکے چپکے اور غیر محسوس طور پر پلٹنے والے کسی خفتہ دماغ خفتہ جذبے کا اظہار اس کی آواز میں لرزنے لگا۔

”میں اب انہوں کی نظروں میں مجرم بن ہی چکی ہوں۔ شاید تم ابھی تک ان باتوں کا اندازہ نہیں لگا پائے۔ سب سے پہلے تو مجھے میرا ہاپ گولی مارے گا۔ تم اسے نہیں جانتے شاید..... وہ ایک کٹر یہودی ہے جو فلسطینیوں اور بالخصوص مسلمانوں سے سخت نفرت کرتا ہے اور ان کا دشمن ہے۔ کیا میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتی ہمیشہ کے لیے.....؟“

اس کی بات اور اس کے عجیب جذبے تلے لرزتی آواز نے..... اس کے لہجے نے..... محسن کو اب بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ وہ بولا۔

”میرے ساتھ جا کے تم کیا کرو گی؟ میرے جلو میں ہر وقت موت ایک ”مسافر“ کی طرح ہم رکاب رہتی ہے۔ تمہیں میرے ساتھ ہر قدم پر موت کی سرگوشیوں کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔“

”مجھے صرف تمہارا ساتھ چاہیے محسن! پھر چاہے ہماری منزل کوئی بھی ہو۔“ بازغہ نے ڈوبے ڈوبے لہجے میں کہا۔

محسن پہ غور اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ بازغہ کی آنکھوں میں اسے اپنے لیے پسندیدگی کے ایسے ویپ جلتے محسوس ہوئے تھے جس نے اسے پریشان سا کر دیا تھا۔ لہذا وہ ایک گہری سانس لے کر اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”بازغہ! تم جو چاہ رہی ہو ایسا ممکن نہیں۔ تم نے ایک غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے۔ اس وقت میرا اہم مقصد..... میرا کاز ہے اور میرا عظیم مقصد اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ میں جذبہ حب الوطنی کے آدرش کے سوا دوسری طرف سوچوں۔“

”مجھے تمہاری یہ سب باتیں تسلیم ہیں محسن!“ بازغہ کی آواز لرز رہی تھی۔ ”میں تمہارے اس عظیم مقصد کے ہرگز حائل ہونے کی کوشش نہیں کر رہی ہوں۔ میں تو خود تمہاری ساتھی بن کر..... تمہارے کاز میں شامل ہونا چاہتی ہوں۔ تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔“

”تمہارا ٹھکر یہ بازغہ!..... تم نے واقعی ہماری اپنی استطاعت کے مطابق مدد کی، اس کے لیے میں تمہارا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔“

”محسن!..... مجھے اپنے لوگوں سے، اپنی قوم سے نفرت ہو گئی ہے۔ میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باشعور لڑکی ہوں۔ افسوس تو یہ ہے کہ تم نے مجھے ایک عام سی لڑکی سمجھ لیا اور میری پسندیدگی کو..... میری چاہت کو..... نادانی خیال کر رہے ہو۔“ ایک لمبے توقف سے بولی۔

”تم شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ میں تمہاری پسندیدگی میں ایسا کہہ رہی ہوں تو یہ تمہاری غلط سوچ ہے۔ تم سے ملاقات سے پہلے ہی میں اسلام اور اس کی تعلیمات سے متاثر رہی ہوں۔ امریکا کی جدید تعلیمی درس گاہوں میں طالب علمی کے دوران میں نے بہت سے مذاہب کا مطالعہ کیا تو مجھے ان میں سب سے زیادہ پائیدار، امن پسند اور مکمل دین..... دین اسلام ہی نظر آیا اور پھر جب میں نے عالمی تناظر و حالات پر نظر ڈالی تو خود مجھے اپنے آپ سے شرمندگی محسوس ہونے لگی کہ میری قوم، میرے مذہب کے لوگ مظلوم فلسطینیوں کے ساتھ ظلم و بربریت کا کس قدر گھناؤنا کھیل کھیل رہے ہیں۔ پھر جب یہاں آکر خود میں نے اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھا تو میں کانپ گئی۔ لیکن محسن! تم سے میری پسندیدگی کی وجہ دل و دماغی ہے..... میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔“ اتنا کہہ کر بازغہ نے اپنی مہین پلکیں جھکا دیں۔

محسن اس کی باتوں سے متاثر ہوا۔ ملاحت سے بولا۔

”بازغہ! سچائی اور حق کو سمجھنے اور پہچاننے والے لوگ عظیم

کویت پر عراقی قبضے کی سب سے زیادہ اور سب سے پہلے اسلامی ممالک نے ہی تشویش ظاہر کی تھی اور بعد میں عراق کو سمجھانے بھگانے کا سلسلہ شروع کیا تھا اور عراق سے متعدد درخواستیں بھی کی تھیں کہ وہ کویت سے اپنا غاصبانہ قبضہ ختم کر کے کویت سے نکل جائے..... مگر عراقی صدر کے عاقبت نائنٹس دماغ میں خفیہ یہودی سازش کا ایسا زخم بھرا تھا کہ اس نے اپنی بڑی بڑی توپوں، صحرائی فوجوں اور جراثیمی ہتھیاروں کا استعمال اور جانے کیا کیا پروپیگنڈا کروایا تھا۔

لا محالہ جب یہ لڑائی جسے متفقہ امت مسلمہ کی رائے کے مطابق ”گھر کی لڑائی“ کہا جاتا تھا، باہر کے منصف اور عالمی ہندو دھرم کے در پر لے جانی گئی تو سازش کے اصل محرکات سامنے آنے لگے اور پھر ہندو ریاست انصاف کا عمل لایا گیا۔ اب یہ امت مسلمہ کی بدبختی تھی یا پھر بے حسی کہ صیہونی سازش کی اس بساط میں امریکا اور برطانیہ ہی نہیں بلکہ دوسرے یورپی ممالک کی افواج کویت کو عراق کے غاصبانہ قبضے سے چھڑانے کے لیے میدان میں اتر آئیں۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ سب ماہر آئین دشمنوں نے ہنستے ہوئے اور ہم نے روتے ہوئے دیکھا۔

عراقی صدر کی پچاس پچاس گز لمبی توپیں، صحرائی افواج اور بڑھکیں کیا رنگ لائیں وہ..... اتحادی افواج..... بد قسمتی سے شمول مسلم ممالک کے سامنے نقش بر آب ثابت ہوئیں۔ اس کے بعد سے آج تک عراق کے عوام پر کیا بیت رہی ہے..... یہ ہم سب کے سامنے ہے۔ نصرانی سازشیں وہاں آج بھی اپنے جوبن پر ہیں۔

آئرلینڈ میں بیوری جوئیز جسے اپنے دادا (آئرلینڈ میں بیوری) کے یہودی قوم کے ہیرو کے حوالے سے فخر تھا، اس نے یہودیوں کو آنے والے وقتوں میں عظیم قوم اور عظیم طاقت کے حوالے سے جگایا تھا اور کہا تھا، فلسطین میں واقع ایک پہاڑی ”صیہون“ ان کے لیے مقدس نشان کی حیثیت رکھتی ہے اور اس نام سے اس نے صیہونی دہشت گرد تنظیموں کی بنیاد ڈالی۔ یہودیوں کے بڑے دانشوروں کے خفیہ اجلاس جو 1897ء سے 1905ء تک کے خفیہ اجلاسوں پر محیط تھے جن میں تمام عرب ملکوں پر قبضے کا منصوبہ تیار کیا جاتا رہا تھا۔ اس منصوبے کی بنیاد فیوری میسن کی کامیابی پر رکھی گئی جبکہ خود فیوری میسن کی بنیاد 1717ء میں یہودیوں نے مملکت انگلستان میں رکھی۔

فیوری میسن اپنے اس عظیم منصوبے..... پر القاعدہ دیگر گریٹر اسرائیل پلان کو علامتی طور پر ایک سیاہ کالے رنگ اور

ہوتے ہیں۔ تم بھی ایک ایسی ہی لڑکی ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے سچائی کو نہیں جھٹلایا۔ لیکن بازو!..... میرے ساتھ تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ سوائے آتش و آہن کی گھن گرج کے..... یقین کرو میرا۔ مجھے تمہارے خلوص اور تمہاری نیک نیتی پر کوئی شبہ نہیں ہے بلکہ میں تمہاری عظمت کو سلام پیش کرتا ہوں۔“

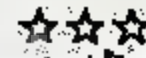
بازو اس کی بات سن کر بڑی محبت سے مسکرائی پھر بولی۔ ”میں نے تمہارے یہاں سے فرار کا بندوبست کر دیا ہے۔ یہ کام آج رات میں ہی ممکن ہو سکے گا۔“

”مگر رات ہونے میں تو ابھی کئی گھنٹے ہیں؟“ محسن نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تب تک یہاں مجھے دیکھ لیے جانے کا خطرہ بڑھ جائے گا۔“

”گھر میں میرے سوا اور کوئی نہیں۔ دو تین ملازم تھے، ان میں سے ایک تو طبیعت کی خرابی کی وجہ سے نہیں آیا۔ باقی دو کو میں نے..... باہر کے کسی کام میں مصروف کر دیا ہے۔ رات میں مزید تمہائی ہو جائے گی۔“

”تمہارا منصوبہ کیا ہے آخر..... مجھے بھی تو بتاؤ؟“

محسن نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا تو وہ اس کی تفصیل بتانے لگی۔



اسرائیلی خفیہ طہری اعلیٰ جنس یونٹ ”ہگانہ آرمی“ کا چیف ڈائریکٹر آئرلینڈ میں بیوری جوئیز..... اس وقت اپنی دو کاؤنٹر اعلیٰ جنس تنظیموں ”الیابیتھ“ اور ”شن بیٹھ“ کے دو اعلیٰ عہدیداروں فوہاگ، ہیل اور مادام میڈوسا کے ساتھ بند کمرے میں ایک کارٹر میٹنگ میں مصروف تھا۔ ”ہگانہ آرمی“ بیرونی معاملات سنبھالتی تھی اور اس کے لیے اس نے دو یونٹ بنا رکھے تھے۔ الیابیتھ کے فوہاگ ہیل کو امریکی عالمی معاملات کے خارجی اور داخلی امور میں پارلیمنٹ سطح کی عمل داری حاصل تھی، جو درون خانہ سی آئی اے کے کامیاب گٹھ جوڑ کے ساتھ اپنی خفیہ سازشوں کو اسلامی ممالک میں پھیلنے پھولنے کا موقع دیتی تھی۔ کویت پر عراق کے حملے کی سازش بھی ہگانہ آرمی کے اس کاؤنٹر اعلیٰ جنس یونٹ الیابیتھ نے امریکی سی آئی اے کے ساتھ مل کر تیار کی تھی اور عراق کے عاقبت نائنٹس بادشاہ نما صدر نے ”کٹ آؤٹ“ کا کردار سنبھالتے ہوئے کویت پر حملہ کر کے اسے بعض تاریخی حوالوں سے عراق کا حصہ قرار دیا تھا..... وہ شاید بھول گیا تھا کہ اگر تاریخی حد بند یوں کو جدید دور میں دہرایا جانے لگے تو دنیا میں بہت سے ممالک کا نام ہی نقشے پر باقی نہ رہے۔

کالے سیٹوں والے تیل نما انسانی چہرے سے تشبیہ دی ہے۔ جس نے قوم عالم اسلام کو اپنے پیرے میں لیا ہوا ہے اور اس کا منہ یر و خلم کی طرف ہے۔ کسی کالے ناگ ہی کی طرح گریٹر اسرائیل کا منصوبہ آگے کو بہ ظاہر خاموشی سے سرک رہا تھا کہ اچانک 1904ء میں روس کے ایک پادری پروفیسر اے نیلسن کے ہاتھ اس منصوبے کی ایک کاپی لگ گئی۔ حالانکہ تمام تر احتیاط کے باوجود یہ عالم اسلام خلاف منصوبہ اس خوبی سے پوشیدہ رکھا جاتا رہا تھا کہ اعلیٰ سطح کے یہودیوں کے سوا کسی دوسرے کو رسائی نہ تھی، یعنی خود عام یہودیوں تک کو نہ تھی۔

29 جولائی 1951ء میں اسرائیلی وزیر اعظم دیوید بن گوریان نے اسرائیلی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا: "ہمیں پورے جوش و خروش کے ساتھ یہ جنگ جاری رکھنا ہے۔ ہمیں ایک بار پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے کی سلطنت قائم کرنا ہے۔ تحریک صیہونیت کا یہ اولین نشانہ ہونا چاہیے کہ بکھری ہوئی بھیڑوں کو جمع کرنا ہے۔" بن گوریان کے اس خطاب نما تقریر کا واضح مطلب یہی تھا کہ 50 لاکھ یہودیوں کو دس سال میں اسرائیل میں جمع کرنا ہے۔ اگرچہ اسرائیل کے وسائل اس کے تحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے ہمیں خارجہ پالیسی میں یہ بات پیش نظر رکھنا ہوگی کہ اسرائیل کی ساری زمین کو خالی کرایا جائے اور اسرائیل کی "ساری زمین" سے مراد دریائے نیل کے کنارے سے نرات تک پھیلا ہوا علاقہ تھا.....

لہذا..... جب 13 اگست 1951ء کو یر و خلم میں عالمی صیہونی کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں بھی سب سے اہم زیر بحث موضوع یہی تھا۔

مئی 1952ء میں وزیر جنگ موئسے ڈیائیانا نے قوم کے نام پیغام میں یہی کہا کہ ہر ایک یہودی کو میدان جنگ میں نکل آنا چاہیے اور میں نے فوج سے کہہ دیا ہے کہ وہ دن رات تیاری میں مصروف رہیں۔ چاہے اس کے لیے ہمیں کتنے ہی صیہونی خفیہ ادارے تشکیل دینے پڑ جائیں، مگزی کے جال بننے بھی..... تو پروا نہیں۔ یہودی سلطنت کا قیام ہمارا نصب العین ہونا چاہیے اور ہم اسے حاصل کر کے ہی دم کیں گے۔ اور آج مگزی کے جال ہی کی طرح اسرائیلی خفیہ ادارے اپنے خفیہ مذموم کامز میں مصروف کار ہیں۔ ہم تو صرف مواد یا زیادہ سے زیادہ ڈیوڈ اسٹار کو ہی جانتے ہوں گے۔ بہت کم لوگوں کے علم میں فیری میسن، ہگانہ آری، الیا بیٹہ اور شن بیٹہ وغیرہ ہوں گے۔ مگر حیرت کی بات ہے۔ ان

ہتذکرہ بالا خفیہ اسرائیلی اداروں کے مقاصد ایک مگر کام کرنے کا انداز یا لائن آف ایکشن ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے۔ ان میں کوئی داخلی سطح پر متحرک ہے تو کوئی خارجی سطح پر گل کھلا رہا ہے۔ بہر طور..... 13 مارچ 1952ء کو یہودی ریاستوں کی سرحدوں کا تعین کرتے ہوئے لیبیر پارٹی کے سربراہ ڈاکٹر عاری القمان نے شیطانی منصوبے کو قاش کر دیا جو اب تک چلنی تھا۔ اس نے کہا۔

"عظیم تر اسرائیل..... عراق سے سویر تک پھیلا ہوا ہے۔ یہی وہ طاقتور ریاست ہو سکتی ہے جو مشرق وسطیٰ میں اندرونی و بیرونی امن و استحکام کی ضمانت دے سکے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم دنیا کو صاف اور واضح الفاظ میں بتادیں کہ فلسطین میں دنیا بھر کے یہودیوں کو جمع کر کے فوجی قوت بنانے کا مطلب اسرائیل کی نئی سرحدوں کا تعین کرنا ہے۔ جو عراق سے سویر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے بعد ہی اسرائیل مشرق وسطیٰ میں جمہوریت کا گوارہ بن کر اپنے آپ کو تباہی سے بچا سکتا ہے۔"

اسرائیل میں آج بھی اپنی میراث کے ملک کی نشاندہی کرتے ہوئے پارلیمنٹ کی پیشانی پر یہ الفاظ کندہ کیے گئے ہیں۔ "اے عظیم اسرائیل! حیرتی سرحدیں نیل سے فرات تک ہیں۔"

ایک یہودی مصنف نے تو یہاں تک لکھ مارا ہے کہ عظیم تر اسرائیل میں، شام، لبنان، اردن اور عراق کا بڑا حصہ صحرائے سینا بالائی مجدد اور مدینہ منورہ تک کا علاقہ شامل ہے یہودیوں کے لیے الگ سلطنت کا قیام صیہونیت کا واحد مقصد نہیں بلکہ اسرائیل کے قیام کے بعد ہمارے لیے اپنی تحریکوں (سازشوں) کو آگے بڑھانا ضروری ہو گیا ہے۔ اسرائیل کی حکومت تو صرف ایک وسیلہ ہے "منزل" نہیں ہے۔ عجم نامی ایک کٹر یہودی نے تو اسرائیلی پارلیمنٹ میں بہت پہلے بتا دیا تھا کہ اسرائیل کے لوگوں اور خود اسرائیل کی اس وقت تک کوئی اہمیت نہ ہوگی، جب تک ہم اپنا پورا علاقہ صح ناموں پر دستخط کیے بغیر آزاد نہ کرائیں۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہودی منصوبے کا ایک مرحلہ مکمل ہو چکا ہے۔ فلسطین اور جزیرہ نمائے سینائی پر اسے تسلط حاصل ہو گیا ہے۔ اب وہ اس منصوبے کے آخری مرحلے کی تکمیل کے لیے کام کر رہا ہے۔ جس کے در اہم اجزا ہیں۔ ایک تو یہ کہ مسجد اقصیٰ اور مسجد المنورہ کو منہدم کر کے اس کی جگہ ویکل سلیمانی تعمیر کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اسرائیل اپنی میراث کے ممالک پر قبضہ کر لے۔ اس سلسلے میں ہگانہ آری

”گڈ۔“ آئرمن جیری کی چندی چندی آنکھوں میں سانپ جیسی چمک لپک گئی۔ وہ پھنکار سے مشابہ آواز میں بولا۔ ”سب کچھ بالکل اسی طرح ہونا چاہیے لیکن ہر بار ایک یہی تریب نہیں چلے گا۔ سازش جس قدر خفیہ اور رنگ آمیز ہوگی اسی قدر زود اثر ہوگی۔“ آئرمن نے الیابیتہ کے فوہاگ تیل کی طرف کھنڈی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مکارانہ مسکراہٹ سے بولا۔

”جناب!..... اس بار حربہ مختلف ہی استعمال کیا گیا ہے۔ ایک دیرینہ منصوبے کے تحت ہماری یہودی قوم کا ہر آدمی امریکا کے اہم محکموں اور پوسٹ پر مشتمل ہے اور ہمارے کاز کو آسان بناتا رہتا ہے۔ عراق میں امریکی قونصلینٹ میں بھی امریکی یہودی ہیں..... انہی کی بھیجی جانے والی خفیہ رپورٹ کے تحت ہم نے..... عراقی صدر کی کابینہ میں اور باہر ایسے کچھ جرنیل کا پتا چلایا ہے جو بظاہر عراقی صدر کے دوست ہیں مگر اندر سے وہ کچھ اور عزائم رکھتے ہیں..... ان کے ساتھ مل کر ہم عراق پر دوبارہ امریکی اور اس کے اتحادیوں کی ہتھیار کا کامیاب منصوبہ بنا رہے ہیں۔“

فوہاگ تیل کی اس بات پر..... آئرمن جیری کا مکروہ چہرہ خوشی و مسرت کے تاثرات سے مزید گھناؤنا نظر آنے لگا۔ تو صنی لہجے میں بولا۔

”گڈ.....! اس بار ہمارا عراق پر دوسرا اور کارگر وار ہونا چاہیے جس کے بعد عراق دوبارہ نہ سنبھل پائے۔ اس کے بعد شام، لیبیا اور مصر ہماری سازشوں کی ہانڈی بنیں گے، ترکیہ تب ہی ممکن ہوتا رہے گا جب تک ہمارے ہمدرد اور سردسز امریکا کے ہر اہم محکمے اور پوسٹ پر موجود رہیں گے، ان سے حاصل کردہ خفیہ رپورٹس کی ترسیل بھی یقینی بنائی جائے یہ ”لیک آؤٹ“ نہ ہو سکتا ہے۔“

”جی جناب! بالکل..... ایسی تمام رپورٹس مونساد کے ہیڈ کوارٹر میں ”ای سی ایم“ (الیکٹرونک کاؤنٹر میژسٹریسٹم) کے ذریعے حاصل کی جاتی ہیں جو محفوظ ترین اور لیک پروف ہوتی ہیں۔“ فوہاگ تیل نے جواب دیا۔

اس کے بعد مگانہ کے ہانی کا ہم نام اور صیہونیوں کے موروثی ہیرو..... آئرمن جیری جو نیئر نے اپنا روئے سخن..... شین بیتہ کی چیف ماہام میڈوسا کی طرف موڑا۔

”تم برطانیہ میں کیا گل کھلا رہی ہو، یہودیوں کی حسین ملکہ..... میڈوسا؟“

عورت..... بلکہ حسین، طرح دار اور پرشباب عورت..... آئرمن کی بڑی پرانی کمزوری تھی۔ اس کا

کے دو پونٹ الیابیتہ اور شین بیتہ خفیہ طور پر فعال تھے اور اس کا ہنوا امریکا پوری طرح اسرائیل کا ساتھ دے رہا تھا۔ اگر پوری دنیا کے مسلمان اب بھی نفاق پر لعنت بھیج کر خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھام کر متحد نہ ہوتے اور..... اگر..... اب بھی ہوس اقتدار کے مارے جنہیں اپنے سنگھاسن کے ڈانواں ڈول ہونے کا خطرہ زیادہ عزیز رہتا ہے اور یہ سمجھتے رہیں کہ قوموں کی تقدیریں میدان جنگ کے بجائے ایوانوں میں بنتی ہیں تو پھر وہ دن دور نہیں جب گریٹر اسرائیل کا کالا ناگ سب کو لپیٹ میں لے لے گا..... (خاکم بدہن)

آئرمن جیری جو نیئر نے الیابیتہ اور شین بیتہ کے دونوں اسٹیشن چیف فوہاگ تیل اور ماہام میڈوسا کے سامنے اپنے دیرینہ اسرائیلی ناپاک منصوبے کی تکمیل کے خلاف معمول حلف لیا۔ اس کے بعد فوہاگ تیل سے مخاطب ہو کے بولا۔

”اسرائیل کی موجودہ داخلی صورت حال اتنی تسلی بخش نہیں رہی۔ اس لیے ہمیں اپنی خارجہ پالیسی کو اس کے تابع کرنا پڑے گا کیونکہ پہلے کے مقابلے میں فلسطین کے معاملے پر امت مسلمہ کا شور دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمیں اپنی خارجہ پالیسیوں کو آگے بڑھانا ہوگا۔ اسرائیل کو اس وقت سب سے بڑا خطرہ عراق سے ہے جو ایک ممکنہ ایٹمی اسلامی ملک ہے۔ ہمارے گریٹر اسرائیل پلان میں عراق سب سے بڑی رکاوٹ ہے اس وقت..... اور تمام اسلامی ممالک بشمول پاکستان، فلسطین کے معاملے پر ہم آواز ہو رہے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک ان کی پذیرائی عرب ممالک تک رسائی حاصل نہیں کر سکی ہے لیکن..... عراق کو تباہی کے دہانے پر کھینچنا ضروری ہے۔“

اس کے جواب میں گھٹے ہوئے قد اور گول سر اور چہرے والے فوہاگ تیل نے ہولے سے کھٹکھٹا کر گلا صاف کیا اور بولا۔

”جناب!..... موجودہ حالات ایک بار پھر اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ اس بار عراق کو تھم ہونے والی تباہی سے دوچار کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں ہمارا پونٹ واسٹیشن میں بڑی سرعت سے کام کر رہا ہے۔ بین الاقوامی پریس میں موجود ہمارے یہودی گماشتے ایک بار پھر پہلے کی طرح عراقی فوج اور ایشیائی قوت کا پردیگشا کرنے میں مصروف ہیں..... جس کے نتیجے میں غیر یہودی اور عیسائی مغربی طاقتیں گمراہ ہو رہی ہیں۔ اور ایک بار پھر عراق پر امریکا کی اتحادی بن کر چڑھ دوڑنے کے لیے بے چین نظر آ رہی ہیں۔“

اگر چہ پابھی حسن و شباب کا شیدائی تھی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس نے اپنے محل میں جو یہوشلم کے جنوب میں "یہودم" نامی گنجان پہاڑی مقام پر واقع تھا، مغربی حسیناؤں کا جگمگنا جمع کر رکھا تھا اور یہ حسینائیں گاڑی کے آئل کی طرح تھوڑے عرصے بعد بدل دی جاتی تھیں۔ اسی سال کی عمر تک ہگانہ کے ہائی ٹریڈ پائیز میں کا یہی مشغلہ تھا۔

سن بیٹھنے کی مادام میڈوسا بھی کم حسین تھی۔ وہ بچی یہودن اور حسین اسپرائٹل عورت تھی۔ ایک حسین ناگن..... جس کے حسن کا ہی نہیں بلکہ اڈتے شباب کا جادو بھی سر چڑھ کر بولتا تھا۔ اپنے حسن کی :- بانی اور پر شباب جسم کی ہوشر ہائی کو مزید قیامت خیز بنانے کے لیے وہ لباس بھی چست پہنتی تھی۔ وہ اپنے حسن اور دل آرا اداؤں کو دشمنوں کے خلاف ایک خطرناک بلکہ تباہ کن ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی تھی اور خاصی کامیاب رہتی تھی۔

سن بیٹھنے کی مادام میڈوسا اپنی حسن آرا ترفیوں سے قطع نظر ایک خطرناک اور زہریلی ناگن کی طرح تھی، اتنی ہی ذہین و فطین بھی اور سفاک بھی۔ اس کے مذکورہ یونٹ کی ذمہ داری امریکا اور برطانیہ کی جدید تعلیمی درسگاہوں میں مختلف اسلامی ممالک سے آئے ہوئے مسلم اسکالرز پر نہ صرف کڑی نگاہ رکھنا تھی، بلکہ انہیں بہکانے اور اپنے اصل مقصد سے ہٹانے کے علاوہ ان کی سرگرمیوں کو جانچنے کا بھی کام کرتی تھی اور انہی میں سے وہ ایسے اعلیٰ دماغ ذہین طالب علموں کی "کریم" کو بڑی بڑی آفرز کی صورت میں اپنے ملک اونٹنے کے بجائے وہیں امریکا کے مختلف محکموں میں اعلیٰ پوسٹ پر تعینات کرواتی تھی جہاں پہلے ہی امریکی نژاد یہودی لابی جو خفیہ طور پر گرین اسرائیل کے ایجنڈے پر معروف کار ہوتی تھی، وہ انہیں اپنے اشاروں پر ناپھنے پر مجبور کرتے، تھے اور جو ایسا نہ کرتا..... اسے کسی غیر قانونی سرگرمی میں پھنسا کر اس بے چارے کا مستقبل ہی نہیں حال بھی بربادی سے دوچار کر دیا جاتا تھا۔ مکروہ صورت آئزمن ہیری کے پر شکوہ انداز میں مخاطب ہونے پر مادام میڈوسا نے بڑی دل بھانے والی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا پھر ہلکتی آواز میں جواب دیتے ہوئے بولی۔

"ہمارا یونٹ امریکا اور برطانیہ کی اعلیٰ درسگاہوں میں بڑی کامیابی کے ساتھ عمل پیرا ہے جس کے نتیجے میں کئی آئی ٹی اینڈ کمپیوٹر ایکسپٹ، جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی اور ہیومن سائنس کی بڑی کمیپ ہمارے لیے مخصوص ہو چکی ہے۔ اگرچہ محدودے چند لوگوں نے سچ میں دامن

چھڑانے کی کوشش چاہی تھی مگر ان پر مختلف جھوٹے الزامات لگوا کر انہیں امریکی جیل خانوں میں ساری عمر سڑنے کے لیے ڈال دیا گیا اور ان کے ملک کے خلاف پروپیگنڈا بھی عمل میں لایا گیا۔"

"ہمیں سائنس کے شعبے علم الجبرائیم کے لیے کچھ اعلیٰ دماغ ورکار ہیں۔ یہ مائیکرو بیالوجسٹ ہاری اس کی کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوں گے جن کی ایک عرصے سے اسرائیل کی اٹنی لیبارٹریوں کو رت ہے۔" آئزمن نے اس بار کھنڈی ہوئی سنجیدگی لے سا۔ مادام میڈوسا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ اثبات میں دھیرے سے اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے بولی۔

"یہ بات ہمارے علم میں ہے۔ اس سلسلے میں تین بہترین اسکالرز ہماری نگاہ میں ہیں۔ ان میں سے دو کا تعلق عراق اور شام سے ہے جبکہ تیسرا ایک پاکستانی ڈاکٹر ہے....."

"گڈ.....! ان تینوں کو فوکس کرو..... اس کے علاوہ..... کسی قسم کی فلسطین موومنٹ کی خبر؟"

"بیس سر!" مادام میڈوسا نے کہتے ہوئے فوراً اپنے سر کو اٹھاتی جنبش دی اور آئزمن نے اس کی طرف گھورتے ہوئے یکلفت مستفسرانہ انداز میں اپنی بھوس سیکڑ لیں۔ میڈوسا بتانے لگی۔

"برطانیہ میں سرگرم ہمارے ایک سیکرٹ کاؤنٹر یونٹ نے رپورٹ دی ہے کہ وہاں فلسطینی اور ان کے ہمدرد سوس کے..... آئی آراے (آئزمن ری پبلک آرمی) سے تعلقات ہیں۔ ان کا خفیہ گھ جوڑ ایک باقاعدہ نیٹ ورک کی صورت اختیار کر چکا ہے۔"

مادام میڈوسا کی بات پر مکروہ صورت کٹر یہودی آئزمن کا چہرہ یکدم غصے سے لال چلا ہو گیا۔ "یہ کیوں اور کیسے ہوا..... مادام؟ وہ بھی سن بیٹھنے کی موجودگی میں؟ اور تم نے ان کا یہ نیٹ ورک توڑنے میں کیا کیا اب تک؟"

آئزمن طیش کا بھی پکا آدی تھا۔ اس سلسلے میں وہ کسی اپنے سے بھی رعایت برتنے کا قائل نہ تھا۔ اس نے باؤلے کتے کی طرح چلاتے ہوئے دہاڑ کر کہا تھا اور ساتھ ہی اس نے..... اپنے لباس سے ایک لمبی نال والا خونخاک پستول نکال لیا اور اس کا رخ مادام میڈوسا کی طرف کر دیا۔ میڈوسا کی سانسیں سینے میں اٹکنے لگیں۔ موت کے خوف سے طلق یکدم سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ وہ پیلے پڑتے چہرے اور پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

"س..... سر.....! ہم اس نیٹ ورک کا ہٹا چلا چکے

نے میز کے نچلے حصے کا ٹخن دبا دیا۔ بازو والے کمرے میں ایک چھوٹا گرین بلب چلنے بھینے لگا اور ساتھ ہی ہلکی ہلکی آواز ابھری۔ وہاں دو افراد آرام دہ صوفوں پر پہلے سے موجود تھے، ایک اسرائیلی انٹروکیشن کا چیف انچارج شمیر گویان تھا اور دوسرا..... کشن بیریڈن تھا۔ اشارہ پاتے ہی وہ کانفرنس ہال کی طرف بڑھ گئے، جدھر آئرزمین بیریڈن ان کا منتظر تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر کمال احمد سے زیادہ جیتھر نیوٹر پریشان تھی، بلکہ وہی سب سے زیادہ کمال کے لیے فخر مند ہو رہی تھی۔ اگرچہ کالے امریکی بیودی اسکالر ڈی کارلو کو اس روز ڈاکٹر کمال نے سینٹرل کیمپین میں جو منہ توڑ جواب دیا تھا، تو اپنی ہرزہ سرائی کے جواب میں وہ ڈاکٹر کمال احمد کی مدد اور شعلہ بیاں جو اپنی کارروائی کے آگے ڈرا بھی نہ ٹھہرا پاتا تھا اور رخصت ہوتے سے اس کی آنکھوں اور چہرے سے ڈاکٹر کمال کے لیے کینہ اور بغض کے علاوہ ذاتی عداوت کی چنگاریاں بھی پھوٹنے لگی تھیں۔ وہاں موجود تقریباً سبھی طالب علموں نے بھانپ لی تھی، کچھ مسلم اسٹوڈنٹس نے بعد میں ڈاکٹر کمال کو ازراہ ہمدردی۔ مشورہ بھی دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس کٹر بیودی کے منہ لگنے کی کوشش نہ کرے۔ مگر ڈاکٹر کمال کو اس کی پروا کب تھی۔ وہ بڑے جوش کے ساتھ اپنے ہم مذہب ہمدردوں سے کہتا۔

”کوئی میرے سامنے کھڑا ہو کے..... مجھے متوجہ کر کے..... میرے مذہب، میری قوم اور میرے وطن کے خلاف اس طرح کا زہراٹھے..... میں اسے اسی طرح منہ توڑ جواب دیتا رہوں گا۔ چاہے میرے سامنے..... لندن کا میئر یا یو نیورٹی کا چانسلر ہی کیوں نہ کھڑا ہو۔ میں ایسی مصلحت آمیز خاموشی اور ایسی ڈگری پر ہزار بار لعنت بھیجوں گا، جس کی خاطر مجھے یہ بکواس سننا پڑے۔“ ان ہمدرد مسلم طلباء..... میں ایک عراقی اسکالر حماد اندال بھی شامل تھا۔ اس نے Metallurgy میں انجینئرنگ کی تھی اور اب سبیکٹ اسپیشلائزیشن کی غرض سے یہاں آیا ہوا تھا۔ یہ اسکالر تو نہیں تھا اور اپنے غریبے پر یہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا تاہم اس کا خاندانی بیک گراؤ نڈ خاصا مضبوط تھا۔ جو عراق کے شہر بغداد کے مشہور اور پوش علاقے ”النصور“ میں رہائش پذیر تھا اور اس خاندان کا شمار بغداد کے متمول اور معزز گھرانوں میں ہوتا تھا۔ اس کا باپ شائل اندال..... بغداد میں ایک اعلیٰ اور کلیدی اہمیت کے حامل عہدے پر فائز تھا۔ اس کی

تھی..... اور اسے سبوتاژ کرنے کی منصوبہ بندی بھی مکمل ہو چکی ہے..... امید ہے اسے زیادہ بھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملے گا۔“

”نو..... نو..... نیور..... وٹس ناٹ انٹ..... مادام.....! آئرزمین اپنا پستول والا ہاتھ قدرے بلند کرتے ہوئے اس کی نال کارخ مادام میڈوسا کی سپید و ملائم جلد والی پیشانی کی طرف کرتے ہوئے چیخا۔

”مجھے بھلانے کی کوشش مت کرو مادام.....! یہ سب کافی نہیں، اب دوبارہ امید جیسا لفظ استعمال نہ کرنا میرے آگے۔ یقیناً بات کرو، عمل کی..... ڈو آر ڈائی..... وٹس اٹ۔ اوکے.....؟“

شن بیٹھ کی میڈوسا کی پیشانی حرق آلود ہو گئی، خوف سے اس کا حسین چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ تاہم اس نے اپنے سینے سے پھنسی پھنسی سانس خارج کی اور یہ مشکل بولی۔ ”بس ہر!..... ایسا ہو جائے گا، بہت جلد ہو جائے گا۔“

”بس اوکے..... آئرزمین کے چہرے اور لہجے کے تناؤ کا پھر اپنا قدرے کم ہوا اور پستول اس نے واپس اپنے لباس میں چھپا لیا۔ مادام میڈوسا کی ہی نہیں..... بلکہ سامنے بیٹھے، الیا بیٹھ کے فوہاگ تکل کی بھی جان میں جان آئی تھی کیونکہ آئرزمین انہوں میں بھی ایک سفاک اور سنگدل پاس کے نام سے مشہور تھا۔ اس منحوس ٹھیل پر کئی اسرائیلی

تھیجیہ ایجنٹیوں اور یونٹ..... کے افسروں نے..... اپنے ہاسر کے ہاتھوں چشم زون میں اپنے ساتھیوں کو گولی کھا کر مرتے دیکھا تھا۔ پھر بالخصوص فوہاگ تکل کو تو کم از کم مادام میڈوسا جیسی حسین ساتھی کا اپنی آنکھوں کے سامنے

مرنے دیکھنا بہت دردناکی کا باعث ہوتا۔ اس لیے کہ فوہاگ تکل اور مادام میڈوسا کے درمیان آپس میں ساتھی کے علاوہ گہرے دوستوں جیسے مراسم تھے۔ اس وقت بھی اس اہم میٹنگ سے فارغ ہونے کے بعد دونوں نے یروشلم کے ایک گلابری ہوم میں رات اکٹھے گزارنے اور پینے پلانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔

”میں فلسطینی حریت پسندوں کے کسی بھی بیرونی سرگرمیٹ ورک کو پروا نہیں کر سکتا..... وٹس آل۔“

چند ثانیوں کی دھڑکی خاموشی کے بعد آئرزمین نے تھکمانہ لہجے میں کہا اور پھر مخصوص انداز میں اپنے سر کو ایک جانب جھکا۔ یہ اشارہ تھا میٹنگ کے برخاست اور ان کی رخصتی کا۔

تھوڑی دیر بعد آئرزمین تنہا بیٹھا رہ گیا۔ پھر اس

گھومنے اور دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔ اس کی ایک وجہ ہے بچپن میں ہم بغداد کی کہانیاں پڑھتے اور سنتے آئے ہیں۔ چاہے وہ پریوں، جنوں اور شہزادوں کی داستان ہو یا پھر الف لیلا۔“

”ہاں دوست! بغداد واقعی بہت خوب صورت ہے لیکن میں نے تمہارے وطن پاکستان کی بھی بہت ترغیبیں سنی ہیں۔ وہاں کے لوگ بہت اچھے، محبت کرنے والے، مہمان نواز اور پر غلوس ہوتے ہیں۔“ حماد نے بھی مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

”اس میں تو کوئی شک نہیں۔ میرا وطن پاکستان پانچ خوب صورت دریاؤں کی سرزمین ہے۔ سارے موسموں کی فصلیں اترتی ہیں۔ مرغزار ہیں برف پوش پہاڑیاں ہیں۔ صحرا ہیں اور سب سے بڑی خوبی بارہ مہینے ٹھانھیں مارنے والا سمندر ہے۔“

ڈاکٹر کمال احمد بڑی محبت اور بڑے جذبہ حب الوطنی میں ڈوب کر اپنے پیارے وطن پاکستان کے بارے میں بتا رہا تھا اور حماد اندال بڑے پر شوق انداز میں اس کی بات سن رہا تھا پھر بولا۔

”بے شک کمال! اتنی خوبیوں والا وطن خوب صورت ہی ہونا چاہیے۔ ہر انسان کو اپنے وطن سے اتنی ہی محبت ہوتی ہے اور ہوتی بھی چاہیے۔“ پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”مگر دوست! یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہی ہے کہ جب اپنے وطن پر ذرا بھی آج آتی ہے تو ہر محب وطن کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ میرے وطن عراق پر بھی ایک ایسی بری گھڑی چلی جگمگ کی صورت میں آئی تھی۔ کچھ عاقبت نا اندیش جرنیلوں کی اندرونی سیاست کے باعث عراق کا یہ ایک بڑا نقصان ہوا۔ اس وقت وہ پہلی اسلامی ایشیائی قوت بن کر ورلڈ اسلامک نیشن کے نقشے میں ابھرنے والا تھا مگر اغیار کو اسلامی ملک کی متوقع ایشیائی طاقت ایک آنکھ نہ بھائی اور اسے سبوتاژ کر دیا گیا۔“

یہ بتاتے ہوئے حماد اندال کا چہرہ اداسی کا مظہر نظر آتا تھا۔ ڈاکٹر کمال کو ہمیشہ کرنٹ افیئر پر اتھارٹی رہا کرتی تھی۔ وہ آج سے کئی سال پہلے کے تناظر میں عراق پر امریکا اور اس کے اتحادیوں کی لشکر کشی کے حوالے سے اس گفتگو کا اشارہ سمجھ رہا تھا۔ گہری متانت سے بولا۔

”ہاں ہر اسلامی ملک بالخصوص میرے پاکستان کے اہل دل میں اس کا دکھ اب بھی تازہ ہے جب امریکا کے اتحادیوں میں اسرائیل بھی پیش پیش تھا اور اس نے ہی سب سے پہلے عراق کے ایشیائی پلانٹ کو نشانہ بنایا تھا۔ اس سازش

والدہ ام کلثومہ بھی ”موصول“ کے ایک معزز قبائلی سردار خاندان سے تعلق رکھتی تھی، جو ایک اچھی وفا شعار بیوی اور ماں تھی۔ حماد سے ایک سال چھوٹی جوان بہن حبیبہ تھی۔ حماد کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا، وہ خاصا ذہین اور پُر جوش نوجوان تھا۔

سرخ و سفید رنگت اور وجیہ شخصیت کا مالک حماد اندال..... بھی ڈاکٹر کمال احمد کا ہم عمر تھا۔ دونوں میں ایک قدر اور بھی مشترک تھی، دونوں ہی لیے دیے رہنے والے اور مرنجان مرنج انسان تھے مگر سینٹرل گیسٹین والے اس روز کے واقعے کے بعد۔ حماد کو ڈاکٹر کمال نے از حد متاثر کیا تھا اور پھر جب اسے ڈاکٹر کمال کے احساسات و جذبات کا اندازہ ہوا تو بے اختیار اس نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حماد خود بھی ایک ایسے بہادر اور جزی باب کا بیٹا تھا جو اپنے وطن اور قوم کا وقادار اور بہرورد تھا۔ یہی خصوصیات حماد میں بھی بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔

اس طرح کے دو آدمیوں میں دوستی بھی بہت گہری ہوتی ہے۔ لہذا ان کی دوستی بھی خوب جتنے لگی۔

”یار! میرا بڑا دل کرتا ہے تمہیں اپنا وطن دکھاؤں..... اپنا شہر بغداد دکھاؤں، اپنے گمراہوں سے ملواؤں۔“

ایک روز دونوں دوست کمرے میں موجود تھے تو حماد نے بڑے غلوس و اشتیاق کے ساتھ ڈاکٹر کمال سے کہا۔

اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے لندن بارش سے بھیگا ہوا تھا۔ ٹھنڈی پڑ رہی تھی مگر اس سردی کا احساس بڑا دلفریب اور خوشگوار تھا۔ کمپس کی وسیع و عریض عمارت خوب صورت محسوس ہو رہی تھی ایسے میں حماد نے کمال کو اپنے روم میں آنے اور گرم کافی کی دعوت دے ڈالی تھی جو وہ رو نہیں کر سکا تھا۔ حماد نے رین کوٹ پہنا ہوا تھا جبکہ کمال نے کالے رنگ کا چمڑ چڑھایا ہوا تھا۔

دونوں دوست اب کمرے میں بیٹھے کافی پیتے ہوئے باتیں بھی کر رہے تھے۔ روم سینٹرلی بیٹھتے تھے۔ گھڑکی کے پٹ کھلے ہوئے تھے اور شفاف شیشے کے پار سبز اور اوو سے رنگوں کی خوشنما پھولوں سے لیدی کیاریاں بارش کے پانی سے بھیگ رہی تھیں اور گھر رہی تھیں۔ کمر اکشادہ اور آرام دہ تھا۔ کمرے میں بیٹے، صوفے، دو کرسیاں ایک کونے میں راتنگ ٹیبل تھی اور ایک ڈبل دیوار گیر الماری تھی۔

حماد کی بات پر ڈاکٹر کمال نے صوفے سے سر کھایا تھا پھر کافی کا..... ایک گھونٹ لینے کے بعد بولا۔

”دوست! آج پوچھو تو مجھے بھی بغداد جیسا قدیم اور تاریخی شہر

کا مائٹرمائٹڈ بھی اسرائیل تھا اور اسے شروع سے ہی متوقع
ایسی قوت والا عراق آنکھوں میں کھٹک رہا تھا۔

”وہ تو ہوا سو ہوا مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ آخر
اغیار کی سازش کو اپنے ملک میں پھیلنے پھولنے کا اور اندرونی
سیاست کا موقع ہی کیوں دیا گیا؟“ حماد افسردگی سے بولا۔ تاہم
اس کی آواز میں جوش کا ارتعاش بھی تھا۔ ”آج ایک بار پھر
وہی صورت حال ہے عراق نے کلف دار کے بعد جس تیزی
سے خود کو دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا کیا تو ایک بار پھر اغیار
کی سازشوں اور اندرونی سیاست کی ہانڈی پکنا شروع
ہو چکی ہے۔ جو اسرائیلی خفیہ دستکندوں کے لیے راہیں ہموار
کرنے لگی ہیں۔ میرے دوست کمال! میرا وطن عراق مجھے
ایک بار پھر ڈانواں ڈول ہوتا نظر آ رہا ہے۔ میرے والد
شمالی اس سٹیٹ میں بہت پریشان رہنے لگے ہیں۔ وہ ہم
بچوں سے (ماد اور اس کی بہن حبیبہ) اپنی پریشانی چھپاتے
ہیں مگر والدہ (ام کلثوم) سے ہر معاملے پر اظہار خیال
کرتے رہتے ہیں۔ اس بار جب میں چند روز کے لیے
بغداد گیا تو والد نے ہی مجھے یہ سب بتایا تھا کہ چند ایسے
عراقی جرنیل جنہوں نے جانے کتنے دستکندوں سے انقلابی
کونسل میں اکثریت حاصل کر لی ہے وہ اب والد سمیت
پارٹی کے ایسے اعلیٰ عہدیداروں کو کسی ایسی اندرونی سیاست
کی سازش کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں جن سے ان کی وطن سے
وقاداری اور پارٹی سے غداری پر تشکیک کی مہر ثبت کی
جاسکے۔ حالانکہ میرے والد اور ہمارے خاندان کی وطن
اور پارٹی سے وقاداری کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے لیکن
دوست، سازش اسی کو تو کہتے ہیں کہ اچھے بھلے آدمی کے
چہرے پر کالک ل دی جائے۔“

حماد اتنا بتاتا کر خاموش ہو گیا۔ اس کا چہرہ اترا اترتا تھا۔
آنکھوں میں غمگینی تھی اور اپنے وطن کو ایک بار پھر عالمی اور
صیہونی سازش تلے تختہ مشق بننے دیکھنے کا دکھ ایک کرب
مسلل کی طرح اس کے سنے ہوئے چہرے سے مترشح تھا۔
ڈاکٹر کمال حمد اپنے دوست کو اس قدر... آزرده خاطر پا کر
فوراً اٹھ کر اس کے پاس آیا، کافی کا کپ تپائی پر رکھا اور
بڑی دوستانہ محبت کے ساتھ اپنا ایک ہاتھ اس کے کاندھے
پر رکھتے ہوئے بولا۔

”نماذ بھائی! افسردہ اور پریشان ہونے سے خطرات
فل نہیں ہوتے۔ بیرونی سازشیں تب ہی کامیاب ہوتی ہیں
جب ایک ملک اور قوم کا باہمی اتحاد کمزور پڑنے لگے جبکہ
اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ امت مسلمہ متحد ہو کر

ایک ایسی ریجن بن جائے کہ پھر اغیار کی سازشوں کو پھیلنے
پھولنے کا موقع ہی نہ ملے۔ اس کے ساتھ ہی ہم مسلمانوں کو
اللہ کی رسی بھی مضبوطی سے تھامنا ہوگی۔“

حماد نے اپنے کاندھے پر دھرے ڈاکٹر کمال کے
ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور ہولے سے خیمہ تپایا۔ ان دونوں
دوستوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے برادر اسلامی ملکوں کی
باہمی اتحاد کی داغ بیل کا ادھر ہی سے آغاز ہونے لگا ہو۔
حماد تو ڈاکٹر کمال کی باتوں سے اس قدر متاثر ہوا کہ
اٹھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

”ہاں دوست! تم صحیح کہتے ہو۔ اغیار کی سازشوں کا
توڑ توڑ موموں اور امت مسلمہ کا باہمی اتحاد ہے۔“

اگلے دن کی صبح رات بھر کی بارش سے دھلی دھلی اور
کھھری کھھری تھی۔ لندن کو بارشوں کا شہر بھی کہتے ہیں۔ اس
قدر بارشوں کے ہا وجود مجال ہے جو سڑک پر یا کسی گھر کے
آگے ذرا بھی پانی... جمع نظر آتا ہو۔ اس کی وجہ نکاسی کا
بہترین نظام تھا۔ کیا مجال جو بجلی بھی جاتی ہو۔ بجلی جانا تو
درکنار ایک ذرا سا جھٹکا بھی نہیں آتا تھا۔ شدید ہے کہ ایک بار
لندن میں بجلی نے ہلکا سا جھٹکا لیا تھا تو الیکٹریک سٹی
ڈیپارٹمنٹ کے چیف انجینئر کو معطل کر دیا گیا تھا۔

کارلو ڈاکٹر کمال کی موٹر جوانی کا ردوائی کے بعد غائب
رہنے لگا تھا۔ یہی نہیں اب ان مسلم اسکالرز طلبانے بھی سکھ کا
سائنس لیا تھا۔ جو بے چارے اس امر کی نڈا دکالے بیہودی
ڈی کارلو کی تشکیک و تشبیح کا نشانہ بنتے رہتے تھے مگر اس کا
مطلب یہ نہ تھا کہ کارلو بالکل ہی منظر سے غائب ہو گیا تھا۔
وہ نظر آتا رہتا تھا مگر پھر دوبارہ اس نے کسی سے اچھنے کی
جرات نہیں کی تھی البتہ ڈاکٹر کمال کے لیے وہ اپنے دل میں
کینہ اور بغض رکھنے لگا تھا۔ کسی کبھار ان کا سامنا بھی ہو جاتا
تو ڈی کارلو اسے محض محاسمانہ نظروں سے گھور کے رہ جاتا۔

اس روز ہالی ڈے تھا۔ ڈاکٹر کمال نے اپنے بھائی ظہیر
احمد کے ہاں جانے کا پروگرام بنایا۔ ظہیر سینٹرل سٹی کے نواحی
علاقے میں بالفاظ دیگر لندن کے مضافات میں ایک
درمیانے درجے کے علاقے میں رہتا تھا۔ جدھر چھوٹے
بڑے فلیٹوں کی بھرمار تھی۔ سینٹرل لندن میں کوئی فلیٹ مسلم نہ
تھا چند لگژری ہائی فائی اسٹینڈرڈ کے اپارٹمنٹ نظر آتے تھے۔
زیادہ تر لوگوں کے خوب صورت کشادہ مکان تھے۔ ایک
منزلہ دو منزلہ..... یہاں ہر گھر میں بیس منٹ ضرور ہوتی تھی۔
یہاں بھی رہائش ہوتی تھی۔ عموماً لینڈ لارڈز اپنی بیسمنٹ
کرائے پر دیا کرتے تھے۔ مکان بہترین اور بیش قیمت

بعد اکتھے ایک کمرے میں چائے پینے لگے تو ظمیر احمد نے ایک لغاف کمال کی طرف بڑھا دیا۔ یہ پوئل لغاف تھا یعنی خط تھا جو بہاولپور (پاکستان) سے ظمیر احمد کے نام آیا تھا۔

”یہ کیا ہے بھائی جان؟“ ڈاکٹر کمال نے اپنے چہرے نا عینک درست کرتے ہوئے بڑے بھائی سے پوچھا، ساتھ ہی لغافہ تمام لیا۔

”تم خود ہی پڑھ لو، اب تمہیں کیا بتاؤں؟ تم تو ایسے لندن آئے ہو کہ پیچھے پلٹ کر بھی دیکھنا گوارا نہ کیا۔“ ظمیر کزوے سے لہجے میں بولا۔ ”کہ وہاں ہماری دو بہنیں بھی رہتی ہیں۔“

کمال کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا مگر وہ بڑے بھائی کی عزت کرتا تھا اس لیے خاموش ہی رہتا تھا۔ اس نے لغافہ کھول کر خط نکالا۔ یہ خط ان کی بہن راشدہ کا تھا۔ بڑا ہی دکھ بھرا خط تھا۔ راشدہ کے مقابلے میں شمیمہ خوش نصیب بہن تھی جو اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی بہاولپور کے نواحی گاؤں میں زندگی بتا رہی تھی مگر بے چاری راشدہ کا نصیب خراب نکلا تھا۔ اس کا شوہر لاہنگی اور بدو ماغ تھا۔ ابتدا میں تو سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ تین بچوں کی ولادت بھی ہوئی مگر پھر جانے کیا ہوا کہ راشدہ کے شوہر شمس کا رویہ ایسا ہیوی سے خراب رہنے لگا۔ ایسا تب سے ہونے لگا جب اس کی نوکری چھوٹی تھی۔ پھر دوبارہ اسے کہیں ملی بھی نہیں۔ وہ مایوس اور چڑچڑا رہنے لگا۔ بیوی کو مارتا پھیٹا اور معصوم بچوں کو بھی ذرا ذرا سی بات پر دھڑکنے لگتا۔ خط کے متن کے مطابق راشدہ نے ظمیر احمد اور کمال احمد اپنے دونوں بھائیوں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ شمس نے اس کی اور بچوں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ آئے روز طعنے دیتا رہتا ہے۔ تیرے دودھ بھائی لندن میں ہیں اور تجھے کوئی پوچھتا تک نہیں۔ کہہ دے ان کو تجھے میں آج طلاق دے کر گھر سے نکال باہر کروں تو، تو کدھر جائے گی۔ اس کا اصل مقصد محض یہ ہوتا تھا کہ انہیں بھی لندن بلا لیا جائے۔ دماغ اس کے گھروالوں اور دوستوں نے خراب کیا تھا۔ راشدہ نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے کہنے پر اپنے بھائیوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی مگر شمس کی طرف سے دن بدن دباؤ اور بڑھتے ہوئے ظلم کے نتیجے میں وہ ایسا خط... بھائیوں کو انتہائی مجبور ہو کر لکھ رہی ہے، ہو سکے تو اس بد نصیب بہن کو معاف کر دیتا۔

بہن کے خط کا لب لباب یہی تھا جسے پڑھ کر ڈاکٹر کمال کو دکھ بھی ہوا اور اپنے لاہنگی بہنوئی پر غصہ بھی آیا۔

نمارتی لکڑیوں کے بنے ہوئے تھے۔ انگریزوں کا اپنا ایک پراپرٹیونگ اسٹائل ہے۔ چاہے ساٹھ گز کا مکان ہی کیوں نہ ہو، وہ اپنے مکان کے آگے پیچھے باغیچے ضرور بناتے ہیں۔

لیڈز (Leeds) لندن کا ایک جدید علاقہ تھا۔ ڈاکٹر کمال اپنے کیپس سے نکل کر بس اسٹاپ پر آ گیا جو یورنیورسٹی کیپس کے گیٹ سے واکنگ ڈسٹینس پر تھا۔ سردی زوروں پر پڑ رہی تھی۔ گوروں نے موسم کی مناسبت سے بڑے موٹے اونٹنی لباس پہنے ہوئے تھے۔ کمال نے بھی اپنی دراز قامت پر لمبا چسٹر پہن رکھا تھا۔ جس کے کالر کھڑے کر رکھے تھے۔ بیروں میں لانگ بوٹ تھے۔

ظمیر احمد لیڈز کے جس نواحی علاقے میں رہتا تھا، وہ زیادہ دور نہ تھا۔ وہ ٹیوب میں سوار ہوا اور لگ بھگ کوئی پندرہ منٹ میں ٹرل پہنچ گیا۔ علاقے کا نام غیر ملکیوں اور مقامی دونوں کے لیے عجیب و غریب تھا مگر اس کی ایک تاریخی وجہ تھی۔ بہت پہلے جنگ عظیم دوم میں اتحادیوں نے یہاں جرمن قیدیوں کو رکھا ہوا تھا۔ یہ عام قیدی نہ تھے وہ گناہوں کے اعلیٰ افسر تھے۔ چند ہاپانی قیدی بھی تھے۔ یہ لوگ ہمیں سے کوئی ڈیڑھ سو فٹ لمبی سرنگ بنا کے فرار ہوئے تھے۔ وہ سرنگ آج بھی قائم تھی اگرچہ یہاں اب نکاسی کے موٹے موٹے سیلن زدہ زنگ آلود پائپ بچھا دیے گئے تھے۔

”ٹرل“ ہماری اصطلاح میں ایک گاؤں ہے مگر لندن کے گاؤں بھی کسی خوب صورت شہر کا ہی منظر پیش کرتے تھے۔ سرسبز قارم یہاں بھی بنے نظر آتے تھے۔ بڑے بڑے طویل گھاس کے میدانوں پر پن چکیاں گھومتی رہتی تھیں۔ اوپر کھلا نیلا آسمان ہوتا۔ سکون اور خاموشی رہتی تھی۔

ڈاکٹر کمال اپنے بھائی اور بھابی پروین اور اپنے دونوں بھتیجیوں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لے کر جاتا تھا۔ اس دن بھائی بھی گھر پر ہوتا تھا۔ فون پر ان کی بات ہو جاتی تھی۔ ایک سگے بھائی کے مقابلے میں بھابی پروین کا رویہ ڈاکٹر کمال یعنی یورپی کے ساتھ اچھا ہوتا تھا پھر دونوں بچے بھی کمال سے بے حد مانوس تھے۔ وہ ان کے ساتھ کھیلتا بھی تو بچوں کی طرح تھا۔ ظمیر عام سے انداز میں بھائی سے ملتا تھا لیکن اس بار کمال کو ظمیر کچھ الجھا الجھا سا دکھائی دیا۔ بھابی بھی خاموش خاموش ہی نظر آئیں۔ کمال کو اچھا تو ہوا تاہم چپ رہا۔ بھینی پروین اسے زبردستی دوپہر کے کھانے پر روک لیا کرتی تھیں یوں وہ سہ پہر کو ہی واپس وہاں سے کیپس لوٹتا تھا۔

جلد دن بات کھل گئی۔ جب دونوں بھائی کھانے کے

بولے۔ ”بھلا تمہارے اکیلے آدمی کا کیا خرچہ ہے۔ اسکا ر شپ پر آئے ہو، تمہارا تعلیمی خرچہ تو پاکستان اٹھارہ ہے۔“
 ”ہاں بھائی جان! اس لیے محض گزارہ ہی ہو رہا ہے اور اپنی استطاعت کے مطابق میں پاکستان بہنوں کے لیے کچھ نہ کچھ بھیجتا رہتا ہوں۔ آپ بتائیں آپ نے ان دس پندرہ سالوں میں کیا بھیجا؟“

ظہیر لاجواب ہونے لگا اور آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ کمال کا مقصد بڑے بھائی کو مت توڑ جواب دینا ہرگز نہیں ہوتا تھا مگر اسے بھائی کی اس بات پر دکھ ہوتا تھا کہ وہ اپنی کمزوریوں اور بے حس خود غرضیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے بلاوجہ اسے نشانہ بناتا رہتا تھا۔

بھائی پر دین کی قریبی چوکھٹ کے پار سے دونوں بھائیوں کی سچ کلامی کون رہی تھی۔ اندر آ کر شوہر سے بولی۔
 ”کمال بھائی سچ کہہ رہے ہیں ظہیر..... یہ بے چارے تو خود لندن میں رہتے ہوئے پاکستانی تنخواہ پر گزارہ کر رہے ہیں۔ یہاں تنخواہ لے رہے ہوتے تو الگ بات تھی۔ آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ راشدہ بہن کے شوہر کو اسپانسر شپ نہ یہاں بلا لیں اور اپنے ساتھ کام پر لگالیں۔ آپ کو تو یہاں کی سیکسٹی بھی مل چکی ہے۔“

بیوی کی بات پر ظہیر نے کڑی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور جل کر بولا۔ ”تو میں یہاں کیا درختوں سے روپے توڑ رہا ہوں؟ ایک چھوٹا سا ڈپارٹمنٹل اسٹور ہی چلا رہا ہوں۔ تم اپنا کام کرو، اندر جاؤ یہ ہم بھائیوں کا آپس کا معاملہ ہے۔“

پروین واقعی نیک پروین تھی، وہ روایتی بھائیوں کی طرح نہیں سمجھی کہ اپنے دیور اور اپنی مندروں کے خلاف شوہر کے کان بھرتی ہو بلکہ وہ ایک سلیقہ شعار، سکھڑ اور نیک فطرت عورت تھی۔ ڈاکٹر کمال کی طرح وہ بھی جانتی تھی کہ ظہیر احمد کس قدر خوش حال اور آسودہ حال زندگی بسر کر رہا تھا اور اگر چاہتا تو اپنی نصیبوں جلی بہن راشدہ کی مدد کر سکتا تھا۔

”آپ لوگ پلیز میری وجہ سے اپنے گھر کا ماحول خراب نہ کریں۔“ ڈاکٹر کمال دونوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”میں ٹیلی فون پر ٹیکس بھائی سے بات کر کے انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں مگر بھائی جان پلیز! آپ میری مجبور یوں کو بھی سمجھیں۔ میں نے وطن میں رہتے ہوئے ایسا کیا اور بہنوں کے لیے جو کر سکا، وہ کیا۔ یہاں میں اپنی تعلیم مکمل کرنے آیا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے بعد پاکستان جا کر میں راشدہ بہن کے لیے ہی نہیں بلکہ شمیمہ بہن

”ٹھیک ہی تو لکھا ہے بہن نے۔ اس وقت خاموشی میں سب سے زیادہ آزاد، بے فکری اور خوش حال زندگی تم ہی گزار رہے ہو۔ کمال! کم از کم تم ہی راشدہ بے چاری کا خیال کر لیا کرو۔“ بڑے بھائی نے حسب عادت اس پر طنز کرنا شروع کر دیا۔ کمال بڑے بھائی کی سچ بات کو پنی گیا اور بروہاری سے بولا۔

”بھائی جان! مجھے تو لندن آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں اور انشاء اللہ جلد سے جلد اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس اپنے وطن لوٹ ہی جاؤں گا لیکن باوجود اس کے میں راشدہ کا ہی نہیں، شمیمہ بہن کا بھی خیال رکھتا ہوں۔ ماموں جب زندہ تھے تو ان کے بوڑھے کاندھوں پر جوان بیٹیوں کا بوجھ آن پڑا تھا۔ وہ بھی میں نے ہی بانٹا تھا ابا کے ساتھ۔ لندن... آ کے اپنی تعلیمی مصروفیات کے باوجود میں راشدہ کو پیسے بھیجتا رہتا ہوں اب آپ اپنے بارے میں بتائیں ذرا آپ کو تو ایک عرصہ ہوا لندن میں سیشنل ہوئے۔ آپ نے چھوٹے بہن بھائیوں اور بوڑھے ماں باپ کے لیے کیا کیا تھا؟“

”اب تم گڑے مردے اکھاڑو گے۔ اس وقت میرے ساتھ بھوریاں تھیں۔ اتنی آسانی سے میں یہاں سیشنل نہیں ہوا۔“ ظہیر احمد لاجواب ہونے لگا تو بات کا رخ دوسری طرف موڑنا شروع کر دیتا تھا۔

”بھائی جان! ماشاء اللہ آپ تو شادی کے بعد سے ہی یہاں اچھا خاصا میٹ ہو چکے تھے۔“ کمال گل سے بولا۔
 ”اور میں کہاں سے خوشحال ہوں؟ جو کچھ میں نے پاکستان میں رہتے ہوئے نوکری میں کمایا، وہ بوڑھے ماں باپ کی بیماری اور پھر دونوں بہنوں کی شادیوں پر خرچ کر ڈالا۔ اعلیٰ تعلیم کا چانس ملا تو یہاں آ گیا مگر مجھے اب بھی جو تنخواہ ملتی ہے، وہ پاؤنڈ اڈالر کے حساب سے نہیں پاکستانی کرنسی کے حساب سے ملتی ہے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ پاکستانی روپے کی پاؤنڈ اور ڈالر کے سامنے کیا حیثیت ہے؟ جو یہاں کی کرنسی میں تبدیل کر کے اوٹ کے منہ میں زیرے کی مثال بن جاتی ہے۔ لندن جیسے مہنگے ترین شہر میں پاکستانی آمدنی کے سہارے گزارنا کس قدر مشکل ہے۔ یہ میں ہی نہیں، آپ بھی جانتے ہوں گے بھائی جان..... پھر ہمیں نوکری کرنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی۔ اگر چوری چھپے اس کی کوشش کی بھی جائے تو فوراً انکو آڑی ہو جاتی ہے اور ایسے اسکا لکوفور اتان گریٹا پرسن کالینل لگا کر لندن بدر کر دیا جاتا ہے۔“

”مجھے یہ علمی بھارت میں نہ سمجھاؤ۔“ ظہیر ناگواری سے

افسانچہ

زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ وہ میرے لیے کیا تھی۔ اس سے جدا ہونے کے بعد زندگی کا ہر رنگ بے رونق ہے جیسے دل کسی دیرانے میں کھنچ گیا ہو۔ میرے ہونٹ مسکراتا تک بھول گئے ہیں زندگی کا یہ میرا پہلا فیصلہ ہے جس پر میں پشیمان ہوں۔

آج میں سوچتا ہوں کہ میں نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کیوں کیا؟ مجھے کیا خبر تھی کہ اس سے جدا ہو کر میں تمام خوشیوں سے دور ہو جاؤں گا۔ مجھ سے میری مسکراہٹ اور زندگی کے تمام رنگ روٹھ جائیں گے، تمام خوشیوں سے دور ہو جاؤں گا۔ مجھ سے میری مسکراہٹ اور زندگی کے تمام رنگ روٹھ جائیں گے۔ اس سے جدا ہونے وقت مجھے یقین تھا کہ میں کسی بھی مشکل کا مردانہ وار مقابلہ کروں گا لیکن میں تو بے حد کمزور نکلا۔ اب میں اسے دیکھ کر سوچتا ہوں کہ وہ کتنا خوش نصیب ہوگا جو اس کے قریب ہوگا۔ وہ میرے دل میں ایک خوب صورت یاد کی طرح ہے۔ ایک خزانے کی طرح میرے دل میں بند ہے۔

اے میری پیاری "نظر کی عینک" میں تم سے جدا ہو کر بے حد بچھتا رہا ہوں، تم جلد از جلد دوبارہ میرے پاس آ جاؤ۔

مرسلہ۔ محمد محسن قاروقی،
ہائی سیکوریٹی زون، نیوسینٹرل جیل ملتان

ایک شیورٹ کار جیڑی کے ساتھ اسے روندنے کے لیے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کار اور اس کے درمیان کا فاصلہ بہت کم رہ گیا تھا۔ کمال کے اعصاب تن گئے۔ اس نے خود کو کار کی خوفناک گھر سے بچانے کی بھرپور کوشش کرنا چاہی۔ کافی حد تک وہ کامیاب بھی رہا مگر بد قسمتی سے بچتے بچتے وہ کار کے سائڈ ویو سے ٹکرائی گیا۔ اس کے حلق سے غیر ارادی طور پر ایک چیخ خارج ہوئی۔ کار کی سائڈ گھر گئے سے وہ اچھل کر فٹ پاتھ پر آ رہا اور وہاں ایسا وہ ایک لیمپ پول سے ٹکرا کر سڑک پر گر گیا۔ گرتے وقت اس کی نظریں کار پر

کا بھی خیال رکھتا رہوں گا لیکن ابھی آپ سے جو کچھ ہو سکے، وہ کم از کم راشدہ بہن کے لیے ضرور کریں۔ دیکھیں بھائی جان! بھائی بہنوں کے رشتے دنیا میں ایک بار ملتے ہیں۔ وہ بہت مقدس اور محترم ہوتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ بڑے دلگیر انداز میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

واپسی میں اسے شام ہونے لگی۔ بھائی کے گھر سے اداس اداس سا نکل کے وہ سڑک پر آ گیا۔ نکل پر سوگوار سی خاموشی چھانے لگی تھی۔ قریب گھاس کے میدان کے ساتھ ساتھ لائن سے آٹھ دس پن چکیاں ہوا کے دوش پر گردش کر رہی تھیں۔ اسے ٹیوب کا اشتہار تھا جو تھوڑی دیر میں آگنی دروازے سلائیڈ ہونے اور کمال اس میں سوار ہو گیا۔

لیڈز کے مین اسٹاپ پر اتر کر وہ کیمپس کی طرف قدم بڑھانے سے چلنے لگا۔ بہن کے حالات جاننے کے بعد اس کا دل دو باغ بکھا بکھا سا تھا۔ وہ بہت افسردہ ہو رہا تھا۔ اسے اپنی دونوں بہنوں سے شدید محبت تھی۔ شہینہ تو بڑی بہن تھی جبکہ راشدہ اس سے دو تین سال چھوٹی ہی تھی۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد پاکستان میں جب تک کمال رہا، وہ اپنی دونوں بہنوں کی خبر گیری رکھتا تھا۔ دیارِ مغرب میں رہنے کا اسے نہ شوق تھا، نہ ہی آگے اس کا ایسا کوئی ارادہ تھا۔ وہ تو محض ایک محدود عمر سے کے لیے یہاں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے آیا تھا اور اس کے بعد اس نے وطن لوٹ جانا تھا۔ اپنے وطن کی خدمت کرنا تھی جس نے اس کا اتنا اثر چھٹا رکھا تھا۔ وہ اپنے ملک کے غریب عوام کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ اپنے آبائی شہر بہاولپور میں ایک چیرینی میڈیکل سینٹر قائم کرنے کا تھا۔ جو ہر غریب کا مفت علاج کرتا۔ کئی لوگ ایسے تھے جو دیارِ غیر میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے آتے اور پھر یہاں سے ملنے والی بڑی بڑی آفرز قبول کر کے ادھر کے ہی ہو کر رہ جاتے تھے مگر ڈاکٹر کمال احمد کا ایسا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اسے اپنے وطن سے، اپنی مٹی سے محبت تھی۔ وہ خود کو اب پہلے سے زیادہ اس عظیم مٹی کا مقروض سمجھنے لگا تھا۔

انہی خیالات میں کھویا ہوا وہ فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا اور جب یونیورسٹی کیمپس کے گیٹ کی طرف بڑھنے کے لیے وہ سڑک کر اس کرنے لگا تو اچانک اسے عقب میں کسی گاڑی کے پھوپھوں کی تیز چرچاہٹ کی آواز سنائی دی۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے کبھی تریپ ہی کھڑی کوئی گاڑی گرج دار آواز کے ساتھ اچانک دوڑنی ہوئی اس کے تعاقب میں بڑھی ہو۔ وہ بری طرح چونک کر رکا اور پلٹ کر دیکھا تو لرز گیا۔

پڑیں تھیں جو پونیورسٹی کمپس کے گیٹ کے سامنے سے تیزی سے گزرتی چلی گئی۔ اس نے گیٹ سے کسی کو باہر دوڑتے ہوئے، نکلنے بھی دیکھا تھا پھر اس کے بعد اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

”فکر نہ کرو، میرے پاس اس کا حل موجود ہے۔“ ان دونوں کے دھواں دھواں پڑتے چہروں کو دیکھتے ہوئے کپتان موسیٰ نے فوراً کہا۔ اس کا انداز نشانی آمیز تھا۔

”میں شپ کو روکنے کا حکم دیتا ہوں۔ جب تک تم دونوں آکسیجن سلینڈر چڑھا کر فوراً پانی میں اتر جاؤ۔ آؤ جلدی میرے ساتھ۔“

کپتان موسیٰ نے ایک طرف سمندر میں ایسکر ڈالنے کا حکم دیا اور دوسری طرف نامہ اور عابد کو غوطہ خوری کا لباس پہنا کر دونوں کو مقناطیسی پلیٹس بھی تھما دیں کپتان موسیٰ نے انہیں ہدایت کر دی کہ پانی میں اترتے ہی اپنے آپ کو جہاز کے فریم کے ساتھ چپکا دینا۔ آخری ہدایت کے مطابق اس نے یہ بھی کہا۔ ”خبردار! شپ کے دنیالے کی طرف مت جانا ورنہ دیویجیکل پروپیلر تمہارے جسموں کا ایک لمحے میں تیرہ بنا دیں گے۔“

دونوں نے ایک دوسرے کو اسی کے ذریعے سے باندھے رکھا تھا تاکہ ایک... دوسرے سے جدا نہ ہوں۔ عابد اور نامہ آکسیجن سلینڈر لگائے پانی میں اتر گئے۔ ہلکورے کھاتے تار یک سمندر کے پانیوں میں دونوں کافی دیر تک رہے اور دونوں نے ایک دوسرے کو بازوؤں سے تھامے رکھا اور دل ہی دل میں خدا سے خطرہ نکل جانے کی دعا بھی مانگتے رہے۔ کافی دیر گزر گئی۔ اچانک انہیں جہاز کی ہاڈی میں مخصوص قسم کی تھر تھراہٹ میں اضافہ ہونا محسوس ہوا۔ یکبارگی سر سے عابد کا دل زور سے دھڑکا گویا جہاز نے سفر شروع کر دیا تھا۔ ان کے ٹھنکے دلوں میں سر سے جاگی مگر دوسرے ہی لمحے ایک زبردست گڑ گڑاہٹ کی آواز ابھری اور پانی کے اندر جہاز کے فولادی فریم میں ہیبت ناک لرزش پیدا ہوئی اور ان کی مقناطیسی پلیٹس اس قدر گرم ہو گئیں کہ ان کی حدت سے دونوں کے ہاتھ جلنے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ پانی کے اندر اور تاریکی میں انہیں کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا کہ اوپر کیا ہو رہا تھا؟ مگر عابد حکم مری کو کسی خوفناک گڑبڑ کا احساس ضرور ہو گیا تھا۔ جہاز کی دھکی ہاڈی سے انہوں نے خود کو پہلے ہی علیحدہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد پانی میں زبردست لچل اور جوار بھانا کی

کی کیفیت پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ عابد دہل کر رہ گیا۔ شاید اسے کچھ متوجع خوفناک حقیقت کا اندازہ ہو چلا تھا۔ اس نے نامہ کو ساتھ لیا اور بیروں میں موجود لمبے لمبے لیسپر ز کی مدد سے پاؤں چلاتے ہوئے جہنم زدہ بنتے جہاز سے جتنی دور جاسکتے تھے دور ہو گئے تاہم ان کی کوشش یہ بھی تھی کہ وہ سطح آب پر ابھرنے نہ پائیں۔ نامہ کو بھی کسی خوفناک گڑبڑ کا اندراک ہو چکا تھا۔ اس نے خود کو مکمل طور پر پانی کے اندر عابد کے حوالے کر دیا تھا۔

تاریکی اور پانی کی دھندلاہٹ کے باوجود عابد کو آتشیں سرخی کا بھی احساس ہونے لگا تھا۔ لگتا ایسا ہی تھا کہ اسرائیل جہلی ہیلی کاپٹر نے ذرا سے مہیے کی بنیاد پر اپنی فطری بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جہاز پر میزائل داغ کر اسے تباہ کر ڈالا تھا اور اب غالباً تباہ حال جہاز چلتے سکتے بلے کی صورت میں غرقاب ہونے لگا تھا۔ عابد کی ایک زندگی سمندر گردی میں گزری تھی لہذا وہ اس خوفناک حقیقت سے اچھی طرح واقف تھا کہ جہاز ڈوبنے کی صورت میں وہ اپنے اوپر اور تقریباً کئی سو فٹ کے دائرے کی صورت میں ایک خوفناک بھنور پیدا کرتا ہے اور اس دائرے کی حدود کی زد میں جو بھی آتا ہے اسے بھی تباہ شدہ جہاز کے ساتھ ہی ڈوبنا پڑتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ عابد کی جتنی لامکان کوشش تھی کہ وہ اور نامہ یہ موت کا بھنور بننے سے پہلے ہی اس قاتل دائرے سے دور ہو جائیں مگر ان کی یہ کوشش بھی نقش بر آب ثابت ہوئی۔ جہاز پورا غرق ہونے لگا اور پانی کے اندر ہاتھوں بیروں کو چھوؤں کی صورت چلاتے ہوئے اس کا جسم بھی مثل ہونے لگا تھا کہ اچانک انہیں احساس ہوا کہ ان کے پانی کے اندر آگے بڑھنے کی رفتار صفر ہو چکی تھی۔ جہد کی بندرگاہ سے کئی ٹائیکل میل دور بحیرہ روم کے گہرے سمندر میں بنتے اس خوفناک بھنور میں دو گوشت پوست کے انسان بغیر کسی آبی وسائل کے اپنی بقا کی جنگ لڑنے میں مصروف کار تھے اور سوائے اللہ کی طرف سے یہی مدد کے ان دونوں کو اور کسی کا آسرا نہیں تھا مگر جان تو ایک چھوٹی کو بھی پیاری ہوتی ہے جسے بچانے کے لیے وہ بھی تڑپتی ہے وہ دونوں بھی رات کی پُر ہیبت تاریکی میں گہرے پانیوں میں تڑپ رہے تھے۔ اپنی جان بچانے کے لیے کوشاں تھے اور سردی کی بازی لگا رہے تھے مگر کتاب یہی تھا کہ جیسے خوفناک بھنور ایک آبی عفریت کی طرح اپنا دہانہ کھولے انہیں ہڑپ کرنے کے لیے تیار تھا۔

دونوں کی رفتار صفر کے درجے پر تھی وہ جیسے پانی میں

سسرال

دوڑ میں کچھ عورتیں بہت خوش تھیں۔
شیطان نے فرشتے سے پوچھا۔ ”یہ کون
عورتیں ہیں جو یہاں بھی اتنی زیادہ خوش ہیں؟“
فرشتے ”سب کی سب یہ وہ عورتیں ہیں، کہ سخت
آتے ہی ایڈ جسٹ ہوئیں، کہتی ہیں، بالکل سسرال
والا ماحول ہے۔“

مرسلہ: رضوان ہنولی کر بڑی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

نے عابد کو اپنے بوجھ سے الگ کیا۔ اس کی تقلید میں وہ بھی
آب دوڑ کی سطح کے ساتھ چٹ گئی۔ آب دوڑ کی سطح سے چھٹنے
ہی انہیں ارتعاش کا احساس ہوا، آبدوڑ..... اب بھنور کے
حصار کو تیزی سے کاٹی ہوئی اپنے نامعلوم سفر کی طرف
گامزن تھی، زندگی بچنے کی کیا سبیل نظر آئی تھی کہ ان دونوں
کے حوصلے بھی پھر سے بلند ہو گئے۔ عابد کا ذہن تیزی سے
کام کر رہا تھا، آب دوڑ کے سہارے وہ اس قابل بھنور سے
نکل تو آئے تھے مگر انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ آب دوڑ کس
ملک کی تھی؟ اگر اسرائیل کی تھی تو پھر یقیناً ان کے لیے آسمان
سے گرا بھور میں انکا والی بات ہو جاتی لیکن یقینی موت کے
فوری خطرے سے بچنے کے لیے اور دوسری کوئی راہ بھی نہ
تھی۔ دونوں آب دوڑ کی سطح سے چپکے ہوئے تھے اور آب
دوڑ کس منزل کی طرف گامزن تھی؟ یہ وہ نہیں جانتے تھے،
عابد کو ایک بات کا اور خدشہ بھی تھا۔ اگر یہ دشمنوں کی یا کسی
اور ملک کی آب دوڑ تھی، تو..... کوئی بعید نہ تھا کہ... انہیں
آب دوڑ کے اندر بیٹھ کر بھی اپنے طاقتور ریڈار اینڈ اپنی
اسکوپ سسٹم کے ذریعے دیکھا تو جاسکتا ہے تاہم اس میں
ایک احتمال بھی تھا کہ مذکورہ سسٹم metallic کی حد تک
عیاد کیلئے کا محتاج ہوتا ہے بہر حال اب جو بھی تھا، تقدیر پر
بھروسے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

آب دوڑ، کسی دیوبیکل وہیل مچھلی کی طرح ان
دینوں کو اپنی پشت پر لیے انتہائی منزل کی طرف گامزن
تھی۔ لگر کی بات اب یہ تھی کہ یہ دونوں زیادہ دیر سمندر کے
اندر آب دوڑ کے سہارے بھی نہیں رہ سکتے تھے، ان کے
سلیینڈرز میں آکسیجن کی مقدار محدود تھی، ایک بار عابد کے جی
نس آئی تھی کہ اب چونکہ وہ آبدوڑ کی وجہ سے قابل بھنور کی
زد سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے لہذا آب دوڑ کی
گرفت چھوڑ کر سطح آب پر چلے جاتے، مگر بات پھر وہی ہوتی
وسیع و عرض حدنگاہ تک پھیلے ہوئے سمندر میں آخر تک کسی

نہیں گویا ہوا میں بے سودی ہاتھ پاؤں مار رہے تھے جبکہ
موت سامنے نظر آرہی تھی۔ ایک پانی اور دوسری آگ کی
موت بڑی دردناک ہوتی ہے۔ اچانک یہ دونوں بھی بھنور
کی زد میں آ گئے، گول ٹھونسنے لگے تیزی سے تہ آب
ہونے لگے۔ انہیں اپنی جان کسل موت سامنے نظر آرہی
تھی۔ شاید انہیں اپنی یقینی موت کا اندازہ بھی ہو چلا تھا عابد
نے نائمہ کو اپنے آپ سے لپٹا لیا تھا۔ جان بچانے کی ہر
کوشش ناکام ثابت ہوتے ہی انہوں نے بھی اپنے ہاتھ
پاؤں چھوڑ دیے تھے۔ بھنور تیزی سے گردش کرتا انہیں
اپنی گود میں لیے موت کی اتھاہ تار یک واوی میں لیے
چار ہاتھا۔ عابد اور نائمہ ایک دوسرے کے ساتھ چپکے ہوئے
تھے۔ ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کر سکتے تھے۔
گہرے پانیوں میں بننے والے بلبلوں کی وحشت ناک
آوازیں انہیں اپنی سماعتوں میں جیسے یقینی موت کی
سرگوشیاں محسوس ہو رہی تھی۔

آکسیجن سلیینڈر اب زیادہ دیر تک مستعار سانس
نہیں فراہم کر سکتے تھے۔ تاہم ٹینک میں جتنی آکسیجن باقی
ہو چکی وہ گویا ان کی مستعار سانس ہی تھی۔ عابد نے
نائمہ کو خود سے لگا رکھا تھا اور نائمہ اس سے یوں چٹ گئی تھی
جیسے اس نے بھی عابد شیکھری کے ساتھ ہی مرنے کا ارادہ
کر لیا ہو۔

عابد شیکھری کی آنکھیں ماسک کے شیشے کے اندر
سے تیزی کے ساتھ گردش کر رہی تھیں۔ اسے ہر طرف
پانی کے بلبلوں اور ہیبت ناک شور کے سوا کچھ دکھائی اور
سنائی نہیں دے رہا تھا کہ اچانک اس کی نیم سروہ
آنکھوں میں امپیر کی ایک چمک اتھاہ تارکیوں میں بٹھائی
جوت کی طرح جاگی۔

ایک لمبی، بیٹنی فولادی سی دیوبیکل شے کی جھلک اسے
خود سے ذرا قافلے پر نظر آئی تھی وہ شے بیرونی طرف سے
بالکل سپاٹ دکھائی دیتی تھی، البتہ اوپری سطح پر مخصوص قسم کی
دھاتی پٹیاں ابھری ہوئی نظر آرہی تھیں۔

”آب دوڑ۔“

مجا عابد شیکھری کے ذہن میں ابھرا پھر اس نے
نائمہ کو آہنگی کے ساتھ خود سے جدا کیا اور اشارہ کیا اور اس کا
ہاتھ تھاما۔ بھنور کی گردش ہی کے سہارے وہ دونوں اس آب
دوڑ کی سطح سے جا گرائے اور پھر لپک کر عابد نے آب دوڑ کی
سطح پر ابھری دھاتی پٹی پر اپنے ایک ہاتھ کی گرفت جما
دی۔ تب تک، نائمہ بھی بہت کچھ سمجھ اور جان چکی تھی۔ اس

مدد کے سہارے نکلورے لیتے رہتے؟

دفعاً آب دوز کی سطح پر کچھ عجیب سی ہیبت ناک آوازیں ابھریں۔ یوں لگا جیسے وہ اپنا رخ بدل رہی ہو۔ عابد کو اتنا تو معلوم تھا کہ اکثر و بیشتر آبدوز کو آکسیجن کا ذخیرہ کرنے کے لیے گاہے بگاہے سطح آب پر آنا ہی پڑتا ہے..... ممکن تھا ایسی کسی امید افزا صورت حال میں مفرک راہ میسر آ جاتی۔

آبدوز سے اچانک ابھرنے والی یہ آواز "غرارے" کرنے سے مشابہ تھی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ عابد شکمھری ایک طویل عرصے سے جہاز رانی کے شعبے سے وابستہ تھا تاہم "بدوز ایک الگ شعبہ تھا مگر پھر بھی وہ اتنی جانکاری تو رکھتا تھا کہ آب دوز کی اس مخصوص آواز پر خوشی سے چونک نہ پڑے۔ غرارے کرنے بھی اس مخصوص آواز کا مطلب تھا کہ آبدوز سطح آب پر آنے والی تھی۔ اس نے تاہم کو ایک مخصوص اشارہ کیا اور پھر دیرے دیرے آبدوز کی پھسلواں سطح میں آہنی رہوں اور دھاتی ٹیوں کے سہارے وہ اس کی پشت کے ایسے حصے کی طرف آگیا جہر آبدوز کے "بفر" ہونے چاہیے تھے۔ اس کے محتاط اندازے کے مطابق آبدوز کے سطح آب پر آتے ہی سب سے پہلے ایک نوکار نظام کے تحت یہی دروازے کھلتے تھے، ان کے ساتھ ہی ایمر جی ڈورز بھی بے ہوتے تھے۔ آبدوز دیرے دیرے غرارے کرتی ہوئی سطح آب پر آئی تو: عمر نے آکسیجن ماسک اپنے چہرے سے ہٹا کر نکلی مگر تار پک فضا میں گہرے گہرے سانس لیے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے سلینڈر میں آکسیجن کی مقدار ختم ہونے والی ہے، مگر دوسرے ہی لمحے وہ مارے دہشت کے لرز اٹھی تھی۔

☆☆☆

زیبیدہ اور لیلیٰ..... اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مل کر کھینچ چکی تھی۔ وہاں ایک تاجر کے مکان کے تہ خانے میں ان کی خفیہ میٹنگ تھی۔ غضب خدا اور بی فرنت کے کمانڈرز بھی وہاں موجود تھے، یاسر العربی، شہید عظیم الوزیر کا نائب تھا۔ اب اس نے ہی غضب خدا کی کمان سنبھالی ہوئی تھی، وہ ایک پختہ العمر اور لمبے قد کا فلسطینی مجاہد تھا جبکہ بی فرنت کا خالد بن جنید، چھبیس چھبیس سالہ جوان اور خوبصورت تھا۔ ان کے علاوہ دیگر اہم ساتھی بھی موجود تھے، تازہ صورت حال کے مد نظر اس خفیہ میٹنگ کا دورانیہ بہت مختصر رکھا گیا تھا، اسی لیے کسی گفتگو سے اجتناب ہی برتا گیا اور فوری کارروائی شروع

کر دی گئی۔

لیلیٰ کو مذکورہ مجاہد کمانڈرز نے نجف میں واقع اسرائیلی ڈیمون نیوکلیئر پاور پراجیکٹ پر کامیاب حملے کی مبارکباد دی۔ اس کی اور اس کی مجاہدانہ کاوشوں کو سراہا تھا، اسی طرح المجاہد کی زیبیدہ کو بھی خراج تحسین پیش کیا تھا کہ اس نے تیہانان میں واقع ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر میں جزوی کامیابی حاصل کی تھی اور اسرائیل کے دو بڑے شیطان دماغ سربراہ آردوہ یہودیوں ایہود شاہک اور اشفاق شامیر کو جہنم واصل کیا تھا۔

"ہمیں اپنے عزیز اور دلیر ساتھیوں کی شہادت کا بھی رنج ہے، مگر خوشی بھی ہے کہ انہوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے، اسرائیلیوں کی کمر توڑ دی۔" غضب خدا کے یاسر العربی نے میٹنگ کی کارروائی کے آغاز میں کہا تو بی فرنت کے خالد بن جنید نے کہا۔

"محترم!..... اس کے رد عمل میں اسرائیل نے ہمیشہ کی طرح اپنی بزدلانہ بھڑاس نکالنے کی خاطر شہری عرب بستیوں میں گزشتہ روز جو وحشیانہ بمباری کی ہے، ہمارا دل اس اندوہناک اور صیہونی چنگیزیت پر خون کے آنسو رو رہا ہے۔ ہمیں نئے حملے کی منصوبہ بندی سے پہلے اس کے سدباب کا بھی سوچنا پڑے گا۔"

"ہماری اس میٹنگ کا اہم ایجنڈا یہی ہے..... عزیز بی خالد! یاسر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں کچھ اہم خفیہ اطلاعات بھی ملی ہیں۔ جن کے مطابق ہماری تازہ سرفروشانہ کارروائی کے بعد اسرائیلی سپر ہیڈ کوارٹرز نے اپنی تمام اٹھیلی جنس ایجنسیوں کو حرکت میں لانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگرچہ وہ پہلے بھی فعال تھیں مگر ماسوائے ڈیوڈ اسٹار اور موساد کے باقی بیرونی معاملات پر اپنے آپ کو مشغول کر کے صرف کار نہیں اور اب ان میں ہنگامہ اور فیری میسن کار فرما ہیں۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے ہنگامہ نے اپنی دو کاؤنٹر اٹھیلی جنس الیا بیتہ اور شن بیتہ کو عالمی سطح پر اپنے گریٹر اسرائیل کے وسیع تر مفادات میں مصروف کار رکھا ہوا ہے۔ جس کے تحت الیا بیتہ واشنگٹن اور وائٹ ہاؤس میں کسٹم میٹنگ ہے اور شن بیتہ تعلیمی ورگس ہوں میں..... جبکہ فیری میسن کے چھروکار مشرق وسطیٰ اور روم کے کناروں میں واقع اسلامی ممالک میں مسلمانوں کے ہمیں میں ان کے ساتھ مل کر بیٹھی ان کے درمیان نفاق کا بیج بوری ہے....." اتنا بتا کر یاسر العربی کچھ ٹائپ کے لیے تھما تو زیبیدہ بولی۔

محبوبوں کے حسین رنگ فروری 2105ء کے پاکیزہ کے سنگ

پاکیزہ

کراچی ماہنامہ

نگار سیمما اور رفاقت جاوید کے قلم ہنر کے شاہکار ناول نئی اقساط کے ہمراہ

نایاب جیلانی کے فن کا عروج توکب و فاکا بھر پور اختتام

زاہدہ پروین کے قلم سے محبتوں سے گندہا منی ناول جنگل کا پھول

اسما قادری کی متاثر کن آمد ایک بھر پور مکمل ناول کے ساتھ

عظمیٰ آفاق سعید کے پُر اظف سفر نامے کا مزید احوال

شمع ہدایت کے سلسلے میں
اختر شجاعت کا لکھا پُر عقیدت اور
روں پر مضمون ذکر قرب الہی

سنگ

ان مایہ ناز قلم کاروں کی تازہ ترین تحریریں پڑھیے جن میں ناہید سلطانیہ اختر،
عالیہ ہرا سیمما سراج، رضوانہ پرنس، غزالہ جلیل راؤ و دیگر شامل ہیں

اس کے ساتھ ساتھ مستقل مضمون نگاروں کا دلکش اور دلربا معراج صرف آپ کی اتنی ذوقی کی نذر

Copied From Web

دو گول دائرے بنائے اور پھر تل ایب سے ایک لکیر چھد کی بندرگاہ تک پہنچی اور پھر پھر ہاروم تک نشانہ ہی کرتے ہوئے لیبیا کی دو بڑی بندرگاہوں پر گول دائرہ بنا دیا۔ ان میں ایک دارالحکومت طرابلس تھا اور دوسرا شہج سورہ میں واقع شہر بن غازی تھا۔ یہاں تک نشان لگانے کے بعد یاسر قدرے سیدھا ہو کے بولا۔ ”سب سے پہلے ایک اہم بات سن لو ایک یہودی..... ایک عام یہودی بھی خواہ وہ دنیا کے کسی کونے میں چھپا بیٹھا ہو، وہ اپنی ذات میں مجسم ایک اسرائیلی خفیہ ادارہ..... ایک اسرائیلی ایجنٹ ہے..... یہ لوگ سب سے پہلے اسی کو تلاش کر کے اپنے خفیہ مشن کا آغاز کرتے ہیں۔“ وہ پھر اسٹول اٹس پر جھکا اور آگے بولا۔

”میں نے یہاں لیبیا کی جن دو بڑی بندرگاہوں طرابلس اور بن غازی پر نشان لگائے ہیں۔ اسرائیلی نیوی کی نہ صرف محنتی کشتیاں بلکہ آب دوز بھی لیبیا کی نیوی کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھتی ہیں۔ ایک پرانے تنازع کے تحت اسرائیلی معترضین ان دونوں بندرگاہوں پر ایک کرنا چاہتا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ لیبیا میں ہمارے کئی سربراہ اور وہ لوگ ہمدرد موجود ہیں۔ ہمیں سب سے زیادہ مدد اور سپورٹ ادھر سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے حریت پسندوں کے بڑے بڑے گروہس ادھر ہی تشکیل پاتے ہیں اور اس بھیرہ روم کے ایک مخصوص خفیہ ”سی پھینل“ کے ذریعے ہمیں بھاری مقدار میں اسلحہ بھی پہنچتا ہے..... نئی تشویش ناک اطلاع کے مطابق اسرائیلی نیوی کو اس کی ہینک پڑ چکی ہے، اس وجہ سے اسرائیلی دو خطرناک ”یو بوس“ آبدوزیں ہر وقت یہاں گشت کرنے لگی ہیں۔ یہ خطرناک اور تباہ کن میزائلوں اور تار پیڈ سے لیس ہیں۔ ہمیں ان دو اسرائیلی آبدوزوں کو تباہ کرنا ہوگا تاکہ لیبیا میں مقیم ہمارے ہمدردوں اور سوریوں کو ہمارے لیے رسد سپلائی کرنا ممکن ہو سکے، جو ان کی وجہ سے ایک عرصے سے تامل کا شکار ہے۔ اس مشن کا بیڑا کون اٹھائے گا؟“

یاسر اپنی بات مکمل کر کے سیدھا ہو گیا۔
”یہ کام میرا گروپ کر سکتا ہے۔“ پی فرنٹ کے خالد بن جنید نے کہا تو یاسر العربی کے چہرے پر اسرار بھری مسکراہٹ نمودار ہو گئی اور پھر وہ اس لہجے میں بولا۔
”میرے عزیزا شاید تم اس لیے اسی ناممکن حد تک مشکل کام کا بیڑا اٹھانا چاہ رہے ہو کہ انہی دونوں ”یو بوس“ (U-Boats) کی مدد سے گزشتہ دنوں اسرائیلی سات نکال فورس نے تمہارے عظیم لیڈر خلیل الوزیر کو شہید کیا تھا

”محترم یاسر! ضرورت ابھی اس امر کی ہے کہ اسرائیل کے یہ خفیہ ادارے کڑی کے جال کی طرح پوری دنیا میں اپنے نارگٹھ کنٹریز میں پھیلے ہوئے ہیں جبکہ یہاں فلسطین میں ان کے دو ادارے موساد اور ڈلوڈ اسٹار ہمارے سامنے ہیں جنہیں بالخصوص ہمارے لیے خیال رکھا گیا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان کی چہرہ دستیوں کا تب ہی صحیح معنوں میں مقابلہ کر سکتے ہیں جب ہم بھی مختلف شاخوں میں بٹ کر ان کے مدموم عزائم کو ناکام بناتے رہیں۔“

زبیدہ اتنا کہہ کر رکھی تھی۔ پی فرنٹ کے خالد بن جنید نے اپنی ساتھی مجاہدہ کی بات کا مطلب اچکتے ہوئے اس کی تائید میں یاسر سے کہا۔

”عزیزی زبیدہ کا کہنا ٹھیک ہے محترم العربی!..... یہ اسرائیل پر کاری ضرب لگنے کے مترادف ہوگا، کیونکہ اسرائیل کے یہ ادارے بہر حال کسی نہ کسی مضبوط حوالے سے ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ جتنی بھی ہیں۔ ہنگامہ گیری میں، الیا بیٹھ اور شن بیٹھ اس کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ہمیں خوش قسمتی سے ان کے آئندہ کے مذہم عزائم کا بھی پتا مل چکا ہے۔ ہمیں بھی مختلف گروپوں میں بٹ کر ان کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک وائیڈ ایکشن پلان (wide action plan) ترتیب دینا ہوگا۔ ورنہ اسرائیلی ادارے، ایک دوسرے کے غبارے میں ہوا بھرنے کا ذریعہ بنتے رہیں گے اور ہم اپنے ساتھی ایک ہی طاقت کے آگے زبیاں کرتے رہیں گے۔“

اس کی بات پر غضب خدا کے یاسر العربی نے خاصے پر خیال انداز میں اپنے سر کو جنبش دی، پھر گویا ان کی باتوں کے ٹچ میں جواب اخذ کرتے ہوئے بولا۔

”تم لوگوں کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں الگ الگ گروپ ترتیب دے کر انہیں پھیلانا چاہیے۔ اگر یہ بات ہے تو..... پھر میں ایسا ایک پلان اپنے تئیں پہلے ہی ترتیب دے چکا ہوں۔“

”یقیناً۔“ زبیدہ اور خالد بن جنید نے ہیک وقت کہا تھا۔
”کلینٹر.....“ یاسر نے کہا۔ پھر ایک ”اسٹول اٹس“ درمیان میں رکھتے ہوئے بولا۔ ”سب سے پہلے میں اپنے مجاہد ساتھی مجاہدوں کی رپورٹ کے مطابق آپ سب کو کچھ خاص آگاہی دینا چاہوں گا..... آپ ذرا آگے آجائیے۔“
یاسر نے بائیں نوک دار بیٹل سے تل ایب اور یرد شہم پر

اگرچہ ادھر بھی رہا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کا جذبہ قابل قدر ہے کہ آپ نے خطرناک اور اہم مشن کا بیڑا اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ ہمیں قبول ہے۔" یاسر کی بات پر سلی کی کشادہ آنکھوں میں جوش کی چمک لہرانے لگی۔

تھوڑے وقفے کے بعد یاسر العربی نے ایک گہری سانس لے کر خالد بن جنید اور زبیدہ سے بیک وقت مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "تمہارے "لیبیا مشن" کا آغاز سب سے پہلے سلی کے جزیرہ "کوانڈو" سے ہونا چاہیے۔ جدھر اسرائیل نے اٹلی کے اشتراک سے اپنا ایک خفیہ "اسپائی اسٹیشن" قائم کیا ہوا ہے۔ اس کی تباہی کے بعد ہی اسرائیل کا لیبیا کے خلاف خفیہ نقل و حرکت کا "کٹ آؤٹ سسٹم" ہو گس ہو کر رہ جائے گا اور ہمارے مجاہدین گروپ کے لیے وہاں سے آنے والی رسد اور مدد کی چھلانی دوبارہ بحال ہو جائے گی۔" اس کی بات پر جنید اور سلی دونوں نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیے۔

"اب میں سینک کے آخری ایجنڈے پر بات کروں گا۔" یاسر نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد کہا اور سب یہ غور مستغرقانہ نظروں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"میرا گروپ..... دو حصوں میں بٹ کر بیک وقت امریکا اور برطانیہ میں کار فرما..... ہنگامہ کے دو کاؤنٹر اٹھائی جس گروپس الیا بیتہ اور شن بیتہ کی اسلام دشمن کارروائیوں اور فلسطین سمیت اسرائیل کے اس ناپاک ارادوں کو سبوتاژ کرے گا جس کے تحت وہ فلسطین اور دیگر عرب ممالک پر اپنے متوقع غاصبانہ قبضے کو یقینی بناتا ہے۔ ایک اور اطلاع کے تحت الیا بیتہ امریکا کی اہم پوسٹوں اور حکموں میں کھس بیٹھی عراق اور ایران کے خلاف پروپیگنڈا کارروائیوں میں مصروف ہے۔ اس سلسلے میں الیا بیتہ عراق کی تباہی کے لیے اپنا پلان اسے مکمل کر چکی ہے جبکہ شن بیتہ برطانیہ اور ہائر اسٹڈی کے لیے آئے مسلم ممالک کے ہونہار اسکالرز کے خلاف مصروف عمل ہے۔ ہنگامہ کے چیف اور موروثی بانی آئرن مین میری جنیئر نے اپنے الیا بیتہ اور شن بیتہ کے دونوں چیف انچارج اور ٹاپ ایجنٹوں فوہاگ ہیل اور ماڈام میڈوسا کو امریکا، برطانیہ روانہ کر دیا..... ان دونوں کو جہنم واصل کرنے کا ذمہ میں لیتا ہوں۔"

تہ خانے میں چند ثانیے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ ایسے میں پی فرنت کے ایک لہتانی مجاہد سخ دانیال نے کہا۔ "ہم اپنے دو عظیم ہمدردوں کو فراموش کر رہے ہیں جنہوں نے شاید اب ہماری طرح اپنے طور پر اپنی بساط بھر اور

جس کا دائرہ تینوں تک وسیع تھا، اگر تم محض ایک "انتقامی جوش" کے باعث اس خطرناک مشن کی ہامی بھر رہے ہو تو میرا خیال ہے تمہیں ایک بار پھر اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی کی ضرورت ہے میرے عزیز۔"

یاسر کی بات ٹھیک ثابت ہوئی تھی کیونکہ اس نے ہی نہیں بلکہ سلی اور زبیدہ نے بھی خالد بن جنید کے چہرے سے جوش بھری تہاژت کے آثار اٹھانے بھانپ لیے تھے۔ اس پر خالد بن جنید کو بھی صاف گوئی اختیار کرنا پڑی۔ بولا۔ "شاید آپ کا خیال درست ہے جناب یاسر! اس لیے کہ ہم ابھی تک موساد اور ڈیوڈ اسٹار کی تینوں آپریشن کی خونی کارروائی کو نہیں بھولے۔ میں نے اس لیے ہی ہامی بھری تھی کہ ہم اس کا خاطر خواہ انتقام لینا چاہتے ہیں۔ اس امید کے ساتھ کہ آپ ہماری یہ درخواست رد نہیں کریں گے کیونکہ انہی اسرائیلیوں نے آپ کو بھی ایک عظیم مجاہد اور ولیر کمانڈر سے محروم کیا تھا۔"

"تمہارے بات بھی ٹھیک ہے عزیز ی خالد بن جنید!..... مگر PLSO اور الجاہد کی اسرائیل کے خلاف تازہ کارروائی کسی حد تک اس کا بدلہ چکا چکی ہے مگر ہمیں اس پر بس نہیں کرنا ہے۔ ہمیں اسرائیل کے وسیع تر مفادات پر بھی کاری ضرب لگانا ہوگی "لیبیا مشن" اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے اور اہم بھی..... مجھے تمہاری درخواست پر اور تمہارے ہامی بھرنے پر بالکل اعتراض نہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ..... اس اہم مشن میں جسے ہم "لیبیا مشن" کا نام دیں گے، مجاہدوں کے دو گروپس اکٹھے اسے پورا کریں۔ اس پر پہلے متفقہ طور پر بات طے ہو جائے تو ہم آگے بڑھیں۔"

الجاہد کی زبیدہ نے اس اہم مشن کے لیے اپنے گروپ کا نام پیش کر دیا۔ جسے تھوڑی بحث کے بعد قبول کر لیا گیا۔

"ڈیوڈ اسٹار کے جنرل فرناش کی سرکوبی کے لیے ناکام "تیونائی آپریشن" کو میرے سپرد کر دیا جائے تو اس سے بہتر کوئی آپشن نہیں ہوگا۔" PLSO کی سلی نے فوراً یاسر العربی کی طرف دیکھتے ہوئے بھرپور جوش سے کہا تو یاسر بولا۔

"عزیزی سلی!..... اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے گروپ نے صحرائے نجف میں واقع اسرائیلیوں کے ڈیمون نیوکلیئر پلانٹ کو خاصا نقصان پہنچایا ہے اور عزیز ی زبیدہ نے تیونائی میں واقع ڈیوڈ اسٹار اور موساد کے دو اہم شیطانوں کو جہنم واصل کیا۔ یہ مشن بد قسمتی سے

”آزرین بیڑی نے سب سے پہلے جزل فرناش کو
توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کے اب تک کے خونریز
... کارناموں کی تعریف کی مگر تازہ تہنائی حملے پر عقیدہ وہ
پہلے کر چکا تھا۔

بہر طور..... جزل فرناش نے اسے بتایا کہ وہ اپنے
ایک اہم اور کڑے فیصلے پر اس کی توثیق چاہتا تھا۔ لہذا جب
آزرین بیڑی جو نیئر نے جزل فرناش کی زبانی یہ سنا تو
فرناش کی توقع کے عین مطابق آزرین بیڑی نے فوراً اس کے
فیصلے کی توثیق کر دی اور نہایت بے رحمانہ لہجے میں بولا۔
”یہودی قوم کا ہر فرد ہمارے لیے اہم ترین ہے لیکن جس پر
غدارگی اور حریت پسندوں (فلسطینی مجاہد) کی مدد کرنے کا
الزام ثابت ہو جائے تو ایسے غدار کی سزا صرف موت کے سوا
اور کوئی نہیں کیونکہ یہی غدار ہمیں دشمنوں سے زیادہ نقصان
پہنچانے کا سبب بن سکتے ہیں۔“

اپنے مائی باپ کی بات پر جزل فرناش کی آنکھوں
میں ایک سفاکانہ مسرت چمکی۔ نہایت خوشی اور احترام سے
بولتا۔ ”مقدم..... مقدم..... ٹیکس گریٹ قادر!..... مجھے
اب تسلی ہوگئی، سیری مشکل یہی تھی میں اپنے اس کڑے فیصلے
کے باعث کہیں محتوب یا سزاوار نہ ٹھہروں لیکن آپ کی
اجازت سے مجھے تسلی ہوگئی۔“

آزرین نے اس اہم مگر قلیل ترین نشست کو
برخواست کرتے ہوئے گھبر اور سرد لہجے میں کہا۔

”ہماری طرف سے تمہیں مہربند اجازت نامہ تھوڑی
دیر میں مل جائے گا۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ اپنے فیصلے
پر فوراً عمل پیرا ہو جاؤ۔ دیش آل۔“

ان دونوں مہاشیطانوں کے سچ کشنر بیڑی تاؤن کی
لاڈلی اور اکلوتی بیٹی ہازنہ کو اپنی قوم اور مہلک اسرائیل سے
غدارگی کے الزام تلے سزائے موت دینے کے فیصلے پر
اتفاق ہوا تھا۔ اس روز تہنائی حملے میں ہازنہ کی فلسطینی
مجاہدوں کی مدد اور ہمدردی جیسے سلوک کو دیکھتے ہوئے جزل
فرناش نے یہ کڑا فیصلہ کیا تھا۔

فرناش ایک مکار آدمی تھا۔ وہ جانتا تھا ہازنہ کشنر
بیڑی تاؤن کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی ہے..... قوم اور ملک کے
وسیع تر مفادات میں اس کی بیٹی کی سزائے موت کو کسی
صورت آشکار نہیں کیا جاتا، اس طرح بددی پھیلنے اور اپنی
تباہ بنائی اور ایسے رویے کو فروغ دینے کا باعث بنتا۔
اس لیے دونوں یہودی شیطانوں آزرین اور جزل فرناش
نے باہمی طور پر یہی فیصلہ کیا تھا کہ ہازنہ کو انتہائی رازداری

اپنے محدود مسائل میں رہتے ہوئے ہمارے عظیم مقصد کی
برآوری کے لیے اپنے سر سے کفن باندھ رکھا ہے۔“

”تمہارا اشارہ اس قبر میں لیڈی رپورٹر نامہ اور
جہاز راں کہتی ”البحر“ کے عابد شکھری کی طرف تو نہیں؟“
زبیدہ نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا تو یا سرنے اثبات میں
سر ہلاتے ہوئے سچ دانیاں کی حمایت میں کہا۔

”ہم بھلا اپنے ایسے گناہ ہمدردوں کو کیسے فراموش
کر سکتے ہیں۔ ان دونوں نے تو خونِ مسلم کا جیسے حق ادا کر دیا
اور اپنے طور پر ان دونوں نے ہمارے لیے جو عظیم قربانیاں
دیں اور ابھی تک دے رہے ہیں وہ لائق تحسین ہیں اور ہم
نے بھی انہیں جہد کی ہزرگاہ سے لے کر ہوٹل پورٹ لینڈ تک
کھل سکیورٹی فراہم کی تھی لیکن بد قسمتی سے ہمیں خاطر خواہ
کامیابی نہ ہوئی مگر ہمیں باخبر ذرائع سے پتا چلا ہے کہ وہ
دونوں عظیم گناہ مجاہد جہد سے زندہ سلامت نکلنے میں
کامیاب ہو چکے ہیں۔“

وہاں موجود سارے مجاہدین نے ہم آواز ہو کے نامہ
اور عابد شکھری کی کامیابی کے لیے دعائیہ کلمات ادا کیے۔

☆☆☆

اسرائیلی ہائی کمان کی کال کی گئی چار بڑوں کی اس
میٹنگ، جس کی صدارت ہگانہ کے آزرین بیڑی جو نیئر نے
کی تھی، کے بعد جزل آنرک فرناش نے ایک الگ ون ٹو
ون خفیہ نشست موداد کے باریق شمعوں کے ساتھ بھی جمانے
کا سوچا مگر بعد میں کچھ سوچ کر اس نے اپنا یہ ارادہ بدل
ڈالا، کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ وہ جس کڑے فیصلے پر بڑی
سرعت کے ساتھ عمل کرنے والا ہے، اس سے ہو سکتا ہے
بارق شمعوں متعلق نہ ہو اور یہ حساس معاملہ لیک آؤٹ
ہو جائے مگر یہ اس کی مجبوری تھی کہ اپنے اس ”کڑے فیصلے“
پر عمل پیرا ہونے کے لیے کسی ”بڑے“ کی بھی ”حمایت“
ضروری تھی، بہ صورت دیگر خود اس کا اپنا کورٹ مارشل بھی
ہو سکتا تھا، لہذا اس کے لیے اس نے یہودیوں کے ”باپ“
یعنی مائی باپ اور موروثی بیرو ہگانہ کے آزرین بیڑی
جو نیئر سے خفیہ ملاقات کی ٹھانی، وہی اسے اپنے مطلب کا
آدمی محسوس ہوا تھا۔ اس نے سیکرٹری کے ذریعے اس تک
اپنا یہ پیغام پہنچایا۔ چار گھنٹے بعد کا اسے ٹائم ملا۔ وہ
آزرین بیڑی سے اس طرح کی ”ملاقات“ کرنے کے
لیے چوبیس گھنٹے ہی انتظار کر سکتا تھا۔

مگر تین گھنٹے بعد ہی جزل فرناش کی ون ٹو ون
ملاقات آزرین بیڑی سے کرا دی گئی۔

کے ساتھ موت سے اٹکناد کرنے کے بعد اس کے باپ ہیریٹ ناؤن کو آگاہ کر دیا جائے گا، نیز اس سے حلف بھی اٹھوایا جائے گا کہ ملک اور قوم کی وقاداری اور مفادات کی خاطر اسے اپنی خدار بچی کی مزائے موت کو نہ صرف کھلے دل سے قبول کرنا پڑے گا بلکہ اس سلسلے میں خاموشی بھی اختیار کرنا ہوگی۔

☆☆☆

ادھر کشن ہیریٹ ناؤن کو پہلے ہی سے یہی تشویش لاحق تھی کہ اور کوئی تو نہیں مگر جنرل فرناش اس کی لاڈلی بیٹی بازغہ کو ہرگز زندہ نہیں چھوڑے گا۔ کشن ہیریٹ ناؤن کی آنکھوں کے سامنے بار بار وہ منظر رقصاں ہونے لگتا تھا، جب اس نے جنرل فرناش کو اس کی بیٹی بازغہ پر گولی چلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت تھوٹا، حملے یعنی ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر میں فلسطینی حریت پسندوں کی چھاپا مار کارروائی کے دوران..... بازغہ فلسطینی مجاہدوں کی حمایت اور ہمدردی میں بول رہی تھی تو جنرل فرناش نے نہایت سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے.... بے دریغ بازغہ پر گولی بھادی تھی مگر عین وقت پر ایک مجاہد نے اپنی جان پہ کھیل کر بازغہ کی جان بچائی تھی۔

ہیریٹ ناؤن کی بلا کا مکار اور درندہ صفت انسان تھا۔ بے گناہ فلسطینیوں کے خون ناحق سے اس کے ہاتھ بھی رنگے ہوئے تھے۔ وہ بھی ایک کٹر یہودی تھا اور اپنے ملک اسرائیل کا وقادار بھی مگر اپنی اکلوتی اولاد پر ایسا وقت آنے پر وہ بھی پریشان ہونے لگا تھا۔ اسے سخت گیر اور سفاک جنرل آئزک فرناش سے خیر کی کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ لہذا کشن ہیریٹ ناؤن نے اپنی بیٹی بازغہ کو جنرل فرناش جیسے سفاک انسان کی توقع دیندگی اور سفاکیت سے بچانے کی خاطر اسرائیلی مقننہ میں معافی طلبی کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی تھی۔

اس نے سب سے پہلے موساد کے میجر بارق شمعون سے ایک ملاقات کی۔ اس کے ساتھ ہیریٹ ناؤن کے اچھے تعلقات بھی تھے، جب اس سلسلے میں ناؤن نے بارق شمعون کو اپنے ”خداشات“ سے آگاہ کیا تو وہ پر خیال لہجے میں بولا۔

”اس بات کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔ مسٹر ہیریٹ! تمہاری لاڈلی بیٹی بازغہ نے بہت خطرناک اور غلط حرکت کی ہے۔“ ناؤن اس کی بات پر اندر سے لرز گیا۔ اس کی تشویش بے جا نہ تھی۔ شمعون کی بات سے یہی محسوس ہوتا تھا جیسے اسے بھی اس کی ”مخدوش توقع“ تھی۔ وہ فوراً لاجت آمیز

لہجے میں میجر شمعون سے بولا۔
”سر!..... وہ بچی ہے نا سمجھ اور ناؤن ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔ آپ اس سلسلے میں میری کچھ مدد کریں، میری اسرائیل کے لیے خدمات کو ہی مد نظر رکھ کر مجھے جنرل صاحب سے معافی دلوائیں۔“

”دل کو بہلانے والی باتیں مت کرو کشن!“ میجر بارق شمعون نے ایک کالے رنگ کا سوٹا سا رسلگاتے ہوئے تمبیر لہجے میں کہا۔

”وہ تمہاری بیٹی بازغہ امریکا کی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہے اور اس کی باتیں اور نظریات ہمارے بارے میں خطرناک حد تک پیچورڈ اور ایشیلاڈ ہیں۔ ان سے خداری کی بو آتی ہے۔ رہی بات جنرل فرناش سے معافی نامہ طلب کرنے کی تو یہ ناممکن سی بات ہے مجھے تو ڈر ہے کہیں وہ تمہیں شاعر کروادے۔“

ناؤن پریشان ہو گیا۔ اپنی شکل پہ لاجت اور... بے چارگی سوتے ہوئے بولا۔ ”سر! آپ اس سلسلے میں کچھ کیجیے نا.....! میرے ماضی کی خدمات کو ہی مد نظر رکھتے ہوئے میری مدد کریں۔ آپ بھی موساد کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں اور اس وقت قائم مقام چیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کوئی اچھا مشورہ بھی دیں۔“

”ایک ہی صورت مجھے نظر آتی ہے۔“ شمعون نے موٹے سگار کا ایک گہرا کش لے کر کیف دھوئیں کے لہجے دار مرغولے فضا میں بکھیرتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پہ سوچ کی گہری لکیریں اٹھ آئی تھیں۔

”مقدم..... مقدم..... خداوند کے لیے..... مجھے اس کا حل بتائیں کہ کسی طرح میری بھول سی بیٹی بازغہ کی جان بچ جائے، میرا وعدہ ہے، میں آپ کی مدد کو..... مرتے دم تک راز رکھوں گا۔“ ناؤن خوش ہو کے امید بھرے لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”جتنی جلد ممکن ہو سکے اپنی بیٹی بازغہ کو خاموشی اور رازداری کے ساتھ اسرائیل بدر کر دو۔“ شمعون نے مشورہ دیا۔ ہیریٹ ناؤن کا چہرہ سمجھ کے رہ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ موساد کا چیف اس کی کوئی حوصلہ افزا مدد کرے گا لیکن اسے یہ سن کر سخت مایوسی ہوئی تھی کہ ڈیوڈ اسٹار کے سربراہ جنرل آئزک فرناش کے سامنے موساد کا میجر بارق شمعون کس قدر بے بس اور بے اختیار تھا۔ بالآخر عظیم سوچ و بچار کے بعد ہیریٹ ناؤن کو بھی اس میں مفر کی راہ دکھائی دی کہ جنرل فرناش کی بربریت کا شکار ہونے سے پہلے اپنی بیٹی کو فوراً

ملک سے نکال دے، یا امریکا واپس بھیج دے۔

☆☆☆

ٹھہرتی ہوں رات اپنے جوہن پر تھی۔ بازغہ نے رات ہونے سے پہلے محسن کو بہ خیر و عافیت یہاں سے نکالنے کا بندوبست بڑے، خفیہ طریقے اور نہایت ہوشیاری سے کیا تھا۔ اسٹیٹ ہی کے سپتال میں اس نے ایک دورہ بھی کیا تھا جس کے بعد ہی اسے معلوم ہوا تھا کہ آج رات دو ایسے مریضوں کو مل ایبیب کے ایک بڑے اسپتال میں شفٹ کرنا تھا۔ بازغہ نے ایک تیسرے مریض کی بھی "ایمر جنسی شفٹنگ لسٹ" میں شمولیت کروادی۔ جو بیڈ نمبر اس نے لسٹ میں درج کروایا تھا، اس پر ایک نیم پاگل یہودی مریض تھا۔ بازغہ چونکہ کمنشنر جیریز ناون کی بیٹی تھی لہذا اسپتال کے جنرل ایڈمنسٹریشن کو انکار کرنے کی جرأت نہ ہو سکی تھی۔

ابھی اصل مرحلہ باقی تھا۔

شفٹنگ سے محض ٹھوڑی دیر پہلے جب ایبیبولینس میں مریضوں کو سوار کروایا جا رہا تھا، ان میں اسٹاف کے دو افراد اور ایک ڈرائیور شامل تھے جبکہ پیر ویشن جی اسے کا ایک نائب کر رہا تھا۔ یہ اسٹیٹ کا ایک جنرل اسپتال تھا، کسی قید خانے کا نہیں، اس لیے زیادہ چیکنگ کی سختی نہ تھی، محسن کو سہارا دے کر بازغہ نے اسے ایبیبولینس میں خود سوار کروایا تھا۔ اس موقع پر نائب کسی کام کے سلسلے میں اندر چلا گیا تھا جبکہ اسٹاف کے دو آدمیوں کو بازغہ نے خود کسی بہانے سے ادھر ادھر کھینک دیا تھا۔

اسٹیٹ کے اندر آنے والوں کی معمول کے مطابق تو چیکنگ ہوتی تھی، خواہ وہ "انٹری" اسپتال کے لیے کیوں نہ ہو، مگر نکلنے والوں کو درگزر کر دیا جاتا تھا۔

ایبیبولینس خاصی بڑی تھی، تینوں مریضوں کو اندر بیڈ نما اسٹریچر میں لٹا دیا گیا تھا۔ بازغہ بھی ڈرائیور کے ساتھ اس کے برابر کی سیٹ کا دروازہ کھولے سوار ہونے لگی تو اچانک سامنے سے امانی کے گیٹ سے ایک بند جیب تیزی سے اندر داخل ہوئی، اس جیب کو دیکھ کر بازغہ کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔ وہ اپنے باپ کی جیب کو پہچان چکی تھی، مگر اسے حیرت تھی کہ اس کے باپ نے تو رخصت ہوتے وقت کہا تھا کہ ہنگامی حالات کے پیش نظر وہ ابھی دو تین روز مل ایبیب میں ہی گزارے گا مگر یہ تو دوسرے دن ہی آن پہنچے۔ پھر اپنی رہائش گاہ کا رخ کرنے کے بجائے یہاں! یقیناً وہاں کسی نے بتایا ہوگا کہ ان کی بیٹی یہاں اسپتال آئی ہوئی ہے۔

بازغہ کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ کیا اس کے پاپا

اس سے کوئی ضروری اور اہم بات تو نہیں کرنا چاہتے تھے؟ ورنہ تو بازغہ کا ارادہ تھا کہ ان سے ملے بغیر ہی نکل جائے۔ وہ رک گئی۔ جیب پیریز ناون ہی کی تھی۔ بازغہ نے ایبیبولینس کے ڈرائیور کو ڈرائیور ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ ناون کی دور سے ہی بیٹی پر نگاہ پڑی اور اس نے جیب اس کے قریب ہی آ کر ایک جھٹکے سے روک دی تھی۔ وہ اکیلا تھا اور خود ہی جیب ڈرائیور کو ماہو اتل ایبیب سے یہاں پہنچا تھا۔ وہ اس وقت بیٹی کو ڈیوڈ اسٹار کی اسٹیٹ تیونائی سے ہی نہیں بلکہ مل ایبیب اور اسرائیل سے بھی باہر نکال دینا چاہتا تھا۔ ادھر ایبیبولینس سے اندر مخصوص ساخت کے اسٹریچر بیڈ پر لیٹا ہوا... محسن بھی اپنے گرد و پیش سے بے خبر نہ تھا۔ وہ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالے ہوئے تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ گاہے بہ گاہے ایبیبولینس کی کھڑکی سے باہر جھانک لیتا تھا۔ ایک بار دیکھنے پر وہ چونک پڑا۔ اس کی محنت بازغہ کو اس نے کھڑکی کے قریب باپ سے لہجے ہوئے پایا۔

"تنت... تم... کہاں جا رہی ہو بیٹی؟" ناون نے جیب سے اتر کر اس کے قریب آ کر کہا۔ وہ خاصا بوکھلا یا ہوا اور تشویش زدہ نظر آ رہا تھا۔

"پاپا! میں کچھ سیریس مریضوں کو مل ایبیب کے بڑے اسپتال پہنچانا چاہتی ہوں۔" بازغہ اسے جواب دے رہی تھی۔ "گھر پر بیٹھے بیٹھے پور ہو جاتی ہوں۔ سوچا بھلائی کے کام کر لوں۔ اس لیے ادھر آ گئی۔" وہ بڑی خوب صورتی سے یہاں ترائش رہی تھی اور بالکل بھی گھبرائی ہوئی نظر نہیں آ رہی تھی بلکہ اس کے برعکس وہ خاصی پراعتماد نظر آ رہی تھی۔ محسن نے دھڑکتے دل سے کھڑکی سے دیکھا۔ اس نے یہودی کمنشنر جیریز ناون کو پہلے ادھر ادھر گردن گھما کر اطراف میں نظریں دوڑاتے دیکھا اس کے بعد وہ نہایت مخدوش انداز میں اور دھیمے لہجے میں بیٹی سے بولا۔

"بیٹی!... تمہاری جان اس وقت سخت خطرے میں ہے۔ مجاہدوں سے تمہارے ہمدردانہ رویے نے جنرل فرناش کو آگ بگولا کر دیا ہے۔ وہ تمہیں کسی وقت بھی گرفتار کرنے اور بعد میں گولی مار دینے کا حکم دے سکتا ہے۔ اس سفاک آدمی سے کچھ بھی بعید نہیں... تم... فوراً آج کی فلائٹ پکڑو اور امریکا روانہ ہو جاؤ، چلو میرے ساتھ... میں تمہیں مل ایبیب سے باہر نکال دوں۔"

یہ سن کر محسن کے کان کھڑے ہو گئے۔ بازغہ کو بھی اس نے کسی قدر پریشان ہوتے دیکھا مگر وہ اپنے لیے نہیں بلکہ محسن کے لیے فکر مند اور متوشش ہو گئی تھی۔ باپ سے بولی۔

تجلی کہانیوں آپ بیتیوں جگ بیتیوں کے برائے مثال محمود



ماہنامہ
شمارہ فروری 2015
کی جھلکیاں

باکمال

اس سائنسدان کی داستان زیست
جس نے کمال کر دکھایا

ظلامیں نماز

سیارہ زمین سے دو خطا میں نماز پڑھنے والے کا تعارف

لغیرے

دنیا کے مشہور لیڈروں کا مختصر مختصر سا تذکرہ

حکام محسن

ایک نیکی ڈرائیور کی سچ بیانی،
وہ موت کے منہ سے نکل آیا

کاکہ بھان

"الف لیلا" و "الوداع" جیسا دلچسپ
سلسلہ اور "سراب" ایسی منفرد لہو گرم
کردینے والی طویل کہانی

ان سب کے علاوہ بھی بہت سی سچ بیانیاں،
سچے قصے، انوکھے واقعات، پاکستان اور
بیرون پاکستان سے دلچسپ روداد

بس ایک بار پڑھ کر دیکھیں،
آپ خود گرویدہ ہو جائیں گے

خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ

"مجھے اس کا اندازہ ہے پاپا!..... مگر آپ میری فکر
نہ کریں..... میں گل ایب ایب ہی جا رہی ہوں۔ پلیز! زیادہ
شور مت مچائیے گا۔ ورنہ میری جان مزید خطرے میں
پڑ جائے گی۔"

بچی کی بات سن کر کمشنر پیریز ناون کا ماتھا ٹھنکا۔
غیر ارادوی طور پر اس نے قریب کھڑی ایبویٹنس کی طرف
دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا اور بیٹی
کی طرف دیکھ کر مٹکا کر لہجے میں مستفسر ہوا۔
"اس ایبویٹنس میں تم کون سے مریض لے جا رہی
ہو بیٹی؟"

بازغہ نے سرد لہجے میں کہا۔ "دو تین مریضوں کی
حالت بہت خراب ہے۔ انہیں لے جا رہی ہوں۔ پاپا پاپا!"
یہ کہہ کر وہ ایبویٹنس کی طرف لپکی اور دروازہ کھول کر ڈرائیور
کے برابر والی سیٹ پر براجمان ہو گئی۔ ڈرائیور نے
ایبویٹنس اشارت کر کے آگے بڑھا دی۔

ناون ہلکا سا سارہ گیا۔ بیٹی کی باتیں اس کے دماغ
میں گردش کرنے لگیں۔ "پلیز پاپا! شور مت مچائیے گا۔ ورنہ
میری جان مزید خطرے میں پڑ جائے گی۔" اس بات نے
اسے کم صدم کر دیا تھا، صاف مطلب تھا کہ اس کی لاڈلی ضرور
کوئی ایسا کام کرنے جا رہی تھی، جو اسٹیٹ کے اصولوں کے
سخت منافی تھا۔ وہ بیٹی کی جان بچانے ہی کے لیے تو یہاں
آیا تھا پھر بھلا کیسے اس کی جان کو خطرے میں ڈالنے کا سبب
بنا؟ تاہم اسے تشویش نے ضرور آن گھیرا تھا۔ بیٹی کی محبت
نے اسے جیسے مہربان لب کر دیا تھا۔ لہذا اور جاتی ایبویٹنس کو
دیکھتا رہ گیا۔

ادھر ایبویٹنس کے اندر موجود محسن نے بھی دونوں
باپ بیٹی کی باتیں سن لی تھیں، اسے اپنی اور بازغہ کی
فکر ہونے لگی۔ اتنا تو اسے بھی اندازہ ہو چلا تھا کہ کم از کم
کمشنر ناون ان کا راستہ کھوتا کرنے کی کوشش نہیں کرے گا
لیکن اسے سب سے زیادہ اس بات کی تشویش ہو رہی تھی کہ
بقول کمشنر پیریز ناون کے بازغہ کو جنرل فرناش جیسے چنگیز صفت
آدی سے جان کا خطرہ تھا جو کسی وقت بھی بازغہ کو گرفتاری اور
بعد میں گولی مارنے کے احکامات صادر کر سکتا تھا اور بازغہ
کے باپ پیریز ناون نے بیٹی کو فی الفور امریکا یا کسی اور ملک
نکل جانے کی تاکید کی تھی۔

ادھر آئرن مین سے "اجازت" لینے کے بعد
جنرل فرناش نے فوراً ہیڈ کوارٹر کا رخ کیا اور جب اسے یہ بتا
چلا کہ بازغہ اسٹیٹ کے جنرل اسپتال سے چند مریضوں کو

میں ہوں..... میں..... جزل آنزک فرناش..... میرے حکم کے بغیر یہاں ایک پتا بھی نہیں ہلنا چاہیے۔ اب دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں ایک لمحے کی دیر کے بغیر تمہیں گولی مار دوں گا۔“

جی اسے کی حالت تپتی ہو رہی تھی وہ معافیاں مانگتا ہوا وہاں سے کھسک گیا۔

جزل فرناش کا چہرہ مسخ ہو کے مزید کردہ نظر آنے لگا تھا۔ اسے یقین کی حد تک شبہ تھا کہ بازغہ ضرور کسی زخمی حریت پسند کو یہاں سے نکال کر لے گئی ہوگی، یہ یقیناً اس روز تیونائی حملے میں یہاں کہیں زخمی ہو کے پھنس گیا ہوگا۔

اس نے فوراً سات لڑاکا اور انتہائی تربیت یافتہ کمانڈوز کو بازغہ کے تعاقب میں روانہ کر دیا اور ساتھ ہی تل ایب میں واقع چوکیوں پر ناکا بندی کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ اسے اپنے نائب ایجوڈنٹس کی یاد آنے لگی۔ ایسے مواقع پر میں وہ اس کا سچا دست راست تھا مگر اب وہ اس سے بچھڑ چکا تھا۔ جزل فرناش اسے اپنا بڑا نقصان سمجھتا تھا اور وہ انتقام میں اندھا ہو رہا تھا۔ اس نے مزید کچھ اور احکامات صادر کیے، اس کے بعد اس نے کسٹمز جیریز ٹاون سے رابطہ کیا اور اسے فی الفور اپنے آفس میں حاضر ہونے کا حکم دے ڈالا۔

☆☆☆

آنکھ کھلنے پر اس نے دو مہربان چہروں کو خود پر جھکے ہوئے پایا۔ ایک تو اس کا عراقی دوست حماد تھا دوسری جینیئر نوویئر یعنی جینیئر جینیئر۔

”جینیئر گڈ! تمہیں ہوش آ گیا۔“ ڈاکٹر کمال احمد کو ہوش میں آتے دیکھ کر جینیئر کے نرم و گداز ہونٹوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

”اب کسی طبیعت ہے دوست؟“ حماد نے مسکرا کر پوچھا۔

کمال چند ٹاپے تک تو خالی الذہنی کی حالت میں رہا۔ پھر اسے یاد آنے لگا کہ اسے ایک کار نے ٹکر مار دی تھی۔ اس نے خود کو کسی اسپتال کے بیڈ پر پایا تھا۔ اس کی ٹانگ اور پیشانی پر ہینڈ ٹیج بندھی ہوئی تھی۔ ایک بازو میں کیوٹا لانسب تھا، جس کے ذریعے ڈرپ لگائی گئی تھی، کمال کو سب یاد آچکا تھا۔ یہ بھی کہ ایک شیور لیٹ سیاہ رنگ کی کار نے عقب سے اسے تیز رفتاری سے روندنے کی کوشش جاہلی تھی۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بروقت اس کی خوف ناک ٹکر سے بچ تو گیا تھا، مگر فٹ پاتھ پر چڑھتے ہوئے اس کا سر لیپ پوسٹ کے پول سے جا کرایا تھا اور پھر اسے کچھ ہوش

بذات خود اپنے ساتھ ایجوینس میں لے کر تل ایب روانہ ہوئی ہے تو اس کی ٹانگ پیشانی پر ٹھکنوں کا جال سا پھیل گیا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آ سکی کہ..... بھلا ایک کسٹمر کی بیٹی بازغہ کو ایسی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی کہ وہ راتوں رات ایسا فریضہ انجام دے رہی ہے؟ اس نے یہ پتا چلانے کے لیے فوراً اپنی اسٹیٹ کے جزل اسپتال کے میڈیکل جزل ایڈمن کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ اس کے ذریعے معلوم ہوا کہ جب دو مریضوں کو ایمر جسی کے پیش نظر راتوں رات تل ایب کے ایک بڑے اسپتال میں شفٹ کیا جا رہا تھا تو..... بازغہ نے ایک تیسرے مریض کو بھی یہاں سے شفٹ کروایا تھا۔ یہ سن کر جزل فرناش کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے بڑے کرخت لہجے میں درپخت کیا۔

”وہ مریض کون تھا؟..... اس کی میڈیکل ہسٹری کیا ہے، مجھے اسی وقت آگاہ کرو؟“

جزل ایڈمن گھبرایا ہوا تھا اور اب تو جیسے باقاعدہ تشویش زدہ بھی نظر آنے لگا تھا۔ اسے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ کہیں کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ اس نے تھوڑی دیر میں تفصیل حاصل کر لی تو اس کی حالت مزید خیر ہو گئی کیونکہ بازغہ نے جس بیڈ نمبر کے مریض کو شفٹ کرنے کے لیے ایجوینس میں سوار کروایا تھا وہ اب بھی اپنی جگہ موجود تھا۔

جزل آنزک فرناش کو جب یہ پتا چلا تو اس کا دماغ جھک سے اڑ گیا اور اس نے مارے طیش کے دانت چیں کر جی اسے کے چہرے پہ زوردار تھپڑ رسید کر دیا اور دہاڑ کر بولا۔ ”اگر..... اصل مریض ابھی تک اپنے بیڈ پر موجود ہے تو پھر بازغہ کون سے تیسرے مریض کو ایجوینس میں اپنے ساتھ لے کر گئی ہے؟“

جی اسے کی حالت خیر ہو رہی تھی، وہ کیا جواب دیتا۔ لفظ اپنی صفائی میں اتنا ہی بول سکا۔

”م..... مجھے سن..... نہیں معلوم..... م..... میڈم (بازغہ) نے کہاں..... کونسا..... مریض شفٹ کیا ہے؟“

”یہ سب کچھ تمہاری سپرویزن میں کیوں نہیں ہوا اور بازغہ تم پر حکم ہلانے والی کون تھی؟“ جزل فرناش نے اسے تشکیکی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

”س..... سر..... وہ..... کک..... کسٹمر کی بیٹی تھی..... اس لیے ہم نے بھی زیادہ توجہ نہ دی۔“ جی اسے نے لرزتے ہوئے جواب دیا اور جزل فرناش نے آگے بڑھ کر اسے ریمان سے دبوچ لیا۔

”کان کھول کر سن لو..... اس اسٹیٹ کا مالک صرف

”آف کورس۔“ حماد نے پورے یقین سے کہا۔
 ”ڈی کارلو کارڈ رائیو کر رہا تھا اور کیا تم اس کار میں
 موجود اس کے تینوں ساتھیوں کو پہچان رہے تھے؟“ جینی
 نے حماد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا اور نہ جانے کیوں.....
 ڈاکٹر کمال کو جینی کے حماد سے اس انداز میں پوچھنے پر عجیب
 ساٹا اور اسے نامعلوم سی حیرت بھی محسوس ہوئی۔

وہ اپنے بیڈ پر تقریباً نیم دراز تھا۔ اس کی حالت اب
 کافی بہتر تھی، ڈاکٹر کے مطابق ٹانگ اور سر میں معمولی
 چوٹیں آئی تھیں اور دو گھنٹوں بعد اسے اسپتال سے ڈسچارج
 بھی کیا جانے والا تھا۔

”جی ہاں.....! مس جینئر نسویٹر.....! میں نے بہت
 اچھی طرح یہ سب دیکھا تھا۔“ حماد نے ایک بار پھر ایک
 عجیب سی نظر جینی پہ ڈالتے ہوئے کہا تو نہ جانے کیوں ڈاکٹر
 کمال کو حماد کے لہجے میں ہلکی سی جھین کا احساس ہوا۔

”یقیناً پھر تم نے ان کی کار کا نمبر بھی نوٹ کیا ہوگا؟“
 ”ہاں۔“

”تو پھر آپ اب تک خاموش کیوں بیٹھے ہیں مسز
 حماد؟ آپ کو تو فوراً کسی پولیس شریف سے رابطہ کرنا چاہیے
 تھا۔“ جینی نے کہا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر کمال نے جینی کے
 سرخ و سپید اور حسین چہرے کو بہ غور دیکھا۔ وہ بار بار اپنا
 نچلا ہونٹ کاٹے جا رہی تھی، جو اس کے اندر ایک مضطربانہ
 بے چینی کو ظاہر کر رہی تھی۔ حماد اس کی بات پر قدرے
 چونکا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے کمال نے سنا۔ حماد خامے
 ظہر یہ انداز میں ایک کڑوی سی مسکراہٹ تلے جینی سے
 مخاطب ہو کے کہہ رہا تھا۔

”میں نے یہی سوچا تھا مگر شاید..... اس کیس کی
 شنوائی ہی نہ ہو سکے؟“

”کیا مطلب؟“ جینی نے الجھن آمیز ٹکا ہوں سے
 اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں! مس جینی!..... اس لیے کہ..... اس کار
 میں امریکی پارلیمانی ممبر کا بیٹا..... ڈی کارلو ہی نہیں بلکہ سٹی
 پولیس ڈیپارٹمنٹ کے شریف جان نسویٹر کا جواں سال بیٹا
 اور تمہارا بھائی ایان نسویٹر بھی موجود تھا۔“ یہ سنسنی خیز
 انکشاف..... ڈاکٹر کمال احمد کے لیے خاصا چونکا دینے والا
 تھا۔ یہ سنتے ہی اس نے بے اختیار جینی کی طرف دیکھا۔
 اس کے چہرے پر ہلدی کا سارنگ ابھرا تھا۔ وہ چند ثانیے
 تک تو قریب موجود حماد کے چہرے کو دیکھتی رہ گئی۔

”الل..... لیکن..... یہ..... یہ..... کیسے ہو سکتا

نہ رہا تھا، کارڈ رائیو کے ساتھ اس کے قریب سے گزرتی جلی
 گئی تھی، نیز ایک شخص کو بھی اس نے یونیورسٹی کے گیٹ سے
 نکل کر اس کی طرف دوڑتے دیکھا تھا، وہ شاید اسے پہچانے
 کے لیے ہی اس کی طرف دوڑا تھا۔

”میں کافی بہتر ہوں دوست!“ کمال نے جواباً
 دوستانہ مسکراہٹ سے حماد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

جینی زیادہ فکرمند اور تشویش زدہ دکھائی دے رہی
 تھی۔ ”تھوڑی دیر بعد ہی کچھ اور فیلوز بھی وہاں کمال کی
 خیریت دریافت کرنے آئے۔ یہ مسلم طلبا کا گروپ تھا
 جن میں کمال فیس تھا۔

کچھ کا خیال تھا یہ محض اتفاقی حادثہ تھا۔ تاہم تھوڑی
 دیر بعد جب وہ گروپ نیک خواہشات کے ساتھ واپس
 لوٹ گیا اور کمرے میں صرف حماد اور جینی رہ گئے تو حماد نے
 کمال سے عجیب لہجے میں پوچھا۔

”تمہارا کہ خیال ہے کمال.....! کیا ایک اتفاقی حادثہ تھا؟“
 ”شاید.....“ ڈاکٹر کمال نے گونگو کے انداز میں کہا۔

”نہیں۔“ حماد نے پر زور انداز میں اس کی بات کی
 نفی میں اپنا سر جھکا۔ ”میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا
 تھا۔ ڈی کارلو اور اس کے تین دوستوں کو سیاہ رنگ کی
 شیورلیٹ کار میں.....“

اس کی بات پر نہ صرف ڈاکٹر کمال بلکہ جینی نے بھی
 چونک کر اس کی طرف دیکھا اور یہ بتاتے ہوئے حماد نے بھی
 جانے کیوں ایک دزدیدہ سی نظر جینی کے چہرے پر بھی ڈالی
 تھی۔ حماد نے آگے بتایا۔

”میں اس وقت..... وکسٹن ویڈیو پبلک لائبریری
 جانے کے لیے نکلا تھا۔“

”اوہ..... تو تم ہی تھے وہ..... جب میں نے گرتے
 ہوئے آخری بار نہیں دوڑتے ہوئے اپنی طرف آتے
 دیکھا تھا؟“ کمال کو جیسے یاد آ گیا۔

”ہاں دوست.....! وہ میں ہی تھا۔ اس چشم دید
 واردات کا واہ.....“ حماد نے سنجیدگی سے کہا۔ ڈاکٹر کمال
 نے ایک بار پھر محسوس کیا کہ حماد نے کوئی دوسری تیسری بار
 جینی کی طرف کن انھیوں سے دیکھا تھا..... اسے نہ جانے
 کیوں حماد کی یہ حرکت عجیب سی محسوس ہونے لگی۔ اس
 درمیان..... جینی نے حماد سے مخاطب ہو کے کہا۔

”کیا واقعی تم اس واردات کے چشم دید گواہ ہو؟
 م..... میرا مطلب ہے..... ڈی کارلو..... اپنے تین
 دوستوں کے ہمراہ سیاہ شیورلیٹ میں موجود تھا؟“

جینی نے بے اختیار اپنے سینے سے ایک ہرکاری خارج کی۔ اس کی کیفیات اب خاصی مستدل محسوس ہو رہی تھیں، بولی۔ "جس وقت ڈاکٹر کمال کو ڈی کارلو کی شیور لیٹ نے نکر مارنا چاہی تھی۔ اس کے صرف ایک گھنٹے بعد ہی میں نے اپنے بھائی ایان کو ڈی کارلو کی کار سے اترتے ہوئے گھر کی طرف آتے دیکھا تھا۔ اس وقت میں اپنے کمرے کی کھڑکی کی بالکونی سے باہر دیکھ رہی تھی جب اس نمبر پلیٹ کی کار سے میرا بھائی ایان اترتا تھا، وہ چہرے مہرے سے خاصا پریشان نظر آ رہا تھا..... لیکن ہائی گاڈ! مجھے بالکل بھی یہ نہیں معلوم تھا کہ اس وقت یہ چاروں کس خوبی واردات کی ناکامی کے بعد لوٹے ہیں..... میں نے اپنی ہی کوشش تو چاہی تھی کہ..... اپنے بھائی ایان سے اس کی پریشانی کا سبب پوچھوں اور یہ بھی کہ آخر ڈی کارلو جیسے شہ پسند انسان کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا کب سے رہنے لگا ہے..... مگر میں نہ جانے کیوں ایسا نہ کر سکی؟" جینی نے بالآخر صاف گوئی سے بتایا۔ ڈاکٹر کمال کو اب اپنے دوست..... حماد اندال..... کی چھٹی ہوئی نظریہ نظروں کا مغلوب سمجھ میں آ گیا تھا جو وہ وقفے وقفے سے جینی پر ڈالے جا رہا تھا مگر اب جینی کی صاف گوئی نے اسے بھی کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ڈاکٹر کمال تو کچھ نہ بولا۔ البتہ..... جینی نے ہوا ایک جوش تلے انداز میں ڈاکٹر کمال اور حماد کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، اگر یہ بات ہے تو پھر مجھے بھی اس دوائی میں اپنے ساتھ شامل سمجھو..... اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد ہم تینوں پولیس میں اس کی رپورٹ کھسوا گئے..... چاہے میرا بھائی ہی کیوں نہ مجرم ہو..... ڈاکٹر کمال کو انصاف ملنا چاہیے۔"

اس کی فیصلہ کن گفتگو پر ڈاکٹر کمال اور حماد اندال..... قدرے چونک کر جینی کا چہرہ دیکھنے لگے۔

ٹھیک اسی وقت ایک خوب صورت سی نازک اندام نس نے آکر بتایا کہ پولیس شریف جان نسوینر ڈاکٹر کمال کا بیان قلم بند کرنا چاہتے ہیں۔

تینوں کے لیے یہ خبر اچانک تھی۔ تینوں ہی یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھے کہ اس وقت شریف کا کیا رد عمل ہوگا جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ اس کے اپنے بیٹے ایان کے خلاف بھی ان تین چشم دید گواہان میں خود اس کی اپنی بیٹی جینی بھی شامل ہے۔

(جاری ہے)

ہے؟..... ڈی کارلو کی اس کار میں موجودگی کا سبب تو سمجھ میں آتا ہے..... حماد! مگر جینی کا بھائی.....؟" ڈاکٹر کمال جیسے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے غیر یقینی لہجے میں بولا۔ "ہاں ڈاکٹر کمال..... اس بات پر تو مجھے بھی حیرت ہوئی تھی۔" حماد نے اس بار چھٹی ہوئی نظر فریق چہرے کے ساتھ بیٹھی جینی پر ڈالنے ہوئے کہا۔

"نن..... نو..... نیور..... ایسا نہیں ہو سکتا..... نو..... نیور..... بھلا..... جینی کے بھائی ایان کو مجھ سے کیا پرکاش ہو سکتی ہے؟"

"حماد بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے..... ڈاکٹر کمال!....." دفعتاً جین نے جے ہوئے لہجے میں کہا اور نہ صرف ڈاکٹر کمال..... بلکہ اس بار حماد اندال نے بھی قدرے چونک کر جین کی طرف دیکھا تھا۔ اب پہلی بار اس کے چہرے پہ حیرت چمکی تھی۔ شاید اسے جینی سے امید نہ تھی کہ وہ کار میں اپنے بھائی ایان کی موجودگی پر اس قدر اعتماد کا اظہار کرے گی۔ ورنہ تو وہ یہی سمجھا تھا کہ جین ہونے کے ناتے اپنے بھائی کو پہچاننے کی کوشش کرے گی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم..... جینی؟ بھلا تمہارے بھائی کو مجھ سے کیوں کر دستنی ہونے لگی؟" ڈاکٹر کمال کا ہنوز یقین کرنے کو جی نہیں پاہ رہا تھا۔

"اس کا..... نے لیے تڑنگے امریکی نژاد یہودی ڈی کارلو سے تو تمہاری اس دن سے ہی دشمنی کی ابتدا ہو چکی تھی جب سینٹرل کیشنن سٹریم نے اس کی ہرزہ سرائی کا منہ توڑ جواب دیا تھا۔"

حماد نے کمال کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اس لیے تو کہہ رہا ہوں کہ ڈی کارلو کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے، مگر ایان.....؟"

"ایان اس کا لے یہودی کا دوست ہے۔" "مگر..... پھر بھی دوست! یہ کیسے ممکن ہے؟" ڈاکٹر کمال کا یقین کرنے کو جی ہی نہیں مان رہا تھا۔

"ڈی کارلو..... ایک پوسٹ گریجویٹ ہے جبکہ ایان اس کے بالکل الٹ....." کمال اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔ شاید جینی کی موجودگی میں وہ اس کے بھائی ایان کو کم پڑھا لکھا اور آوارہ منس نہیں کہنا چاہتا تھا۔

"کیا آپ بتا سکتی ہیں مس جینی! کہ آخر..... آپ کو اس حقیقت کا کیسے پتا چلا اور معلوم ہونے کے باوجود بھی آپ نے اب تک..... پولیس ڈیپیکٹو یا شریف سے ذکر نہیں کیا؟" حماد نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو

مہمان

بابر نسیم

کچھ مہمان ایسے ہوتے ہیں جو بلائیے جان کی طرح چمت جاتے ہیں۔ جس گھر کے دروازے اچھی دستک پر بنا پڑتال کے باآسانی کھل جاتے ہیں وہاں اپنایت کا ہر انداز بھیکا پڑ جاتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی مہمان تھا جس کے آنے پر نہ مکان اپنا ربا تھا اور نہ مکین... اس جادو پر دنیا حیران تھی۔

دوسروں کی مملکت میں دخل اندازی کرنے والے ایک ساحر کی فنکاری



دروازے پر مسلسل دستک ہو رہی تھی لیکن اسمتہ نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ شاید وہ دروازہ کھولنا ہی نہیں چاہ رہا تھا لیکن دستک دینے والا بھی پیچھے ہٹنے پر تیار نہیں تھا۔ اس نے اپنی کوشش جاری رکھی اور التجائیہ انداز میں بولا۔ ”مسٹر اسمتہ! دروازہ کھول دیں۔ میں آپ کے قاعدے کے لیے ہی یہاں آیا ہوں۔“

”تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سنی۔“ اسمتہ نے جھلا کر ہاتھ میں پکڑی ہوئی تیزاب کی بوتل دیوار پر روئے ماری۔ پلاننگ کی بوتل دیوار سے ٹکرا کر

سپینس ڈائجسٹ 117 فروری 2015ء

Copied From Web

اس پر ایک نظر ڈالی اور لکھی ہوئی عبارت دیکھ کر چونک گیا۔
 "لیسن تھارپ....." مشیر زندگی۔"
 اسمتہ نے کارڈ کو پلٹ کر دیکھا لیکن پشت پر کچھ نہیں
 لکھا تھا۔ وہ بولا۔ "مشیر زندگی۔ اس کا کیا مطلب ہے؟"
 "میں تم جیسے لوگوں کی مدد کرتا ہوں۔ جن کی زندگی
 برباد ہو جاتی ہے جو اس، مایوس اور تنہا نظر آتے ہیں اور وہ
 اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتے
 لگتے ہیں۔"

"تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ میرے پاس
 تمہاری فیس دینے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ اس لیے بہتر ہوگا
 کہ تم کوئی اور گاہک تلاش کرو۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت
 نہیں ہے۔"

"کیا واقعی؟" یہ کہہ کر تھارپ نے اپنی جیکٹ کی
 جیب سے وسکی کی ایک چھوٹی بوتل نکالی اور بولا۔ "میرا
 خیال ہے کہ اس مخلول کے مقابلے میں تمہیں اس کا ڈالنے بہتر
 لگے گا۔"

اسمتہ کو واقعی اس وقت شدت سے وسکی کی طلب ہو
 رہی تھی اور اگر بھوک کی وجہ سے وہ کمزوری محسوس نہ کر رہا
 ہوتا تو شاید چھٹ کر اس سے وہ بوتل چھین لیتا۔

تھارپ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مسکرایا
 اور بولا۔ "یہ بوتل تمہیں مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ میری
 جیب میں ایک اور بوتل بھی ہے۔ میں وہ بھی تمہیں دے
 دوں گا بشرطیکہ تم مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ اس سستے سے بوتل
 میں کیوں آئے اور یہاں بیٹھ کر کاسٹک سوڈا کے ذریعے اپنی
 زندگی کا خاتمہ کرنے کی پلاننگ کیوں کر رہے ہو؟"

تھارپ نے وسکی کی بوتل گدے پر رکھی پھر اس نے
 کمرے میں رکھی واحد کرسی پر سے وسکی کی تین خالی بوتلیں
 اٹھائیں اور انہیں ڈسٹ بن میں پھینک دیا پھر کرسی گھسیٹ کر
 اس پر بیٹھے ہوئے بولا۔ "اب تم مجھے اپنی کہانی سناؤ۔ تم اچھی
 پہلی زندگی بسر کر رہے تھے پھر یہ تباہی کس طرح ہوئی؟"
 اسمتہ نے بوتل اٹھائی اور اس کا ڈھکن کھول کر دو
 ٹھونٹ حلق میں انڈیل لیے اور سرشاری کے عالم میں بولا۔
 "میں ہمیشہ سے ہی ایسا نہیں تھا۔"

تھارپ نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "جانتا
 ہوں مسٹر اسمتہ سب کچھ جانتا ہوں۔ اب تم مجھے بتاؤ گے کہ
 اس حال تک کیسے پہنچے؟"

"میرا بھی ایک اچھا گھر، نیپلی اور عمدہ ملازمت تھی
 جہاں مزید ترقی کرنے کے مواقع بھی تھے۔ میں ایک اچھی

فرش پر گری اور لڑھکتی ہوئی ایک کونے میں چلی گئی جہاں
 پہلے سے وسکی کی خالی بوتلوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔
 "میں جانتا ہوں کہ تم کیا کر رہے ہو مسٹر اسمتہ!"
 دروازے کے باہر سے آواز آئی۔

اسمتہ اپنے بستر پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے سر
 تھامتے ہوئے بولا۔ "یہاں سے دور چلے جاؤ۔"

"ٹھیک ہے۔ تم نے میرے لیے کوئی راستہ نہیں
 چھوڑا۔" باہر گھرے ہوئے شخص نے بے بسی سے کہا پھر اس
 نے اپنی جیب سے ایک مخصوص اوزار نکالا اور تالا کھولنے
 میں کامیاب ہو گیا۔ دروازہ کھلنے پر ایک شخص کاروباری
 سوٹ میں لمبوس چشمہ لگائے اندر داخل ہوا اور اپنا تعارف
 کرواتے ہوئے بولا۔

"گڈ آفٹرنون۔ میرا نام تھارپ ہے۔ کیا میں اندر
 آسکتا ہوں؟"
 "نہیں۔" اسمتہ نے بے رخی سے کہا۔

تھارپ نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور کمرے
 میں داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کر دیا پھر اس نے ایک
 تجزیہ نگاہ ہوئی کے کمرے پر ڈالی اور بولا۔ "یہاں تو کافی
 گھنٹن ہے۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو کھڑکی کھول دوں۔"

"جو تمہارا نام چاہے وہ کرو۔" اسمتہ بستر کے تاہوار
 گدے پر لیٹتے ہوئے بولا جس پر سفید چادر پڑی ہوئی تھی
 پہلی بار اس کی نظر پست پر لگے ہوئے دھبوں کی طرف گئی
 جنہیں دیکھ کر افریقا کا نقشہ ذہن میں ابھرنے لگا۔ کھڑکی
 کھولنے کے بعد تھارپ نے تیزاب کی بوتل اٹھائی اور اس
 پر لگے ہوئے لیبل کو پڑھنے لگا۔ وہ پائپ کی صفائی کرنے
 والا مخلول تھا۔ اس نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میری کچھ

میں نہیں آتا کہ تم نے اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے اس کا
 انتخاب کیا۔ تم نہیں جانتے کہ یہ کتنا مہلک ہے۔ اگر ذرا سی
 زیادہ مقدار لے لی تو کوئی آواز نکالے بغیر ہی مر جاؤ گے۔"
 "مجھے اس کی پروا نہیں۔" اسمتہ نے بے زاری سے کہا۔
 "ہاں میں جانتا ہوں اور اسی لیے یہاں آیا ہوں۔"
 اسمتہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ "تم کون ہو؟ کہیں تمہارا
 تعلق پولیس سے تو نہیں۔"

"نہیں۔"
 "پھر تمہیں میری بیوی نے بھیجا ہوگا۔ ٹھیک ہے تم
 اپنی کارروائی پوری کرو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے مسٹر اسمتہ۔" تھارپ نے
 اندرونی جیب سے ایک کارڈ نکال کر اسے پکڑا دیا۔ اسمتہ نے

میز پر چلی آئی اور اس نے تلا ہوا انڈا ٹوٹی کی پلیٹ میں ڈال دیا جو پہلے ہی مختلف چیزوں سے بھری ہوئی تھی۔
”تمہاری بیوی بہت اچھا کھانا بناتی ہے۔“ ٹوٹی نے کہا۔

”شکریہ۔“ ہیلیری نے کہا، پھر وہ اسمتھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں اپنا ناشا خود بنانا ہوگا۔ مجھے ابھی گھر کی صفائی بھی کرنی ہے۔ تم سے تو اس سلسلے میں کسی مدد کی توقع رکھنا بے کار ہے۔“

اسمٹھ اس کی بات سن کر حیران رہ گیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ”تمہیں اتنی جلدی کیوں ہو رہی ہے؟ گھر کی صفائی بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔“

”شاید تم نے غور نہیں کیا کہ ہمارے گھر میں ایک مہمان موجود ہے۔“

”اوہ پلیز۔“ ٹوٹی بولا۔ ”میری وجہ سے، عکڑا مت کرو۔“
”اس میں لڑائی والی کوئی بات نہیں ہے۔“ ہیلیری اس کی طرف دیکھ کر سسکراتے ہوئے بولی پھر اس کا رخ اسمتھ کی طرف ہو گیا۔ ”تمہیں کم از کم نیچے آتے وقت ڈھنگ کا لباس تو پہن لینا چاہیے تھا۔ ہمارا مہمان کیا سوچے گا۔“

دل گرفتہ اسمتھ واپس جانے کے لیے مڑا جب وہ اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو اسے اپنی بیٹی کی آواز سنائی دی۔ وہ اجنبی سے کہہ رہی تھی۔ ”کی کہتی ہیں کہ تم آرمی میں تھے انکل ٹوٹی! کیا تم نے کسی کو مارا؟“

اسمٹھ نے نسل کیا۔ شیو بنایا اور دانت صاف کر کے جب بیڈروم میں آیا تو ہیلیری قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی اپنا میک اپ درست کر رہی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور اسمتھ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”اگر تم برانہ مانو تو کمرے سے باہر چلے جاؤ۔ میں لباس تبدیل کرنا چاہ رہی ہوں۔“

اسمٹھ اپنی اسٹڈی میں جا کر ان رپورٹوں کی ورق گردانی کرنے لگا جنہیں اس نے ابھی تک نہیں پڑھا تھا۔ آداب کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اپنے مہمان کی خاطر مدد کرتا لیکن ہیلیری کے طرز عمل سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اسے مہمان سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ شاید وہ کسی وجہ سے خوفزدہ تھی۔

اگلا مرحلہ بچوں کو اسکول لے جانے اور خود کام پر جانے کا تھا۔ جب وہ نیچے آیا تو اس نے دیکھا کہ ہیلیری پہلے ہی بچوں کو بیرونی دروازے سے باہر لے جا رہی تھی اور ٹوٹی برآمدے میں کھڑا اس کی کار کی چابیاں اپنی انگلی میں کھما

پہلی حوصلہ طبیعت کی زندگی گزار رہا تھا لیکن صرف ایک ماہ پہلے وہ سب کچھ ہو گیا جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ بدھ کا دن تھا۔ میں معمول کے مطابق صبح بیدار ہوا تو نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوا کہ دن اچھا نہیں گزرے گا۔ میں نے اسے اپنا واہمہ سمجھ کر سر جھٹک دیا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس دن کیا تھا ہی آنے والی ہے تو کبھی بستر سے باہر نہ آتا۔“

”میں نے انڈا تلنے کی خوشبو محسوس کی اور اندازہ ہو گیا کہ سب کچھ معمول کے مطابق نہیں ہے۔ اس وقت صبح کے سات بجے تھے اور میری بیوی ہیلیری شاید ہی بھی آٹھ بجے سے پہلے اگلی ہو وہ اس وقت مکن میں کھڑی ناشا بنا رہی تھی۔“

☆☆☆

اسمٹھ بستر سے اٹھا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے مکن میں آ گیا۔ جہاں سے مختلف آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے جیسے ہی دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا، اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی آنے والی ہو۔ اس نے ایک بار پھر یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ پریشانی کی کیا بات ہے۔ یہ اس کا گھر ہے۔ یہاں کیا غیر معمولی بات ہو سکتی ہے۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ مکن میں داخل ہوا۔ اس وقت ہیلیری فرائنک مین میں انڈا مل رہی تھی اور اس کے بچے اینڈریو اور جسیکا اسکول یونیفارم میں ملبوس ناشتے کی میز پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ ایک اجنبی بھی نظر آ رہا تھا جس کے لیے ناشتے کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ اجنبی تقریباً اسمتھ ہی کی عمر کا تھا۔ اس نے عمدہ لباس پہن رکھا تھا۔ صبح سات بجے اسمتھ کے گھر ناشتے کی میز پر اس کی موجودگی ایک غیر معمولی بات تھی جسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسمتھ نے اس اجنبی سے پوچھ کچھ کرنا مناسب نہ سمجھا اور نہ ہی اسے یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ اس کی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ مہمان بہر حال مہمان ہوتا ہے۔

”صبح بخیر! اسمتھ نے کہا۔

”صبح بخیر! بچوں نے جواب دیا۔

اجنبی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”تم یقیناً اسمتھ ہو۔ مجھے ٹوٹی کہتے ہیں۔“

اسمٹھ نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم کیسے ہو؟“
”بالکل ٹھیک۔“ یہ کہہ کر وہ دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”تمہارا گھر بہت اچھا ہے۔“

ہیلیری نے گیس کا پھولہا بن کیا اور فرائنک مین لے کر

”اس سے پہلے کہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے

اسمٹھ تم یہاں سے چلے جاؤ۔“

اسمٹھ یہ سوچ کر چلا گیا کہ شاید گھر واپس آنے تک ہیلیری کا موڈ ٹھیک ہو جائے اور وہ زیادہ بہتر انداز میں اس مسئلے پر گفتگو کر سکیں لیکن یہ محض اس کا خیال تھا۔

☆☆☆

اسمٹھ کی عادت تھی کہ جب اسے کوئی گھریلو مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ پوری طرح دفتر کے کام میں مشغول ہو جاتا۔ اس روز بھی یہی ہوا۔ اس نے دفتر میں بیٹھے بیٹھے وہ تمام رپورٹس پڑھ ڈالیں جنہیں دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ مختلف فائلوں میں سر دیے بیٹھا تھا کہ دوپہر کے قریب اس کی سیکریٹری مسز گلیڈ اسٹون نے انٹرکام پر دو آدمیوں کے آنے کی اطلاع دی۔

”کون لوگ ہیں؟“ اس نے اپنی ڈائری پر نظر پڑ

جماتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ سیکریٹری کوئی جواب دیتی، وہ دونوں آدمی اس کے کمرے میں چلے آئے۔ انہوں نے برساتی اور ہیٹ لیکن رکھے تھے۔ ان میں سے ایک بولا۔ ”اسمٹھ براؤن؟“

”ہاں۔“

”ہمارے پاس تمہارے لیے ایک عدالتی حکم ہے۔“ دوسرے آدمی نے ایک لفافہ اسمٹھ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تم اپنے گھر، بیوی اور بچوں سے کم از کم ایک میل کے فاصلے پر رہو گے اور اپنی بیوی کے وکیل سے علاوہ ان سے کوئی رابطہ نہیں رکھو گے۔ اس حکم کی خلاف ورزی پر تمہیں جیل بھی بھیجا جاسکتا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ دونوں آدمی چلے گئے اور اسمٹھ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا رہ گیا۔ اس کی سیکریٹری بوکھلائی ہوئی اندر داخل ہوئی اور بولی۔ ”مجھے افسوس ہے مسٹر اسمٹھ۔

میرے منہ کرنے کے باوجود وہ دونوں اندر چلے آئے۔“

”اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔“ اسمٹھ نے سرد مہری سے کہا پھر لڑتے ہاتھوں سے اس نے وہ لفافہ کھولا تو اس میں سے تین کاغذ برآمد ہوئے۔ اس نے ان پر ایک نظر ڈالی اور سیکریٹری سے کہا۔

”کیا تم یہ معلوم کر کے بتا سکتی ہو کہ ہماری کمپنی کا وکیل چارلس وارن دفتر میں موجود ہے؟“

”میں نے اسے دس منٹ پہلے دیکھا تھا۔“

”کیا تم اس سے میری ملاقات کروا سکتی ہو؟ اس

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اسمٹھ نے پوچھا۔

ہیلیری نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”ٹونی کی مہربانی ہے کہ وہ بچوں کو اسکول چھوڑنے جا رہا ہے۔“

”لیکن میں بھی یہ کام بخوبی کر سکتا ہوں۔“

”نہیں، تمہیں ہمیشہ شکایت رہتی ہے کہ بچوں کو اسکول چھوڑنے کی وجہ سے دفتر پہنچنے میں دیر ہو جاتی ہے۔“

”میں نے بھی ایسا نہیں کہا۔“ وہ احتجاج کرتے ہوئے بولا۔

”ہمیں مہمان کے سامنے بحث نہیں کرنی چاہیے۔“

”میں کوئی بحث نہیں کر رہا۔“

”بس تو پھر چلے ہو گیا کہ بچے، ٹونی کے ساتھ ہی جائیں گے۔“

ٹونی ایک قدم آگے بڑھا اور اسمٹھ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور مجھے یہ کہنے کی اجازت دو کہ تمہاری ایک بہت ہی خوب صورت فیملی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ہیلیری کے گال پر بوسہ دیا اور بولا۔

”میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔“

اس کے جانے کے بعد اسمٹھ نے ہیلیری سے پوچھا۔ ”کیا تم بتانا پسند کری گی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“

ہیلیری نے، باکس میں سے ڈاک نکالی اور بولی۔ ”ٹونی کچھ عرصہ یہاں ٹھہرے گا۔ تم نے دیکھا نہیں کہ بچے اس سے کس قدر ماؤس ہو گئے ہیں۔“

”لیکن یہ کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟“

”میں نے نہیں بتایا تو تھا کہ اس کا نام ٹونی ہے۔“

”میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مجھے یہ شخص بالکل پسند نہیں آیا۔“

”وہ تمہیں کیوں اچھا لگنے لگا۔“ ہیلیری طنزیہ انداز میں بولی۔ ”وہ پُر جوش اور حاضر دماغ ہے اور تم جیسا ڈل نہیں ہے۔ تم میرا اچھا چھوڑو اور کام پر جاؤ۔ مجھے بھی بہت سارے کام نمٹانے ہیں۔“

”وہ میرے گھر میں نہیں رہے گا۔“ اسمٹھ نے تیز لہجے میں کہا۔

”یہ ہمارا گھر ہے اور میں کسی بھی شخص کو یہاں بلا سکتی ہوں۔ اگر تم مجھ سے اونچی آواز میں بات نہ کرو تو میں تمہاری شکر گزار ہوں گی۔“

”میں نے اونچی آواز میں بات نہیں کی۔“

سے کہنا کہ یہ بہت ضروری ہے۔“

☆☆☆

چارلس وارن ایک خوش شکل اور خوش مزاج شخص تھا۔ اس نے وہ کاغذات پڑھے اور انہیں واپس لگانے میں رکھتے ہوئے بولا۔ ”کسی نے تمہارا پکا کام کیا ہے۔ میں نے اپنی ساری زندگی میں اس سے زیادہ خطرناک بے دخلی کا حکم نامہ نہیں دیکھا۔ تم اپنی بیوی کے ساتھ کیسا سلوک کرتے رہے ہو؟“

”کچھ نہیں۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔“

”کیا تم نے اسے دھمکایا یا مارا؟“

”میں کوئی عنقریب نہیں بلکہ ایک عام شخص ہوں جو

اپنی بیوی اور بچوں سے محبت کرتا ہے۔“

”اوہ سمجھا۔“ وارن کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ

قابل نہیں ہو سکا پھر اس نے کہا۔ ”کیا تم نے الیکٹریک نامی تنظیم کا نام سنا ہے۔“

”نہیں، کیا میرے لیے یہ جاننا ضروری ہے؟“

”شاید نہیں۔“ وارن نے کھوئے کھوئے انداز

میں کہا۔

”تم مجھے اس عدالتی حکم کے بارے میں کیا

مشورہ دو گے؟“

”تم اس پر حرف بہ حرف عمل کرو گے۔“ وارن نے

کہا۔ ”اپنی فیملی سے دور رہو اور کسی اچھے وکیل کا بندوبست کرو۔

اس عدالتی حکم پر عمل نہ کرنے کے نتیجے میں تم جیل جا سکتے ہو۔“

☆☆☆

اس روز وہ وقت سے پہلے ہی دفتر سے اٹھ گیا جس پر

بہت سے لوگوں کو حیرت ہوئی کیونکہ وہ عموماً دیر تک کام کرتا

تھا، اس کی واپسی سات بجے کے بعد ہوتی تھی۔ اس بار

اسے ترقی ملنے کی پوری امید تھی جس کے لیے وہ کافی عرصے

سے جدوجہد کر رہا تھا۔ کارپارکنگ کی طرف جاتے ہوئے

اس نے محسوس کیا کہ حریفوں کی نیند اس کے تعاقب میں

ہے اور وہ اس کی جلد روانگی کو اپنی فتح سمجھ رہے تھے۔ اس

نے سوچا کہ انہیں انگوٹھا دکھا کر اس تاثر کی نفی کر دے لیکن

اس مرحلے پر وہ کسی سے الجھنا نہیں چاہ رہا تھا۔

اس کی کار کے قریب وہی دونوں افراد منڈلا رہے

تھے جو اسے وہ کاغذات دینے کے لیے آئے تھے۔ ان میں

سے ایک کار کے پچھلے دروازے کے شیشے سے اندر جھانک

رہا تھا جبکہ دوسرا ایک نوٹ بک میں کچھ لکھنے میں مصروف

تھا۔ انہیں دیکھتے ہی اسمتھ کو غصہ آ گیا اور وہ تیزی سے ان کی

طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ کیا کر رہے ہو؟“

لبے قد والا بولا۔ ”ہم تمہارے سامان کی فہرست بنا

رہے ہیں۔ عدالت کو تمہارے اثاثوں کی تفصیل درکار ہے۔“

”اے سسٹرا یہ پرائیویٹ کار پارکنگ ہے۔ تمہیں

یہاں آنے اور تاک جھانک کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ پھر ہمیں کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا

ہوگا۔“ لبے قد والا بولا۔

”تم جو چاہو کرتے رہو۔“ اسمتھ نے بے زاری سے

کہا۔ ”فی الحال میں اپنے وکیل سے ملنے جا رہا ہوں۔“

☆☆☆

وکیل مارکوس کینگ نے ان کاغذات پر اچھی ہونٹی

ٹٹاہ ڈالی اور اسمتھ کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس

معاہدے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا، البتہ میرا مشورہ ہے

کہ اس عدالتی حکم کی من و عن عمل کی جائے۔“

اسمٹھ کو چونی کے وکیل سے اس جواب کی توقع نہیں

تھی۔ اس نے نیچے دل سے کہا۔ ”کیا میں اس کے خلاف

اجل دائر نہیں کر سکتا؟“

”تم اس کے اخراجات برداشت نہیں کر سکو گے۔“

”وہ کیوں؟“ اسمتھ نے تعجب سے پوچھا۔ ”میرے

بینک اکاؤنٹ میں اچھی خاصی رقم موجود ہے۔“

”یہ محض تمہاری خوش فہمی ہے۔“ وکیل نے معنی

خیز انداز میں کہا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

کینگ اپنی کرسی سے اٹھا اور ٹپکتے ہوئے کھڑکی تک

گیا۔ ”یہ نیلے رنگ کی سیلون کار تمہاری ہی ہے نا؟“ اس نے

کھڑکی سے نیچے جھانکتے ہوئے کہا۔

اسمٹھ مردہ قدموں سے چلتا ہوا کھڑکی تک آیا اور یہ

دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی کار کو سوبائل کرین کے ذریعے

اٹھا کر ایک ٹرک میں رکھا جا رہا تھا اور وہی دونوں آدمی اس

عمل کی نگرانی کر رہے تھے۔ وہ احتجاج کرتے ہوئے بولا۔

”یہ لوگ ایسا نہیں کر سکتے۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔“ وکیل نے

کہا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ انہوں نے تمہارے معاہدے میں

بیٹ مین اور ریٹ منڈ کی خدمات حاصل کی ہیں اور یہ کوئی

اچھی علامت نہیں ہے۔“

”یہ کون لوگ ہیں؟ کیا تم انہیں جانتے ہو؟“

”چھوٹے قد والے کا نام بیٹ مین ہے۔ یہ ایک

انتہائی خطرناک مجرم ہے اور مختلف جرائم میں چار مرتبہ سزا
بھگت چکا ہے۔ دوسرے شخص ریڈ منڈ کے بارے میں کہا
جاتا ہے کہ اس نے اپنے ہمائی کو قتل کر دیا تھا گو کہ اس پر یہ
جرم ثابت نہیں ہو سکا۔ مجھے امید ہے کہ تم ان دونوں سے
الجھنے کی کوشش نہیں کرو گے۔“

☆☆☆

کیٹنگ نے اس سے مشورہ نہیں مانگی بلکہ اس
کے برعکس اپنی جیب سے بیس پاؤنڈز کا ایک نوٹ نکال کر
اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ رکھ لو۔ شاید تمہیں اس کی
ضرورت پڑ جائے۔“

اسمٹھ وہاں سے سیدھا اپنے بینک گیا اور اے ٹی ایم
مشین سے رقم نکالنے کے لیے اس نے اپنا کارڈ ڈال دیا۔
بین نمبر ڈائل کرنے کے کافی دیر بعد اسکرین پر پیغام نمودار
ہوا۔ ”اس ٹرانزیکشن کے لیے آپ کے اکاؤنٹ کی رقم
نا کافی ہے تفصیلات کے لیے اپنا برانچ سے رابطہ کریں۔
مشین استعمال کرنے کا ٹکریے۔“

وہ بوتھ سے باہر آیا تو اس نے بیٹ مین اور ریڈ منڈ
کو بینک کے مرکزی دروازے پر کھڑا پایا۔ مجبوراً اسے لابی
میں سے ہو کر اندر جانا پڑا۔ بینک منجھرنے اسے دو ہوش ربا
خبریں سنائیں۔ پہلی یہ کہ اس کی بیوی نے جو اسٹ
اکاؤنٹ سے بیس ہزار پاؤنڈز نکال لیے ہیں اور دوسری یہ
کہ عدالتی حکم پر اس کے تمام اثاثے منجمد کر دیے گئے
ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کریڈٹ کارڈ کی واپسی کا
مطالبہ بھی کر دیا۔

اسمٹھ تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا سڑک پر آ گیا۔
اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کا تعاقب کیا جا رہا تھا۔ وہ
ایک سپر مارکیٹ میں داخل ہو گیا اور رسالوں کی الماری کے
پیچھے چھپ گیا۔ بیٹ مین اور ریڈ منڈ اس سے کافی فاصلے پر
تھے۔ وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک
فٹ پاتھ پر کھڑے، اسے تلاش کرتے رہے پھر مایوس ہو کر
وہاں سے چل دیے۔

ان کے جانے کے بعد وہ بھی سپر مارکیٹ سے
باہر آ گیا اور تیز تیز قدموں سے سڑک پر چلنے لگا۔ اس
نے انہیں چمک دینے کے لیے بلا ارادہ دو تین موڑ کاٹے
اور جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا تعاقب نہیں کیا جا رہا
تو اس نے ایک مکان کے دروازے پر کھڑے ہو کر
اپنی سائیس درست کیں۔ جیب سے اپنا فون نکالا اور
گھر کا نمبر ملا یا۔ تین بار گھنٹی بجتے کے بعد ٹونی نے فون

اٹھایا۔ ”ہیلو۔“
اس کی آواز سنتے ہی اسمٹھ کا خون کھول اٹھا۔ وہ
دانت پیٹتے ہوئے بولا۔ ”میں ہیلیری سے بات کرنا چاہتا
ہوں۔“
”وہ اس وقت گھر پر نہیں ہے۔ کیا میں جان سکتا ہوں
کہ تم کون ہو؟“

”اس کا شوہر۔“
”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اب تم اس سے فون پر
بھی بات نہیں کر سکتے۔ اس بار تو میں رپورٹ نہیں کروں گا
لیکن آئندہ ایسی کوشش مت کرنا۔“

”میں صرف اپنا ذاتی سامان لینا چاہتا ہوں۔“
”میں نے اس کے بھیجنے کا انتظام کر دیا ہے۔
خدا حافظ اسمٹھ۔“ یہ کہہ کر ٹونی نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

وہ رات اس نے وائی ایم سی اے ہاسٹل میں
گزاری۔ اسے ایک ایسا کمرہ دیا گیا جس میں چار بستر
تھے۔ ہاسٹل میں زیادہ رش نہیں تھا۔ اس لیے بقیہ تینوں بستر
خالی تھے۔ البتہ بجنگ کلرک نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ
رات میں کسی بھی وقت یہ بستر آباد ہو سکتے ہیں۔ اس نے
بستر پر لیٹے لیٹے کئی بار ٹونی کو قتل کرنے کے بارے میں سوچا
جس نے نہ صرف بڑی عیاری سے اسے قلاش کر دیا تھا بلکہ
عدالتی حکم کے ذریعے بیوی کو بھی اس سے دور کر دیا۔ اس
نے ہیلیری کو اس کے خلاف درغلا یا تھا۔

یہ کون شخص تھا جس نے اسے اپنے ہی گھر سے نکلنے پر
مجبور کر دیا۔ کیا ہیلیری کے اس کے ساتھ تعلقات تھے لیکن
اس نے بھی اس کا ٹوکس نہیں لیا تھا۔ بہر حال اب وہ اس کے
ساتھ تعلق قائم کر چکی تھی۔ اس نے تصور میں ہیلیری اور ٹونی
کو اکٹھے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ دونوں اس کے بستر پر
دراز تھے جبکہ سچے برابر والے کمرے میں سو رہے تھے پھر
اس نے دیکھا کہ ٹونی کے سر میں گولی لگی ہے اور وہ اپنا
پستول لیے پاس کھڑا ہوا ہے۔

اس نے دوسرے دن اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا
ارادہ کر لیا۔ وہ ایک ریوالور خریدنے کے لیے گئیں نہ کہیں
سے پیسوں کا انتظام کرے گا اور کوٹ آرڈر کی پروا کیے بغیر
اپنے گھر جائے گا تا کہ وہ سب کچھ حاصل کر سکے جو اس کا اپنا
ہے۔ اگر وہ ریوالور کا انتظام نہ کر سکا تو ٹونی کو مارنے کے
لیے کوئی دوسری چیز استعمال کرے گا۔ مثلاً پارخ میں رگی
کھاڑی یا گیراج میں پڑا ہوا دزنی ہتھوڑا۔ اگر کچھ بھی نہ ملا تو

ازواجیات

میاں بیوی میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا، شوہر بیوی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ بیوی۔ "اب میں 10 تک گنتی گنتوں کی اگر تم نہ بولے تو میں زہر کھا لوں گی۔"

"1۔ بولو..... شوہر خاموش۔"
"2۔ بولو نا پلیز..... شوہر خاموش۔"
بیوی۔ "بولو نا پلیز..... بیوی روٹا اسٹارٹ۔ شوہر۔ "گنتی گن..... گنتی۔"

بیوی۔ "شکر ہے آپ بولے تو سہی....."

.....
کولبس نے شادی نہیں کی۔ اسی لیے تو امریکا ڈھونڈ لیا۔

کیونکہ اس سے کسی نے نہیں پوچھا۔

- 1۔ کہاں جا رہے ہو؟
- 2۔ کس لیے؟
- 3۔ کس کے ساتھ؟
- 4۔ واپس کب آؤ گے؟
- 5۔ مجھے امی کی طرف چھوڑ دو۔
- 6۔ گھر رہ کر ہی ڈھونڈ لو امریکا۔
- 7۔ آپ رہنے دو کوئی اور ڈھونڈ لے گا۔
- 8۔ میں اکیلی گھر میں کیا کروں گی۔
- 9۔ اچھا بچوں کو ہی لے جاؤ۔
- 10۔ میرے لیے کیا لادو گے؟
- 11۔ کوئی اور چکر تو نہیں؟
- 12۔ اور واپس پہنچنے لیتے آنا۔

مرسلہ۔ امان اللہ، حیدرآباد

.....
مجھے اپنی بیوی پر حیرت ہے کہ وہ دس بچوں کو کس طرح سنبھالتی ہے۔ ایک بار وہ کسی کام سے بازار گئی اور مجھے دو گھنٹے تک بچوں کو سنبھالنا پڑا۔ واپس آ کر اس نے مجھ سے پوچھا۔
"کوئی مشکل تو نہیں پڑی؟"

میں نے کہا۔ "بس وہ جو سامنے لڑکا کھڑا ہے، وہی ذرا شرارت کر رہا تھا مگر میں نے ایک زوردار طمانچہ ایسا لگایا کہ....." "ہائیں۔" وہ گھبرا کر بولی۔
"لیکن وہ لڑکا تو ہمارا نہیں پڑوس کا ہے۔"

مرسلہ۔ ریاض بیٹ، حسن ابدال

وہ اپنے ہاتھوں سے ہی ٹوٹی کا گلا گھونٹ دے گا۔
بچی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی لیکن تھوڑی دیر بعد ہی کھٹ پیٹ کی آواز سن کر وہ جاگ گیا۔ کمرے کی لائٹ جل رہی تھی اور آپٹ شخص فرش پر ٹپل رہا تھا۔ اس کا لباس شکن آلود تھا اور صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ مشکل حالات سے گزر رہا ہے۔

"اگر تمہیں ناگوار نہ ہو تو براہ کرم روشنی گل کر کے اپنے بستر پر لیٹ جاؤ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔" اسٹہ نے محل سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔" اس آدمی نے بدولی سے کہا اور بستر پر بیٹھ کر جیب سے ایک چھوٹی سی برانڈی کی بوتل نکالی۔ "گویا تم کپڑوں اور جوتوں سمیت ہی سونے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"میرا خیال ہے کہ اس سے تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔"

"یہ شخص میرا شاہدہ ہے اور میں تم پر کوئی تنقید نہیں کر رہا۔ میرا حال بھی تم سے مختلف نہیں ہے۔ میں تین دن سے یہی کپڑے پہنے ہوئے ہوں۔ یقیناً تم اس کی وجہ جانتا جاؤ گے۔"

"نہیں۔" اسٹہ نے کہا۔ "مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

اس شخص نے برانڈی کی بوتل کھولی اور ایک بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ "میں اپنی ہر چیز سے محروم ہو چکا ہوں۔ بیوی، بچے، مکان اور ملازمت سب کچھ چلا گیا۔"
"میں تمہارے جذبات کو سمجھ رہا ہوں۔ اب تم خاموش ہو جاؤ اور مجھے سونے دو۔"

جواب میں اسے ایک دردناک کراہ سٹائی دی اور اس شخص نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔ "سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ میں اپنی فسطیوں باقاعدگی سے ادا کرتا اور روزانہ شام کو اسکوٹھ کھیلتا۔ میری ترقی ہونے والی تھی اور میں سال میں دو مرتبہ فیملی کے ساتھ چھٹیاں گزارنے جاتا تھا۔ میرے پاس وہ سب کچھ تھا جس کا خواب ایک متوسط طبقے کا شخص دیکھ سکتا ہے۔ ایک دن میں بیڑھیاں اتر کر نیچے آیا تو میری جگہ میز پر ایک اجنبی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنا نام گوڈون بتایا۔ میں نے پہلے بھی اسے نہیں دیکھا تھا لیکن میری بیوی ایک پرانے دوست کی طرح اس کی خاطر برادری کر رہی تھی۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے اور میرے گھر میں کیا کر رہا ہے تو وہ ناراض ہو گئی

اور کہنے لگی کہ مجھے مہمانوں کے بارے میں اس طرح پوچھ گچھ نہیں کرنی چاہیے۔ اسی روز میرے دفتر میں دو آدمی آئے اور انہوں نے مجھے ایک عدالتی حکم پکڑا دیا جس میں کہا گیا تھا کہ میں اپنے بیوی اور بچوں سے دور رہوں۔ کیا تم نے کبھی ایسی کوئی بات سنی ہے؟

”نہیں“ اسمتھ نے کہا۔ وہ بستر پر سیدھا لیٹ گیا اور آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں سنی۔“

☆☆☆

دوسرے دن صبح وہ سوکر اٹھا اور معمول کے مطابق تہانے چلا گیا گوکہ اسے ایک دن پہلے کے کپڑے دوبارہ پہننے میں الجھن ہو رہی تھی لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کے پاس بہت تھوڑے پیسے باقی رہ گئے تھے اور اس کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ وہ دفتر کس طرح جائے گا۔ ڈائمنگ روم میں جا کر اس نے اپنی پلیٹ میں کچھ سلاکس، گوشت کے ٹکڑے اور پنیر رکھا پھر چپکے سے کچھ چیزیں اپنی بلیکٹ کی جیب میں رکھ لیں۔ ابھی وہ ناشا کر رہا تھا کہ اسے ایک آواز سنائی دی۔

”کیا میں تمہارے ساتھ شامل ہو سکتا ہوں؟“

یہ اس کا روم میٹ تھا جس نے اپنی پلیٹ کو پوری طرح بھر لیا تھا۔ وہ اس کے برابر میں بیٹھ گیا اور چکن کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے بولا۔ ”ہوں مزے کا ہے۔“ پھر جینچے ہوئے بولا۔ ”میں تمہیں اپنا نام بتانا تو بھول ہی گیا۔ مجھے بین بیری کہتے ہیں۔“

”اسمٹھ!“ اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا لیکن اس کے انداز سے ظاہر ہوا تھا کہ وہ اس کے ساتھ بیٹھنے یا اس سے باتیں کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

”چند منٹ پہلے ہی مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ تم بھی ہم میں سے ہو؟“

”ہم“ اسمتھ نے چوکتے ہوئے کہا۔ ”ہم سے تمہارے کیا مراد ہے؟“

”جو اپنے گھروں سے بے دخل کر دیے گئے ہوں۔ کم از کم تمہارے لباس سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے میری یہاں ایک اور شخص سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کا نام طر تھا۔ وہ پرانی کاروں کا بزنس کرتا تھا اور اچھی بجلی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سب کچھ بیچ کر وہ جملہ اسپین چلا جائے گا اور بقیہ زندگی وہیں گزار دے گا لیکن تم سمجھ سکتے ہو کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ وہ بھی ایک روز ناشا

کرنے کے لیے اپنے کمرے سے بیچے اتر آواں نے اپنی کرسی پر ایک اجنبی شخص کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیسے ممکن ہے؟ کیا اس طرح فطری انصاف اور سماجی حقوق کی خلاف ورزی نہیں ہو رہی؟“

بین بیری آگے کی طرف جھکا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ”الیکویر!“

چارلس وارن نے بھی یہی نام لیا تھا۔ اسمتھ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی اور وہ بولا۔ ”الیکویر!“

”یہ ایک خفیہ تنظیم ہے جو بیویوں کو ان کے شوہروں سے چھٹکارا دلوانے کے لیے غیر واضح قوانین کا سہارا لیتی ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ واقعی ایسی کسی تنظیم کا وجود ہے؟“

”کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ مانیا بلکہ فیری میسن کی طرح طاقتور ہے۔“

”اور یہ سب کچھ وہ گھروں کو برباد کرنے کے لیے کرتے ہیں۔“

”انہیں اس سے غرض نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ وہ صرف غیر مطمئن بیویوں میں خوشیاں بانٹتے ہیں اور ان کی زندگی میں نئے رنگ بکھیرتے ہیں۔“

”لیکن میری بیوی تو غیر مطمئن نہیں تھی۔“ اسمتھ نے فخریہ انداز میں کہا۔ ”میں نے اسے دنیا کی ہر آسائش مہیا کر رکھی ہے۔“

”اگر ایسا ہوتا تو وہ تمہیں گھر سے نکال کر ایک اجنبی کو مہمان نہ بناتی۔“ بین بیری نے جلی سے کہا۔ ”صرف مادی آسائش ہی کافی نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ بھی عورت بہت کچھ چاہتی ہے۔“

بین بیری کا جملہ اس کے سر پر اتھوڑے کی طرح لگا۔ اس نے مزید بات چیت نہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اس سے پہلے ایک سوال کرنا ضروری سمجھا۔

”وہ اس خدمت کے عوض کیا معاوضہ طلب کرتے ہیں؟“

”شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے بیس ہزار اور اس کا تبادلہ فراہم کرنے کے لیے بیس ہزار پاؤنڈز مانگتے ہیں۔“

اسمٹھ کو یاد آ گیا کہ ہیلیری نے بھی مشترکہ اکاؤنٹ سے اتنی ہی رقم نکلائی تھی۔

ہائے ہیلو کرنے کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو اسے دیوار کے ساتھ چار سوٹ کیس ایک قطار میں رکھے ہوئے نظر آئے۔ سیکرٹری جی جی قدموں سے چلتی ہوئی اس کے کمرے میں آئی اور بولی۔ "یہ سوٹ کیس آج صبح ہی پہنچائے گئے ہیں لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کس نے بیچے ہیں اور ان میں کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے سزگھڈ اسٹون! میں جانتا ہوں کہ ان میں کیا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آدھ گھنٹے تک مجھے بالکل ڈسٹرب نہ کیا جائے؟"

"پانچ منٹ بعد مسٹروں کے ساتھ تمہاری میٹنگ ہے۔" سیکرٹری نے اسے یاد دلایا۔

"اسے گینسل کرو۔"

"لیکن یہ بہت اہم میٹنگ ہے۔"

"انہیں سہ پہر کا وقت دے دو۔"

"مسٹروں نے شاید یہ پسند نہ کریں۔"

"میں اس کے باپ کا نوکر نہیں ہوں۔ بہتر ہوگا کہ تم مجھے کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو۔"

"ٹھیک ہے۔" سیکرٹری بے دلی سے بولی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

توجیح کے مطابق ان سوٹ کیسوں میں اس کے کپڑے اور ذاتی استعمال کی اشیاء شامل تھیں۔ اس کے علاوہ گھر کی سب چیزیں اب ہیلٹری کے قبضے میں چلی گئی تھیں۔ اس نے سوٹ کیس سے کپڑے اور الیکٹرونک شیور نکالا۔ کم از کم وہ بین بیری کی طرح نہیں رہ سکتا تھا۔ کپڑے بدل کر اسے اپنے اندر ایک نئی طاقت کا احساس ہوا اور وہ بہ آواز بلند بولا۔ "میں ان سے لڑ سکتا ہوں۔ وہ مجھے شکست نہیں دے سکتے۔"

☆☆☆

اب وہ شہر کے ایک گھٹا ہوٹل میں پڑا ہوا تھا۔ اس کی ملازمت ختم ہو گئی تھی۔ جیب بالکل خالی تھی اور مستقبل مبہوش نظر آ رہا تھا۔ اس کی مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ خود کلائی کے انداز میں بول رہا تھا۔

"ایک ایک کر کے میں نے اپنا سامان اور سوٹ کیس تک بیچ دیے۔ البتہ الیکٹرونک شیور اس وقت تک اپنے پاس رکھا جب تک میرے پاس بیچنے کے لیے دوسری چیزیں تھیں۔ اس الیکٹرونک شیور کو بیچ کر مجھے اتنے پیسے ملے کہ ان سے بہ مشکل ایک سینڈویچ اور سستی شراب کی ایک بوتل خرید سکا۔ سوٹل سروس سے جو تھوڑی بہت رقم ملی وہ ہوٹل کے

وہ اپنی جگہ سے اٹھنے ہی والا تھا کہ وہ پائیس والے وہاں آئے اور ان کیلئے ایک بین بیری کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں عدالتی امکانات کی خلاف ورزی کرنے کے الزام میں گرفتار کر رہا ہوں۔ میں اپنی بیوی سے ایک میل دو روپے کے لیے کہا گیا تھا مگر تم ایسا کرنے میں ناکام رہے۔"

بین بیری کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ کانپتے ہوئے بولا۔ "لیکن میں تو اس کے قریب بھی نہیں گیا۔"

"دو منٹ پہلے ہم نے خود اپنی آنکھوں سے اس کی گاڑی کو یہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا۔"

"اس کے لیے مجھے موروثی الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔"

"ہمیں شک ہے کہ تم نے اسے فون کر کے یہاں آنے پر مجبور کیا ہوگا۔ تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ کوئی ہنگامہ کٹرانہ کرو۔"

"نہیں، میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔"

"تم اپنے لیے مشکلات پیدا کر رہے ہو۔"

"اس سے زیادہ مشکل اور کیا ہوگی۔" بین بیری اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اس نے اپنی کرسی اوپر اٹھا کر دونوں آدمیوں کو ایک جانب ہٹنے پر مجبور کیا اور دوڑتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

ان دونوں نے اسے پکڑنے کی کوشش نہیں کی۔ بس اپنی جگہ کھڑے انہوں سے سر ہلاتے رہے۔ ان میں سے ایک بولا۔ "اس شخص نے واقعی اپنے لیے بہت بڑی مشکل کھڑی کر دی ہے۔"

دوسرے نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "الحق انسان۔"

☆☆☆

اس وقت دفتر کے لیے روانہ ہو گیا۔ تمام راستے وہ اپنے بچوں کے بارے میں ہی سوچتا رہا کہ وہ کس طرف اپنی زندگی میں ہونے والی اتنی بڑی تبدیلی کا سامنا کر پائیں گے۔ اسے امید تھی کہ وہ بھی اسے یاد کر رہے ہوں گے۔ شاید وہی ہیلٹری کو سمجھانے میں کامیاب ہو جائیں اور اسے یہ احساس ہو جائے کہ بچوں کو ہمیشہ اپنے حقیقی باپ کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کی کمی کوئی راہ چلنا نہیں پوری نہیں کر سکتا۔ ٹوٹی بھی ایسا ہی ایک بندہ تھا جس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔

وہ آدھ گھنٹا تاخیر سے دفتر پہنچا۔ سزگھڈ اسٹون سے

”اب ہم آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔“ قمارپ نے کہا۔ ”کسی بھی مسئلے کا حل تلاش کرنے سے پہلے اسے جاننا ضروری ہے۔ مسٹر اسمتھ۔ یہ دھسکی بھی لی لو اور تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ۔ کل صبح ہم تمہارے اثاثوں کو غیر منجمد کروانے اور نئی ملازمت حاصل کرنے کے بارے میں سوچیں گے۔ اگر تم میرے کہنے پر عمل کرتے رہے تو بہت جلد اپنے بیروں پر کھڑے ہو جاؤ گے۔“

”کیا میں ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟“ اسمتھ نے کہا۔

”ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔“

”کیا تم اینگلیز کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟“

قمارپ پر اسرار انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ”مسٹر اسمتھ! میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس بارے میں جانتا ہوں۔“

☆☆☆

دو صبح بہت خوشگوار تھی۔ ایک طویل اور گہری نیند لینے کے بعد جری ایش ورتھ بیدار ہوا تو کمرے کی کھڑکی سے سورج کی روشنی اس کے کمرے میں اجالا بکھیر رہی تھی۔ وہ بستر سے اترتا۔ نیچے کچن سے انڈیے تلنے اور کافی کی خوشبو آ رہی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی کہ اس کی پیاری بیوی مارتھا اتنی جلدی بیدار ہو جائے۔ شاید وہ اسے بچوں کو اسکول لے جانے سے پہلے ناشادے کر حیران کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ڈریسنگ گاڈن پہنا اور میز صیباں اتر کر نیچے آ گیا۔ اس کے دونوں بچے ناشا کر رہے تھے جبکہ مارتھا گنگنائے ہوئے فرانتک چین میں کچھ گل رہی تھی۔

”صبح بخیر! جری نے اس کے قریب جا کر کہا۔

مارتھا چونک پڑی۔ ”تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔“ اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہیں ناشا چاہیے تو خود بنا لو۔ میرے پاس سائس لینے کی بھی فرصت نہیں ہے۔“

جری نے میز کے اس حصے پر نظر ڈالی جہاں اس کی مخصوص کرسی رکھی ہوئی تھی۔ وہاں ایک پلیٹ میں تلے ہوئے انڈیے، جھنی ہوئی پھلیاں اور ٹماٹر کا ساس رکھا ہوا تھا۔ وہ پوچھنے ہی والا تھا کہ یہ تیسرا ناشا کس کے لیے ہے کہ ایک اچھی شخص کاروباری سوٹ میں لمبوس اندر داخل ہوا۔

”ہیلو! وہ میز کی طرف بڑھا اور چھری کا ٹھاٹھا تھامتے ہوئے بولا۔ ”تم یقیناً جری ہو۔ میرا نام اسمتھ ہے اور میں کچھ عرصہ یہاں قیام کروں گا۔“

کرائے میں چلی گئی۔ میں نے کئی دن سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔“

”جانتا ہوں۔ پتہ ہمارے لیے بہت مشکل ہے۔“

قمارپ نے ہمدردی سے کہا۔

”میں بین بیری نا طرح فرار نہیں چاہتا۔“

”تم نے کبھی سوچا کہ تمہاری بیوی کیوں چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی؟“

”تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔“ اسمتھ نے دھسکی کا آخری گھونٹ لیا اور بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری۔ اس نے کہا۔ ”اب تم وعدے کے مطابق مجھے دوسری بوتل دو۔“

قمارپ نے دوسری بوتل بھی اسے پکڑا دی اور اس کے بستر پر برابر میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”اب تم پہلے کے مقابلے میں بہتر نظر آ رہے ہو۔ میں تمہاری کہانی کا بقیہ حصہ بھی سنتا چاہوں گا۔“

اسمتھ نے بوتل کا ڈھکنا کھولا اور ایک لمبا گھونٹ لینے کے بعد بولا۔ ”کوئی شخص میری بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا جیسے ہی میرے دفتر کے ساتھیوں کو ان حالات کا علم ہوا تو میرے بارے میں یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ میں گھریلو تشدد میں ملوث ہوں۔ والی ایم سی اے والوں نے بھی اسی بنیاد پر مجھے وہاں سے نکال دیا کہ وہ مجھ جیسے آدمی کو وہاں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ میری نوکری چلی گئی اور مجھے واجبات بھی ادا نہیں کیے گئے کیونکہ ان کے خیال میں، میں نے خود اپنی برطرفی کا سامان کیا تھا۔ یہاں تک کہ چرچ میں بھی میرے ساتھ اچھوتوں جیسا سلوک کیا گیا۔ مجھے سب سے الگ نشست پر بٹھایا گیا اور فادرولس جو مجھے بچپن سے جانتے ہیں، انہوں نے بھی مجھے اعتراف کا موقع نہیں دیا جب تک میں بیوی کو مارنے کا جرم تسلیم نہیں کر لیتا۔“

”میں نے اس بارے میں بہت سوچا کہ ہیلیری مجھ سے دور کیوں چلی گئی۔ پہلے تو مجھے اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ میں آئیپ اچھا شوہر اور باپ تھا۔ ہماری میز مختلف قسم کے کھالوں سے بھری رہتی تھی۔ میرے بچوں کے پاس جدید قسم کا پہلے اسٹیشن تھا۔ میں نے بھی زندگی میں کوئی برا کام نہیں کیا۔ میں نے اپنی بیوی کو وہ سب کچھ دیا جس کی وہ توقع کر سکتی تھی۔ سوائے اس کے کہ میں ایک سادہ لوح شخص تھا۔ وہ ادارہ اور محبت کرنے والا اور اس پر مکمل بھروسہ کرتا تھا۔“

کاش

ملکِ صندریات

لفظ ”کاش“ ہمیشہ ناقابلِ تلافی غلطیوں پر پچھتاوے کی عکاسی کرتا ہے... مگر ان پچھتاووں سے ازالے ممکن نہیں ہوتے۔ نقصان پر حیاں میں اتھانا پڑتا ہے۔ ملک صاحب کی کاوشیں ہر بار کی طرح اس مرتبہ بھی کاش پر ختم ہونے والی نہیں تھیں... تفتیشی مراحل سے گزرتے ہوئے نتیجے میں جو چہرہ سامنے آیا اسے دیکھ کر ہر رشتے سے اعتبار ختم ہونے لگا تھا... اور پھر وہ نازک تعلق اس فریب

کی زد میں آگیا جسے وہ دوسروں کو دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ عشق اندھا ہوتا ہے لیکن غرض اندھی کے ساتھ ساتھ شاید بہری بھی ہوتی ہے... جسے کچھ دکھائی دیتا ہے نہ سنائی دیتا ہے۔

کاشیات کی لپیٹ

میں آنے والے

عقلمندوں کی مندی

عقل کی روداد

ہو گیا تھا۔ میں نے حوالدار جن شاہ کو اپنے ساتھ لیا اور ایک تانگے میں بیٹھ کر جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم لوگ موضع قلعہ دیدار سنگھ کے اندر تھے۔ وہ ماہ اکتوبر کے اختتامی ایام تھے۔ موسم سرما اپنے ہاتھ پاؤں سپدھے کر رہا تھا۔ یوں سمجھیں کہ گلابی جاڑے کا سماں تھا اور رات اچھی خاصی ٹھنڈی ہو جاتی تھی۔ کچھ نہ کچھ اوڑھ کر سونے کو دل چاہتا تھا۔ قتل ہونے والے شخص کا نام لالی معصوم ہوا۔ لالی کا اصل نام قادر بخش تھا، تاہم وہ پورے علاقے میں ”لالی“ ہی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر اٹھارہ اور بیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ ایک خوب رو اور دلکش جوان تھا۔ ”قدا“ کا صیغہ میں اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ لالی کو دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس کا شمار کسی بھی قیمت پر زندہ انسانوں میں نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لالی کی لاش بھینسوں والے باڑے میں، ایک کمرے میں چار پائی پر رکھی تھی۔ اس کے سینے اور پسلیوں میں کسی تیز

کاش..... ایک ایسا لفظ ہے جو ہزاروں انگلوں اور اربانوں کا خون کرتے ہوئے ایک سرد آہ کے ساتھ زبان سے خارج ہوتا ہے مگر یہ انسان کی زندگی کا ایک ناگزیر جزو بھی ہے۔ انسانی زندگی خوشی اور غم کی ملی جلی کیفیات کا مرقع ہے اور ہر انسان کو اپنی زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں اس لفظ ”کاش“ سے ضرور واسطہ پڑتا ہے۔

اس تہیہ کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔ ان دنوں میں طبع گوجرانوالہ کے ایک تھانے میں تعینات تھا۔ ایک روز میں حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو ایک بری خبر میری منتظر تھی۔ میری رہائش تھانے کی عمارت کے پچھواڑے واقع سرکاری کوارٹر میں تھی اور میں نے بڑے واضح الفاظ میں اپنے تھانے کے عملے سے کہہ رکھا تھا کہ رات کے کسی بھی حصے میں کوئی بھی ایمر جنسی پیش آجائے تو وہ لوگ بلا ٹکلف اور بلا دریغ مجھے سوتے سے اٹھا سکتے ہیں۔ پتا نہیں، اس معاملے میں انہوں نے مجھے زحمت دینے کی ضرورت کیوں نہیں محسوس کی تھی۔ بہر حال، اطلاق یہ تھی کہ آپ قریبی گاؤں ”قلعہ دیدار سنگھ“ میں کوئی بندہ قتل



Copied From Web



لینے گئے تھے؟“
 ”میں باڑے میں نہیں گیا تھا، تھانے دار صاحب۔“
 وہ بے بسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں تو اس وقت
 گہری نیند سو رہا تھا۔“
 ”پھر..... پھر تمہیں کیسے پتا چلا؟“ میں نے سوال کیا۔
 ”قاضی صاحب سے۔“ اس نے بتایا۔

”یہ قاضی صاحب کون ہیں؟“
 ”قاضی صاحب کا نام قاضی کبیر ہے جناب۔“ اس
 نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اسی علاقے میں رہتے
 ہیں۔ بہت ہی نیک اور پرہیزگار آدمی ہیں۔ ہمارے
 علاقے کی مسجد میں اذان بھی قاضی صاحب ہی دیتے
 ہیں۔“ لکھائی توقف کر کے اس نے ایک پوجمل سانس خارج
 کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔
 ”قاضی صاحب نے مسجد کی طرف جاتے ہوئے مجھے
 سوتے سے جگا کر اس واقعے کے بارے میں بتایا تھا۔“
 خدا بخش کی بات آسانی سے مجھے ہضم نہ ہوئی تو میں
 نے پوچھ لیا۔ ”قاضی کبیر کو کیسے پتا چلا کہ باڑے میں، کمرے
 کے اندر سوتے ہوئے لالی کو کسی نے قتل کر دیا ہے.....؟“
 ”قاضی صاحب نے مجھے لالی کے قتل کے بارے
 میں نہیں بتایا تھا۔“

”پھر.....؟“ میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔
 ”انہوں نے باڑے کے اندر سے کسی چھوٹے قد
 کے بندے کو نکلنے دیکھا تھا۔“ خدا بخش وضاحت
 کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے دیکھا ہے، میرے لالی کا
 قد اونچا لمبا ہے۔ قاضی صاحب اس ٹھگنے آدمی کو باڑے سے
 نکلنے دیکھ کر حیران ہوئے اور انہوں نے اسے آواز دے کر
 روکنے کی کوشش کی مگر وہ کسی چھلاوے کی طرح تارکی میں
 غائب ہو گیا۔ باڑے سے آگے کھیتوں کا سلسلہ ہے
 جناب۔ وہ دوڑ کر ادھر ہی گیا تھا۔ قاضی صاحب نے سمجھا،
 شاید وہ کوئی چورا چکا ہے۔ وہ مجھے اس پر امرار بندے کے
 بارے ہی میں بتانے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے جگا کر کہا
 تھا کہ مجھے فوری طور پر باڑے کا جائزہ لے کر اس بات کی
 تسلی کرنا چاہیے کہ اندر مال مویشی پورے ہیں یا نہیں۔“
 ”تو تم نے قاضی کبیر کے کہنے پر باڑے کا جائزہ لیا تھا؟“
 ”جی تھانے دار صاحب!“ اس نے اثبات میں
 گردن ہلائی۔ ”قاضی جی مجھے اس ٹھگنے بندے کے بارے
 میں بتا کر مسجد کی طرف چلے گئے تھے اور میں نے گھر سے
 لائین اٹھائی اور باڑے کی سمت بڑھ گیا۔ میں نے جمیلہ اور

دھار آنے کے متعدد وار کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا
 تھا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ آٹھ گھنٹے کوئی خنجر یا خطرناک چھری
 ہوگا۔ اس الزام کے بے کسی کی موت نے لالی کی ساری رحمت کی
 اور تندرستی کی ایسی کم تھیں کر کے اس کی جوانی کو خاک میں
 ملا دیا تھا۔

مویشیوں والا وہ باڑا جس کے اکلوتے کمرے میں
 لالی کی لاش پائی گئی تھی، وہ نیچی چار دیواری والا ایک عام سا
 باڑا تھا جس کے ایک کونے میں باڑے کا واحد کمرہ بنا ہوا
 تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق مذکورہ کمرے کا سائز
 بارہ پائی چھ برہ فٹ رہا ہوگا۔ کمرے کے اندر کاشت کاری
 سے متعلق مختلف زرعی آلات بھی رکھے دکھائی دے رہے
 تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ چند بھینسیں اپنی کھریوں
 (کنڈلیوں) پر بندھی دکھائی دے رہی تھیں۔ میرے محتاط
 اندازے کے مطابق مقتول لالی کو سوتے میں قتل کیا گیا تھا۔
 آٹھ گھنٹے کی تلاش کے لیے میں نے اس کمرے کے علاوہ
 باڑے کا بھی ایک ایک حصہ دیکھ لیا لیکن مجھے اس مقصد
 میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔

ابتدائی پوچھ گچھ کے بعد پتا چلا کہ مقتول قادر بخش
 عرف لالی کا گھر اس باڑے سے جڑا ہوا تھا یعنی مذکورہ باڑا
 گھر کے پچھواڑے واقع تھا۔ جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کرنے
 کے بعد میں نے لالی کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے فسطی
 اسپتال بھجوا دیا اور خود مقتول کے باپ خدا بخش کے ہمراہ
 اس کے گھر کی طرف آ گیا۔

میرے استفسار پر خدا بخش نے بھرائی ہوئی آواز
 میں بتایا۔ ”تھانے دار صاحب! پچھلے کچھ دنوں سے ادھر
 قلعے (قلعہ دیدار سنگھ) میں ڈنگروں کی چوری کی وارداتوں
 میں اچھا خاصا اضافہ ہو گیا ہے، اسی لیے لالی رات کو باڑے
 کے اندر ہی سو جاتا تھا۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ وہ یوں بے موت
 مارا جائے گا تو میں ڈنگروں (مویشیوں) کو بچانے کے لیے
 اسے بھی باڑے میں سونے کے لیے نہ کہتا۔“

”تو وہ تمہارے کہنے پر باڑے میں سویا کرتا تھا؟“
 میں نے پوچھا۔

”جی سرکار.....!“
 ”خدا بخش! تمہیں کب پتا چلا کہ لالی کو یہ اندوہناک
 جان لیوا واقعہ پیش آچکا ہے؟“
 ”صبح فجر کے وقت جی!“

اس کے جواب پر میں چونکا۔ ”فجر کے وقت، کیا
 مطلب.....!“ میں نے پوچھا۔ ”اتنی صبح تم باڑے میں کیا

سے اسے جریدے سے روک دیا اور کہا۔ ”ابھی تم نے بتایا ہے کہ باڑے کا دروازہ اندر سے بند تھا پھر قاضی کبیر نے اس ٹھکنے بندے کو باڑے میں سے نکلے ہوئے کیسے دیکھ لیا تھا؟“

”یہ تو میں نے ان سے نہیں پوچھا تھا، تمہارے دار صاحب!“ یہ اچھن زوہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ظہیر ہے، تم نے نہیں پوچھا تو میں پوچھ لوں گا۔“ میں نے ظہیر سے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”ہاں تو تم بتا رہے تھے کہ مال مویشیوں کو پورا پا کر تم مطمئن ہو گئے اور لائین تمہارے لالی والے کمرے کی طرف گئے تھے.....؟“

”جی.....!“ وہ دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ ”کمرے میں پہنچ کر مجھ پر ایک قیامت سی ٹوٹ پڑی تھی۔ لائین کی روشنی میں، میں نے لالی کی خون خون لاش دیکھی تو میرا دماغ گھومنے لگا۔ میرے جوان جہان لالی کو کسی نے بڑی ...

بے دردی سے لٹ کر دیا تھا۔“ اس نے گلوگیر آواز میں اپنی بات مکمل کی پھر آنکھوں میں اترنے والے آنسوؤں کو پونچھنے لگا۔

میں نے لالی کی لاش کا بہ غور جائزہ لیا تھا اور مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی تھی کہ اس بد نصیب کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

اگر حالتہ بیراری میں اس پر قاطعانہ حملہ ہوا ہوتا تو وہ یقیناً اپنے بچاؤ کے لیے مزاحمت پیش کرتا اور اگر بالفرض قاتل اسے زیر کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتا تو پھر اس خونیں واردات کے نتیجے میں جائے وقوعہ پر ایک خاص نوعیت کی

افزائش دیکھائی دینا چاہیے تھی جو مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ خدا بخش نے اپنے مال مویشی کو باڑے میں پورا اور صحیح سلامت پایا تھا۔ اس بات سے یہ بھی ثابت ہوا کہ لالی کا قاتل ہرگز کوئی ڈنگر چور نہیں تھا۔

خدا بخش آنسو صاف کر چکا تو میں نے پوچھا۔ ”لالی کی کسی سے دشمنی وغیرہ بھی تھی؟“

”نہ جی.....“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”لالی اپنے کام سے کام رکھنے والا بچہ تھا جناب۔ آج تک کسی سے اس کا معمولی سا جھگڑا بھی نہیں ہوا تھا۔“

”خدا بخش!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”مجھے لالی کی اندوہناک موت کا گہرا دکھ ہے۔ میں تمہارے بیٹے کو تو واپس نہیں لاسکتا۔

البتہ یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ لالی کے قاتل کو جلد از جلد گرفتار کر کے قراقرظی مزاحم روہلوادوں کا لیکن.....!“

”بلی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔“

”یہ جیلہ اور بلی کون ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جیلہ میری بیوی اور بلی بیٹی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”بلی کا اصل نام عارفہ ہے۔ بلی، لالی سے چھوٹی ہے۔ ہماری یہی دو اولادیں تھیں لیکن اب.....“ بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی۔

میں نے لمحاتی توقف کے بعد سوال کیا۔ ”جب تم باڑے میں پہنچے تو کیا باڑے کا دروازہ کھلا ہوا تھا؟“

”نہیں جناب۔“ خدا بخش نے نفی میں گردن ہلائی۔

”دروازہ اندر سے بند تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے، آج کل ڈنگروں کی چوری بہت عام ہو گئی ہے اس لیے میں نے لالی کو سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ رات کو سونے سے پہلے وہ دروازے کو اندر سے بند کر لیا کرے۔“

”اگر باڑے کا دروازہ اندر سے بند تھا تو پھر تم اندر کیسے پہنچے؟“

”جناب! پہلے تو میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور زور زور سے لالی کو آواز دی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس صورت حال نے مجھے پریشان کر دیا۔ اسی لمحے مسجد میں فجر کی اذان ہونے لگی تو میرے ذہن میں ایک نئی بات آئی۔“

”کون سی نئی بات؟“ وہ ذرا دیر کو رکھا تو میں نے پوچھا۔

”دیوار کو دیکھا ہے کہ باڑے کی چار دیواری زیادہ اونچی نہیں۔ میں نے لائین کو تین فٹ چلتی ہوئی اونچی دیوار پر رکھا اور چھڑا پی مار کر (اچھل کر) دیوار کے اوپر چڑھ گیا۔ اگلے ہی لمحے میں باڑے کے اندر کود گیا.....“

”لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتا ہوا بولا۔

”سب سے پہلے میں نے دیوار کے اوپر سے لائین اٹھائی، پھر دروازے کی کٹھی کھول دی۔ اس کے بعد میں لائین تمہارے لالی والے کمرے کی جانب بڑھا۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ میں نے اتنی زور سے دروازہ بچایا تھا لیکن لالی اس کے باوجود بھی سویا رہا تھا۔ راستے میں ایک دیوار کے ساتھ مال مویشی بھی بندھے ہوئے تھے۔ ان کی تعداد پوری تھی جس کا مطلب یہی تھا کہ قاضی صاحب نے جس ٹھکنے بندے کو باڑے سے نکل کر کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا وہ کوئی ڈنگر چور نہیں تھا۔“

”ایک منٹ خدا بخش!“ میں نے ہاتھ کے اشارے سے

میں نے سانس بھرا کرنے کے لیے ذرا توقف کیا تو اس نے پوچھا۔ ”لیکن کیا؟“
 ”لیکن یہ کہ اس کام کے لیے مجھے تمہارے بھرپور تعاون کی ضرورت ہوگی۔“
 ”میں کیوں نہیں تعاون کروں گا جناب۔“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میرا جوان بیٹا قتل ہوا ہے۔ میں تو یہی چاہتا ہوں کہ اس کے قاتل کو عبرت ناک سزا ملے۔“
 ”تو پھر تمہیں بتانا ہوگا کہ لالی سے کس کی عداوت تھی؟“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ کام کسی دوست کا تو ہو نہیں سکتا؟“

وہ مجھے بڑی مشکل میں نظر آیا۔ لگاتی توقف کے بعد اس نے بے بسی سے کہا۔ ”تھانے دار صاحب! آپ چاہیں تو مجھ سے، بڑی سے بڑی قسم لے لیں مگر یہ حقیقت ہے کہ میں لالی کے قاتل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ میں نے اسے پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا اور دوستانہ انداز میں کہا۔ ”کیا تم لوگوں نے لالی کی شادی کر دی تھی؟“
 ”نہیں جی۔۔۔۔۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔
 ”شادی کا پروگرام اگلے سال تھا۔ ابھی صرف ہم نے اس کی منگنی کر رکھی تھی۔“

میں نے ایک خاص زاویے سے سوال کیا۔ ”کیا لالی کی منگیتر کا تعلق بھی قلعہ ویدار سنگھ ہی سے ہے؟“
 ”نہیں جناب! وہ محلہ گوندلاں والا میں رہتی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

محلہ گوندلاں والا بھی ضلع گوجرانوالہ ہی میں تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا لالی کی منگیتر کو اس واقعے کی اطلاع دے دی گئی ہے؟“

”نہیں سرکار! ابھی ان لوگوں کو نہیں بتایا گیا۔“ میں خدا بخش سے سوال و جواب کر رہی رہا تھا کہ اس کی بیوی اور مقتول کی ماں جیلہ بی بی اپنے بیٹے کی المناک موت کا ماتم کرتے ہوئے ہینک میں داخل ہوئی۔

جوان بیٹے کی موت نے جیلہ کی ذہنی کیفیت پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور جھولی پھیلا پھیلا کر لالی کے قاتل کو بددعا میں دے رہی تھی۔ میں نے اس کے زخمی دل پر تسلی اور دلا سے کا پھایا رکھا تو تھوڑی دیر کے بعد وہ قدرے نارمل ہو گئی۔ میں نے جیلہ بی بی سے بھی گھما پھرا کر مختلف سوالات کیے مگر مجھے اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی

حاصل نہ ہو سکی۔
 میں نے ابھی تک باڑے کے اندر جو بھی تفتیش کی تھی وہ چونکہ بے نتیجہ رہی تھی اس لیے میں اپنی کارکردگی سے قطعی غیر مطمئن تھا لہذا میں نے باڑے کا ایک اور راونڈ لگانے کا فیصلہ کیا اور اپنے سامنے بیٹھے خدا بخش کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”خدا بخش! تمہیں فوری طور پر دو کام کرنا ہیں۔“
 ”جی حکم کریں۔۔۔۔۔“ وہ سوالیہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔
 ”نمبر ایک۔۔۔۔۔ کسی کو بھیج کر قاضی کبیر کو باڑے میں بلا لو۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس سے پوچھ لگ کر بتا چاہتا ہوں۔“
 ”باڑے میں کیوں جناب؟“

”اس لیے کہ میں یہاں سے اٹھنے کے بعد سیدھا باڑے میں جاؤں گا۔“ میں نے بتایا۔ ”ابھی وہاں تفتیش کا کچھ کام باقی ہے اور نمبر دو۔۔۔۔۔“ لگاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
 ”فوری طور پر ایک بندے کو محلہ گوندلاں والا روانہ کر دو تاکہ لالی کی منگیتر اور اس کے گھر والوں کو خبر ہو جائے کہ یہاں کون سی قیامت ٹوٹ چکی ہے۔“

”جی، بہت اچھا۔“ وہ اشیات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔
 میں خدا بخش کے گھر سے اٹھا اور باڑے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

حوالدار جن شاہ کو میں نے لالی کی لاش کے ساتھ سرکاری اسپتال روانہ کر دیا تھا لہذا اب مجھے اکیلے ہی سب کچھ کرنا تھا۔ میں نے پوری توجہ سے باڑے کے اندرونی اور بیرونی ”ماحول“ کا جائزہ لیا اور بالآخر ایک سراغ میرے ہاتھ لگ گیا۔

وہ گرگابی ٹائپ کا چمڑے کا ایک بند جوتا تھا۔ رنگ سیاہ اور نمبر لگ بھگ چھ۔ اس نمبر کا جوتا عموماً دس سے بارہ سال کی عمر کے لڑکوں کے لیے موزوں رہتا ہے۔ میں نے ابھی جس جوتے کا ذکر کیا ہے یہ مکمل جوتے کی جوڑی نہیں تھی بلکہ محض مذکورہ جوتے کا دایاں پاؤں تھا۔ یہ اکیلا پاؤں مجھے باڑے کی اندرونی جانب جنوبی دیوار کے ساتھ پڑا ملا تھا۔ میں نے اس چمڑے کے جوتے کے پاؤں کو اٹھا لیا اور بہ غور اس کا جائزہ لینے لگا۔

اتنی دیر میں مقتول لالی کا باپ خدا بخش بھی میرے پاس آ گیا اور اطلاع دینے والے انداز میں بتانے لگا۔

پاس لے آؤ..... وہ ایسے بچے ہونا چاہئیں جن کی عمریں دس اور پندرہ سال کے درمیان ہوں۔“
”اچھا جی، میں ابھی بچوں کو بلاتا ہوں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ بات ختم کرتے ہی وہ باڑے سے باہر نکل گیا۔

میں کوئی نظر سے ایک بار پھر مذکورہ جوتے کے دائیں پاؤں کا جائزہ لینے لگا۔ وہ جوتا نہ تو نیا گور تھا اور نہ ہی اسے گھسا پٹا کہا جاسکتا تھا وہ کم از کم چھ ماہ اور زیادہ سے زیادہ ایک سال کا استعمال شدہ تھا۔ میں جوتے کے معائنے میں مصروف ہی تھا کہ خدا بخش نصف درجن سے زیادہ بچوں کو گھیر کر باڑے میں لے آیا۔ ان میں ہر عمر اور قد کاٹھ کے بچے شامل تھے۔ میں نے وہ جوتا سب کو دکھانے کے بعد پوچھا۔

”تم میں سے یہ جوتا کس کا ہے؟“
مجھے امید تھی کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی لڑکا اس جوتے کو ضرور پہچان لے گا مگر اس وقت مجھے سخت مایوسی ہوئی جب ان لڑکوں نے اس جوتے کی شناخت سے انکار کر دیا۔ وہ جوتے کا دایاں پاؤں نہ تو ان میں سے کسی کا تھا اور نہ ہی وہ اس کے بارے میں کچھ جانتے تھے۔
”اس گاؤں میں کتنے موہمی ہیں؟“ میں نے خدا بخش سے سوال کیا۔

”ہمارے چھوٹے سے گاؤں میں صرف ایک ہی موہمی ہے سرکار۔“ خدا بخش نے جواب دیا۔ ”فضل دین نام ہے اس کا۔“

یہ جس زمانے کا واقعہ ہے اس وقت قلعہ دیدار سنگھ ایک چھوٹا سا گاؤں ہی ہوا کرتا تھا۔ آج کل تو یہ اچھا خاصا پھیل کر ایک قصبے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ میں نے خدا بخش کہا آنکھوں میں دیکھتے ہوئے حکیمانہ انداز میں کہا۔
”فضل دین کو یہاں بلا لو۔“

خدا بخش نے ایک کچھدار لڑکے کو فضل دین موہمی کی طرف روانہ کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں قاضی کبیر باڑے میں پہنچ گیا۔

قاضی کبیر کی عمر چالیس اور بچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ ایک فریب، باریش شخص تھا۔ رگی علیک سلیک کے بعد میں نے اس سے کہا۔

”قاضی جی! مجھے پتا چلا ہے کہ آج صبح آپ نے کسی پتہ قاصد بندے کو باڑے سے نکل کر کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ یہ تو آپ کو پتا چل گیا ہوگا کہ خدا بخش کے بیٹے کو کسی نے بڑی بے دردی سے پھیلی رات قتل کر دیا ہے۔“

”تھانے دار صاحب! میں نے ایک بندہ قاضی صاحب کی طرف بھیج دیا ہے۔ وہ قاضی صاحب کو یہاں آنے کا کہہ کر سیدھا محلہ گوندلاں والا جائے گا اور لالی کی منگیتر خالدہ کو اس سانچے کے بارے میں بتائے گا.....“ پھر اس کی نظر میرے ہاتھوں پر پڑی تو وہ چونک اٹھا۔

”یہ آپ نے کس کا جوتا پکڑا ہوا ہے؟“
”یہی سوال میں تم سے پوچھنے والا تھا خدا بخش!“
”میں..... میں کیا بتاؤں جی۔“ وہ ابھمن زدہ نظر سے کبھی مجھے اور کبھی اس جوتے کے پاؤں کو دیکھنے لگا۔ ”مجھے تو یہ کسی دس بارہ سال کے لڑکے کا جوتا لگتا ہے۔“
”مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے خدا بخش۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”یہ جوتے کا پاؤں مجھے تمہارے باڑے کی جنوبی دیوار کے پاس پڑا ہوا ملا ہے اس لیے تمہی بتاؤں گے کہ یہ کس کا جوتا ہو سکتا ہے.....؟“
”کیا واقعی آپ کو یہ جوتا باڑے کے اندر سے ملا ہے؟“ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا۔

”تو کیا میں تم سے غلط بیانی کر رہا ہوں خدا بخش؟“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”جوتے کا یہ پاؤں تمہارے باڑے کے اندر جنوبی دیوار کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔“
”آپ غلط بیانی نہیں کر رہے ہوں گے سرکار۔“ وہ جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”دراصل میرے گھر میں اس عمر کا کوئی لڑکا نہیں ہے نا اس لیے مجھے بہت حیرانی ہو رہی ہے مگر.....!“

اس نے اچانک جملہ ادھورا چھوڑا تو میں پوچھے بنانہ رہ سکا۔ ”مگر کیا خدا بخش؟“
”وہ..... قاضی صاحب نے بتایا تھا کہ انہوں نے.....“
وہ ٹھہر ٹھہر کر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”کہ انہوں نے کسی چھوٹے قد کے آدمی کو باڑے سے نکل کر کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے، یہ جوتا اسی کا ہو.....“

”ہاں..... یہ ہو سکتا ہے۔“ میں نے تائیدی انداز میں.... گردن ہلا دی پھر پوچھا۔ ”کیا یہاں باڑے میں بچوں اور لڑکوں وغیرہ کا گھس آنا جانا گرتا ہے؟“
”نہیں جناب..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ میری بات کی توجہ میں اترتے ہوئے بولا۔ ”یہ باڑا ہے، کوئی کھیل کود کا میدان نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ ”میں خود پتا لگاتا ہوں کہ یہ جوتا کس لڑکے کا ہے۔ تم قلعہ دیدار سنگھ سے تعلق رکھنے والے تین چار بچوں کو میرے

دیوار کے پاس سے بھاگ کر کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ وہ انجمن زدہ انداز میں بولا۔ ”اگر باڑے کا دروازہ واقعی بند تھا تو پھر وہ دیوار کو درستی باہر نکلا ہوگا۔“

”اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پراسرار بندہ باڑے سے نکلا ہی نہ ہو۔“ میں نے ایک مضبوط امکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھی ممکن ہے، وہ باڑے کے پاس کسی بری نیت سے چکرارہا ہو اور آپ کو دیکھ کر وہاں سے فرار ہو گیا ہو۔ آپ نے اسے اپنی آنکھوں سے تو باڑے سے نکلنے ہوئے نہیں دیکھا نا.....“

”جی ہاں..... یہ بھی ہو سکتا ہے۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے جتنا علم تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا۔ اس کے علاوہ مجھے اور کچھ بتائیں جناب۔“ میں نے مزید دو چار سوالات کے بعد قاضی کبیر کو فارغ کر دیا پھر وہاں پر موجود افراد کو جوڑتے کا وہ پاؤں دکھایا جو مجھے باڑے کے اندرونی حصے میں، جنوبی دیوار کے ساتھ پڑا ملا تھا۔ سب نے باری باری غور سے اس کو دیکھا اور نئی میں گردن ہلاتے ہوئے اس سے اپنی ناواقفیت کا اعلان کر دیا۔

میں مزید تفتیش کے لیے باڑے سے باہر نکل آیا۔ قاضی کبیر، خدا بخش کے علاوہ دوسرے لوگ بھی میری تقلید میں باہر آگئے۔ میں نے قاضی کبیر سے پوچھا۔

”قاضی صاحب! آپ نے کس مقام سے اس بندے کو بھاگ کر کھیتوں کی جانب جاتے دیکھا تھا؟“ وہ باڑے کی ایک دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتانے لگا۔ ”جناب! جب میری اس بندے پر نظر پڑی تو وہ وہاں دکھائی دیا تھا اور مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے کھیتوں کی جانب ریس ہو گیا تھا۔“

قاضی کبیر نے اس چھلاوے کے دیکھنے کے حوالے سے جس جگہ کی نشاندہی کی تھی وہ مقام باڑے کی جنوبی دیوار کے نہایت ہی قریب تھا اور دیوار کی دوسری جانب باڑے کے اندر اسی سمت سے مجھے جوڑتے کا وہ پاؤں ملا تھا جو اس وقت ایک معما بنا ہوا تھا۔ ان حالات و واقعات کی روشنی میں کہا جاسکتا تھا کہ وہ بندہ دیوار پھلانگ کر باڑے سے باہر آیا ہوگا اور اسی دوران میں اس کے دائیں پاؤں کا جوتا باڑے کے اندر گر گیا ہوگا۔

یہ ”ہوگا، ہوگا۔“ ایک دلچسپ سوال کو جنم دیتا تھا کہ جب وہ بندہ باڑے کا دروازہ کھول کر باہر نکل سکتا تھا تو پھر کن ہنگامی حالات میں اسے دیوار پھلانگنے پر مجبور ہونا

”جی تھانے دار صاحب!“ وہ افسوسناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے بہت ہی دکھ ہے اس واقعے کا۔“

”آپ نے اب تک کتنے بچے اس بندے کو دیکھا تھا؟“ ”وقت کا تو مجھے صحیح اندازہ نہیں جناب۔“ اس نے بتایا۔ ”بس، یہ سمجھ لیں کہ میں فجر کی اذان دینے مسجد کی طرف جا رہا تھا۔“

”اس کا مطلب ہے، اس وقت ابھی اندھیرا ہی تھا؟“ ”جی بالکل۔“ اس نے اشات میں گردن ہلائی۔ ”پھر تو آپ اس بندے کی شکل نہیں دیکھ پائے ہوں گے؟“ ”اگر اندھیرا نہ بھی ہوتا تو شاید میں اس کی شکل نہ دیکھ سکتا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”کیونکہ اس نے اپنے چہرے پر ڈھانٹا لٹکا رکھا تھا۔“

”اوہ.....“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس دوران میں قلعہ دیدار سنگھ کے اور لوگ بھی باڑے میں جمع ہو چکے تھے۔ خدا بخش نے اپنے گھر سے ایک دو چار پائیاں لا کر باڑے میں بچھادی تھیں۔ ویسے بھی یہ انسانی نفسیات ہے کہ جس علاقے میں پولیس آئے، لوگ سن گن لینے کے لیے وہاں اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ یہاں پر تو ایک جوان جہن آدمی نکل ہو گیا تھا۔ لوگوں کا اس جانب متوجہ ہونا عین نظری امر تھا۔

”قاضی صاحب!“ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ نے اس ڈھانٹے والے ٹھکنے بندے کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی؟“

”وہ بیٹھے دیکھ کر اتنی تیزی سے بھاگا تھا کہ میں اگر چاہتا بھی تو اس کا پتہ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھ میں اتنی پھرتی نہیں ہے۔“ وہ اپنے ڈیل ڈول پر ایک سخت آمیز نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ ”ویسے میں نے اسے آواز دے کر روکنے کو کہا تھا مگر وہ رکا نہیں۔ گولی اس رفتار سے وہ کھیتوں کی طرف چلا گیا تھا۔“

”کہا وہ ننگے پاؤں تھا؟“ میں نے اچانک پوچھ لیا۔ ”ہاں نہیں جناب.....!“ وہ عجیب سے انداز میں مجھے ہنسنے لگا۔

”آپ نے اسے باڑے کے اندر سے نکل کر باہر آتے دیکھا تھا یا وہ باڑے کی دیوار پھلانگ کر باہر آیا تھا۔“ میں نے قاضی کبیر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”خدا بخش نے مجھے بتایا ہے کہ جب وہ آپ کی اطلاع پر باڑے کی جانب گیا تو باڑے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔“ ”جی..... بس، میں نے اس چھلاوے کو باڑے کی

پڑا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ڈھانٹا لگا کر پاڑے کے اندر کیا کر رہا تھا، اگر وہ کوئی مویشی چور تھا تو پھر خدا بخش کے مویشی پاڑے، کے اندر صبح و سلامت کیوں موجود تھے؟ کچھ بھی تھا لیکن میری نگاہ میں وہ ڈھانٹا پوش بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ اگر وہ میرے ہتھے چڑھ جاتا تو لالی کے نقل کا معما آسانی سے حل کیا جاسکتا تھا۔

میں اس پر اسرار ڈھانٹا پوش کی "تلاش" میں کھیتوں کی سمت قدم اٹھانے لگا۔ مذکورہ کھیت پاڑے کے جنوبی سمت میں تاحدنگاہ پھیلے ہوئے تھے۔ دراصل، وہ ہاڑا قلعہ ویدار سنگھ کے آخری کنارے پر واقع تھا۔ اس سے چند گز آگے سرسبز کھیتوں کا ایک لائن ہی سلسلہ تھا۔ قاضی کبیر نے ٹھکنے ڈھانٹا پوش کو اسی طرف بھاگ کر جاتے دیکھا تھا۔

چند منٹ، میں، میں کھیتوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ فطری جیس مجھے کھیتوں کے اندر لے گیا۔ کھیتوں میں چاول کی تیار فصل کھڑی تھی۔ میری عجبانی نگاہ نے جلد ہی وہ مقام تلاش کر لیا جہاں فصل کے ساتھ کچھ افراتفری نظر آرہی تھی۔ لگتا تھا، کسی بدست ہاتھی نے کھیتوں کے اس حصے کو بری طرح روند ڈالا ہو۔ یقیناً وہ ڈھانٹا پوش اسی جانب سے کھیتوں میں داخل ہوا ہوگا۔

تھوڑا آگے جانے پر مجھے جوتے کا دوسرا پاؤں بھی مل گیا۔ یہ ایک جزوی کامیابی تھی اور اس امر کا ثبوت بھی کہ خدا بخش کے پاڑے سے دیوار پھلانگ کر فرار ہونے والا بندہ اسی سمت سے کھیتوں میں داخل ہو کر کہیں آگے نکل گیا تھا۔ میں نے، اس بندے کی تلاش کو فوری اور آسان بنانے کے لیے کھوئی نور محمد کوئی الفور جانے وقوعہ پر بلا لیا۔ نور محمد ایک تجربہ کار اور قابل بھروسہ سا کھوئی تھا۔ یہ کام وہ میری بہ نسبت زیادہ اچھے انداز میں کر سکتا تھا۔ میں پہلے ہی دو تین کیسز میں نور محمد کی مدد حاصل کر چکا تھا اور اس نے مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ چونکہ نامعلوم پر اسرار ڈھانٹا پوش کے پاؤں کے دونوں جوتے مل چکے تھے لہذا مجھے امید تھی کہ کھوئی نور محمد کو اس بندے کا کھرا تلاش کرنے میں کئی دقت کا سامنا نہیں ہو سکتا تھا۔

میرا کھیتوں سے نکل کر دوبارہ پاڑے میں آ گیا۔ اگرچہ آسمان پر سورج موجود تھا مگر اکتوبر کے آخری ایام میں دھوپ اتنا تپش کھویشی تھی اور کھلے آسمان کے نیچے نقل و حرکت ہر صبح خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے پاڑے کے اندر دور باہر کھیتوں میں بھی آگے نقل کو تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی تاہم اسی سمت میں مجھے کامیابی حاصل

نہیں ہو سکی تھی۔ کسی بھی نقل کے کیس میں آگے نقل کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں فنگر پرنس وغیرہ اٹھانے کا رواج نہیں تھا اور نہ ہی عدالتیں فنگر پرنس یا پورٹس کو کوئی اہمیت دیتی تھیں تاہم آگے نقل کی بازیابی پھر بھی تفتیشی امور میں بہت ہی مفید اور معاون ثابت ہوتی تھی لیکن محسوس کہ چھری یا فنگر جس کی مدد سے قادر بخش عرف لالی کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا وہ ابھی تک میرے ہتھے نہیں چڑھ سکا تھا اور اس کے ساتھ ہی ابھی تک کیس کا ایک اور پہلو بھی کھینچا تھا۔ میں لالی کے نقل کے محرک تک رسائی حاصل نہیں کر سکا تھا۔ خدا بخش کا دعویٰ تھا کہ لالی کی کسی سے کوئی عداوت یا دشمنی وغیرہ نہیں تھی اور یہ بات ہضم ہونے والی نہیں تھی۔ مجھے اس سبب کا بھی سراغ لگانا تھا جو لالی کی زندگی کا چراغ گل کرنے کا موجب بنا تھا۔

تھوڑی دیر بعد فضل دین موہمی پاڑے میں پہنچ گیا۔ اس نے مجھے نہایت ہی ادب سے سلام کیا اور عاجزانہ انداز میں بولا۔

"مائی باپ..... مجھ سے کیا خطا ہو گئی.....!"

فضل دین کی عمر بچپن اور ساتھ کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ سانولی رنگت کا ایک دبلا پتلا انسان تھا۔ فضل دین عرف فضل چاچا کی کمر قد رے جھکی ہوئی تھی۔ میں نے بہ غور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"خطا بھی بتا دوں گا چاچا۔ پہلے تم سے کام کی بات ہوگی۔"

"کام کی بات.....!" اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "آپ مجھ سے اپنے لیے کوئی تھیل یا جوتا بنوانا چاہتے ہیں۔ یہ تو میرے لیے بڑے فخر کی بات ہوگی۔ آپ حکم کریں سرکار..... میں ابھی آپ کے پاؤں کا ناپ لے لیتا ہوں۔ ویسے تو میں کھلی نظر ہی میں جان گیا ہوں کہ آپ کو آٹھ نمبر کا جوتا بہت مناسب آئے گا پھر بھی سائز لیوا ضروری ہے....."

بات ختم کرتے ہی وہ میری جانب بڑھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔

"ایک منٹ فضل چاچا.....!"

وہ یکدم رک گیا اور ابھمن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ فضل دین عرف فضل چاچا ایک باتوئی اور جھکی آدی ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"چاچا! تم ہر وقت جوتے بنانے کے بارے ہی میں

سے اس شخص کا نام بھی بتا سکتا ہوں جس نے مجھ سے وہ جوتا بنوایا ہو۔۔۔۔۔“

”بس اتنا ہی کافی ہے۔“ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ”ابھی تمہاری یادداشت کا امتحان ہو جاتا ہے۔“ میں نے نامعلوم ٹھکنے ڈھانا پوش کے متوجع جوتے ایک تھیلے میں ڈال رکھے تھے۔ مذکورہ جوتے میں نے تھیلے میں سے نکال کر فضلو موچی کے حوالے کر دیے اور کہا۔ ”ان جوتوں کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد اپنی عالمانہ رائے دو۔۔۔۔۔“

فضلو موچی پورے دو منٹ تک ان جوتوں کو گھما پھرا کر دیکھتا رہا پھر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں سرکار۔۔۔۔۔ یہ جوتے میرے ہاتھ کے نہیں بنے ہوئے۔ میں نے ایک ایک جوڑ دیکھ کر اچھی طرح تسلی کر لی ہے۔ یہ کسی دس بارہ سال کے لڑکے کے لگتے ہیں۔۔۔۔۔ کس کے ہیں یہ جوتے؟“

بات ختم کر کے اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔ ”یہ اس شخص کے جوتے ہیں جو ممکنہ طور پر لالی کا قاتل ہو سکتا ہے۔ وہ کوئی بچہ نہیں بلکہ پورا آدمی ہے، بس قد کاٹھ اور جٹے میں، ارکھا گیا ہے۔ ایک جوتا مجھے پاڑے کے اندر سے اور دوسرا باہر کھیتوں میں سے ملا ہے اور قاضی کبیر نے آج علی الصبح ایک ٹھکنے بندے کو پاڑے کی جانب سے بھاگ کر کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق وہی ٹھکنا شخص قادر بخش عرف لالی کا قاتل ہے۔ تم سے ان جوتوں کی شناخت اسی سلسلے میں کرائی جا رہی ہے لیکن تم تو ان جوتوں کو پہچاننے سے صاف انکاری ہو۔۔۔۔۔“ میں نے لہجائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر بہ دستور فضلو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی۔

”کیا تم اپنے تجربے کی روشنی میں یہ بتا سکتے ہو کہ یہ جوتے کس موچی نے بنائے ہوں گے؟“

”جناب! پورے گوجرانوالہ ضلع میں دس ہزار موچی ہوں گے۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”اس سلسلے میں میرا تجربہ آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ میں نہیں بتا سکتا کہ یہ جوتے کس موچی کے ہاتھوں نے تیار کیے ہیں۔۔۔۔۔“

”تم نے تیار نہیں کیے اس کا یہی مطلب ہے کہ اس ٹھکنے ڈھانا پوش کا تعلق دیدار سنگھ سے نہیں ہو سکتا۔“ میں نے سوچ میں ڈوے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے اپنی تعینات دائرہ قلعہ دیدار سنگھ سے باہر دور تک وسیع کرنا ہوگا۔“

ادھر میری بات ختم ہوئی اور پتا چلا کہ کوئی بابا نور محمد وہاں پہنچ گیا ہے۔ میں نے فوراً اسے اپنے پاس بلا لیا۔ نور محمد

سوچتے رہتے ہو یا اس کے علاوہ تمہارے ذہن میں کوئی اور خیال بھی آتا ہے؟“

”جناب! میں ذات کاموچی ہوں اور پتا نہیں، کتنی بیڑھیوں سے میرا خاندان یہی کام کرتا چلا آ رہا ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ہم (چڑے) سے ہمارا پرانا ساتھ ہے اور جوتے بنانا ہمارا روزگار ہے۔ یہی ہماری ریڑھی روٹی ہے سرکار۔“

”تمہارے علاوہ قلعہ دیدار سنگھ میں اور کتنے موچی جوتے بنانے کا کام کر رہے ہیں؟“ میں نے اپنے اطمینان کی خاطر پوچھ لیا۔

”کوئی نہیں جناب۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”صرف ایک میں ہوں۔ میرے بیٹے بھی اس کام میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ قلعہ دیدار سنگھ میں رہنے والوں کے پاؤں میں آپ کو میرے ہی تیار کیے ہوئے جوتے نظر آئیں گے۔“

”تم صرف جوتے ہی تیار کرتے ہو یا ان کی پہچان بھی ہے تمہیں؟“

”میں کچھ سمجھا نہیں سرکار۔۔۔۔۔!“ وہ متاطلانہ انداز میں مجھ سے دیکھنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ کیا تم اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے جوتوں کو دیکھ کر پہچان سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں جناب۔“ وہ فخر سے بولا۔ ”مجھے اپنے ہاتھ سے بنے ہوئے جوتوں کے ایک ایک ترو پے (سلائی) کی خوب پہچان ہے اور میں انہیں ایک نظر دیکھ کر ہی پہچان سکتا ہوں۔۔۔۔۔“ لہجائی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو ایسی ہی بات ہے جناب جیسے کوئی، کسی ل سے پوچھے کہ کیا تم اپنی اولاد کو پہچان سکتی ہو۔۔۔۔۔“

اولاد اور جوتوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ کوئی ماں میں پچیس سال میں دو چار یا زیادہ سے زیادہ دس پندرہ بچے پیدا کر لے گی لیکن اسی عرصے میں کوئی موچی دس بیس ہزار جوتے بھی تیار کر سکتا ہے جنہیں یاد رکھنا یقیناً ایک ناممکن سی بات ہے لیکن میں نے فضلو چاچا سے کسی قسم کی بحث مناسب نہ جانی اور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”کیا تمہیں یہ بھی یاد رہ جاتا ہے کہ تم نے کون سا جوتا کس بندے کے لیے تیار کیا تھا؟“

”میں یہ بات دعوے سے تو نہیں کہہ سکتا سرکار لیکن اگر وہ جوتا پچھلے چھ آٹھ۔۔۔ میں تیار ہوا ہوتا تو میں بڑی آسانی

”ملک صاحب.....!“ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”میں نے دو کھرے تلاش کر لیے ہیں۔“

”دو کھرے؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”جی ہاں!“ وہ اشات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”دونوں کھرے باڑے کے اندر سے شروع ہو کر باہر آئے ہیں لیکن دونوں میں ایک خاص فرق بھی پایا جاتا ہے۔“

”کیسا فرق؟“ میں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ”ایک کھرا تو اسی ٹھکنے بندے کے پاؤں کا ہے جس کا جوتا آپ نے مجھے دیا ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ بندہ مقول والے کھرے تک گیا تھا مگر کھرے کے اندر داخل نہیں ہوا اور واپس پلٹ گیا۔ باڑے کی جنوبی دیوار تک اس کے دونوں پاؤں کا کھرا بڑا واضح ملتا ہے۔ دیوار پھلانگنے کے بعد جب یہ بندہ باہر پہنچا تو اس کے کھرے میں بھی تہدیلی آگئی۔ اب یہاں سے کھیتوں تک ایک پاؤں کا جوتے کے ساتھ اور دوسرے پاؤں کا بغیر جوتے کے کھرا ملتا ہے۔“

”اس کے دائیں پاؤں کا جوتا، دیوار پھلانگتے ہوئے باڑے کے اندر گر گیا تھا۔“ وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا تو میں نے کہا۔ ”ظاہر ہے، اس کے بعد وہ ایک جوتے کے ساتھ ہی بھاگا ہوگا۔ اس کا دوسرا جوتا مجھے کھیتوں کے اندر سے ملا ہے۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ وہ ٹھکانا بندہ کھیتوں سے نکل کر کس طرف گیا ہے؟“

”سر دست میں نے جہاں تک اس کے کھرے پر کام کیا ہے اس کے مطابق، وہ قلعہ دیدار سنگھ سے نکل کر گھنٹھ منڈی کی جانب بڑھتا محسوس ہوتا ہے لیکن کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کے لیے مجھے اس کا..... یعنی اس کے کھرے کا باقاعدہ تعاقب کرنا پڑے گا۔“

”تمہیں تعاقب کرنے سے کس نے روکا ہے؟“ میں نے اضطرابی انداز میں کہا۔ ”لیکن کھرے کے پیچھے جانے سے پہلے یہ ضرور بتا دو کہ دوسرا کھرا کیا کہتا ہے؟“

”دوسرا کھرا.....!“ اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ ”دوسرا کھرا مقول والے کھرے کے اندر سے نکلتا ہے اور باڑے کی مشرقی دیوار پھلانگ کر باہر آ جاتا ہے۔ اس بندے نے پاؤں میں جوتے پہنے ہوئے ہیں۔ وہ مشرقی سمت میں سر کرتے ہوئے ٹھلی کے اس درخت کی طرف جاتا ہے.....“ یہاں تک بتانے کے بعد کھوجی نور محمد نے ٹھلی کے ایک

تہات ہی تجربہ کار اور سمجھدار کھوجی تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے ’سورت‘ حال سے آگاہ کر دیا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر بولا۔

”ملک صاحب! اگر آپ کا حکم ہو تو بسم اللہ کریں؟“ ”بسم اللہ اگر کسی نیک کام کی ہو تو اس کے لیے حکم کی ضرورت نہیں ہوتی نور محمد۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ قائل کا کھرا نکالنے کے لیے سو بار ”بسم اللہ“ کر سکتے ہیں۔“

”تو پھر میں اپنے کام کو وہاں سے شروع کروں گا جہاں قتل کی واردات ہوئی ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”ٹھکنے ڈھانا پوش اور چھ نمبر کے جوتے کو میں بعد میں دیکھ لوں گا۔ ویسے یہ جوتے آپ میرے حوالے کر دیں۔“ میں نے اس کی فرمائش پوری کر دی۔

نور محمد کھوجی نے باڑے کے ایک کونے میں تعمیر شدہ اکلوتے کھرے سے اپنے کام کا آغاز کیا اور اس آغاز سے پہلے اس نے مجھ سے کہا تھا۔

”ملک صاحب! کام تو آپ نے شروع کر دیا ہے لیکن آپ کو یہ تو پتا ہوگا.....“

”ہاں..... اچھی طرح پتا ہے۔“ میں نے کھوجی کی بات پوری کرنے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ”اس اسٹبل کام کے لیے تمہیں کوئی انعام شام بھی چاہیے ہوگا۔“

”اللہ آپ کا بھلا کرے ملک صاحب!“ وہ معنی خیز انداز میں سسراتے ہوئے بولا۔ ”آپ بڑے سمجھدار اور ذہین پولیس افسر ہیں۔“

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں انعام وغیرہ تو ضرور دوں گا مگر اس وقت جب تم مجھے کوئی خوشخبری سناؤ گے۔ ایسی خوشخبری جو مجھے لالی کے قائل تک پہنچا دے۔“

”جی ضرور..... ضرور.....!“ اس نے بڑے توانا انداز میں سر کو اٹھائی جنبش دی اور اپنے کام میں جت گیا۔

ایک محاورہ بہت عام ہے کہ ”تجربہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔“ یا..... ”تجربہ بولتا ہے۔“ میں اس محاورے کی روح سے اتفاق کرتا ہوں کیونکہ میں نے اسے بار بار درست پایا ہے۔ نور محمد کے کام کا تجربہ بھی مجھے نظر آ رہا تھا۔ اس نے بڑی مہارت اور تکنیک کے ساتھ ”جوتے“ کا استعمال کرتے ہوئے آدھے ٹھکنے کے اندر باڑے والے کھرے سے کھیتوں تک کا سفر طے کیا تھا اور اپنی اس ماہرانہ کارکردگی کے نتیجے میں اس نے ایک لتوی صادر کر دیا تھا۔

تیار ہو کر تھانے پہنچا تو وہ پہلے سے وہاں میرے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا اور فوری طور پر میرا دھیان ایک خاص زاویے کی طرف چلا گیا۔ گزشتہ رات ہلکی پھلکی بارش ہوئی تھی۔ اسے موسلا دھار بارش تو نہیں کہا جاسکتا تاہم اس کا شمار پونڈ پاندی میں بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ ایک باقاعدہ بارش تھی جس نے زمین کے سینے کو تریبہ تر کر دیا تھا اور ظاہر ہے، زمین کے اس طرح نم ہونے سے کھرا وغیرہ بھی غائب ہو گیا ہوگا۔ مجھے تشویش ہوئی کہ شاید نور محمد اسی پریشانی کے باعث صبح ہی صبح تھانے پہنچ گیا ہے۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

رکی علیک سلیک کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ”نور محمد! پچھلی رات ہونے والی بارش نے تمہاری سخت کا تو ستیا اس مارو دیا ہوگا؟“

”نہ جی..... بالکل نہیں۔“ وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ ”بارش تو جی آدمی رات کے بعد کسی وقت ہوئی ہے۔“

”ہاں..... اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔“ میں نے نور محمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں رفع حاجت کے لیے اٹھا تھا تو وقت بھی دیکھ لیا تھا۔“

”ملک صاحب! آپ نے مجھے ان دونوں بندوں کے کمرے کی تلاش کے لیے جوہیں گھنٹے کا وقت دیا تھا۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ”لیکن میں نے کل کا سورج غروب ہونے سے پہلے ہی اپنا کام مکمل کر لیا تھا لہذا رات کو ہونے والی بارش سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”یہ تو تم بہت بڑی خوشخبری سنا رہے ہو نور محمد.....!“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”بتاؤ، تمہاری تحقیق سے کیا نتائج برآء ہوئے ہیں؟“

”بہت ہی سنسنی خیز انکشافات ہوئے ہیں سرکار.....“ وہ سنسنی خیز انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”سنسنی ہی پھیلاتے جاؤ گے یا کچھ بتاؤ گے بھی؟“ میں نے قدرے سخت مگر اطمینان سے لہجے میں کہا۔

”میں ملک صاحب!“ وہ بے حد کھیر انداز میں بولا۔ ”جیسا کہ میں نے آپ سے کل ہی عرض کر دیا تھا کہ چھوٹے پاؤں والے ٹھکنے بندے کا کھرا گھنٹہ منڈی کی جانب جانے کا اشارہ کر رہا ہے۔ میں اس کمرے کے تعاقب میں گھنٹہ منڈی تک گیا ہوں اور وہ کمرہ بھی دیکھ لیا ہے جہاں تک اس کمرے نے میری راہنمائی کی ہے۔“

”شاہاش نور محمد!“ میں نے بے ساختہ سراہنے والے انداز میں کہا۔ ”یہ تو تمہاری بہت بڑی کامیابی ہے۔ اب ذرا

درخت کی جانب اشارہ کیا۔ مذکورہ درخت کھیتوں کے پہلو میں ایسا وہ تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”اور ٹھلی کے درخت سے آگے کی کیا صورت حال ہے؟“

”ٹھلی کے درخت کے نیچے وہ کھرا غائب ہو جاتا ہے۔“ وہ انکشاف آمیز انداز میں بولا۔

”کیا مطلب، نور محمد؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”مطلب یہ جناب کہ.....“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس کے بعد اس بندے کے پاؤں کا کھرا نہیں ملتا البتہ.....“ اس نے لمبائی توقف کر کے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر مٹی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”البتہ، ٹھلی والے درخت کے نیچے سے کسی گھوڑے کا بڑا واضح کھرا مجھے ملا ہے۔ لگتا ہے، وہ بندہ گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں نکل گیا ہے۔“

”کہاں نکل گیا ہے نور محمد؟“ میں نے پوچھا۔

”میں بتانے کی کوشش کرتا ہوں ملک صاحب!“ وہ پراعتاد انداز میں بولا۔ ”آپ مجھے شام تک کا وقت دے دیں۔ میں اپنا ماہر اندہ تحقیق سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دوں گا۔“

”ٹھیک ہے نور محمد! میں تمہیں کل دوپہر تک کا وقت دیتا ہوں۔“ میں نے پرجوش انداز میں کہا۔ ”جوہیں گھنٹے میں تم اپنے تجربے کے سارے گھوڑے دوڑا ڈالو لیکن کل دوپہر تک مجھے ان دونوں بندوں کے بارے میں مکمل معلومات چاہئیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو.....“

”چنگی طراں، سمجھ رہا ہوں ملک صاحب۔“ وہ سستی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ میں آپ کو بائیس نہیں کروں گا۔“

”ٹھیک ہے، تم اپنا کام شروع کرو۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

اس کے بعد میں تھوڑی دیر تک مزید قلعہ دیدار سنگھ میں رکا پھر واپس تھانے کی جانب روانہ ہو گیا۔ میں جیسے ہی تھانے پہنچا، حوالدار جن شاہ بھی لالی کی لاش کو سرکاری اسپتال پہنچا کر لوٹ آیا تھا پھر ہمارے درمیان قادر بخش عرف لالی کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔

☆☆☆

میں نے کھوئی بابا نور محمد کو جوہیں گھنٹے کا وقت دیا تھا تاکہ وہ کسی حتمی نتیجہ پر پہنچ جائے لیکن اگلے روز جب میں

”مجھے اجازت دیں ملک صاحب۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”جب آپ قائل کو پکڑ لیں تو پھر میں آپ کے پاس آ جاؤں گا۔“

”نہیں نور محمد.....“ میں نے نشی میں کروں ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں یوں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”جی.....“ وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”کیا مطلب ملک صاحب؟“

”مطلب صاف ظاہر ہے نور محمد!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تم نے جن دو بندوں کا کھرا نکالا ہے اور جن کے ٹھکانے کا سراغ لگایا ہے وہاں تک مجھے کون پہنچائے گا؟ میں نے تو وہ گھر نہیں دیکھے ہوئے.....“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”آج کا سارا دن تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے۔ دعا کرو، شام سے پہلے لالی کا قائل میری گرفت میں آ جائے اور تمہیں بھی آج ہی انعام مل جائے۔“

”ٹھیک ہے جناب! جیسی آپ کی مرضی۔“ وہ ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”بتائیں، پہلے کس طرف جانا ہے.....؟“

”پہلے ادھر جائیں گے جو جگہ تھانے سے زیادہ نزدیک ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”یعنی قلعہ دیدار سنگھ.....!“

اس نے اثبات میں کروں ہلا دی۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے ایک کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور کھوجی بابا نور محمد کی معیت میں قلعہ دیدار سنگھ پہنچ گیا۔ میں نے مقتول قادر بخش عرف لالی کے باپ خدا بخش کے گھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ اس سے بعد میں بھی ملاقات ہو سکتی تھی۔

نور محمد مجھے قلعہ دیدار سنگھ کے جس گھر کے دروازے تک لے گیا وہ کسی اور جٹ کا گھر تھا۔ نور محمد نے بڑے قیمتی انداز میں مجھے بتایا تھا کہ جس گھوڑے کے کمرے کا اس نے تعاقب کیا تھا وہ باڑے سے جی ٹی روڈ تک اور پھر جی ٹی روڈ سے اس گھر تک آیا تھا۔

”ملک صاحب! میں نے آپ کو پہلی منزل تک پہنچا دیا ہے۔“ وہ نظریہ نیچے میں بولا۔ ”اب آگے آپ کا کام شروع ہوتا ہے۔“

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور کانسٹیبل علی حسن کی طرف دیکھا۔ کانسٹیبل نور امیری آنکھ کا اشارہ سمجھ گیا اور آگے بڑھ کر اس نے اور جٹ کے دروازے پر دستک دی۔

دوسری دستک کے جواب میں ایک خوب صورت

دوسرے آدمی کے کمرے کا احوال بھی سناؤ الو.....؟“

”اس کے کمرے کا احوال دلچسپ ہونے کے ساتھ ہی الجھن آمیز بھی ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”میں گھوڑے کے سموں کے تعاقب میں جی ٹی روڈ تک پہنچا اور پھر کچھ آگے جا کر میں نے یہ کھرا کھودیا۔ باوجود کوشش کے میں اس بندے کے پاؤں کے نشانات کو ڈھونڈ نہ سکا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور نہ ہی کوشش ترک کی، بالآخر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ میں نے دوبارہ اسی گھوڑے کے سموں کا کھرا پایا مگر اس مرتبہ ایک عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی کہ وہ کھرا قلعہ دیدار سنگھ کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے اس کمرے کا تعاقب کیا اور قلعہ دیدار سنگھ کے ایک گھر تک پہنچ گیا۔ مجھے تو یہی لگتا ہے ملک صاحب..... کہ اس بندے کا تعلق دیدار سنگھ ہی سے ہے۔ وہ باڑے سے نکلا اور ایک لمبا چکر لگانے کے بعد واپس قلعہ دیدار سنگھ آ گیا۔“

میں نے نور محمد کی بات پوری توجہ سے سنی اور اس کے خاموش ہونے پر سوال کیا۔ ”جی ٹی روڈ پر جہاں تم نے جاتے ہوئے گھوڑے کا کھرا کھویا اور پھر کچھ قاصلے پر اسی گھوڑے کا قلعہ دیدار سنگھ کی طرف آتا ہوا کھرا پکڑا..... وہاں تمہیں اور بھی کوئی خاص کھرا ملا تھا؟“

”جناب! سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے کسی اور کمرے پر توجہ ہی نہیں دی تھی۔“ وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”میرے لیے دلچسپی کا پہلو یہی تھا کہ میرے مطلوبہ گھوڑے کے سموں کے نشانات کس طرف جا رہے ہیں۔ اس کمرے کو کھودنا عمل مندی نہ ہوتی۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو نور محمد۔“ میں نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”اتنا بھی کافی ہے کہ تم نے پچھلی رات باڑے کی یا تڑا پر آنے والے دو بندوں کے ٹھکانے کا سراغ لگایا ہے۔“

”آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے نا ملک صاحب؟“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

”کون سا وعدہ؟“ میں نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

”جناب! اتنی جلدی بھول گئے۔“ وہ شاکی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”میں انعام کی بات کر رہا ہوں ملک صاحب.....؟“

”نور محمد! فکر نہ کرو۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ”تمہارا انعام کہیں بھگا نہیں جا رہا۔ پہلے قائل کو میرے ہاتھ لگ جانے دو۔ پھر تمہارا انعام پکا ہے۔“

اس بندے کی عمر ساٹھ کے آس پاس نظر آتی تھی۔ وہ جس طرح آنکھوں کو میچ کر ہماری طرف دیکھ رہا تھا، اس سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا کہ اس کی دور کی نگاہ میں اچھا خاصا ضعف آچکا تھا۔

”تم سیانے بیانے ہو چاچا.....“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”پولیس خواجہ خواہ تو کسی کے دروازے پر نہیں آتی.....؟“

”ہتر..... وہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں۔“ وہ باری باری ہم سب کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آخر معاملہ کیا ہے؟“

”معاملہ جو بھی ہے وہ یوں لگی میں کھڑے کھڑے نہیں بتایا جاسکتا۔“ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”کیا تمہارے گھر میں بیٹھے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے؟“

میں نے دیکھا کہ ہماری آمد پر لگی میں نصف درجن لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ان سب کے چہروں پر گہری تشویش پائی جاتی تھی۔ ان سب کے ذہنوں میں یقیناً ایک ہی سوال ہو گا کہ پولیس انور جٹ کے دروازے پر کیا کرنے آئی ہے۔

میرے استفسار کے جواب میں زاہدہ کے چاچا نے جلدی سے کہا۔ ”کیوں نہیں جناب، آپ اندر بیٹھک میں بیٹھ کر آرام سے بات کریں۔ ویسے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ انور جٹ گھر میں موجود نہیں۔“

ٹھیک ایک منٹ کے بعد ہم اندر بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ زاہدہ اور اس کے چاچا بھی ہمارے سامنے موجود تھے۔ اس شخص کا نام مشتاق جٹ معلوم ہوا۔ وہ انور جٹ کا باپ تھا۔ انور کی ماں کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ یہ صرف تین افراد کا کنبہ تھا۔ انور جٹ اور زاہدہ کی شادی چند ماہ پہلے ہی ہوئی تھی۔ مشتاق جٹ کی بیٹائی قدرے کمزور تھی۔ وہ لوگ کاشت کاری کرتے تھے۔ ان کے پاس دس ایکڑ زرعی اراضی تھی جو ان کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی تھی۔ زاہدہ کی عمر بیس اور پچیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ ایک دلکش اور پرکشش لڑکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے تیزی اور طراری نکلتی تھی۔ میں نے بوڑھے مشتاق جٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”چاچا! تمہاری بیوی نے بتایا ہے کہ انور جٹ کل صبح ایمن آباد گیا تھا اور اس کی واپسی شام تک ہوگی۔ کیا وہ پچھلی سے پچھلی رات گھر پر موجود تھا؟“

میں نے مشتاق جٹ سے اس رات کے بارے میں پوچھا تھا جس رات لالی کو باڑے میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس نے پر وثوق انداز میں جواب دیا۔

عورت نے دروازہ کھولا۔ میں اور کانسٹیبل علی حسن سرکاری یونیفارم میں تھے۔ ہم پر نظر پڑتے ہی وہ عورت چونکی اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”ہائے رہا..... پولیس.....!“

اس کے ساتھ ہی اس نے جلدی سے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس سے بھی زیادہ تیزی دکھائی اور دروازے کے بیچ پاؤں پھنسا کر اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔ اسی لمحے اندر سے ایک مردانہ آکٹائی ہوئی آواز ابھری۔

”زاہدہ..... باہر کون ہے؟“

زاہدہ یقیناً اسی نورت کا نام تھا جس نے دروازہ کھولا تھا اور اپنے سامنے وہ پولیس والوں کو چاقو چوہند کھڑے دیکھ کر بدگئی تھی۔ اس کے ردعمل نے مجھے حُک میں ڈال دیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے ورنہ زاہدہ ہمیں دیکھ کر یوں خوف زدہ نہ ہو جاتی۔

”چاچا..... دروازے پر پولیس آئی ہے۔“ زاہدہ نے استفسار کرنے والے شخص کو جواب دیا۔

میں نے سخت لہجے میں اس سے پوچھا۔ ”بی بی! کیا یہ انور جٹ کا گھر ہے؟“

زاہدہ بدکنے کے بعد دروازے کی اوٹ میں ہو گئی تھی۔ اس کی شکل مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے دروازے کے پیچھے ہی سے جواب دیا۔

”جی..... انور جٹ میرے خاوند کا نام ہے۔“

”پولیس ہمارے گھر کیا لینے آئی ہے.....؟“ اندر سے اسی شخص نے پوچھا۔ زاہدہ نے جسے ”چاچا“ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ ”ٹھہرو میں آ رہا ہوں۔“

”انور جٹ کو باہر بھیجو۔“ میں نے زاہدہ سے کہا۔ ”میں ایک کیس کے سلسلے میں اس سے پوچھ کچھ کرنے آیا ہوں۔“

”انور تو گھر میں نہیں ہے جی۔“

”گھر میں نہیں تو پھر کہاں ہے؟“ میں نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ”وہ کل صبح کابین آباد گیا ہوا ہے جی۔“

”واپس کب آئے گا وہ.....؟“

”کہہ گیا ہے، آج شام تک واپس آ جائے گا۔“

زاہدہ نے جواب دیا۔

اتنی دیر میں زاہدہ کا ”چاچا“ بھی دروازے پر پہنچ گیا۔ ”کیا بات ہے سرکار، صبح ہی صبح پولیس ہمارے دروازے پر۔ سب خیریت تو ہے نا.....؟“

نیچے پہنچا تھا پھر وہاں سے گھوڑے پر بیٹھ کر جی ٹی کی طرف گیا اور وہاں سے گھوم کر اس گھر تک آیا تھا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بتایا۔ "اب تو تمہاری سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ میں تمہارے بیٹے سے کیوں پوچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ کا اندازہ ٹھیک نہیں ہے تھانے دار صاحب۔" مشتاق جٹ نے کہا۔ "میرا بیٹا کسی کے قتل میں ملوث نہیں ہو سکتا۔"

"چاچا بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔" زاہدہ نے جلدی سے کہا۔ "انور ایسا نہیں کر سکتا۔ آپ کو یقین نہیں آرہا تو گھر کی تلاشی لے لیں....."

"تلاشی کس بات کی۔" مشتاق نے گھور کر اپنی بہو کو دیکھا۔ "انور کوئی گھر میں تھوڑی چمپا بیٹھا ہے۔ وہ ایمین آباد گیا ہوا ہے اور شام کو واپس آئے گا۔"

"نہیں چاچا، میں انور کی بات نہیں کر رہی۔" زاہدہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ تو مجھے بھی بتا ہے کہ انور ایسا سنگین جرم کر ہی نہیں سکتا۔"

"پھر تم نے گھر کی تلاشی کی بات کیوں کی؟" مشتاق نے پوچھا۔

"تھانے دار جی کو شک ہے کہ قاتل گھوڑے پر سوار ہو کر ہمارے گھر تک آیا ہے۔" زاہدہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "اگر یہ ہمارے گھر کی تلاشی لے لیں گے تو انہیں یقین آ جائے گا ہم نے کسی قاتل کو اپنے گھر میں پناہ نہیں دے رکھی۔"

"چاچا! تمہیں گھر کی تلاشی لینے پر کوئی اعتراض ہے؟" میں نے مشتاق جٹ کی طرف دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔

"نہیں سرکار..... مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ نرم لہجے میں بولا۔ "میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ میرا بیٹا قاتل کی کسی واردات میں ملوث نہیں ہو سکتا۔"

"اس بات کا فیصلہ میں خود کروں گا کہ انور جٹ کسی واردات میں ملوث ہے یا نہیں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "وہ جب ایمین آباد سے واپس آئے گا تو میں اس کی خبر لے لوں گا۔ پہلے اس گھر کی تلاشی ضروری ہے۔"

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر زاہدہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ مشتاق جٹ نے اس سے پوچھا۔ "کیا ہوا زاہدہ.....؟"

"تھانے دار جی ہمارے گھر کی تلاشی لیں گے تو ان کے ساتھ رہنا ہو گا نا۔" وہ جلدی سے بولی۔ "چاچا! تمہاری

"جی ہاں، وہ تو ہر رات گھر میں سو جاتا ہے، بس پچھلی رات اس نے ایمین آباد میں گزار دی ہے اور آج شام تک وہ واپس آ جائے گا۔"

"ایمین آباد وہ کس کام سے گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک بندے سے کچھ رقم لینا تھی جناب۔" مشتاق جٹ نے بتایا۔

"کتنی رقم..... اور کس بندے سے.....؟"

"اس بندے کا نام سودی شاہ ہے جی۔" اس نے بتایا۔ "کافی عرصے سے سودی شاہ کی طرف ایک ہزار روپے پھنسے ہوئے ہیں۔ انور اسی سلسلے میں ایمین آباد گیا ہے۔ سودی شاہ کا اصل نام مسعود ہے جی۔"

"کیا انور جٹ بس کے ذریعے ایمین آباد گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جناب۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر گیا ہے۔"

گھوڑے کے ذکر پر میں نے چونک کر انور جٹ کی جانب دیکھا، وہ بھی معنی خیز انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ اس صورت حال نے مشتاق جٹ اور زاہدہ کو بے چمن کر دیا۔ زاہدہ نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔

"تھانے دار صاحب! آخر بات کیا ہے۔ آپ کس قسم کی تفتیش کرتے پھر رہے ہیں؟"

"جی سرکار! کچھ بتا تو چلے، آپ کو کس سلسلے میں انور کی تلاش ہے؟" مشتاق جٹ کی تشویش بھری آواز ابھری۔

"سلسلہ بہت سنگین ہے چاچا.....!" میں نے سناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سبھی بتا ہے نا کہ پچھلی سے پچھلی رات کسی نے خدا بخش کے بیٹے لالی کو باڑے میں قتل کر دیا تھا؟"

"جی۔ بہت ہی افسوسناک واقعہ ہے۔" وہ دکی لہجے میں بولا۔ "لالی بے چارے کے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے لیکن....." اس نے ابھن زدہ انداز میں مجھے دیکھا اور پوچھا۔ "لالی کے قتل سے میرے بیٹے کا کیا تعلق..... آپ انور سے کس قسم کی پوچھ کرنا چاہتے ہیں؟"

"تعلق، لگتا ہے تو میں تمہارے دروازے پر آیا ہوں نا چاچا۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں نے ایک ماہر کھوجی سے قاتل کا کھرا نکلوایا ہے اور اس گھر سے ہی مجھے تمہارے گھر تک پہنچایا ہے۔"

"کیا مطلب جی؟" مشتاق جٹ پریشان ہو گیا۔

"قاتل باڑے میں سے نکل کر لالی کے درخت کے

تو طبیعت خراب ہے۔ میں دیکھتی ہوں اس معاملے کو۔ آپ آرام کرو۔“

ایک بات کو میں نے خاص طور پر محسوس کیا کہ ان بہو سر میں ذہنی ہم آہنگی نہیں پائی جاتی تھی۔ دونوں کو یہ تو یقین تھا کہ انور جٹ، لالی کے قتل میں ملوث نہیں ہو سکتا لیکن میری تفتیش کے سلسلے میں دونوں کا رویہ جدا تھا۔ زاہدہ میرے ساتھ کھل تعاون کر رہی تھی جبکہ مشتاق جٹ اس سلسلے میں خاصا گریزاں دکھائی دیتا تھا۔ میں اس فرق کو ذہن میں رکھتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور زاہدہ کی راہنمائی میں گھر کی تلاشی لینے لگا۔

وہ ایک درمیانے سا سائز کا عام سا گھر تھا۔ میں نے مذکورہ مکان کا کونا کونا چمان مارا۔ ایک کمرے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کمرے میں جاتے ہوئے بالآخر کامیابی نے میرے قدم چوم لیے۔ اس دوران میں زاہدہ کسی ساہنے کی طرح میرے ساتھ رہی تھی۔ لکڑی کی ایک بڑی الماری کے پیچھے سے میں ایک گھٹری ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ زاہدہ اس گھٹری کو دیکھ کر بری طرح چونک اٹھی۔ اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”یہ کیا ہے تمہارے دار صاحب.....؟“

”یہ تمہارے گھر سے برآمد ہوئی ہے زاہدہ۔“ میں نے چپچپے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم ہی بتاؤ گی، یہ کیا ہے.....؟“

”میں..... تو اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“ وہ خوف زدہ انداز میں بگوا بگوا کر مجھے اور کبھی اس گھٹری کو سکنے لگی۔

”مجھے نہیں پتا، یہ کس نے یہاں چھپا کر رکھی ہے۔“

اس دوران میں جاچا مشتاق بھی ہمارے قریب پہنچ گیا تھا۔ میں نے مذکورہ گھٹری کی گرہ کھولتے ہوئے زاہدہ سے کہا۔

”فکر نہ کرو..... ابھی سب پتا چل جاتا ہے۔ یہ گھٹری کس کی ہے۔“

میں نے ان دونوں سرسبز بہو کی موجودگی میں، ان کی آنکھوں کے سامنے وہ گھٹری کھول ڈالی۔ اگلے ہی لمحے مجھ سمیت وہاں موجود تمام لوگ حیران رہ گئے۔ گھٹری کے اندر سے ایک خون آلود لباس برآمد ہوا۔ میں نے اس لپٹے ہوئے مردانہ لباس کو بھی کھول کر دیکھا۔ لباس کے اندر ایک خون آلود خنجر کو چھپا کر رکھا گیا تھا۔ کپڑوں اور خنجر کی دھار پر لگا ہوا خون خشک ہو کر گہری رنگت اختیار کر چکا تھا۔ میں نے یہ تمام چیزیں زاہدہ کے سامنے پھیلاتے ہوئے طنز یہ لہجے میں پوچھا۔

”ان کو پہچانتی ہو.....؟“

”جی..... یہ لباس تو انور ہی کا ہے.....“ وہ بے یقینی سے خون آلود کپڑوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”مگر..... میری کچھ..... میں نہیں آ رہا..... یہ سب کیا ہے.....“

مشتاق جٹ پر بھی صورت حال واضح ہو چکی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔ ”یا مولانا..... یہ سب کیا ہو رہا ہے.....؟“

”جب انور جٹ میرے ہتھے چڑھے گا تو آپ لوگوں کو سب پتا چل جائے گا کہ کیا ہو چکا ہے، کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے.....“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے زہرے لہجے میں کہا۔ ”انور کا خون آلود لباس اور اس کے اندر لپٹا ہوا خنجر جو کہانی بنا رہا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ لالی کو انور جٹ ہی نے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ میں ابھی اس کی گرفتاری کے لیے ایمن آباد جا رہا ہوں۔ مجھے بتاؤ، وہ سوڈی شاہ ایمن آباد میں کس جگہ رہتا ہے۔ میں شام تک یہاں بیٹھ کر انور کی واپسی کا انتظار نہیں کر سکتا۔“

مشتاق جٹ نے مجھے سوڈی شاہ کے گھر کا ایڈریس بتا دیا۔ ایمن آباد، گوجرانوالہ شہر سے جنوب میں، پانچ چھ میل کے فاصلے پر واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ سوڈی شاہ کو وہاں تلاش کرنا دشوار نہیں تھا۔ میں مشتاق جٹ کے گھر سے نکلنے لگا تو وہ منت ریز لہجے میں بولا۔

”تمہارے دار صاحب! میرا بیٹا قاتل نہیں ہو سکتا۔ لالی سے اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ وہ لالی کے خون میں ہاتھ نہیں رنگ سکتا۔“

”کمال کرتے ہو تم بھی چاچا!“ میں نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ ”آؤ لال اور تمہارے بیٹے کا خون آلود لباس اسی گھر کے اندر سے برآمد ہوا ہے اور تم کہہ رہے ہو، لالی کے قتل میں انور جٹ کا کوئی ہاتھ نہیں۔ میں اس خون آلود لباس اور خنجر کو ابھی لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے بھیج رہا ہوں۔ بلکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ اس گھر میں صرف تین افراد رہتے ہیں۔ انہی میں سے کسی نے اس گھٹری کو لکڑی کی الماری کے پیچھے چھپا ہوا ہونا..... بتاؤ چاچا! اگر انور کا لالی کے قتل میں کوئی ہاتھ نہیں تو پھر تم دونوں میں سے کس نے یہ کام کیا ہے۔ بتاؤ، تم دونوں میں سے کس نے لالی کو قتل کیا ہے.....؟“

”کسی نے نہیں سرکار.....“ وہ بے بسی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس وقت میرا دماغ کام نہیں کر رہا لیکن مجھے اس بات کا یقین ہے کہ ہم تینوں میں سے کسی نے لالی کو قتل نہیں کیا.....“

آیا۔ تب ہم تھانے پہنچے تو ضرب کی اذان ہو رہی تھی۔
ابتدائی پوچھ بچھ تو میں نے ادھر ایمن آباد ہی میں
کر لی تھی لیکن انور جٹ نے اس سلسلے میں اپنی قطعی لاشی کا
اظہار کیا تھا۔ اسے تو یہ تک معلوم نہیں تھا (یہ قول اس کے)
قلعہ ویدار سنگھ میں لالی کو کسی نے قتل کروایا تھا۔ وہ اس روز علی
الصباح گھر سے نکل آیا تھا لیکن میں اس کی کسی بات پر یقین
کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس کے گھر کے اندر سے مجھے اس
کے بزم کا جو ٹھوس ثبوت ملا تھا، میں اسے کس طور نظر انداز
کر سکتا تھا۔ حالات اور واقعات اور بڑی حد تک میری
تفتیش اس امر کی جانب اشارہ کرتی تھی کہ دو روز قبل وقوعہ
کی رات انور جٹ نے خطرناک سبب کے پے در پے وار
کر کے قادر بخش عرف لالی کو موت کے گھاٹ اتارا، پھر وہ
گھوڑے پر بیٹھ کر جی ٹی روڈ کی طرف گیا تاکہ تفتیش کو غلط
رہنے پر ڈال سکے۔ تھوڑا گھوم پھر کر وہ واپس اپنے گھر آیا تھا
اور پھر علی الصباح ایمن آباد کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ یہ کام
اس نے اتنی صفائی سے انجام دیا کہ گھر میں موجود زاہدہ اور
مشاق جٹ کو کالوں کا خبر نہ ہوگی، یہ محامل کرنا باقی تھا
اور ابھی تک اس امر کا سراغ بھی نہیں لگایا جاسکا تھا کہ انور
جٹ نے کس عداوت میں لالی کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔
تھانے پہنچ کر میں اسے ٹرائل روم میں لے گیا اور
خون آلود لباس مع خون آلود ٹیجر اس کے سامنے رکھ دیا پھر
تخت لہجے میں پوچھا۔ ”اس سامان کو پہچانتے ہو؟“

میں ان چیزوں کا ذکر اس سے ایمن آباد میں بھی کر
چکا تھا اور اس نے ہر بات سے صاف انکار کیا تھا۔ وہ کسی بھی
قیمت پر اپنا جرم قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے گھری
سے برآمد ہونے والی چیزوں کو حیرت بھری نظر سے یہ غور
دیکھا اور فنی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”تھانے دار صاحب..... یہ لباس تو میرا ہی ہے
مگر..... اس پر خون کیسے لگا..... اور یہ خون آلود ٹیجر..... میں
اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”یہ گھری مجھے تمہارے گھر کے اندر سے لکڑی کی
الماری کے پیچھے پڑی ملی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر
زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں تو یہ بھی پتا نہیں ہوگا کہ یہ خون
آلود سامان تمہارے گھر کے اندر کیسے پہنچا؟“

میرے طہر میں ڈوبے ہوئے استفسار کے جواب
میں وہ بڑی ڈھٹائی سے بولا۔ ”تھانے دار صاحب! آپ
مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں مگر حقیقت یہی ہے کہ
میں ان اشیاء کے بارے میں واقعی کچھ نہیں جانتا۔“

”پھر یہ گھری الماری کے پیچھے کیسے پہنچی.....؟“
اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ
گسٹ خوردہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میری تو
کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ سوہنار ب ہی جانتا ہے، اس راز کی
حقیقت کیا ہے.....“

”سوہنار ب تو ہر چیز سے واقف ہے چاہا“ میں
نے گھیر انداز میں کہا۔ ”لیکن میں تمہیں یقین دلانا ہوں کہ
رات تک تمہیں بھی پتا چل جائے گا، اس راز کی حقیقت کیا
ہے..... بس، انور جٹ کو میرے ہتھے چڑھنے دو، پھر سب
کچھ سامنے آ جائے گا۔“

مشاق جٹ کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا
لہذا وہ رحم طلب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ زاہدہ بھی مجھے گہری
تشویش میں گھری نظر آئی۔ میں ان کے گھر سے باہر نکل آیا۔
ہم انور جٹ کی گلی سے باہر نکلے تو کھوجی بابا نے مجھ
سے کہا۔ ”ملک صاحب! اب آپ کا کس طرف جانے کا
ارادہ ہے؟“

”ظاہر ہے، میں پہلی فرصت میں ایمن آباد روانہ ہونا
چاہتا ہوں۔“ میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ”اتنے بڑے
ثبوت کے مل جانے کے بعد انور جٹ کو ایک لمحے کے لیے
بھی نظر انداز کر دینا سنگین غلطی ہوگی۔“

”اور گھری منڈی والے کام کا کیا ہوگا.....؟“ اس
نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”وہ کام بھی ضرور ہوگا.....“ میں نے ٹھوس لہجے میں
کہا۔ ”میں ایمن آباد جاؤں گا اور تم خوالدار جن شاہ کے ساتھ
گھری منڈی کا رخ کرو گے۔ تم نے جس گھر تک ٹھکنے ڈھانا
پوش کا گھرا نکالا ہے، تم لوگ اس گھر کے کینوں سے پوچھ بچھ
کرنے کے بعد اس ٹھکنے بندے کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ
تھانے لے آنا۔ باقی کی پوچھتا چھ اور تفتیش میں خود کروں گا۔“

”ٹھیک ہے ملک صاحب.....!“ وہ اثبات میں
گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ بے فکر ہو کر ایمن آباد
جائیں۔ یہاں کے معاملات کو ہم سنبھال لیں گے۔“
اور میں واقعی بے فکر ہو گیا۔

☆☆☆

ایمن آباد والے مشن میں مجھے کسی دشواری کا سامنا
نہیں کرنا پڑا تھا۔ میں اپنے ساتھ ایک کانسٹیبل کو بھی لے گیا
تھا۔ سووی شاہ کا گھر بہت آسانی سے مل گیا تھا اور میرا
مطلوبہ بندہ، انور جٹ سووی شاہ کے گھر میں موجود تھا۔ قصہ
مختصر، میں انور جٹ کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ تھانے لے

یولا۔ ”اب جو آپ کا حکم.....؟“
 ”حکم ایک نہیں دو ہیں جنم شاہ۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ایک شکار تم گکھڑ منڈی سے پکڑ کر لائے ہو اور دوسرے کو میں اس وقت تمہاری سلطنت یعنی حوالا میں بند ہے۔ تم اس کی ہسٹری سے واقف ہو۔ میں نے اس کے گھر سے جرائم کے جو ٹھوس ثبوت برآمد کیے ہیں وہ میں تمہیں دکھانے کا ہوں مگر وہ بندہ اپنے جرم کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اب یہ دونوں بندے تمہارے حوالے ہیں۔ ان کی زبان کس طرح کھلوانی ہے؟ یہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہوگا۔ بس، میری ایک ہی فرمائش ہے۔“
 ”جی حکم ملک صاحب؟“ جنم شاہ نے فرماں برداری سے کہا۔

”میں بہت تھک گیا ہوں اور آرام کرنے اپنے کوارٹر میں جا رہا ہوں۔“ میں نے معمول انداز میں کہا اور یہ ایک حقیقت بھی تھی کہ آج دن بھر کی بھاگ دوڑ نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ”میں کل صبح جب اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھوں تو.....“ میں نے جنم شاہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی۔ ”تو..... یہ دونوں بندے مجھے صبح وصال ملنا چاہئیں اس طرح کہ ان کی زبانیں سچ بولنے کے لیے بے قرار ہوں۔“
 ”ٹھیک ہے ملک صاحب!“ جنم شاہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے یولا۔ ”آپ مطمئن ہو کر کوارٹر میں جائیں۔ آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔“

حوالدار ولد ارکواپنے ساتھ لے کر میرے کمرے سے نکلا تو کھوجی نور محمد بڑے رازدارانہ انداز میں یولا۔ ”ملک صاحب! میرے خیال میں اب میرا کام تو مکمل ہو چکا۔ اگر آپ ابھی مجھے فارغ کر دیں تو بہت مہربانی ہوگی۔“
 ”نور محمد.....!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خامے تیز لہجے میں پوچھا۔ ”تمہیں یہ خبر کس نے دی کہ آج رات میرا تبادلہ کسی اور ضلع کے تھانے میں ہونے والا ہے؟“

وہ حیرت سے منہ کھول کر مجھے نکلنے لگا۔ ”میں نے ایسا کب کہا جناب۔“
 ”تمہاری باتوں سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے جیسی تمہیں اپنے انعام کی ایسی جلدی لگی ہوئی ہے۔“ میں نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ”میں کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا اور جہاں تک تمہارے کام کا تعلق ہے تو میری نظر میں وہ ابھی پورا نہیں ہوا.....“
 وہ ابھمن بھری سوالیہ نظر سے مجھے نکلنے لگا۔

”تو اس کا مطلب ہے، کھی سیدھی انگلی سے نہیں نکلے گا۔“ میں نے دانت پیتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں قسموں کے پکڑ میں تو نہیں ڈالوں گا مگر آج کی رات یہاں تھانے میں تمہاری خصوصی دعوت ضرور کی جائے گی۔ صبح تک تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔“

وہ خوف زدہ انداز میں مجھے نکلنے لگا۔ میں نے اسے حوالا میں بند کیا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ مجھے دراصل حوالدار جنم شاہ کا اظہار تھا۔ وہ کھوجی نور محمد کے ساتھ نکلنے ڈھانٹا پوش کے ساتھ گکھڑ منڈی گیا ہوا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ ہنسنے کمرے میں بیٹھے ہوئے یہ مشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ حوالدار گکھڑ منڈی سے لوٹ آیا۔ نور محمد کھوجی بھی اس کے ہمراہ تھا اور وہ اپنے ساتھ ایک نیم عجم اور دراز قامت بندے کو بھی پکڑ لائے تھے۔ اس جناتی جنے کے مالک شخص کا نام ولد ار پتا چلا۔ وہ اپنے وزن اور جسم کے پھیلاؤ سے اتنا پریشان اور نالاں نظر آتا تھا کہ چلتے ہوئے یہ دشواری اور ناگواریت اس کے چہرے سے چھلکتی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے چل رہا تھا۔

”یہ کیا ہے جنم شاہ.....!“ میں نے سوالیہ نظر سے باری باری حوالدار جنم شاہ اور کھوجی نور محمد کی طرف دیکھا۔ ”تم لوگ تو نکلنے ڈھانٹا پوش کی تلاش میں گکھڑ منڈی گئے تھے اور پکڑ لائے ہو ایک ہانگی کو..... یہ کیسا مذاق ہے؟“
 ”جناب..... وہ نکلنا اس کے اندر سے نکلے گا۔“
 کھوجی نور محمد نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”کیا مطلب نور محمد.....“ میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ گوشت کے اس پہاڑ نے اس نکلنے ڈھانٹا پوش کو نکل لیا ہے.....؟“

”بات دراصل یہ ہے ملک صاحب کہ.....“ جنم شاہ وضاحت کرتے ہوئے یولا۔ ”یہ ولد ار ادھر گکھڑ منڈی میں دودھ دہی کی دکان چلاتا ہے۔ دکان سے گھر اور گھر سے دکان، بس یہی اس کی کل مصروفیت ہے۔ پھر اچھاٹ اس گھر میں رہتا ہے، جہاں تک نور محمد نے نکلنے بندے کا کمرے کا چھچھا کیا تھا مگر یہ ولد ار اس ضد پر اڑا ہوا ہے کہ یہ کسی نکلنے بندے کو نہیں جانتا۔ میں نے ادھر ادھر چند لوگوں سے بھی پوچھ گچھ کی ہے۔ دودن پہلے لوگوں نے اس نکلنے کو ولد ار کے گھر میں آتے جاتے دیکھا ہے۔ میں نے گکھڑ منڈی میں اس کا تھانہ بنا کر مناسب نہ سمجھا اور تفتیش کے لیے اسے اپنے ساتھ تھانے لے آیا ہوں۔“ وہ لہجے بھر کے لیے سانس درست کرنے کی خاطر تھما پھر بات ختم کرتے ہوئے

تبدیل ہو گیا اور وہ دلدار کو بتائے بغیر اگلی صبح چپ چاپ کہیں چلا گیا۔

”یونٹا کا کیا پروگرام تھا اور وہ چپ چاپ چپاٹے کہاں غائب ہو گیا، اس کا میں پتا لگا لوں گا۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ بتاؤ، مونے دلدار نے اس ٹھکنے کے ٹھکانے کے بارے میں بھی کچھ اگلا ہے یا نہیں.....؟“

”جی..... سب پتا چل گیا ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”یونٹا ’راہ والی‘ کا رہنے والا ہے۔ میں نے اس کے گھر کا ایڈریس نوٹ کر لیا ہے۔“

”ویری گڈ!“ میں نے سراہنے والی نظر سے حوالدار کی طرف دیکھا۔ ”راہ والی تو یہاں سے بہت قریب ہے۔ اگر یونٹا کی گرفتاری کے لیے کسی کو ادھر بھیجا جائے تو وہ دو ٹھکنے میں اچس آ جائے گا۔“

”جی ملک صاحب! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ کس کو راہ والی بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“

”اس کا فیصلہ میں تھوڑی دیر بعد کروں گا۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”پہلے تم مجھے دوسرے شکار کی رپورٹ دو..... انور جٹ نے زبان کھولی یا نہیں؟“

”ملک صاحب! وہ ایک ہی بیان پر ڈٹا ہوا ہے کہ اس نے لالی کو قتل نہیں کیا۔“ جن شاہ نے جواب دیا۔ ”اسے یہ بھی نہیں پتا کہ خون آنسو کپڑوں اور خون آنسو پتھر والی پوتلی اس کے گھر میں کیسے پہنچی تھی۔“

”تم نے اس پر سختی بھی کی ہے؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”جی کی ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”وہ ہر تکلیف سے گزرتا رہا لیکن ایک بار بھی اس نے لالی کے قتل کا اقرار نہیں کیا۔“

”ہوں.....“ میں نے گھبرائے انداز میں کہا۔ ”تمہیں کیا لگتا ہے جن شاہ؟“

”ملک صاحب! میرا تجربہ تو یہ بتاتا ہے کہ.....“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”یا تو وہ بے گناہ ہے یا پھر بہت ہی اونچے درجے کا کلاکار ہے۔“

”اس کی ساری کلاکاری تو میں ناک کے راستے نکال دوں گا۔“ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ذرا وہ ٹھکنا میرے ہتھے لگ جائے..... مجھے امید ہے، یونٹا کسی اہم راز کا انکشاف کر سکتا ہے۔ وہ جو دو تین دن کے لیے دلدار کے پاس رہنے آیا تھا اور پھر قوتور کے اگلے روز ہی وہ اچانک

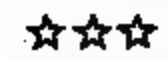
میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”ٹھکنے ڈھانٹا پوش کا ابھی مکمل سراغ نہیں لگ سکا لیکن مجھے جن شاہ کی صلاحیت پر پورا بھروسہ ہے۔ آج کی رات وہ دلدار پر جس قسم کے تجربے کرے گا اس کے نتیجے میں دلدار شیر فروش کو ٹھکنے کے حوالے سے اپنی زبان کھولنا ہی بڑے گی اور.....“ میں نے لمبائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید کہا۔

”ابھی تک انور جٹ نے بھی اپنے جرم کا اقرار نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے، اس کے گھوڑے کے سونے پر تحقیق کرنے کے لیے مجھے دوبارہ تمہاری کھوجیاناہ صلاحیتوں سے استفادہ کرنا پڑے اس لیے، ایک آدھ دن کے لیے تم چھری کے نیچے دم لو۔ میں جب یہاں موجود ہوں تو تمہارا انعام نہیں بھاگا نہیں جا رہا۔“

میری بات س کی سمجھ میں آگئی اور وہ مجھے سلام کر کے رخصت ہونے لگا تو میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ”نور محمد! جب تک لالی کے قتل کی کشتی کسی کنارے نہیں لگ جاتی، تمہیں تھانے میں حاضر رہنا چاہیے۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

”جو حکم آپ کا ملک صاحب!“ وہ فرماں برداری سے بولا۔

تھوڑی دیر بعد میں تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر میں آیا گیا۔



اگلی صبح بہت ہی سنسنی خیز اور تھلکہ ڈال دینے والی تھی۔ میں گزشتہ رات گوشت کے پہاڑ دلدار اور انور جٹ کو حوالدار جن شاہ کے حوالے کر آیا تھا اور حوالدار نے مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ اگرچہ اسے اپنے مشن میں جزوی کامیابی ہوئی تھی تاہم یہ اس کیس کی اہم پیش رفت تھی۔

میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ جن شاہ میرے پاس آ گیا اور یہ اطلاع دی۔ ”ملک صاحب! ٹھکنے ڈھانٹا پوش کا سراغ مل گیا ہے۔“

”تفصیل کیا ہے؟“ میں ہمتن گوش ہو گیا۔

”اس بندے کا نام یونٹا ہے۔“ جن شاہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”یونٹا چھوٹے موٹے جرائم میں ملوث رہتا ہے۔ دلدار کے ساتھ اس کی پرانی جان پہچان ہے۔ دلدار نے تسلیم کر لیا ہے کہ جس رات لالی کو قتل کیا گیا اس سے ایک دن پہلے یونٹا اس کے پاس گھسٹ سنڈی آیا تھا پھر اگلے روز اچانک وہ غائب ہو گیا۔ دلدار کے مطابق وہ اس کے پاس دو تین دن رہنے کے لیے آیا تھا پھر اس کا پروگرام



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر پو پو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

تک دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا ابھی اس کیس کی ایک کڑی گم شدہ ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے میں اس کڑی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد ہی اس کیس کے بارے میں کوئی حتمی بات کر سکوں گا۔“

”آپ ایک تجربہ کار تھانے دار ہیں سرکار۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اپنے کام کو آپ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ میری بس آپ سے ایک ہی درخواست ہے جناب۔“

”کیسی درخواست؟“ میں نے سوالیہ نظر سے خدا بخش کی طرف دیکھا۔ وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ ”تھانے دار صاحب! میرا جوان جہان بیٹا اس دنیا سے چلا گیا ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ لالی کا قاتل جلد از جلد کیفر کردار کو پہنچے لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ کسی بے گناہ کے ساتھ زیادتی ہو۔“

”تمہارا اشارہ انور جٹ کی طرف ہے؟“

”جی..... آپ سمجھدار ہیں۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”خدا بخش! تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ”میں تمہاری دلی کیفیت کو بہ خوبی سمجھ رہا ہوں۔ تم صرف اپنے بیٹے کی تدفین کی طرف دھیان دو۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں انصاف کے تقاضے پورے کرنا چاہتا ہوں۔“

اس نے میرا شکر یہ ادا کیا اور رخصت ہو گیا۔ اسی سہ پہر حوالدار جن شاہ راہ والی سے لوٹ آیا۔ اس کی واپسی کامیاب رہی تھی۔ وہ بوٹا نامی ٹھگنے قید کے اس شخص کو اپنے ساتھ لے آیا تھا جس کی ہمیں تلاش تھی۔ بوٹا کے دست شیر فروش ولد ار کو ابھی تک میں نے رہا نہیں کیا تھا۔ بوٹا کمزور اعصاب کا مالک ثابت ہوا۔ جب اس نے ڈھائی، تین من کے دلدار کو حوالات کے ٹھنڈے ٹھار فرش پر پڑے دیکھا تو اس کی ہمت جواب دے گئی۔ لہذا اس کی زبان کھلوانے کے لیے مجھے زیادہ ”محنت“ نہیں کرنا پڑی۔ بوٹا نے جو بیان دیا اس میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے میں خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

دلدار شیر فروش نے چھترول کے بعد کسی قسم کی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ واقعی اس راز سے واقف نہیں تھا کہ بوٹا دو تین دن کے لیے اس کے پاس رہنے کیوں آیا تھا اور... اگر آیا بھی تھا تو ایک ہی رات کے بعد اگلی صبح وہ چپ۔ چپ کہاں غائب ہو گیا۔ دلدار کی زبانی مجھے یہ پتا چل

غائب ہو گیا تو اس کے پیچھے ضرور کوئی کہانی چھپی ہوئی ہے۔“

”تو پھر میرے لیے کیا حکم ہے ملک صاحب؟“ جنم شاہ نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں اس کے سطر نظر کو ابھی طرح سمجھ رہا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”تم کا شیل علی حسن کو اپنے ساتھ لے کر فوراً راہ والی روانہ ہو جاؤ۔ میں دو تین گھنٹے کے بعد یعنی دوپہر سے پہلے اس ٹھگنے بوٹا کو یہاں اپنی نظر کے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے ملک صاحب۔“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ”انشا اللہ میں آپ کو یابوس نہیں کروں گا۔“

حوالدار کے جاتے ہی مقتول لالی کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش اسپتال سے آگئی۔ میں نے مقتول کے باپ خدا بخش کو بلانے کے لیے اپنے تھانے کے ایک اہلکار کو قلعہ دیدار سنگھ روانہ کر دیا۔ مذکورہ بندہ دس منٹ سے بھی پہلے خدا بخش کے ساتھ واپس آ گیا تو مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ میرے انتظار پر مذکورہ اہلکار نے مجھے بتایا کہ خدا بخش تھانے کے قریب ہی اسے مل گیا تھا۔

میں نے ضروری کاغذی کارروائی کے بعد لالی کی لاش خدا بخش کے حوالے کی تو وہ ابھمن زدہ انداز میں بولا۔

”تھانے دار صاحب! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”کون سی بات خدا بخش؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے مشتاق جٹ کے لڑکے انور جٹ کو لالی کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے تھانے میں بند کر رکھا ہے۔“

”تمہیں بالکل ٹھیک پتا چلا ہے خدا بخش۔“ میں نے کہا پھر اسے گھڑی کی تفصیل بھی سنا دی۔

”جناب..... لیکن..... یہ کیسے ہو سکتا ہے.....“

خدا بخش کی آنکھوں میں ابھمن تیرنے لگی۔

”کیا کیسے ہو سکتا ہے؟“ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

”مطلب یہ کہ انور اور لالی میں تو اچھا میل جول تھا۔ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ان کے درمیان کبھی معمولی سا جھگڑا بھی نہیں ہوا پھر انور اتنا خطرناک قدم کیسے اٹھا سکتا ہے۔ بس، یہی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

”جو حقائق اب تک سامنے آئے ہیں ان کی روشنی میں تو انور جٹ بوٹا لالی کا قاتل نظر آتا ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”حالانکہ ابھی تک اس نے اپنی زبان سے اس جرم کا اقرار نہیں کیا لیکن شام

خاصہ اسیر دکھائی دینے لگا تھا۔ ایک نوری خیال کے تحت میں نے اس سے پوچھا۔

”یونہی کیا منگی نے بھی تمہیں ہاڑے میں دیکھ لیا تھا؟“

”نہیں جناب۔“ وہ منگی میں گرون ہلاتے ہوئے بولا۔

”میں اس کی نگاہ سے بچنے کے لیے فوراً کمرے کی مغربی دیوار کی اوٹ میں تاریکی میں چھپ گیا تھا۔ منگی نے ہاڑے کی مشرقی دیوار پھلانگی اور میری نظر سے اوچھل ہو گیا۔“

ایک لمحے کے لیے مجھے شک ہوا کہ یونہی مجھے چکر دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ اپنی گردن بجانے کے لیے کسی منگی ڈاکو کا کردار تخلیق کر سکتا تھا۔ میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

”وٹھکو یونہی..... اگر بعد میں کسی مرحلے پر یہ ثابت

ہوا کہ تم نے مجھ سے غلط بیانی کی ہے تو میں تمہیں زمین کے اندر ہی دھنسا دوں گا۔ ابھی تو پھر بھی تم زمین کے اوپر چلتے پھرتے نظر آ جاتے ہو۔ مجھ سے جھوٹ بولنے کا بڑا بھیا تک انجام ہوگا۔“

”میری توبہ تھانے دار صاحب۔“ وہ اپنے دونوں کانوں

کو پٹکیوں میں پکڑتے ہوئے بولا۔ ”میری اگلی پچھلی سات

نسلوں کی توبہ جو میں نے ایک ہی بات آپ کو غلط بتائی ہو۔“

”ہوں..... میں نے تمہیں انداز میں کہا۔“ منگی

کے چلے جانے کے بعد تم نے کیا کیا؟“

”منگی کو اس طرح وہاں سے رخصت ہوتے دیکھ کر

میرے دل میں تجسس پیدا ہوا کہ وہ کمرے کے اندر کیا

کر کے آیا ہے۔“ یونہی گہری سنجیدگی سے بتانے لگا۔ ”میں

چند منٹ تک تاریکی میں چپ چاپ کھڑا ہا ہار دے پاؤں

کمرے کی جانب بڑھا پھر میں نے جیسے ہی کمرے کے اندر

تھانکا تو میرا دماغ گھوم کر رہ گیا.....“

”کیوں..... تم نے کمرے میں ایسا کیا دیکھ لیا تھا؟“

میں نے اضطرابی لہجے میں استفسار کیا۔

”تھانے دار صاحب! منگی نے ایک بندے کو قتل کر

دیا تھا۔“ وہ انکشاف انگیز انداز میں بولا۔ ”اندر کمرے میں

ایک چار پائی پر ایک بندے کی لاش پڑی ہوئی تھی۔“

”بہت خوب..... میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

”ہاڑے میں گھپ اندھیرا تھا اور تم نے کمرے کے اندر جھانک

کر دیکھ لیا کہ وہاں چار پائی پر کسی کی لاش پڑی ہوئی ہے؟“

”جناب! میں نے بیٹری مار کر دیکھا تھا کمرے کے

اندر۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ پھر اپنی صفائی پیش

کرتے ہوئے یوں اضافہ کیا۔ ”میں جب کسی مہم پر نکلتا

ہوں تو ایک بیٹری (ٹارچ) اپنی جیب میں رکھتا ہوں۔ یہ

چکا تھا کہ یونہی چھوٹے موٹے جرائم کا ارتکاب کرتا رہتا تھا۔

یونہی نے بتایا کہ ان دنوں وہ میویشیوں کی چوری پر کمر بستہ تھا۔

وہ دلدار کے پاس گھومڑ منڈی اسی لیے رہنے آیا تھا کہ تلخ

دیدار سگھ اور اس کے گرد و نواح کے باڑوں پر ہاتھ صاف

کر سکے۔ اب یہ اس کی بد بھیجی کہ اس نے اپنے ”کام“ کا

آغاز خدائیش کے ہاڑے سے کیا اور پہلا قدم ہی ایسا لٹا

پڑا کہ اسے فی الفور وہاں سے غائب ہونا پڑا۔

”آخر تم پر ایسا کون سی قیامت ٹوٹ پڑی تھی کہ اگلی

صبح تم اپنے میزبان دیتائے بغیر ہی غائب ہو گئے؟“ میں

نے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

”جناب! میں نے اس وقت ہاڑے کا رخ کیا جب

دلدار ٹرانے دار نیند کے مزے لے رہا تھا۔“ وہ ندامت

آمیز لہجے میں بولا۔ ”رات کے اس پہر قلعہ دیدار سگھ کے

دسٹیک اپنے اپنے گھروں میں گہری نیند سو رہے تھے۔

پروگرام کے مطابق میں ہاڑے کی دیوار پھلانگ کر اندر

داخل ہو گیا اور ہاڑے کے اندر نصف درجن سے زیادہ

جانوروں کو دیکھ کر مجھے بے پناہ خوشی کا احساس ہوا۔ میں نے

اعتیاد کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے، جانوروں کو

ہاڑے سے باہر لانے سے پہلے..... ہاڑے کے

کمرے میں جھانکنا ضروری سمجھا تا کہ یہ اطمینان کر سکوں کہ

ہاڑے کا مالک سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے لیکن.....“

وہ بولتے بولتے تھما تو میں نے سوال کیا۔ ”لیکن کیا؟“

”تھانے دار صاحب! ابھی میں کمرے میں چند قدم

دور ہی تھا کہ میں نے اندر سے ایک لمبے تڑنگے آدمی کو باہر

نکلنے دیکھا۔“ وہ سنسنی آمیز انداز میں بتانے لگا۔ ”اس

بندے کے ہاتھ میں ایک پونٹی بھی تھی اور..... اور میں نے

اس بندے کو پچان لیا۔“

”اوہ.....“ ہے سائنس میرے منہ سے نکلا۔ ”کون تھا وہ؟“

”جناب! یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت ہاڑے میں گھپ

اندھیرا تھا لیکن میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔“ وہ

سرسرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”وہ منگی کے سوا اور کوئی ہو ہی

نہیں سکتا تھا۔“

”منگی..... میں نے زیر لب دہرایا پھر اپنے

سامنے کھڑے، ٹھنکنے یونہی سے لبو منگی کے بارے میں استفسار

کیا۔ ”یہ منگی ون ہے۔ ذرا اس کا حدود اور بوجھ بھی تو بتاؤ؟“

”جناب! منگی ایک خطرناک ڈاکو ہے۔“ وہ جھرجھری

لیتے ہوئے بولا۔ ”چند سال پہلے وہ جیل چلا گیا تھا۔“

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ منگی کے ذکر پر یونہی

رات جب ملنگی کو مقتول کے کمرے سے نکلے دیکھا تو مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ وہ وہاں کیا کر رہا تھا۔
”ٹھیک ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم قادر بخش عرف لالی کے قتل کے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟“

”کچھ نہیں جناب..... مجھے جتنا پتا تھا، وہ آپ کو بتا دیا ہے۔“ وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ”لالی کے قتل سے میرا دور کا لمبی واسطہ نہیں سرکار..... آپ مجھے جانے کی اجازت دے دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔“

”یونہی..... تمہیں جانے کی بہت جلدی ہے اور مجھے لالی کے قاتل تک پہنچنے کی۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اور جب تک میرا مقصد پورا نہیں ہو جاتا، تم میرے مہمان رہو گے بلکہ دلدار کے مہمان رہو گے۔ بس، وہ اس وقت جہاں قیام پذیر ہے تمہیں بھی وہیں پروت گزارنا ہوگا۔“

اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ اپنے دوست دلدار شیر فروش کو حوالات کے نیچے فرش پر کسمپرسی کی حالت میں دیکھ چکا تھا۔ اس نے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے التجا کی۔

”قہانے دار صاحب! آپ یقین کریں، میں... بے قصور ہوں۔“

”میں نے یقین کر لیا کہ تم اس کیس میں بے قصور ہو۔“ میں نے بڑی رسوا سے کہا۔ ”لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی حاجی نمازی اور پرہیزگار ہو۔ اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ تم مولیٰ چور ہو بس، یہی سوچ کر حوالات کی ہوا کھا لو کہ میں نے تمہیں مولیٰ چراتے رہنے ہاتھوں گرفتار کر لیا ہے۔“

وہ امید بھری نظر سے مجھے ہنسنے لگا لیکن میں نے کسی رعایت سے کام نہیں لیا اور ایک کانسٹیبل کو بلا کر یونٹ کو اس کے چگری یا ردلدار کے پاس پہنچا دیا۔

یونٹ کے بیان کے مطابق لالی کو ملنگی نے موت کے گھاٹ اتارا تھا تاہم اس نے قتل کی یہ واردات اپنی آنکھوں سے ہوتے نہیں دیکھی تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ملنگی کی لالی سے کیا دشمنی تھی.....؟

مجھے اس قہانے میں تعینات ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لہذا میں ملنگی کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ میں نے فوری طور پر ایک کانسٹیبل کو بھیج کر مقتول کے باپ خد بخش کو قہانے بلانے کا فیصلہ کیا لیکن اگلے ہی لمحے میں

بہت کام کی چیز ہے، اور اندھیری راتوں میں بہت مدد کرتی ہے.....“ لچائی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”میں نے جب ملنگی کو کمرے کے اندر سے نکلے دیکھا تو اسی لمحے جیسے یقین ہو گیا تھا کہ یہاں کوئی بہت بڑی گزبڑ ہو چکی ہے، اسی لیے میں نے بیٹری مار کر اندر کا جائزہ لیا اور جب میں نے ایک بندے کو خون میں لت پت چار پائی پر پڑے دیکھا تو مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ ملنگی نے اس بندے کو قتل کیا ہوگا۔ بس، میں فوراً وہاں سے واپس آ گیا۔ میں قتل کی کسی واردات میں خود کو ملوث نہیں کر سکتا تھا۔ میں چھوٹا موٹا چور ہوں قہانے دار صاحب۔ قتل و قتل کے معاملات سے میں کوسوں دور رہتا ہوں پھر مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر ملنگی واپس آ گیا تو کہیں مجھے بھی موت کے گھاٹ نہ اتار دے.....“

”تو تم نے کمرے کے اندر قدم نہیں رکھا تھا؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”جی نہیں۔“ وہ لٹی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”وہاں کی جو صورت حال تھی اس نے تو میری سمت ہی مار دی تھی قہانے دار صاحب۔ میں سیدھا دلدار کے کمرے آیا۔ دلدار بے خبری کی نیند سو رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی تھی۔ میں نے دلدار کو جانا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی کے ساتھ اس کے کمرے سے نکل گیا۔ بس جناب..... باڑے کی دیوار پھلانگتے ہوئے میرے ایک پاؤں کا جوتا اندر ہی گر گیا تھا اور شاید اسی جوتے نے آپ لوگوں کو مجھ تک پہنچایا ہے۔ میں نے دوسرے پاؤں کا جوتا کھیتوں میں پھینک دیا تھا۔“

یونٹ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ کھوجی نور محمد کی ریسرچ بھی یہی بتاتی تھی کہ چھوٹے پاؤں والا ٹھکانا بندہ مقتول کے کمرے تک گیا تھا مگر کمرے کے اندر داخل نہیں ہوا تھا پھر وہ باڑے کی جنوبی دیوار پھلانگ کر کھیتوں کی سمت بھاگا تھا جبکہ دوسرے آدمی کا کھرا مقتول کے کمرے کے اندر سے نکلنا تھا پھر باڑے کی مشرقی دیوار پھلانگ کر باہر چلا جاتا تھا اور اب، یونٹ نے بھی ملنگی کے حوالے سے جو کچھ بتایا تھا وہ کھوجی نور محمد کی تحقیق کی تصدیق کرتا تھا۔

”یونٹ.....!“ میں نے ہنسنے ڈگر چور کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ ”تم ملنگی ڈاکو کو کب سے جانتے ہو؟“

”ملنگی پہلے راہ والی میں رہتا تھا جناب۔“ یونٹ نے جواب دیا۔ ”پھر وہ کسی ڈکیتی کی واردات میں گرفتار ہو کر جیل چلا گیا۔ اس کے بعد کا مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں نے اس

نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ لالی کو جس بہانہ انداز میں موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے وہ کسی ایسے شخص ہی کا کام ہو سکتا ہے جو اپنے دل میں لالی کے لیے بے پناہ نفرت رکھتا ہو۔“ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”اور میں اس بندے تک پہنچ گیا ہوں۔“

”کون ہے وہ بد بخت؟“ اس نے دہمی لہجے میں استفسار کیا۔

”ملنگی.....!“ میں نے سنسناتے ہوئے انداز میں کہا۔

”ملنگی.....“ وہ حیرت اور خوف کے طے طے

تاثرات کے ساتھ بولا۔ ”مگر وہ تو جیل چلا گیا تھا۔“

”لیکن وقوعہ کی رات ملنگی کو لالی والے کمرے سے

نکلنے دیکھا گیا تھا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے

ہوئے کہا۔ ”اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی بھی تھی۔“

”اوہ.....“ وہ تشریح بھرے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

”اب تم مجھے بتاؤ کہ ملنگی کی لالی سے کیا دشمنی تھی؟“

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

”دشمنی کوئی نہیں تھی ملک صاحب.....“ وہ ابھمن زدہ

لہجے میں بولا۔ ”بس لالی کی بہادری کی وجہ سے وہ ڈکیتی کی

ایک واردات میں ناکامیاب رہا تھا اور گرفتار ہو گیا تھا۔“

”یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟“ میں

نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”میرا ملنگی کی طرف دھیان نہیں گیا تھا سرکار۔“ وہ

لجاجت آمیز انداز میں بولا۔ ”یہ تو تین سال پہلے کا واقعہ

ہے۔ لالی ایک شادی میں گیا ہوا تھا اور ملنگی نے شادی

والے گھر میں ڈکیتی کی کوشش کی تھی لیکن لالی نے اپنی جان

پر کھیل کر نہ صرف یہ کہ ڈکیتی کی واردات کو ناکام بنا دیا تھا

بلکہ اس نے ملنگی کو اس طرح قابو کر لیا تھا کہ پھر وہ مل نہ سکا

اور لوگوں کے جمع ہو جانے پر ملنگی کو پکڑ کر پولیس کے حوالے

کر دیا گیا تھا۔ بعد ازاں ملنگی عدالت سے سزا پا کر جیل چلا

گیا تھا۔“

”اور تم مطمئن ہو گئے کہ مجرم گیا جیل.....“ میں نے

متاسفانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”یہ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے؟“

”لگ بھگ تین سال پہلے یہ واقعہ پیش آیا تھا۔“ اس

نے بتایا۔

”اور ملنگی کو کتنے سال کی سزا ہوئی تھی؟“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب۔“ وہ

بے کھمکے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

نے اپنے اس فیصلے کو بدل دیا۔

یہ ٹھیک ہے کہ ملنگی کے حوالے سے خدا بخش سے

پوچھنا چھ بہت ضروری تھی لیکن آج دن میں، میں نے اس

کے جوان بیٹے کی لاش اس کے حوالے کی تھی۔ آج شام

ہونے والی تھی۔ یقیناً خدا بخش، لالی کی تدفین سے فارغ ہوا

ہوگا۔ اس دل گرفتہ ماحول میں اسے تھانے بلانا مجھے مناسب

نہ لگا اور میں خود چل کر اس کے گھر پہنچ گیا۔ حوالدار جن شاہ

بھی میرے ساتھ تھا۔ میں نے راستے میں جن شاہ سے ملنگی

ڈاکو کے بارے میں تفصیلی بات کی۔ جن شاہ کی معلومات

بھی یونہی جتنی ہی تھیں یعنی..... ملنگی ایک خطرناک ڈاکو تھا جو

چند سال پہلے گرفتار ہو کر جیل چلا گیا تھا۔

جب کوئی مجرم گرفتار ہو کر جیل چلا جاتا ہے تو پھر وہ

لوگوں کی گفتگو کا مرکز نہیں رہتا۔ لوگ رفتہ رفتہ اسے بھلا

دیتے ہیں حتیٰ کہ اس مجرم کے حوالے سے پھر کوئی سنسنی خیز

واقعہ رونما نہ ہو جائے اور..... ملنگی کی نسبت سے ایک تہلکہ

خیز واقعہ ظہور پذیر ہو چکا تھا۔

جب ہم مقبول کے گھر پہنچے تو اندھیرا پھیلنا شروع

ہو گیا تھا۔ میں خدا بخش کو لے کر ایک الگ تھلک جگہ پر بیٹھ

گیا۔ چند لمحات تک میں اس کی دل جوئی کرتا رہا پھر اپنے

مقصد کی طرف آتے ہوئے کہا۔

”خدا بخش! آج دن میں جب تم میرے پاس

تھانے آئے تھے تو میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس کیس کی

ایک کڑی ابھی باقی ہے جو شام تک میرے ہاتھ لگ جائے

گی..... یاد ہے؟“

”جی..... آپ نے ایسی بات کی تھی۔“ وہ ایک

بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

”میں تمہاری ذہنی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں

خدا بخش۔“ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”اگر

اس وقت تم سے ملنا ضروری نہ ہوتا تو میں بھی یہاں نہ آتا۔“

”کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب۔“ وہ مجروح

لہجے میں بولا۔ ”آپ تو قانونی تقاضوں کے سامنے مجبور ہیں

اور ظاہر ہے، یہ سب کوششیں آپ لالی کے قاتل تک پہنچنے

کے لیے ہی کر رہے ہیں۔“

”بے شک!“ میں نے دونوں انداز میں کہا۔ ”میں

اس کیس کی آخری کڑی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔

تمہارے بیٹے کا قاتل مجھ سے دور نہیں لیکن تمہارے تعاون

کے بغیر میں اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔“

”آپ حکم کریں تھانے دار صاحب.....“ وہ سوالیہ

آگیا۔

سب سے پہلے میں نے بونا کو اپنے کمرے میں بلایا اور انور جٹ کے کمرے سے برآمد ہونے والی ٹھری اسے دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم نے وقوعہ کی رات ملنگی کے ہاتھ میں یہی پوٹلی دیکھی تھی؟“

اس نے بہ غور ٹھری کا جائزہ لینے کے بعد حذبذب انداز میں کہا۔ ”تھانے دار صاحب! حق سچ بات تو یہ ہے کہ اب میں پورے دعوے کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ وہی پوٹلی ہے۔ ویسے وہ ایسی ہی پوٹلی تھی۔“

بونا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے اسے واپس حوالات بھیج کر انور جٹ کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ خاصا متحمل اور کھویا کھویا سا تھا۔ میں نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کے لیے کہا اور اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی سوال کرتا، وہ فریادوں لہجے میں بولا۔

”تھانے دار صاحب! لالی کے قتل سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ آپ کو میری بات کا یقین کر لینا چاہیے۔“

”یقین کر لیا.....“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور بولو۔“

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے حذبذب لہجے میں

”ٹھیک ہے، میں کل ہیڈ کوارٹر سے ملنگی کے بارے میں ساری تفصیلات حاصل کر لوں گا۔“ میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا پھر خدا بخش سے سوال کیا۔ ”کیا ملنگی اور انور جٹ میں کسی قسم کا کوئی تعلق ہے؟“

میں نے انور جٹ کے کمرے سے، لکڑی کی ایک الماری کے پیچھے سے جو ٹھری برآمد کی تھی اس میں انور جٹ کا لباس اور خون آلود آلہ قتل یعنی وہ خطرناک خنجر موجود تھا لیکن انور جٹ کا اصرار تھا کہ وہ اس ٹھری کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ لکڑی کی مذکورہ الماری کے پیچھے کیسے چھپی۔ بونا کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ جب اس نے ملنگی کو مقتول کے کمرے سے نکلنے دیکھا تو اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی بھی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ یہ وہی پوٹلی ہوگی جو میں نے انور جٹ کے کمرے کے اندر سے برآمد کی تھی۔ یہاں پر یہ اہم سوال اٹھتا تھا کہ ملنگی نے لالی کو قتل کرنے کے بعد وہ پوٹلی انور جٹ کے کمرے میں کیسے پہنچائی اور کیوں.....؟

”نہیں جی، ابہا کوئی تعلق میرے علم میں تو نہیں۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتا ہوا بولا۔ ”انور جٹ ایک سیدھا سادہ انسان ہے۔ اس کا ملنگی جیسے مجرم سے کیا واسطہ۔“

میں مزید تھوڑی دیر خدا بخش کے پاس بیٹھ کر تھانے

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

2015 کے پہلے شمارے کی مجموعی نگاہیں

سال نو کی جھلکائی کرئیں

مایا جال ● خونی کرداروں کے گرد چھلی سستی خیز داستان..... بیٹھ سیر


آوارہ گد ● دکھ سکھ کے مشترکہ تہذیبوں کی بلیک زالی اور انوکھی دنیا کی جھلک... ہر ایک کو اپنی تلاش کا سہارا پیش تھا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹن کی شہرت

جواری ● احمد اقبال کے شہ پارلیم سے ایک جواری کے کھیل کے نت نئے انداز

مغرب کے نالی انداز ● مغربی دنیا کی تہذیب و سائنس کی عکاسی اور محبت کی پھر وہ ناکام فرسٹوں کہانیاں

پہلی کہانی ● پسندیدہ مصنفہ **غلام قادر** کی واپسی..... تازہ ترین سورتق کے حملو

دوسری کہانی ● شامی اور تیموری کی کجالی میں رونما ہونے والے تازہ کارنامے، **کاشف زبیر** کے شگفتہ انداز بیان میں



آپ کے تہرے... مشورے... محبتیں... دکھائیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

”تمہاری منگنی کے ساتھ کبھی کوئی پر خاش رہی ہے؟“

”نہیں جناب..... بالکل نہیں۔“

”تمہارے گھر میں تم تین افراد یعنی تم، تمہاری بیوی

اور تمہارے باپ کے علاوہ اور کس شخص کا آنا جانا ہے؟“

میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”کسی کا بھی نہیں!“ وہ پوری قطعیت سے بولا۔

”پھر تو وہ تم تینوں میں ہی سے کسی کے تعاون سے...“

گھڑی تمہارے گھر کے اندر چھپا سکتا ہے۔“ میں نے

ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم نے اپنی لاطنی کا اظہار

کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب مجھے مشتاق جٹ

اور زہادہ کو تھانے بلا کر تفتیش کرنا ہوگی۔“

”جناب! یہ ساری باتیں میرا دماغ خراب کر رہی ہیں۔“

وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔ ”ابا تو

مجرموں اور برے لوگوں سے شدید نفرت کرتا ہے۔ وہ منگنی

کے ساتھ مل کر میرے خلاف کیوں سازش کرے گا۔“

”اور زہادہ.....؟“ میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔

”یہ ٹھیک ہے کہ میرے اور زہادہ کے بیچ لڑائی جھگڑا

ہوتا رہتا ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس حد تک گرجائے گی کہ

مجھے پھنسانے کے لیے کسی مجرم کا ساتھ دینے کے لیے تیار

ہو جائے.....“ اس کی الجھن ساتویں آسمان کو چھو رہی تھی۔

”بس تو اس کا پھر ایک ہی مطلب ہے کہ منگنی جیل

سے کوئی زبردست قسم کا جادو سیکھ کر آیا ہے۔“ میں نے طنزیہ

لہجے میں کہا۔

وہ بے بسی سے سر جھٹکنے لگا۔ ان لکھات میں وہ بہت زیادہ

الجھن کا شکار نظر آتا تھا۔ میں نے اسے ایک رات اچھی طرح

سوچنے کا موقع فراہم کر کے دوبارہ حوالات میں بھیج دیا۔

☆☆☆

آئندہ روز میں نے دلدار شیر فروش آف گلکٹر منڈی

کو چھوڑ دیا۔ اس ڈھائی من کی لاش کا لالی کے گل سے کوئی

تعلق نہیں تھا تاہم یونا اور انور جٹ کو اس وقت تک پولیس

کسٹڈی ہی میں رہنا تھا جب تک منگنی پولیس کی گرفت میں

آ کر اپنے جرم کا اقرار نہ کر لیتا۔

اسی روز میں نے اپنے ذرائع استعمال کر کے منگنی

کے بارے میں تفصیلی معلومات بھی حاصل کر لیں۔ وہ اپنی

سزا کاٹنے کے بعد لگ بھگ ایک ماہ پہلے جیل سے رہا ہوا

تھا۔ یونا کی زبانی مجھے پتا چل چکا تھا کہ منگنی جیل جانے سے

پہلے راہ والی میں رہتا تھا لیکن جب میں نے دوبارہ یونا سے

پوچھا تو مجھے پتا چلا کہ گرفتار ہونے کے بعد منگنی نے بھی راہ

بولی۔ ”تو آپ کو میری بے گناہی کا یقین آ گیا ہے.....؟“

”کہا ہے نا، یقین آ گیا ہے..... اور یولو؟“ میں نے

پر دستور گہری سنجیدگی سے کہا۔

”تو پھر..... مجھے گھر جانے دیں.....“ وہ مضطرب

لہجے میں بولا۔

”ٹھیک ہے، میں تمہیں صبح گھر جانے کی اجازت

دے دوں گا۔“ میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ”لیکن میری

ایک شرط ہے۔“

”شرط..... کیسی شرط جناب.....؟“ اس کے انداز

میں الجھن در آئی۔

”میں تم سے جو کچھ بھی پوچھوں، اس کا تم سولہ آنے

سچ جواب دو گے۔“ میں نے کہا۔

”میں نے تو پہلے ہی آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولی

جناب۔“

”پہلے کو تھوڑو..... میں اب کی بات کر رہا ہوں۔“

میں نے زور دے کر کہا۔

”جی.....“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے

بولی۔ ”پوچھیں جی۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا تم منگنی نامی کسی ڈاکو کو جانتے ہو؟“

”جی..... منگنی بہت خطرناک ڈاکو ہے اور شاید اس

وقت جیل میں ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”لالی نے بڑی

بہادری سے اسے جن چھا ڈال کر گرفتار کرایا تھا۔“

”وہ جیل میں تھا مگر اب آزاد گھوم رہا ہے۔“ میں نے

اسے بتایا۔ ”لالی کے جن چھپے نے منگنی کو جیل کی سنگلاخ

دیواروں کے پیچھے پہنچایا تھا۔ یہ تو ابھی مجھے پتا نہیں کہ وہ

اپنی سزا کاٹ کر جیل سے رہا ہوا ہے یا مفرد ہے لیکن میں

یہ حقیقت جانتے میں کامیاب ہو گیا ہوں کہ وقوعہ کی رات

منگنی ہی نے۔ بے وردی سے لالی کو گل کر کے اپنے انتقام کی

آگ کو ٹھنڈا کیا ہے۔“

”اوہ..... یہ تو بہت بری خبر ہے کہ وہ خطرناک ڈاکو

آزاد گھوم رہا ہے۔“ وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

”جو رہتا تھا وہ تو ہو چکا۔“ میں نے اپنے لہجے کی

سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ”مگر میں یہ جانتا چاہتا

ہوں کہ تمہارا لباس اس نے کیسے حاصل کیا اور پھر خون آلود

لباس اور خنجر والی گھڑی کو اس نے کیسے تمہارے گھر کے

اندر چھپا دیا تا کہ لالی کے گل کا الزام تم پر آئے؟“

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا جناب.....“ وہ

پریشانی سے بولا۔

بلند کہا۔ ”ملنگی رک جاؤ ورنہ اگلی گولی تمہاری پیٹھ میں
بھوست ہوگی.....“
میری یہ دھمکی بھی بے کار گئی۔ اسی لمحے ریلوے
ٹریک پر ٹرین نمودار ہوئی۔ میرے ذہن میں خطرے کی
تکٹھی بج اٹھی۔ ٹرین اچھی خاصی رفتار کے ساتھ آرہی تھی۔
ملنگو اور ریلوے لائن میں بہت کم فاصلہ رہ گیا تھا۔ میں اگر
چاہتا تو ایک گولی مار کر ملنگی کو ٹھنڈا کر سکتا تھا لیکن میں اسے
زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کا سینہ کھول کر بہت
سے اہم راز اگلوانا تھے۔

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ٹرین اور ملنگی کے درمیان
فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ ملنگی کی رفتار سے اس کا عزم جھلکتا
تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق وہ ٹرین گزرے
سے پہلے ریلوے لائن کو عبور کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ ممکن
ہے، ریلوے ٹریک کی دوسری جانب اس نے اپنے فرار کا
کوئی بندوبست کر رکھا ہو۔ میں کسی بھی قیمت پر اسے ہاتھ
سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔

میں نے پکے ارادے کے ساتھ ملنگی کی ٹانگوں کا
نشانہ لے کر بے درپے دو فائر کئے۔ اس کی رفتار میں لمحاتی
تھقل پیدا ہوا لیکن وہ رکنا نہیں، ہلکی ٹکڑا ہٹ کے ساتھ اس
نے نوڑنا جاری رکھا۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اب
پولیس کے ہتھے چڑھنے کا مطلب ہے، اپنے ڈیڑھ وارنٹ پر
دستخط کرنا۔

پھر وہی ہوا جس کا خدشہ میرے ذہن کے ایک کونے
میں موجود تھا۔ ملنگی نے آؤ دیکھنا تاؤ، وہ ٹکڑا ہٹ آمیز ووڈ
کے ساتھ ٹرین کے فرنٹ سے ریلوے لائن عبور کر گیا۔ ایک
لمحے کے لیے میں سمجھا کہ وہ گیا ہاتھ سے.....

ٹرین کی وجہ سے ہم سب کو چند سیکنڈ کے لیے رکتا
پڑا۔ جب ٹرین گزر گئی تو میں نے پٹری کی دوسری جانب
نگاہ دوڑائی۔ ملنگی مجھے دو دو رنگ کہیں نظر نہ آیا۔ اسی لمحے
ایک کانسٹیبل نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔
”ملک صاحب! ملنگی ادھر پڑا ہے۔“
”کہہو؟“ میں نے بے ساختہ پوچھا۔

کانسٹیبل نے ایک سمت اشارہ کیا تو ملنگی میری نگاہ
میں ہی آ گیا۔ وہ ریلوے لائن سے تھوڑے فاصلے پر
جھاڑیوں میں پھنسا تڑپ رہا تھا۔ یقیناً وہ گزرتی ہوئی ٹرین
کی لپٹ میں آ گیا تھا۔ اگر میں نے ٹانگوں پر گولی مار کر
اسے زخمی نہ کیا ہوتا تو وہ یہ حفاظت پٹری عبور کر چکا ہوتا۔
گھائل ہونے کے بعد اس کی رفتار میں کمی واقع ہو گئی تھی اور

والی کارخ نہیں کیا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ جیل
سے رہا ہونے کے بعد اس نے اپنا ٹھکانا کہیں اور کر لیا تھا۔
میں نے ملنگی کی گرفتاری کے لیے تین چھاپا ماریمیں
تفکیل دیں۔ ہر ٹیم تین افراد پر مشتمل تھی اور ان میں افراد
میں ایک سینئر اور دو جونیئر پولیس اہلکار شامل تھے۔ انہیں
قلعہ دیدار سنگھ، راہ والی، گلکھڑ منڈی اور اردگرد کے علاقوں
میں ملنگی کو تلاش کرنا تھا۔ اس دوران میں یونانے کئی بار مجھ
سے درخواست کی کہ میں اسے رہا کر دوں مگر میں نے اس کی
گزارشات پر کان نہیں دھرے۔

چوتھے روز ایک خبر نے مجھے اطلاع دی کہ ملنگی
ڈاکو بھیس بدل کر قلعہ دیدار سنگھ ہی کے ایک گھر میں چھپا بیٹھا
ہے۔ یہ اطلاع چوٹا دینے والی تھی۔ مطلب، مجرم پولیس کی
ٹانگ تلے چھپا بیٹھا تھا۔ خبر نے جس گھر کی نشاندہی کی تھی وہ
عام آبادی سے بہت کر ایک طرف بنا ہوا تھا اور حاصل شدہ
معلومات کے مطابق ایک غیر آباد مکان تھا۔ میرے لیے
تشویش ناک بات یہ تھی کہ وہ قلعہ دیدار سنگھ میں گل کی ایک
واردات کرنے کے بعد اسی علاقے میں کیوں چھپا بیٹھا تھا۔
میں نے چاقی و جو بندہ افراد کا ایک دستہ تیار کیا اور خبر
کے ہمراہ مذکورہ غیر آباد مکان کی جانب روانہ ہو گیا جسے ملنگی
نے بغیر اطلاع کے آباد کر رکھا تھا۔

خبر کی اطلاع غلط نہیں تھی۔ ملنگی ایک بھکاری کے
بھیس میں واقعی اس مکان میں موجود تھا لیکن خاصا محتاط بھی
تھا۔ اسے کسی طرح پولیس کی آمد کی خبر مل گئی۔ ہم ابھی اس
مکان سے چند گز کے فاصلے پر ہی تھے کہ اس نے مکان کے
عقبی حصے سے فرار ہونے کی کوشش کی۔ میری عقابلی نگاہ نے
اسے دیکھ لیا اور میں نے لٹکار کر کہا۔

”ملنگی..... رک جاؤ.....“
میری لٹکار کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے ایک بار
پھر اسے دھمکی دی۔ ”ملنگی..... تمہارا کھیل ختم ہو چکا۔ رک
جاؤ ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔“

یوں محسوس ہوتا تھا، اس کی سماعت کہیں رخصت ہو گئی
ہو۔ وہ اندھا دھند بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ روڈ کر اس کرنے
کے بعد اس نے ریلوے لائن کی جانب دوڑ لگا دی۔ اس
ریلوے ٹریک کے ”گے کھیٹوں کا ایک لاتنا ہی سلسلہ پھیلا
ہوا تھا جن میں چاول کی تیار فصل کھڑی تھی۔ اگر وہ کھیٹوں
کے اندر گھس جاتا تو ہماری نظروں سے اوچھل ہو جاتا۔
میرے مستعد جوان بھی اس کے تعاقب میں تھے۔
میں نے ایک ہوائی فائر کیا۔ اس کے ساتھ ہی بے آواز

اسی کمی نے اس کے اندازے کی ایسی کم تھی کر کے دکھ دی تھی۔ وہ ٹرین کا دھکا کھانے کے بعد، بری طرح زخمی ہو کر ادھر جھاڑیوں میں جا گرا تھا۔ اگر وہ ٹرین کی مکمل زد میں آجاتا تو پھر اس کا تیرہ بن گیا ہوتا۔

میں لپک کر اس کے قریب پہنچا۔ اس کی حالت بہت بری تھی۔ وہ اپنے ہی خون میں لت پت نظر آ رہا تھا۔ اس کے بدن کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگ رہے تھے۔ وہ مجھے چند لمحوں کا مہمان دکھائی دیا۔ اگرچہ مجھے اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی تاہم میں نے پھر بھی تمکدنا انداز میں ایک کاسٹیکل سے کہا۔

”ایک تانگے کا فوری بندوبست کیا جائے۔ اسے اسپتال لے جانا ہوگا۔“

پھر میں منگی کی جانب متوجہ ہو گیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا۔ ”لالی کو تمہیں نے قتل کیا ہے نا؟“

”جی..... جی.....“ وہ فلت لہجے میں اقبال جرم کرتے ہوئے بولا۔ ”اس..... کہنے کی..... وجہ سے..... میں قتل چلا گیا تھا..... میں ایسے کیسے..... چھوڑ دیتا.....“

”لالی کے قتل میں انور جٹ کو پھنسانے کا کیا سبب تھا؟“ میں نے منگی سے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

”وہ..... بد ذات..... زاہدہ کے ساتھ بہت..... مار پیٹ کرتا تھا..... مجھے اس بات کا بہت..... دکھ تھا.....“

”زاہدہ سے تمہارا کیا تعلق؟“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”زاہدہ..... آہ..... زاہدہ.....!“ منگی نے ایک ہنگامی لی اور ساکت ہو گیا۔

منگی نے اپنی زندگی کی آخری سانسوں میں جس طرح زاہدہ کو یاد کیا تھا اس سے ساری کہانی میری سمجھ میں آگئی اور یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ انور جٹ کا لباس کس طرح خون آلود ہوا ہوگا اور پھر کیسے خنجر سمیت ایک پوٹی میں بند ہو کر انور جٹ کے گھر میں لکڑی کی الماری کے پیچھے پہنچا ہوگا۔ اس کام میں یقیناً زاہدہ نے منگی کا ساتھ دیا ہوگا۔

یہ جان لینے کے بعد کہ منگی اور زاہدہ میں کوئی سنجیدہ تعلق تھا اور ان دونوں نے ملی جلت سے ایسا منصوبہ بنایا تھا جس میں منگی کا انتقام بھی پورا ہو جاتا اور زاہدہ کی انور جٹ سے بھی جان بچوٹ جاتی۔ گویا کاسٹیکل میں وہ دونوں ایک ساتھ زندگی گزارنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

منگی نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں جو سنسنی خیز افکشاف کیا تھا اس نے ساری صورت حال واضح کر دی تھی اور انہی حقائق کی روشنی میں، میں نے زاہدہ کو گرفتار کر کے

تھانے لانے کا حکم جاری کر دیا۔

وہ جب میرے سامنے آ کر کھڑی ہوئی تو ہر تھمر کا نب رہی تھی۔ قہر دیدار سنگھ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور منگی کو پیش آنے والے حالات وہاں کے ہر رہائشی کے علم میں آچکے تھے لہذا زاہدہ اپنے انجام کے خوف سے مری جا رہی تھی۔

اس سے اقبال جرم کرانے میں مجھے کوئی محنت نہیں کرنا پڑی۔ ”کیوں کیا تم نے یہ سب؟“ میں نے گرج دار آواز میں پوچھا۔

”میں منگی کو پسند کرتی تھی.....“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”مجھے بہادر مرد بہت اچھے لگتے ہیں۔ منگی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھ سے شادی کے بعد وہ جرم کی دنیا کو خیر باد کہہ دے گا۔ اس نے میرا رشتہ مانگا تھا لیکن میرے گھروالوں نے صاف منع کر دیا پھر منگی قتل چلا گیا..... میں کئی سال تک اس کا انتظار کرتی رہی اور پھر گھروالوں نے زبردستی انور جٹ کے ساتھ میری شادی کر دی.....“ لہجائی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”انور جٹ وحشی ہے۔ میرے ساتھ جانوروں ایسا سلوک کرتا ہے۔ اسی لیے جب منگی دوبارہ مجھ سے ملا تو میں نے اس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم نے بہت سوچ سمجھ کر منصوبہ بنایا تھا۔ انور جٹ، لالی کے قتل میں چھانسی چڑھ جاتا اور منگی کا انتقام بھی پورا ہو جاتا۔ بس، اب ہم اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ آپ انور جٹ کو قتل بھیجیں لیکن سب کچھ ختم ہو گیا۔“ بات کے اختتام پر اس کے لبوں سے آہستہ سسکاری جدا ہوئی۔

”ایک دن سب کچھ ختم ہو جاتا ہے زاہدہ.....“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن تمہارے اور منگی جیسے انسان اس حقیقت پر غور نہیں کرتے۔“

انور جٹ کو جب پتا چلا کہ اس سارے فتنے میں زاہدہ نے مرکزی کردار ادا کیا ہے تو اس نے طیش میں آ کر اسی وقت اسے طلاق دے دی۔ زاہدہ منگی کے ساتھ شریک جرم ہونے کا اقرار کر چکی تھی لہذا میں نے اس کے خلاف چالان تیار کر کے اس کو حوالہ عدالت کر دیا۔ اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا تھا۔

”کاش..... میں ایسا نہ کرتی.....“

لیکن ”کاش“ کا بھی ایک وقت ہوتا ہے اور ہر چیز اپنے وقت اور اپنے مقام پر ہی اچھی لگتی ہے۔

(تحریر: ضمام بٹ)

سارے رشتوں میں ایک عظیم ترین رشتے کی نذر توں کا قصہ

اگر انسان غور کرے تو اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی راز پوشیدہ ہوتا ہے اور دنیا میں سب سے بڑا راز اللہ نے دل کی صورت بنایا ہے جس میں ایک کائنات آباد کر کے اسے گوشت کے لوتھڑے کی شکل دے دی... لیکن جب چوٹ لگنے اور درد ہونے کا احساس ہوتا ہے تو یہ گوشت کا لوتھڑا خون کے آنسوؤں لادیتا ہے... اس کے دل پر بھی بہت گہرا زخم تھا جس کا درد سہتے سہتے وہ خود پتھر ہو گئی تھی۔

گہرا زخم

ڈاکٹر شیر شاہ سید



اپنی ماں سے کہا تھا۔ ”بھی نہیں، بھی نہیں آنا میرے پاس، اس گھر اور میرے بچوں پر تمہارا سایہ بھی نہیں پڑتا چاہیے۔ بھی نہیں بھی نہیں۔ یو آر نو مور مائی عد۔ تم میری ماں نہیں ہو اور ہوگی بھی نہیں۔“

پاولا ڈسٹری نام تھا اس کا۔ اس دن اسے میں نے پہلی دفعہ دیکھا۔ وہ ہمارے سنگ روم میں سر جھکائے میری بیوی کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ بچے باہر کھیل رہے تھے۔ وہ میری بیوی کی ماں تھی۔ کارلانے مجھے دیکھ کر بڑی سختی سے

سپنس ڈائجسٹ 155 فروری 2015ء

Copied From Web

کرتی جاتی ہے۔ ان کی بھاری فیس ہوتی ہے۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ بھاری فیس، امتحان میں پاس ہو کر ڈاکٹر بن جانے کے بعد ملنے والی تنخواہ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم چاروں نے دل لگا کر یہ کورس کیا اور بہت اچھے نمبروں سے پاس بھی ہو گئے۔ اس زمانے میں امریکا کے حالات ڈاکٹروں کے لیے بہت ہی سازگار تھے اور ہمارے نمبر بھی اچھے تھے۔ نمبر اگر اچھے ہوں تو رنگ نسل مذہب امتیازات کچھ بھی راہ میں حائل نہیں ہوتے۔

امتحان پاس کرنے کے بعد ہم لوگوں نے میچنگ پروگرام میں درخواستیں ڈال دی تھیں۔ مجھے شروع دن سے ہی شوق تھا کہ سرجری میں ٹریننگ لوں گا اور خدا کا کرنا یہ ہوا کہ مجھے سرجری میں ہی کام مل گیا۔ نہ جانے کیوں شروع میں ڈینور کے نام سے پریشان ہو گیا تھا کہ کون پہاڑوں پر کام کرے گا۔ افسردہ دل کے ساتھ میں وہاں اتر دیکھتے دیکھتے مگر ڈینور آتے ہی اس کی خوب صورتی نے مجھے اپنا گردیدہ کر لیا۔ ڈینور اور اس کے ارد گرد کا سارا علاقہ میرے دل کو بھا گیا۔ ہرے بھرے اونچے نیچے پہاڑ، بارش، سردی، بہار کا موسم، خزاں کی ویرانی سب کچھ تھا اس شہر میں۔ مجھے ہوشن میں بھی نوکری ملی مگر میں نے فیصلہ کیا کہ ڈینور میں رہوں گا۔

ڈینور کا پہلا سال تو اتنی تیزی سے گزر گیا کہ کچھ پتا ہی نہیں لگا کہ سال کب شروع ہوا اور کب ختم ہوا۔ ایک تو اسپتال کا نظام پھر کام کے اوقات کار ایسے کہ آدی کو ہوش ہی نہیں رہتا۔ پاکستان میں پروفیسر صاحب 9 بجے بھی آجائیں تو بڑی بات ہے اور اکثر ڈاکٹر تو ایسا ہوتا ہے کہ پورے ہاؤس جا ب کے دوران پروفیسر صاحب کو پتا بھی نہیں ہوتا ہے کہ کون کون سے ڈاکٹر ان کے پاس کام کر کے چلے گئے ہیں۔ امریکا میں سرجری میں روزانہ صبح ساڑھے چار پانچ بجے کام شروع کرنا پڑتا ہے اور تقریباً روز ہی شام کے سات اور کبھی آٹھ بج جاتے ہیں اور جس روز رات کی بھی ڈیوٹی ہو اس دن نہ دن کا پتا لگتا ہے اور نہ ہی رات کا احساس ہوتا ہے۔

چار سال اسی طرح گزر گئے۔ سچ میں، میں دس، دس دن کے لیے تین دفعہ پاکستان بھی ہو آیا تھا۔ شروع میں، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ میں پاکستان کے علاوہ کہیں اور بھی کام کروں گا کیونکہ بنیادی طور پر مجھے پاکستان اور یہاں کے لوگوں سے محبت تھی اور یہ بھی احساس کہ کتنے کم پیسے خرچ کر کے میں ڈاکٹر بن گیا تھا۔

وہ کارلا کی ہی طرح خوب صورت تھی۔ ساڑھے سال کے لگ بھگ عمر ہوئی اس کی مگر اس عمر میں بھی وہ بلائی خوب صورت لگ رہی تھی۔ وہ دھیرے سے آگے مجھے دیکھ کر مسکرائی اور خاموشی سے دروازہ کھول کر اپنی گاڑی میں جا بیٹھی، پھر پورے نظریوں سے اس نے لان میں کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھا اور وہ موش گاڑی کا انجن چلا کر رخصت ہو گئی۔ کارلا سے میری ملاقات کلیولینڈ میں ہوئی۔ ادہائیچہ کے اس شہر میں وہ مجھے اسپتال میں ملی تھی۔ میں پاکستان سے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کرتے ہی نکل کھڑا ہوا اور نیویارک میں جا کر بسیرا ڈال دیا تھا۔ پیسوں کی کمی نہیں تھی اور ڈیڈی کے تعلقات بھی تھے۔ ڈیڈی سرکاری ملازم تھے۔ تنخواہ کے ساتھ دوسرے وسائل بھی تھے جن کی وجہ سے کبھی روپے پیسوں کی کمی کا سامنا نہیں ہوا۔ دوسرے وسائل کا مجھے کوئی خاص اندازہ پاکستان میں رہ کر نہیں ہوا۔ خاص طور پر اس عمر میں جب میں اسکول اور کالج میں پڑھتا رہا تھا بلکہ میڈیکل کالج کے شروع کے برسوں میں تو میں یہی سمجھتا رہا کہ زندگی میں ہر ایک کے پاس اسی قسم کے وسائل ہوتے ہیں لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ڈیڈی کے زیادہ تر وسائل غیر توفی بلکہ مذہبی اعتبار سے حرام بھی تھے لیکن ہمارے گھر میں اور ہمارے ملنے جلنے والوں کے گھر میں حرام حلال کا اپنا ایک خاص مفہوم ہوتا ہے۔ ڈیڈی کسی زمانے میں شراب پیتے تھے اور عید کی نماز گورنر ہاؤس میں پڑھتے تھے۔ پھر کچھ عرصے بعد بھی شراب تو نہیں چھوڑی مگر آفس میں پابند نماز ہو گئے۔ باقی رہا سہولتوں کا ناجائز استعمال اور سرکاری منصوبوں میں ہیرا پھیری، کمیشن میں خاطر خواہ حصہ، یہ کام کم یا زیادہ تو ہوتے رہے مگر ختم نہ ہوئے تھے۔ انہ ہوں گے۔ اب میں سوچتا ہوں کہ اگر وہ یہ سب کچھ نہ کرتے تو شاید ہم سب بھائی بہن بھی اچھے اسکول، کالج میں نہ پڑھ سکتے اور نہ ہی پیشہ ورانہ کالجوں میں تعلیم حاصل کر سکتے۔ آج ہم سب لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، پروفیشنل ہیں اور ایسی جگہوں پر کام کر رہے ہیں جہاں بے ایمانی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

میں نیویارک میں کونز کے علاقے میں ایک اپارٹمنٹ میں اپنے دوسرے دوستوں کے ساتھ رہا، وہیں رہ کر یو ایس ایم ایل ای کے امتحان کی تیاری کی۔ ہم چار دوست تھے اور ہم چاروں نے بی کاپلان کے ادارے میں داخلہ لے لیا تھا۔ کاپلان سینٹر کی برانچیں پورے امریکا میں موجود ہیں جہاں یو ایس ایم ایل ای کے امتحان کی تیاری

قبل از وقت

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت آغا تمیز درویش صورت بزرگوں کے حلقے میں مہمانی اکبر کے دور کی خوبیاں اور برکتیں نہایت وارفتگی سے بیان کر رہے تھے۔ گویا سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ ابوالفضل کے قتل تک پہنچے تو ایسی ہلکی بندھی کہ معلوم ہوتا تھا انہیں اس واردات کی اطلاع ابھی ابھی ملی ہے۔ اس حسرت پر وہ شیخو کوڈانٹ ڈپٹ کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں پیٹلا درویش بول اٹھا۔ ”اماں چھڑو بھی۔ بھلا وہ بھی کوئی زمانہ تھا۔ جب لوگ چار گھنٹے کی سیل کی رفتار سے سفر کرتے تھے اور روٹا تک جمعہ کے جمعہ نہاتے تھے۔“ اس کا منہ آنانے یہ کہہ کر بند کر دیا کہ حضرت اس سنہری زہ نے میں ایسی سڑی گری کہاں پڑتی تھی؟ پھر پروفیسر شگلا نے آغا کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ہمارے سے میں بھی بھرت درش کی برکھارت بڑی ہی سند رہتی تھی (مجھے بعد میں پتا چلا کہ ہمارے سے سے ان کی مراد ہمیشہ چندر گپت مور یہ کا عہد ہوتا تھا جس پر دو تین دفعہ ”تھیسس“ لکھ کر نامنظور کروا چکے تھے) اس مقام پر تھیں ڈانر می والا درویش ایکا لائی اوچھا وار کر گیا، بولا۔ ”آغا! تم اپنے وقت سے ساڑھے تین سو برس بعد پیدا ہوئے ہو۔“ اس پر آغا، شگلا جی کی طرف آنکھ مار کر کہنے لگے کہ ”تمہارے حساب سے یہ غریب تو پورے دو ہزار سال لیت ہو گیا۔ مگر میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ کیا تم اپنے تئیں قبل از وقت پیدا ہونے والوں میں شمار کرتے ہو؟ کیا سمجھے؟“

اقتباس: چراغ تے از مشتاق احمد یوسفی

مراکز: دانش سنسیر، کراچی

میں آج حساب لگاتا ہوں کہ پورے پانچ سال میڈیکل میں مشکل سے پانچ ہزار روپے کالج اور امتحان کی فیسوں کی مد میں خرچ ہوئے ہوں گے۔ امریکا میں صرف کالج کے پانچ سال کی فیس کم از کم تین لاکھ ڈالرز ہو جاتی ہے پھر ادو پر کا خرچ ہے۔ ایک عام امریکی گھرانہ اپنے بچوں کو میڈیکل کالج یا دوسرے اداروں میں اپنے خرچ سے پڑھائی نہیں سکتا کیونکہ اتنے پیسے خرچ کرنے کی سکت کسی اچھی خاندان میں نہیں ہوتی۔ وہ تو بھلا ہوا امریکن بیکنگ سسٹم کا جس میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو کم سود پر تعلیمی قرض مل جاتا ہے اور اس قرض کی بنیاد پر اپنے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ماں باپ روزمرہ کا خرچ برداشت کرتے ہیں اور یونیورسٹیوں کالجوں کی فیس بینک کے قرضوں سے ادا کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک امریکی ڈاکٹر، انجینئر بننا ہے یا پائی ایچ ڈی کرتا ہے تو زندگی کا آغاز ایک بڑے قرض کے بوجھ سے کرتا ہے۔ پہلی نوکری کے ساتھ ہی اس قرض کو اٹارنا شروع کرتا ہے۔

پاکستان میں تو میں ڈاکٹر ایسے ہی بن گیا۔ ایک یہ وجہ تھی پھر پاکستان اپنا گھر بھی تھا، اس کے پہاڑوں، دریاؤں، سمندروں، وادیوں کی اپنی خوب صورتی بھی تھی لیکن اپنے ریزیڈنسی کے آخری سال میں پاکستان جانے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ کبھی بھی پاکستان واپس نہیں جاتا ہے۔ مجھے احساس ہوا تھا کہ پاکستان جاتے ہی ڈیڈی اور ان کے دوست میرے لیے کسی بہترین نوکری کا انتظام کر دیں گے۔ شاید سی وی مانگا جائے گا نہ ہی انٹرویو ہوگا۔ میں اپنی تمام تر قابلیت کے باوجود زندگی بھر ایک سوریس کی گالی سنتا رہوں گا، لوگ میرے پیٹھ پیچھے یہی کہیں گے، ارے یہ فلاں کا بیٹا ہے، وہ خود زندگی بھر رشوت لیتے رہے پھر بیٹے کو بھی فٹ کر دیا۔ رشوت شاید ڈیڈی کی بھجوری تھی، اچھے طریقے سے رہنے کے لیے ہماری ماں اور ہم سب کو اچھا رکھنے کے لیے، مگر میری کیا بھجوری ہوگی۔ فیلوشپ کے بعد مجھے امریکا میں جہاں چاہوں گا کام مل جائے گا، گوروں، یہودیوں اور ہندوؤں کے مقابلے پر بھی میرے ساتھ نا انصافی نہیں ہوگی۔ میں نے سوچا کہ پاکستان کے قرض کا بوجھ اتنا زیادہ نہیں ہوگا جتنا تکلیف دہ بوجھ ڈیڈی اور ان کے دوستوں کا ہو جائے گا۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ پاکستان واپس نہیں جاؤں گا۔ ڈیڈی میں چار سال خوب گزرے پھر مجھے بہت اچھی

فیوشپ سرجری میں ہی کلونینڈ کے مشہور اسپتال میں مل گئی تھی۔ میرا سی وی ایسا تھا کہ اس کے مقابلے میں کوئی بھی نہیں ٹھہرا۔

کلونینڈ کے پہلے ہی سال میں میری ملاقات کارلائو گنویچی سے ہوئی، وہ بھی اسی اسپتال میں فیوشپ کرنے نیویارک سے آئی تھی۔ بچوں کے وارڈ میں کام کر رہی تھی۔ وہ روم میں ایسا وہ کسی پرانے مجسمے کی طرح حسین تھی۔ نام سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا تعلق اٹالین گھرانے سے ہوگا۔ امریکا بھی کیا خوب ملک ہے، ساری دنیا کے مہاجرین امریکا میں آکر بس گئے ہیں اور بستے چلے آ رہے ہیں اور یہ بھرتی کسی کو مایوس بھی نہیں کرتی۔ یورپ، افریقا، ایشیا، براعظموں کے ہر ملک کے لوگوں کے لیے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ وہ آتے ہیں اور آکر یہاں رہ جاتے ہیں۔

کارلا کے دادا پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں اٹلی سے نیویارک آئے تھے۔ نیویارک میں اٹالین لوگوں نے اپنی ایک دنیا بنا لی ہوئی ہے۔ امریکا میں رہتے ہوئے بھی وہ اٹلی میں رہتے ہیں۔ وہ زمانہ خراب تھا، بڑی محنت کی تھی ان لوگوں نے پھر آہستہ آہستہ نیویارک کے ہاسی بن کر خوب پھلے پھولے تھے۔ کارلا کے باپ اوڈانی گنویچی کا بڑا کاروبار تھا۔ کارلا کے رکھ رکھاؤ میں خاندان کی امارت صاف نظر آتی تھی۔

وہ مجھے ڈاکٹر لاؤنچ میں ملی تھی۔ گہرے سیاہ لائے بال، خوب صورت ترشے ہوئے، کالی سیاہ آنکھیں اور کتابی چہرے پر خوب صورت پیشانی جس سے وہ بار بار بالوں کی لٹ کو جھٹکتے۔ سے ہناتی تھی۔ یہ اس کا اسٹائل ہی نہیں تھا بلکہ اس کی شخصیت کا جزو بھی بن کر رہ گیا تھا۔

میں نے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ ہم دونوں ہی جس بال کا فائنل مقابلہ دیکھ رہے تھے۔ دونوں ہی ڈیوٹی پر تھے اور وہ ہفتے کی شام تھی، وہ کھیل میں کھل طور پر شامل تھی۔ بار بار اس کے چہرے پر لالی کے تھپتھپ سے جلتے اور بار بار میرے دل کی دھڑکن رک سی جاتی۔ میں نے اسی وقت طے کر لیا کہ امی کی بیٹی ہوئی ساری پاکستانی لڑکیوں کی تصویریں واپس بھیج دوں گا۔ کارلا کی بائیں ہاتھ کی مٹھی والی انگلی نکالی تھی۔ میں نے سوچا کہ جانے کوئی اس کا یوٹے فرینڈ ہوگا، بتائیں کتنی پرانی دوستی ہوگی اور جانے میری قسمت میں کیا ہو۔

میں نے کھیل کے ختم ہوتے ہی اسے ڈنر کے لیے مدعو

کیا۔ اسپتال کے نزدیک ایک مشہور اٹالین ریستورنٹ میں ہم دونوں نے کھانا کھایا۔ لڑائی کے ساتھ چھٹی پہن کے ساتھ ڈاکٹر روٹی، جھینگے خاص اٹالین کری میں اور ساتھ ہی سرخ اٹالین واٹن۔ اس دن مجھے پتا چل گیا کہ اس کا کوئی یوٹے فرینڈ نہیں ہے۔ پھر ہم دونوں کی دوستی بڑھی اور بڑھتی چلی گئی۔ آہستہ آہستہ قریب بڑھتی چلی گئی۔ ساتھ ہی کھانا، کبھی اس کے ایارٹمنٹ میں بھی میرے گھر پر، ساتھ سینما دیکھنا، ساتھ ہی گھومنا، کئی دفعہ میں اس کے ساتھ نیویارک گیا، اس کے باپ سے ملا پھر ہم دونوں کو احساس ہوا کہ ہم دور تک چلے آئے ہیں۔ میں تو اس کی محبت میں گرفتار ہو ہی گیا تھا وہ بھی مجھے چاہنے لگی تھی۔ پھر ایک دن میں نے اسے مٹھی کی انگلی پیش کر دی تھی۔ اس نے مجھے گلے سے لگایا، چوما پھر انگلی پھینکی تھی۔

فیوشپ کے فوراً بعد ہم دونوں نیویارک چلے گئے اور ساتھ ہی کام کا آغاز کر دیا تھا ہم دونوں کو ایک ایسے اسپتال میں بہت اچھی نوکری مل گئی تھی۔

میرے پاس دولت کی فراوانی تھی، مجھے قرض لوٹانا تھا، نہ ہی پیسے گھر بھیجتے تھے۔ میں نے کارلا کے لیے ایک خوب صورت سا گھر خرید لیا تھا۔ ہماری شادی بھی ایک یادگار شادی تھی، مسجد میں نکاح، چرچ میں تقریب اور ہوٹل میں ضیافت۔ ڈیڈی، امی اور میرے بھائی بہنوں نے شادی میں شرکت کی تھی۔ اٹالین لوگ بھی پاکستانیوں کی طرح بہت بولتے ہیں، ویسے ہی زور زور سے اور ویسے ہی گرج جوشی سے۔ کارلا کے باپ نے چرچ میں اسے میرے حوالے کیا، میں اسے چوم کر اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر باہر نکلا اور ضیافت میں شرکت کی۔ کارلا کا خاندان، دوست اور میرے گھر والوں کے ساتھ چند پاکستانی دوست بھی موجود تھے۔ وہ دن، شام اور رات خوب تھی، مجھے آج بھی سب کچھ ایک خواب کی طرح یاد ہے۔

میں نے نہ جانے کیوں خود بخود شروع سے ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ کارلا کی ماں نہیں ہے اور پھر ایسا ہوا کہ کبھی بھی ہم لوگوں نے اس موضوع پر بات نہیں کی۔ اس دن گھر میں کارلا کی ماں کو دیکھ کر میں چونک گیا اور خاص طور پر جس طرح سے کارلا نے اس سے بات کی تھی وہ بھی میرے لیے بہت حیران کن تھا۔

جاتے جاتے اس کی وہ خاص نگاہ میں بھول نہیں سکا ہوں جب اس نے مڑ کر دیکھا تھا اور مجھ پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی۔ میں واپس آیا تو دیکھا

کارلا صوفے پر خاموش بیٹھی، کھڑکی سے دور درختوں کے جھنڈ میں کچھ تلاش کر رہی ہے۔

مجھے دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرائی، ایک اداس سی مسکراہٹ، آہستہ سے بولی۔ ”یہ میری ماں تھی، پاؤلا۔ ایک زمانہ تھا میں اسے تلاش کرتی رہی تھی۔ جانے کہاں کہاں مگر نہیں تلاش کر سکی اسے۔ نہ جانے کتنے برسوں تک اس کے خواب بنتی رہی، اپنے دماغ میں اس امید کے ساتھ کہ ایک دن میری ماں جہاں بھی گئی ہے یکا یک واپس آجائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

میں خاموشی سے صوفے پر کارلا کے برابر میں بیٹھ گیا، اس کے ماتھے کو چومنا، اس کے گالوں کو چھوا، اپنے ہاتھ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے بولا۔ ”مگر کارلا اب اگر پاؤلا واپس آئی ہے تو اسے خوش آمدید کہنا چاہیے تھا۔ تمہیں اس کی ضرورت ہے، میرے ماں باپ بھی پاکستان سے نہیں آئیں گے، بچوں کو گرانڈ بیٹریس کی ضرورت ہوتی ہے اور تمہاری ماں کو تمہاری ضرورت ہے۔“

”نہیں۔“ سچی سچی کہا تھا اس نے۔ ”میں چھوٹی سی تھی صرف چار سال کی، کوئی نہیں تھا میرا۔ اس عمر میں کوئی بھی اپنا نہیں ہوتا صرف، ن ہوتی ہے۔ وہی سمجھتی ہے اتنے چھوٹے بچے کی زبان، اس کی ضرورت پوری کرتی ہے، اس کے مسائل کو سمجھتا ہے، اس کے جذبات کا خیال رکھتی ہے اور وہی عمر ہوتی ہے جب اس بچی کے پیار میں صرف پیار ہوتا ہے۔ کوئی غرض نہیں۔ مجھے یاد ہے اس مہربان ماں کا پیار بھرا چہرہ۔ جھکی جھکی نگاہیں، بار بار چومنا، گلے لگانا، پھر ایک صبح یہ سب کچھ نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ مجھے یہ تو یاد نہیں کہ میرے باپ پر کیا گزری، مجھے صرف یہ یاد ہے کہ میری ماں میرے پاس نہیں تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر تک میرا باپ میری پرورش کرتا رہا، کبھی ماں بن کر کبھی باپ بن کر، کبھی بھائی بن کر کبھی بہن بن کر۔ مجھے سب یاد ہے اسکول سے کالج تک ایک ایک دن، ایک ایک لمحہ، ہر جگہ جہاں مجھے ضرورت پڑی کہ کسی کی انگلی پکڑ لوں، کسی کا ہاتھ تمام لوں، کسی کے کندھے پر سر رکھ دوں، کسی کی چھاتیوں میں منہ چھپا کر سو جاؤں، مجھے میرا باپ، موجود ملا۔ ہر طرح سے ہر وقت میرے ساتھ، میرے پاس۔ ان اٹھارہ برسوں میں میرے باپ نے بھی مجھ سے میری ماں کے بارے میں کوئی بری بات نہیں کی۔ مجھے یاد ہے ان کے جواب۔ نہیں نہیں وہ زندہ ہے۔ وہ ضرور تمہیں یاد کرتی ہوگی، ہاں کسی جگہ مجبوری میں پنشن گئی ہوگی۔ بہت اچھی تھی، وہ تم سے بہت پیار کرتی

تھی۔ ضرور آئے گی ایک دن تم سے ملنے تمہارے پاس۔ کیسے دور رہ سکتی ہے تم سے۔ بہت اچھی تھی وہ۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ کھڑکی سے باہر ہلتے ہوئے پتوں کو دیکھتی رہی پھر آہستہ سے بولی۔

”وہ سب جھوٹ تھا۔ میری اٹھارویں سالگرہ کے دوسرے دن پاپا نے مجھے بتایا کہ وہ سب کچھ چھپاتے رہے تھے مجھ سے کیونکہ وہ میرے ذہن میں، میرے دماغ میں کوئی سنگی ات نہیں ڈالنا چاہتے تھے، جب تک کہ میں خود اچھا برانہ نہ بننے کے قابل نہ ہو جاؤں۔ اب اسکی عمر گئی کہ وہ مجھے سب کچھ بتا دیں اور انہوں نے برسوں بعد بھی بڑے کرب سے بتایا تھا کہ پاؤلا یکا یک چھوڑ گئی تھی انہیں، کسی دوسرے آدمی کے لیے۔ کسی دوسری ریاست کے کسی اور شہر میں جا کر آباد ہو گئی تھی اس کے ساتھ اور وہاں سے ہی طلاق لے لی تھی ان سے۔ کوئی ماں ایسا نہیں کرتی کہ بچی کو چھوڑ جائے اس طرح سے کہ واپس آ کر دیکھے بھی نہیں، جو بچی نہیں، چھوڑے بھی نہیں مگر اس نے ایسا ہی کیا۔ پاپا نے کہا تھا کوئی مجبوری ہوگی، کوئی مسئلہ ہوگا مگر بیٹی میں تمہیں یہ سب کچھ نہیں بتا سکتا تھا، تم بچی تھیں، چھوٹی تھیں، زخمی ہو جاتیں تو شاید یہ زخم کبھی نہیں بھرتا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں میری ماں مجھ سے چھن گئی، مر گئی، میرے لیے۔“ مجھے یاد تھا یہی کہا تھا اس نے مجھ سے، جب میں نے اس سے اس کی ماں کے بارے میں پوچھا تھا۔

”اس دن سارا کچھ بھاپ بن کر اڑ گیا، میں نے تصورات کا ایک محل بنایا ہوا تھا جس میں میری ماں ایک شہزادی کی طرح بیٹھی اوپر بادلوں سے مجھے دیکھ رہی تھی، مجھے یاد کہ رہی تھی، میری حفاظت کر رہی تھی، میرے لیے راہیں بنا رہی تھی مگر سب کچھ جھوٹ نکلا۔ محض ایک جھوٹ۔ وہ ایک چھوٹی سی، تنگی سی، کمزوری بچی کو چھوڑ کر اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ میرے باپ کو چھوڑنے کا حق تھا اسے، کیونکہ وہ تو ایک کاغذی بندھن تھا، ایک مذہبی رشتے کے تحت شوہر اور بیوی بن گئے تھے وہ لوگ اور شوہر اور بیوی میں تو محبت ختم ہو سکتی ہے۔ مجھے چھوڑنے کا کوئی حق نہیں تھا انہیں، میں ان کی بیٹی تھی ان کے خون کا حقہ ان کے وجود کا دوسرا روپ اور اب میرا حق ہے کہ میں اسے بھی اپنی زندگی میں داخل نہ ہونے دوں اور آج میں نے اپنا وہی اختیار استعمال کیا ہے جس پر برسوں پہلے اسے زعم تھا۔“



سہیل شہر و سخن



✽ مہرین ناز..... حیدرآباد
اڑ جائیں گے تصویر کے رنگوں کی طرح ہیں
ہم وقت کی شہنی پہ پرندوں کی طرح ہیں

✽ محمد عباس..... نیو سینٹرل جیل ملتان
ہری ہے شاخ تنہا ابھی جلی تو نہیں
دہی ہے آگ جگر کی مگر بجھی تو نہیں
جفا کی آگ سے گروں وفا شعاہوں کی
کٹی ہے بربر میدان مگر جھکی تو نہیں

✽ شازبہ کمال..... کراچی
چھوڑ کے جانے والے تجھ کو اتنا بھی احساس نہیں
اس کے دل پہ کیا گزرے گی جس کو غم بھی رس نہیں

✽ احمد حسن عرضی خان..... قیوہ شریف بائی پاس
اڑ گیا رنگ راہ گزاروں کا قافلہ مجھ گیا چناروں کا
اوڑھ کر زرد موسموں کی ردا آؤ ماتم کریں بہاروں کا

✽ سید امین نقوی بھکر..... پنجاب
چلو اچھا ہوا دھند پڑنے لگی ورنہ
دور تک لگتی تھیں ان کی راہ میری آنکھیں

✽ توہیف احمد..... کراچی
دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں کے تارے سو گئے
آنے والے دور کے محکم ہمارے سو گئے
ان کے سر پر تھا فظ اک بے گناہی کا گناہ
پل میں وہ مصومیت کے استعارے سو گئے

✽ سیرہ اسما بخاری..... اسلام آباد
ارادے جن کے پختہ ہوں نظر جن کی خدا پر ہو
علاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

✽ اظہر حسین بچاوار..... ہزاری جتوئی
اب نریخ کا عالم ہے مجھ پر تم اپنی محبت واپس لو
جب کسی ڈوبنے لگتی ہے تو بوجھ اتارا کرتے ہیں
جانی ہوں میت دیکھ کے بھی واللہ تم چل کر آئے سکتے
دو چار قدم تو دشمن بھی تکلیف گوارا کرتے ہیں

✽ ایم خلیل ساحل..... اسلام آباد
ذرا ٹھہرو کے بارش ہے یہ تم جائے تو پھر جانا
کسی کا تجھ کو چھو جانا مجھے اچھا نہیں لگتا

✽ راجہ افتخار علی انی..... چوآسیدن شاہ، موہنڑہ
میرے مطلب کا تھا وہ وہ شخص
پر افسوس کہ وہ مطلبی نکلا

✽ محبوب مصور سومرو..... گوٹھ کوٹھری، لاڑکانہ
ساتھ ساتھ تم سدا چلتے رہو
روز روز آ کے یوں ہی ملتے رہو
میری دعا ہے میرے محبوب تم
سدا خوش رہو اور یوں ہی بنتے رہو

✽ محمد بشارت..... کنگر دودرہ
نجانے کیا امتحان ہے آج کل مجھ پر
مقدر محبت اور دوست تینوں لکھے سے رہتے ہیں

✽ سید نعیم الحسن شاہ بخاری..... اسلام آباد
جو ہوتا اگر دل میں ایمان کامل
تو کفار کا پھر نہ غم خوار ہوتا
جہاں گیر ہوتا جہاں بان ہوتا
اگر خوابِ غفلت سے بیدار ہوتا

✽ زاہد چودھری..... چھوڑ کینٹ
بے فیض رفاقت میں شمر کس کے لیے تھا؟
جب دھوپ تھی قسمت تو شجر کس کے لیے تھا؟
اے مادرِ نیتی تیری حیرت بھی بجا ہے
تیرے سق کام نہ آیا تو سر کس کے لیے تھا؟

✽ شیانہ حسن..... لاہور
ٹوٹ کر بھی محبتوں کو معتبر رکھتے ہیں
رہتے ہیں بے خبر، ہر خبر رکھتے ہیں
خودداری، گنولنے کا حوصلہ ہم میں نہیں
مگر چپ چاپ چمکڑ جائیں یہ صبر رکھتے ہیں

✽ حنا عروج..... کورنگی، کراچی
ساوان کی ہیں پھواریں، جیون پہ اب تمہارے
جیسا مرا شجر ہے، کیا ساتھ تم چلو گے
راہ جنوں پہ چلنا آساں نہیں ہے دیکھو
دشوار راہ گزر ہے، کیا ساتھ تم چلو گے

✽ در شہوار پیرزادہ..... بہاول پور
یہ خشک رت، یہ نئے سال کا پہلا لمحہ
دل یہ کہتا ہے کہ موسم کو اب یاد آئے
ہم نے ماضی کی سخاوت پہ جو ہل بھر سوچا
دکھ بھی کیا کیا ہمیں یاروں کے سب یاد آئے

✽ محمد امین..... گلجہار، کراچی
انسانوں کی بستی میں کچھ ایسے ہیں دیوانے لوگ
اللہ کے زنب بن بیٹھے پر انساں کو نہ جانے لوگ
ہراک چہرہ پڑھتے جائیں، ہراک داماں چاک کریں
ہراک جو ہر ڈھونڈ کے لائیں، خود کو نہ پہچانے لوگ

✽ نادر سیال..... مہانوالی
اب یہ عالم ہے کہ تہائی سے تک آکر
خود ہی ددوائے کا زنجیر ہلا دیتے ہیں
✽ انیلار شید سیال..... خیر پور (میرس)
پونجی موسم کی لہا دیکھ کے یاد آیا جاناں
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

✽ محمد زریان سلطان..... اردو بازار، کراچی
ہمیں دریافت کرنے سے ہمیں تسخیر کرنے تک
بہت ہیں مرحلے باقی ابھی زنجیر کرنے تک
ہمارے ہجر کے قصے سیمٹو گے تو لکھو گے
ہزاروں بار سوچو گے ہمیں تحریر کرنے تک

✽ اعجاز احمد رحیل..... ماہی سہا ہویال
خوشی کا غم ہے، نہ غم کی خوشی اب تو
بہت اداس گزرتی ہے زندگی اب تو
کہاں گئے وہ شاسا وہ اجسی چہرے
اجاڑ سی نظر آتی ہے ہر گلی اب تو

✽ قاضی عرفان احمد، ماسٹر جمیل احمد..... چکوال
عطا دیکھی تو صرف رب کی بیگم
ورنہ کون دیتا ہے کسی کو محبوب اپنا
✽ رباض بیٹ..... حسن ابدال
جدائی پہ قائم ہے نظامِ زندگانی بھی
چمک جاتا ہے ساحل سے گلے مل کے پانی بھی

✽ خوش بخت رحمن..... سینٹرل جیل لاہور
صبح آئے اور شام کر چلے
ہم سفرِ زیست تمام کر چلے
✽ مسٹر اینڈ مسز محمد فدر معاویہ..... خانپوال
سب جرم میری ذات سے منسوب ہیں حسن
کیا میرے سوا شہر میں معصوم ہیں سارے

✽ محمد جاوید..... تحصیل علی پور
دل میں دھڑکن ہو جیسے
تو مجھ میں بستی ہے ایسے
✽ زوہیب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
میں اپنے آپ میں نہیں رہتا ہوں اس لئے
چپکے سے کہتا ہے جب وہ، مجھے تم سے یاد ہے

✽ احمد خان توحیدی..... پاکستان اسٹیل، کراچی
لاریب تیری روح کو تسکین ملے گی
تو قرب کے لمحات، میں قرآن پڑھا کر

✽ محمد قاسم رحمان..... ہری پور
یہ راز مجھ پہ کھلا شور میرے اندر تھا
میں سو سکا نہ درپچوں کو بند کر کے بھی

✽ نزمین اعجاز..... فیصل آباد
 صحرا کی سمت جاتے ہو کیوں شہر چھوڑ کر
 ویرانوں کی دل کے نگر میں گئی نہیں

✽ افتخار احمد..... کوٹری
 مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
 لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

✽ اوریس فاطمہ..... میانوالی
 خفا نہیں ہے مگر اس ادا کو کیا کیسے
 پکارتا ہوں تو وہ مڑ کے دیکھتا بھی نہیں

✽ مدحت..... کراچی
 تیرے فراق کے لحوں میں دل نے سوچا ہے
 تیرے وصال کے دن کتنے مختصر ٹھہرے

✽ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی
 انجان لگا ہوں کی یہ مانوس سی خوشبو
 کچھ یاد سا پڑتا ہے کہ پہلے بھی لے ہیں

✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
 زندگی تجھ سے ہمیں کوئی تمنا کب ہے
 اب تو اس آس پہ جیتے ہیں کہ مرنا کب ہے

✽ امیر خان..... راولپنڈی
 چادروں طرف فضا میں اداسی بکھر گئی
 تم کیا گئے کہ رونقِ شام و سحر گئی

✽ امجد عباس..... کوئٹہ
 بھول جانے کا میں کیسے تصور کروں
 میری ہر سانس سے وابستہ ہیں یادیں تیری

✽ محمد اقبال..... کوئٹہ، کراچی
 تلخیاں دے کر ہمیں وہ خود بھی تنہا رہ گیا
 ہم اگر ابرے ہیں تو اس کے پاس بھی کیا رہ گیا

✽ وسیم خان..... حیدرآباد
 مدت ہوئی کہ چشمِ تحیر کو ہے سکوت
 اب جنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں

✽ محمد امجد ریاض..... اقبال نگر، چچہ وطنی
 صرف احساسِ ندامت، اک سجدہ اور چشمِ تر
 لے خدا کتنا آساں ہے مٹانا تجھ کو

✽ سکندر خان چاٹریو، سعد خان چاٹریو..... حیدرآباد
 یہ سال بھی گزرا ہے تیرے پیار کے مانند
 آتے ہوئے کچھ اور تھا جاتے ہوئے کچھ اور

✽ عتیق الرحمن، عمران عارف، علامہ خالد..... فیصل آباد
 میں کر رہا تھا فقط تجربہ محبت کا
 اب ایسی آگ لگی ہے بجھا نہیں سکتا

✽ ڈاکٹر محمد غنصر عباس..... ہڈالی، خوشاب
 اتنا کرو کہ صدف مہیا کرو ہمیں
 نہیں گے گوہر کیسے یہ زم پہ پھوڑیے

✽ قاریا محمد رمضان حسرت الحسنی..... خوشاب
 شام ہوتے ہی چرخوں کو بجھا دیتا ہوں
 دل ہی کافی ہے تیری یاد میں جلنے کے لیے

✽ وقاص امین..... لاہور
 دیکھ دل ناداں ستاروں کی تمنا نہیں رکھتے
 پت جھڑ کے ہاں بہاروں کی تمنا نہیں رکھتے

✽ اطہر حسین..... کراچی
 لوگ بھوکے ہوں تو یہ عقدہ کھلے
 کون کتنا صاحبِ کردار ہے

✽ کمال انور..... کراچی
 یہ تو سچ ہے کہ وہ اسی راہ سے گزریں گے مگر
 کوئی دیکھے نہ انہیں، غم ہوا ہے اب کے

✽ نورین عباس..... پشاور
 دورِ افق پر کھیل گئی ہے کاجل کاجل تاریکی
 پاگل پاگل تنہائی میں کس کی یاد کا دسپ چلے

✽ امتیاز احمد..... لاہور
 اس بیاں میں ہے سایہ بھی گریزاں مجھ سے
 کون دیکھے گا تماشا میری رسوائی کا

مختار شعر و سخن		کوئین ہفت روزہ بزمِ ادب مارچ 2015
نام:	پتا:	



واپسی کا سوال

حقیل حیدر

تعریف ہو یا تنقید بگاڑ اور سدھار... دونوں ہی پیدا کر سکتی ہے بشرطیکہ اس کا درست استعمال کیا جائے ورنہ نتائج آپ کے خلاف بھی نکل سکتے ہیں... جیسا کہ یہاں... ہمیشہ دوسروں کو تنقید کا نشانہ بنانے اور خود کو ہر معاملے میں ”پرفیکٹ“ خیال کرنے والے وقت کے وار سے اس حد تک بے پروا رہتے ہیں کہ گہری کھائی میں گر کر بھی انہیں اپنی کسی غلطی پر پشیمانی کا احساس تک نہیں ہوتا بلکہ انہیں حیرت ہوتی ہے کہ ان کے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔

اختیارات کے زعم میں جلا چھ کزور

لوگوں کا احوال

جب یاد کا آئین کھولوں تو کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں
میں گزرے دنوں کو سوچوں تو.....
اب جانے کس گہری میں سوئے پڑے ہیں مدت سے
میں رات گئے تک جاگوں تو.....
کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں، بہت یاد آتے ہیں،
بار بار آغری لائن کو ڈھراتے ڈھراتے چودھری ناصر نے
دیرے سے نیچے پر سر رکھا تو یادوں نے حقیقت کا روپ
دھار کر اس کی آنکھوں میں بسیرا کر لیا۔
”بھائی نے ناچائز تعلقات کے شک کی بنا پر بہن کو
چار پٹی پر باندھ کر زندہ جلا دیا۔“ ناصر نے بلند آواز میں
اخبار کی ہیڈ لائن پڑھی اور چونک پڑا۔ ”ارے بابا سا گیس!

دور تک ہے یعنی تھی۔

”لیکن بابا سا میں.....!“ ناصر نے کچھ کہنا چاہا۔
”بس!“ چودھری اکرم نے ہاتھ اٹھا کر بولنے سے منع کر دیا۔ ناصر کرسی پر پہلو بدل کر رہ گیا۔ اسی اثنا میں موبائل کی بیل بجی تو چودھری فاخر موبائل کان سے لگائے باپ سے اجازت لے کر باہر اٹھ آیا۔

”وعلیکم السلام! ہاں جناب کیسے ہو؟“ چودھری فاخر نے سلام کا جواب دینے کے بعد گفتگو انداز میں کہا۔ سامنے والا شاید بس جواب کے انتظار میں تھا، وہ لگا تار یوں ہی چلا گیا اور جب کافی دیر بعد چپ ہوا تو فاخر کے حلق سے بے ساختہ قہقہہ بلند ہوا۔ ”یار تو تو لڑا کا بیویوں کو بھی طعنے دینے میں مات دے گیا۔ اچھا یا ر معاف کر دے میری توبہ جو آئندہ اتنا عرصہ تمہیں بتائے بغیر غائب رہوں۔ بس یار کیا کروں زمینوں کا تھوڑا سا مسئلہ تھا تو.....“ چودھری فاخر کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ سامنے والا پھر شروع ہو گیا تھا۔ ”اوہو یار شہزادہ، اب بس بھی کرو کہاناں غلطی ہو گئی اور کتنا سوری کروں؟ اچھا غصہ ٹھنڈا کرو اور بتاؤ کب شادی ہے تمہاری بہن کی؟ میں انشا اللہ ضرور آؤں گا۔“

اس نے کہا اور دوسری جانب کی بات سن کر جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے ٹھیک ہے یار، میں آ جاؤں گا پھر سے نہ شروع ہو جاؤ۔ اوکے!“ جواب سننے کے بعد فاخر نے کہا اور اللہ حافظ کہہ کر کال کاٹ دی۔



چودھری اکرم اور چودھری وقار دونوں بہت گہرے دوست تھے، دونوں نے کم میلی خوشحال گھرانے کی پالیسی پر عمل کیا، خدا نے چودھری وقار کو ایک بیٹے چودھری شہزاد اور ایک بیٹی حرا کی دولت سے نوازا جبکہ چودھری اکرم کو دو بیٹے چودھری فاخر اور ناصر اور ایک بیٹی ثنا سے نوازا۔ دونوں خاندانوں میں بے مثال دوستی قائم تھی، بڑوں کی دوستی کا لگا ہوا یہ پودا آج ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ دونوں چودھریوں کے بیٹوں میں بھی ان ہی کی طرح بہت گہری دوستی تھی، دونوں ایک دوسرے پر جان چمکتے تھے خوب صورتی میں، وجاہت میں لوگ ان کی مثال دیا کرتے تھے۔ لیکن بہت سی خوبیوں کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ جاگیردارانہ نظام میں ترتیب پانے کی وجہ سے ان کی طبیعت میں بھی عیاشی رچ گئی تھی۔ اپنے علاقے میں تو یہ کسی بھی لڑکی کی طرف میلی نگاہ سے دیکھتے تک نہیں تھے جبکہ علاقہ، غیر میں جا کر یہ کسی نہ کسی طرح اپنے جذبے کی تسکین کا سامان پیدا کر

تے تو پاس والے گاؤں کی خبر ہے نا؟“ ناصر نے حیران ہو کر چائے پیٹے ہوئے چودھری اکرم سے کہا۔ چوہی نے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے صرف ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا جس کے چہرے پر اس وقت افسوس اور حیرت کے ملے جلے تاثرات تھے۔

”یقین ہی نہیں آتا کہ ابھی اس قسم کے جاہل لوگ بچتے ہیں جو شک کی بنیاد پر ایک زندہ انسان کو اس قدر بے رحمی سے قتل کرتے ہیں۔ کھوکھلی روایات اور غیرت کے نام پر قتل کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔“ ناصر نے جذباتی لہجے میں کہا۔ چودھری اکرم نے غور سے بیٹے کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھا۔

”بیٹا بات ہوتی ہے تو اس کا بھنگڑ جتا ہے۔ اگر رشیدے نے بیٹی بہن کو زندہ جلایا ہے تو غلطی ضرور اس کی بہن کی ہوگی، تم محسوم ہو تمہیں کیا معلوم آج کل کی لڑکیاں گھروالوں کو بے وقوف بنا کر کس طرح کے کام کر کے اپنے گھروالوں کا ٹملہ تچا کرتی ہیں اور کوئی بھی غیرت مند بھائی ایسے اقدامات کو برداشت نہیں کر سکتا۔“ چودھری نے بہت بار عجب لہجے میں بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

اسی دوران چودھری فاخر، ناصر کا بڑا بھائی زمینوں سے فارغ ہو کر واپس آیا اور سیدھا باپ کو سلام کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھا اور مسکراتے ہوئے بھائی سے پوچھا۔ ”خیریت مزاج برہم کیوں نظر آ رہے ہیں؟“

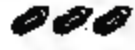
ناصر نے فوراً بھائی کو اخبار کی خبر سنائی اور کہا۔

”دیکھیں نا ادا فاخر، بابا سا میں کہتے ہیں یہ سب ٹھیک ہوا ہے لیکن یہ تو ظلم ہے، صرف شک کی بنا پر کسی کی جان لینا کہاں کا انصاف ہے؟“

”نہیں ناصر، بابا سا میں نے ٹھیک کہا ہے، میں تو کہتا ہوں ایسی لڑکیوں کو پہلے سرعام چوراہے پر کھڑا کر کے لٹ لگائے جا کر، جب عقل ٹھکانے آئے گی ان شریف زادوں کی۔“ چودھری فاخر نے اس قدر نفرت انگیز لہجے میں بات کی کہ بہن میں کھڑی ثنا کا دل پسیلوں میں ایک لمحے کے لیے دھڑکنا بھول گیا۔

ناصر نے حیران نظروں سے بھائی کی جاہلانہ رائے سنی۔ کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ اس کا یہ بڑا بھائی تعلیم یافتہ ہے اور ہاں، تم صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دو فضول باتوں کی طرف دھیان نہ دو، جو ہوا اچھا ہوا، خس کم جہاں پاک۔“ چودھری فاخر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اب کے بھائی کو سمجھایا جس کی حیرت سے کھلی آنکھوں میں

اور بابا سائیں کو تو بتا دو پہلے۔“ ناصر نے اسے گھر کا۔
 ”کیا ہے ادا ناصر کہ میں آپ کو اچھی طرح سے جانتی
 ہوں آپ۔ ایک بار اپنے کمرے میں گھس گئے تو وہاں سے
 آپ کو ہر نکالنا خندق کھودنے کے برابر ہے اور ہاں بابا
 سائیں کہ میں آل ریڈی بتا کے اجازت لے چکی ہوں۔
 اب پلیز چلیں، میں پہلے ہی اتنا لیت ہوگی ہوں۔“
 ثنائے منت کرتے ہوئے باقاعدہ ہاتھ جوڑ لیے تو
 ناصر نے ایک مسکراتی، پیار بھری نگاہ بہن کے چہرے پر
 ڈالی اور بائیک اسٹارٹ کر دی۔



اج کالا جوڑا پاساڑی فرمائش تے
 ذرا پا کے سامنوں آساڑی فرمائش تے
 پورا پنڈال احمد نواز محمدیہ کی آواز سے گونج رہا تھا۔
 نوجوان تو نوجوان، بوڑھے بھی اس آواز پر جموم رہے تھے،
 مردوں کی محفل میں کھانے کی دیکوں کی اشتہا انگیز خوشبو پھیلی
 ہوئی تھی۔
 ”آج ثنا کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گی، خدا ایسی
 دوست کسی دشمن کو بھی نہ دے۔“ حرا بڑبڑاتے ہوئے مسلسل
 کمرے میں پکڑ لگا رہی تھی، اس کا زرتار آج کل اس کے
 شانوں سے نیچے ڈھلک رہا تھا، کانوں میں بھیس سے
 آویزے، بالوں میں گھرے پہنے وہ نظر لگ جانے کی حد
 تک پیاری لگ رہی تھی۔

”ارے..... ارے! بری بات حرا، دوست ہو کر
 دوست کے بارے میں ایسا کہتی ہو؟ انس ٹاٹ فیئر یار!“ ثنا
 نے اندر داخل ہو کر اس کی بڑبڑاہٹ سن کر مسکراتے ہوئے
 کہا اور پھر فوراً ہی اپنی جگہ سے ہٹ گئی کیونکہ حرا نے اسے
 زور سے کٹھن کھینچ کر دے مارا۔

”بد تمیز، جانتی بھی ہو میں تمہارے بغیر کوئی کام نہیں
 کرتی پھر بھی تم.....“ حرا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تو ثنا
 کو ڈھیر ساری شرمندگی نے آن گھیرا۔
 ”حرا، میں تو صبح ہی آجاتی، ادا ناصر کی وجہ سے دیر
 ہوئی۔“ ثنائے پیار سے اس کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر کہا
 تو حرا نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”اچھا دیکھ اب کان پکڑوں کیا؟“ ثنا کو پتا تھا حرا
 فوراً منع کر دے گی لیکن جب حرا نے اثبات میں سر ہلایا تو
 اس نے جھٹ سے حرا کے کان پکڑ لیے اور پھر دونوں ٹھٹھلا
 کے ہنس پڑیں۔



لیا کرتے تھے لڑکیاں ان کی لمبے دار باتوں میں آکر ان کی
 وجاہت پر مرتیں اور یہ نہیں لھے میں اجاڑ کر بنا کسی
 ندامت کے واپس لوٹ آتے جبکہ ناصر ان دونوں کے برعکس
 قتاوہ نہایت سبکی ہوئی اور حساس طبیعت کا مالک تھا اور ان
 کے گھروں کی معصوم گھیاں ثنا اور حرا جو بچپن کی سہیلیاں اور
 ہر از تھیں ان کے لیے کس کائنات ان کے ماں، باپ تھے
 اور بھائی تو ان کا آئیڈل تھے۔ پردے کے معاملے میں
 دونوں خاندان بہت سخت تھے اسی لیے آج تک ایک
 دوسرے کے گھر آنے جانے کے باوجود دونوں خاندانوں
 کے بیٹوں نے سوائے ایک ہلکی سی جھٹک کے ان دونوں کا چہرہ
 نہ دیکھا تھا۔ ایک ہنسی مسکراتی، خوشیوں سے بھرپور زندگی
 کے عکاس تھے یہ دونوں خاندان۔



”افو! میں نے ادا ناصر سے کہا بھی تھا کہ مجھے حرا
 کے گھر جانا ہے پھر بھی اب تک نہیں آئے۔“ ثنا مسلسل
 بڑبڑاتے ہوئے بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔
 ٹرن..... ٹرن..... ٹرن..... اسی دوران فون کی گھنٹی بج
 اٹھی۔ ”سیلبر! سیلبر!.....“ ثنائے ملازمہ کو آواز دی۔ ”پتا
 نہیں کہاں مر گئی۔“ کوئی جواب نہ پا کر اس کو مزید غصہ
 آ گیا۔ مسلسل بچتی گھنٹی کو پہلے تو اس نے نظر انداز کیا لیکن آخر
 اسے اٹھانا ہی پڑا کہ کہیں بابا سائیں کی نیند نہ خراب
 ہو۔ ”ہیلو! کون؟“ اس نے بے دلی سے فون ریسو کیا۔

”تمہری ساس اٹنا کی بچی تو ابھی گھر بیٹھی ہے مجھے لگتا
 ہے میری رخصتی ہو جائے گی تو پھر بھی نہیں آئے گی۔ اگر کچھ
 شرم باقی بچ گئی ہے تو فوراً سے بیشتر میرے گھر پہنچ ورنہ آج
 میرے ہاتھوں تم قتل ہو جاؤ گی۔“ حرا نے ایک ہی سانس
 میں لگا تار بول کے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ ثنا کے ہونٹ
 یکلخت مسکرا اٹھے۔ اچانک ڈور بیل بجی، ثنائے فوراً بھاگ کر
 چادر اوڑھ لی، اسے پتا تھا ادا ناصر ہوں گے اور وہ جانتی تھی،
 ایک بار وہ اپنے کمرے میں گھس گئے تو پھر باہر نکلنے کا نام
 نہیں لیں گے اس لیے بھاگ کر کمرے میں ہی اسے روک دیا
 جہاں وہ اپنی بائیک کھڑی کر رہا تھا۔

”ادا ناصر! اب جلدی سے مجھے حرا کے گھر چھوڑ
 آئیں۔ اب وہ نیچے گالیوں سے لواز رہی ہے اور دیر کی ناں
 تو وہ باقاعدہ مجھے پینے گی۔“ ثنا تیزی سے بولتے ہوئے
 ناصر کے پیچھے بائیک پر بیٹھ گئی۔

”ارے..... ارے ثنا کی بچی! مجھے سانس تو لینے دو
 اتنا تھا ہوا ہوں اور تم ہو کہ آرام بھی نہیں کرنے دے رہیں

آخر ماجرا کیا ہے، یہ آج حرا کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ آخر اتنا کیوں اور کس بات پر رو رہی ہے؟ لاتعداد سوال تھے جو اس کا ذہن چکرارہے تھے۔

”اچھا ٹھیک ہے نہیں بلاتی لیکن تمہیں مجھے رونے کی وجہ بتانی ہوگی۔“ شازم پڑ گئی۔

”میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتی..... اور کر بھی کیسے سکتی ہوں جب میرا دل میری دھڑکن کی اور کے نام منسوب ہو تو خود کو کسی اور کو کیسے سونپ دوں؟ کیسے اپنے جذبات، اپنے احساس کو مار ڈالوں؟ کیسے؟ نہیں ہوگا مجھ سے یہ..... نہیں ہوگا۔“ حرا نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا تو شانے فوراً آگے بڑھ کر اس کے منہ پر بے اختیار ہاتھ رکھ دیا کہ مبادا کوئی سن لے۔

”یا گل ہو گئی ہو؟ تمہیں پتا ہے تم کیا بک رہی ہو؟“ شانے کھٹی کھٹی آواز میں کہا۔

”ہاں..... ہاں جانتی ہوں میں، کیوں کروں میں ایسے شخص سے شادی جس کو میں چاہتی ہی نہیں، کیوں بابا سا میں میری خواہشات کا گلا گھونٹ کر اس ان دیکھے شخص کو مجھ پر مسلط کرنا چاہتے ہیں؟ صرف جائداد کے لیے؟ مجھے جائداد نہیں میرا پیار چاہیے، کیوں نہیں سمجھتا کوئی؟ کیا کروں میں؟ پلیز خدا کے لیے میری مدد کرو خدا.....“ یہ وہ حرا لگ ہی نہیں رہی تھی جسے وہ جانتی تھی حرا پاگلوں کی طرح روتے ہوئے زمین پر بیٹھ گئی اور شانے کے پاؤں پکڑ لیے اور شانے کا تو یہ سن کر کہ حرا کسی اور کو پسند کرتی ہے، اوپر کا سانس اذ پر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا، اسے آنے والے ہر لمحے میں موت دکھائی دے رہی تھی۔ شانے نے فوراً ہی جھک کر حرا کو کندھوں سے تھام لیا۔

”پلیز حرا خود کو سنبھالو، کیوں پاگلوں جیسی بات کر رہی ہو، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہی قسمت میں لکھا ہوگا۔ ہو سکتا ہے جہاں تم چاہتی ہو یہ اس سے بہتر ہو، ناں، بابا اولاد کا برکتو نہیں چاہتے ناں! پلیز حرا اسے اپنا مقدر سمجھ کر قبول کر لو اب کچھ نہیں ہو سکتا، گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے اور پرسوں تمہاری شادی ہے، پلیز حرا کھینے کی کوشش کرو۔“

شانے حرا کو سمجھانے کی ناکام کوشش کی۔

”ہو سکتا ہے۔ سب ہو سکتا ہے۔ پلیز شازم میری مدد کرو، میں اس کے پاس جانا چاہتی ہوں، وہ بہت اچھا ہے تم ملو گی اس سے تو تم بھی مان جاؤ گی کہ میں نے غلطی نہیں کی وہ میرے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے، وہ آج رات پرانی کوئی کے بچھوڑے آنے والا ہے، ہم یہاں سے بھاگ کر لاہور جا کر کورٹ میرج کر لیں گے، اس نے وہاں ایک گھر بھی لے لیا ہے۔ پلیز شازم کسی طرح مجھے یہاں سے نکلنے میں مدد

”یار کیا ہے رنگ زندگی ہے، آج تک اسنے یوریت والے دن میں نے کئی نہیں گزارے۔“ چو دھری قاخر نے صوفے پر نیم دراز ہو کر ناگلوں کو جھلاتے ہوئے کہا۔ ”کتنے دنوں سے نہ رنگین آنچل کی مہک، نہ چوڑیوں کی کھنک، نہ پھیلا ہوا کاجل اور نہ ہی کسی ہرئی کے چیننے کی خوب صورت آواز.....“ آخر میں اس کے لہجے میں عجیب سی خواہش در آئی جسے کوئی بھی نہ جان شریف لڑکی سن سکتی تو یقیناً اس کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ جاتی۔

اس وقت سب دوست شادی کے اس فنکشن میں باقی لوگوں سے الگ کونے میں رکھے صوفوں پر بیٹھے شراب میں مست ہو کر باتیں کر رہے تھے۔ ”ارے میرے شیر بس آج کی رات صبر کر پھر دیکھ کل تیرے لیے کیسی تکی لاتا ہوں۔“ انیس نے نہایت اوجھے پن سے مسکراتے ہوئے کہا تو چو دھری شہزاد نے آنکھیں سکیڑ کر اس کو دیکھا اور ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر ہنس دیا جس سے اس کی وجاہت کچھ اور زیادہ بڑھ گئی۔

”اچھا.....“ اس نے اچھا کو لبہا کھینچ کر طنز یہ انداز میں کہا تو اس کی ہنسی نے انیس کو بھڑکا دیا لیکن وہ اپنے غصے کو ہمیشہ کی طرح دبا کر تھپا اور مسکرا کے کہا۔

”ہنس نے ہنس لے شہزادے، خدا نے اگر تجھے شکل اچھی دی ہے تو اتنا ضرور نہ کر، بے شک لڑکیاں تیرے پیچھے منڈلاتی رہتی ہیں لیکن کم تو ہم بھی نہیں عقل کی کھتی سے دیکھنا اس بار کیسی اہلرا کا شکار کر کے لاتا ہوں۔“ انیس چیلنج کرتے ہوئے غصے سے واٹ آؤٹ کر گیا تو سب ایک دوسرے کو حیران ہو کر دیکھنے لگے۔

شہزاد نے سوالیہ نظروں سے قاخر کو دیکھتے ہوئے کہا

”یار میں نے تو مذاق کیا تھا اسے آج کیا ہو گیا؟“

”چھوڑ یار، فکر نہ کر ٹھیک ہو جائے گا آج اس نے زیادہ پی رکھی تھی۔“ چو دھری قاخر نے تسلی دیتے ہوئے کہا اور چند ہی لمحوں میں انیس کو بھلا کے وہ پھر سے نئے موضوع پر بحث چھیڑ پڑے تھے۔



”دیکھو حرا، مجھے بتاؤ گی نہیں تو تمہاری مدد کیسے کروں گی؟ اب مجھے غصہ آ رہا ہے، بہتر ہوگا اصل بات بتا دو ورنہ میں ابھی آنٹی کو بلاتی ہوں وہ خود ہی تم سے پوچھ لیں گی۔“

شانے سلسل روٹی ہوئی حرا کو آخری دھمکی دی۔

”ایسا مت کرنا پلیز اوہ تو مجھے جان سے مار ڈالیں گی۔“ حرا نے فوراً تڑپ کر کہا۔ شازم کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ

اور چاروں طرف اندھیرے میں آنکھیں بھرا بھرا
 کے ایسے دیکھنے لگے جیسے کسی کی تلاش ہو۔ "کیا وہ آیا ہوگا؟"
 ایک خوفزدہ لرزتی ہوئی آواز نے دوسرے سے پوچھا۔
 "ہاں وہ مجھے بے پناہ چاہتا ہے۔" دوسری آواز نے
 تسلی دی لیکن خوف اس کی آواز میں بھی شامل تھا۔ اچانک
 ان کے پیچھے بھراڑیوں میں ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی تو وہ
 دونوں سایے خوفزدہ ہو کر پیچھے مڑے، ایک تیسرا سایہ ان کی
 طرف لپکا تو وہ دونوں سایے تیزی سے پیچھے ہٹے لیکن جب
 وہ تھوڑی روشنی میں آیا تو انہوں نے اسے پہچان لیا اور پھر
 تینوں کے چہروں پر اطمینان پھیل گیا۔

چودھری فاخر جونہی حویلی سے باہر نکلا سامنے اسے
 چودھری شہزاد کی کروٹا اپنی طرف آتی نظر آئی۔ وہ وہیں
 گیٹ پر رک گیا۔ چودھری شہزاد نے وہیں سے ہاتھ ہلایا
 اور اس کے نزدیک آ کر گاڑی روک دی اور مسکراتے
 ہوئے باہر نکلا۔ "اوسے یار! کدھر رہ گیا تھا۔ نہ فون کیا نہ ملنے
 آئے؟" چودھری فاخر نے بے تکلفی سے چودھری شہزاد کا
 ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"بس یار جانتا تو ہے ناں، شادی والا گھر ہو تو بندہ
 ایک منٹ کے لیے ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتا کبھی یہ کام تو کبھی
 وہ..... بڑے لوگوں کو بھی تو خوش کرنا ہوتا ہے تو ظاہر ہے ان
 کے معیار کے مطابق بھی کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ بڑی
 مشکل سے ٹائم نکال کر تمہیں ملنے آیا ہوں۔ تم سناؤ کیسے ہو
 اور ناصر کہاں ہے آج کل نظر نہیں آ رہا؟" چودھری شہزاد
 نے تفصیلی جواب دے کر آخر میں سوال کیا۔

"یار تمہیں پتا تو ہے وہ پڑھا کو بندہ ہے آج کل
 C.A. کے Exam شروع ہیں وہ لاہور گیا ہوا ہے لگتا ہے
 ٹاپ کرے گا۔" چودھری فاخر کے لہجے میں بھائی کے لیے
 پیار ہی پیار تھا۔

"ہاں یار واقعی، وہ ذہین لڑکا ہے، ارے ہاں، یاد آیا
 تم سناؤ انہیں نے چیخ پورا کیا یا پھر بس ایسے ہی بڑکیں مار رہا
 تھا؟" چودھری شہزاد نے مسکرا کر پوچھا۔

"نہ یار، اس بار تو لگتا ہے اس نے لمبا ہاتھ مارا ہے
 آج صبح ہی اس کا فون آیا تھا، کافی خوش لگ رہا تھا کہہ رہا تھا
 جلد ہی تمہیں ایسی تمہیاں دوں گا جن کے رنگوں میں رنگ
 کے تم خود کو بھول جاؤ گے۔" فاخر نے ایک آنکھ دبا کر شہزاد کو
 مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا واقعی؟ یار ویسے مجھے حیرت ہوتی ہے یہ کہاں
 سے ایسی اہرا میں ڈھونڈ لیتا ہے، دکنے میں کیسی شریف

اس دن کھلا ہوا تھا۔ انہیں کے ذہن میں بچانے کیا سوچ آئی
 اور اس نے دروازے سے ذرا سا پردہ سرکا کے محسن میں
 بھاٹکا اور بھی اس نے چودھری شہزاد کی بہن حرا کو دیکھا جو
 بلاشبہ ایک حسین لڑکی تھی۔ حویلی میں کسی ملازم کے دیکھ لینے
 کے ڈر سے اس نے فوراً پردہ برابر کر دیا اور بتا چودھری کو
 ملے حویلی سے نکل آیا۔ گھر آ کر بار بار حرا کا چہرہ نظروں کے
 سامنے آ جاتا اور پھر اس کے دل میں رقابت کی آگ کو ٹھنڈا
 کرنے کا ایک شیطانی منصوبہ سوچا، اس نے اس کو عملی جامہ
 پہنانے کے لیے اس پر عمل شروع کر دیا۔ اس نے حرا کو اپنی
 محبت کے جال میں پھنسانے کے لیے وہاں کے ایک ملازم کو
 پیسے دے کر خرید لیا، اس ملازم کے توسط سے ایک ملازمہ جو
 زمان خانے کے لیے مخصوص تھی اس سے بات چیت ہوئی وہ
 بھی بیویوں کے لالچ میں انہیں سے مل گئی اور انہیں کا کام
 آسان ہو گیا۔ اس نے حرا پر خوب صورت الفاظ کے جال
 پھینکے نئے نئے ہینترے استعمال کیے اور آخر کار نہ نہ کرتے
 کرتے حرا اس کی اسیر ہوتی چلی گئی۔ انہیں اکثر اسی وقت
 حویلی جاتا جب چودھری شہزاد گھر نہ ہوتا ہینٹھک میں ہی وہ
 حرا سے مل لیتا تھا اور اس کا انتظام وہ ملازمہ کرتی تھی۔

پہ سب چودھری شہزاد کی ناک کے نیچے ہوتا رہا اور
 اسے پتا بھی نہ چلا کہ انہیں اس کے ساتھ کیسا ٹھیل، کھیل رہا
 ہے۔ جس روز انہیں نے چودھری فاخر اور شہزاد کو چیلنج کیا اسی
 روز اس نے انتہائی سفاک فیصلہ کر لیا کہ اب وہ حرا سے محبت کا
 تاوان مانگے گا اور جب وہ اس کی دسترس میں ہوگی، وہ اسے
 چودھری فاخر کے حوالے کر دے گا اور جب تک چودھری
 شہزاد کو پتا چلے گا تب تک پانی سر سے اونچا ہو چکا ہوگا۔

رات کی تاریکی میں دو سائے تیزی سے چلتے ہوئے
 پرانی حویلی کی جانب رواں دواں تھے۔ اس قدر خاموشی
 میں کہیں کہیں کوئی خشک پتا قدموں تلے آ کر چرما کر رہ
 جاتا اور خاموشی میں خلل ڈالتا یا پھر کہیں کہیں کپڑوں کے
 بھونکنے کی آواز اس ماحول کو زیادہ خوفناک بنا رہی تھی۔ ان
 دونوں سایوں کی چال میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی اور ان کا
 انداز ایسا تھا جیسے کوئی ان کے پیچھے ہو اور انہیں پکڑے
 جانے کا ڈر ہو دونوں نے ایک دوسرے کو مضبوطی سے پکڑ
 رکھا تھا، عجیب سروقتا تھی جس سے ان کی ریڑھ کی ہڈی میں
 بار بار ایک خوف کی لہر اٹھتی تھی، پیشانی پر خوف سے بھونٹا
 پینا، آنکھوں میں اتجانے خدشات لیے ان کے قدم بار بار
 ڈگمگا جاتے تھے اور لبوں پر مسلسل خدا سے دعا مانگتے دونوں
 سائے پرانی حویلی کے قریب پہنچ کر رک گئے۔

میری منزل مل گئی، آپ ہمارے لیے واقعی خدا کی طرف سے بھیجا ہوا فرشتہ ثابت ہوئی ہیں اور جس طرح آپ نے دوستی کا حق ادا کیا ہے میں تا عمر اس کے لیے آپ کا احسان مندر ہوں گا۔“ اس کے لہجے میں بلا کی عاجزی تھی لیکن اس کی آنکھیں اس کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں پھر اس نے تیزی سے پلٹتے ہوئے حرا سے کہا۔

”حرا، جلدی کرو گاڑی میں بیٹھو اب تک تمہیں ڈھونڈنے کے لیے سب روانہ ہو چکے ہوں گے۔ ایسا نہ ہو ہم پکڑے جائیں اور شاہ، آپ بھی گاڑی میں بیٹھو راستے میں محفوظ مقام پر آپ کو اتار دوں گا جہاں سے آپ آسانی سے واپس گھر جا سکیں۔“ انیس نے تیزی سے بولتے ہوئے گاڑی کا اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ شاہ کو وہ عجیب سا لگ رہا تھا، ایک انجانا سا خوف تھا جسے وہ کوئی نام نہ دے سکی پھر وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئیں اور گاڑی ایک جھکے سے اسٹارٹ ہو کر چل پڑی۔

”شاہ جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ بہت کچھ غلط ہونے والا ہے۔“ حرا نے گاڑی میں بیٹھ کر دندو سے باہر جھانکتی شاہ کے کان میں سرگوشی کی تو شاہ جو پہلے ہی بہت خوفزدہ تھی اور صبح یا غلط کا فیصلہ نہ کر پارہی تھی، حرا کی بات سن کر اس کا دل پہلے سے زیادہ شدت سے کانپنے لگا اور وہ ابھی نظروں سے اسے ہٹنے لگی۔

جبکہ ادھر گاڑی چلاتے ہوئے انیس ان کے اندیشوں سے بے خبر ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ سجائے کار ڈرائیو کر رہا تھا، اس وقت خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

”اس ہار تو لگتا ہے تقدیر میرا بھر پور ساتھ دے رہی ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ ”ارے واہ رے مالک! سچ کہتے ہیں لوگ، دینے والا جب بھی دیتا ہے پھیر پھاڑ کے دیتا ہے۔“ اسے لگ رہا تھا جیسے برسوں سے اس کے دل میں جو رقابت کی آگ جل رہی تھی اس کے ٹھنڈا پڑنے کا وقت آ گیا ہے۔

”تم دونوں جھک گئی ہوگی یہ لو پانی پی لو اور آرام سے بیٹھو۔“ اس نے پانی کی بوتل ان کی طرف بڑھائی جسے انہوں نے بلاچوں چراں ہاتھ بڑھا کر تمام لیا اور پانی پینے لگیں۔ پانی پیتے ہی ان کا سر بھاری ہونے لگا، دونوں نے پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن کچھ کہنے سے پہلے ہی اندھیرے کی آغوش نے انہیں اپنی پتاہوں میں لے لیا۔

زادیاں بنی پھرتی ہیں اور عمال دیکھو ذرا ان کے اے ہیوا کہاں کھو گئے؟ ابھی سے ان لکھات میں کھو گئے ہو کیا؟“ شہزاد نے تھفر سے ان لڑکیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے قاخر کو سوچ میں ڈوبادیکھ کر مسکراتے ہوئے اس کے آگے چنگی بھائی۔

”نہیں یار!..... میں بس انیس کے بارے میں سوچ رہا تھا، آج اس کا لہجہ بہت عجیب تھا، مجھے صبح سے عجیب سی بے چینی ہو رہی ہے۔“

”چھوڑو یار کنسول فینشن..... جو بھی ہے فائدہ تو ہمارا ہی ہے نا۔“ شہزاد نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ پھانسی مار کر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

انیس کی عیار، چھوٹی سنہری آنکھیں اپنی کامیابی پر خوش سے چمک رہی تھیں۔ ”اتنی دیر لگا دی، میں تو مایوس ہو گیا تھا مجھے لگا میں نے تمہیں کھو دیا ہے۔“ انیس نے لگاوت بھرے انداز میں لہجے میں پریشانی پیدا کرتے ہوئے حرا کے ہاتھ تمام کر آنکھوں سے لگا لیے۔

”تم جانتے تو ہو باہا سائیکس کے لوگ جگہ جگہ پھرادے رہے تھے۔ میرا کلنا تو واقعی بہت مشکل تھا اگر شاہ میری مدد نہ کرتی تو میں شاید واقعی تم سے دور ہو جاتی۔“ حرا نے پر خلوص نظروں سے اپنی بہن جیسی دوست کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”شاہ! انیس نے چونک کر چادر میں لپٹی ہوئی لڑکی کو دیکھا جس کی چادر تک خوف سے لرز رہی تھی۔

”ہاں، یہ شاہ ہے..... جو دھری اکرم کی بیٹی اور میری اکلوتی دوست۔“ کچھ لو آج یہ ہمارے لیے فرشتہ ثابت ہوئی ہے۔“ حرا کی آنکھوں میں خوشی سے نمی پھیل گئی لیکن انیس تو اس کے پہلے جھلے پر ہی انک گیا کہ شاہ جو دھری اکرم کی بیٹی ہے جبکہ شاہراہ سیدی ایک طرف کھڑی آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کے دل دو ماغ میں ایک جنگ سی چھڑی ہوئی تھی، وہ ابھی تک خود کو نہیں قائل کر سکی تھی کہ دوستی کی خاطر جو اس نے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے وہ ٹھیک ہے۔ اس کی آنکھوں میں واضح طور پر سوچ کی پرچھائیاں لرزاں تھیں۔ انیس نے بے اختیار ٹٹوٹی نظروں سے شاہ کے سراپے کا جائزہ لیا اور پھر اچانک اس کی آنکھیں ایک شیطانی خیال سے چمک لگیں ”یعنی ایک تیر سے دو شکار“ اس نے مسکراتے ہوئے دونوں کو دیکھا۔ پھر شاہ کی طرف ایک قدم بڑھ کر سر جھکا کے کہا۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ، آپ کی وجہ سے مجھے

”ایسے تھوڑے ہی ان شہزادوں کے ہاتھ تمہیں لگنے دوں گا پہلے اپنے مال سے خود بھی تو قائمہ اٹھاؤں۔“
اس نے نفرت سے کہا اور اس کی حریمانہ نگاہیں ان کے جسموں کا طواف کرنے لگیں جبکہ وہ دونوں بد نصیب اپنے بدلتے مقدر کی خوفناک سیاقی سے بے خبر ہوش سے بے گاتہ تھیں۔



سچ کہا ہے کسی نے اولاد، والدین کے لیے بہت بڑی آزمائش ہوتی ہے اگر فرما نبرداری ہے تو والدین کے لیے نفرت اور عزت کا باعث ہوتی ہے اور اگر نافرمان ہو تو ذلت کا باعث بنتی ہے۔

شادی والے گھر میں ایک کبرام بپا تھا، خوشیوں کا ماحول غم میں بدل گیا تھا۔ چودھری صاحب کے کارندے بھوکے شکاری کتوں کی طرح حرا اور شاکی بوسوگم رہے تھے۔ علاقے کے لوگوں میں طرح طرح کی باتیں ہورہی تھیں، حرا کے بل بھر کے جذباتی فیصلے نے اس کی اپنی اور والدین کی عزت کا جنازہ نکال دیا۔ چودھری صاحب کے بیٹوں سے حویلی کے درو دیوار گونج اٹھے کسی کی آنکھ میں چودھری صاحب کے لیے ہر روزی تو کئی آنکھیں واضح مسخر اڑاتی ہوئی نظر آئیں جیسے وہ کہہ رہی ہوں کہ اسی کو مکافات عمل کہتے ہیں۔

”مجھے مر رہا یا زندہ کسی بھی حال میں وہ لڑکی چاہیے۔“
چودھری وقار کی گردن آواز نے حویلی کے درو دیوار کو ہلا کے رکھ دیا۔ ”اور اس بے غیرت، کتے کی اولاد لڑکے کو یہاں لانے کی ضرورت نہیں آتی ہی اس کی بوٹیاں کر ڈالو۔“ وہ دونوں ملازم اور ملازمہ جنہوں نے انہیں کا ساتھ دیا تھا انہیں اپنی واضح موت نظر آرہی تھی، انہوں نے چپکے سے سامان باندھا اور حویلی سے بھاگ گئے۔ جب چودھری وقار کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے فوراً انہیں پکڑ کر واپس لانے کا حکم دے دیا۔ شام تک اس کے حکم کی تعمیل ہو گئی۔ جب وہ ان کے سامنے پہنچے تو ان دونوں کی حالت ابتر تھی چودھری کے کارندوں نے انہیں مار مار کے ادھ موا کر دیا تھا۔ چوہری کو سامنے پا کر دونوں اس کے پاؤں پر گر پڑے، چودھری نے ٹھوکر مار کر دونوں کو پیچھے دھکیل دیا۔

”چودھری صاحب ہمیں معاف کر دیں لالچ نے ہمیں اندھا کر دیا تھا، ایک بار معاف کر دیں آپ کو خدا کا واسطہ.....“ ملازم نے گڑگڑا کر کہا پھر سے چودھری کے پاؤں پکڑے۔

”انا دونوں کے ٹکڑے کر کے کتوں کو کھلا دو۔“
چودھری نے سفاک انداز میں حکم دے کر نفرت سے ان پر

تھوک دیا۔
”اس کہنے کا کیا بنا؟“ پھر چودھری نے پلٹ کر اپنے خاص ملازم سے پوچھا۔
”وہ بھی پکڑا جا چکا ہے بشرے کو بھیجا تھا بس آنے والے ہوں گے۔“
یہ سن کر چودھری کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ”جیسے ہی لے آئیں فوراً مجھے بتانا۔“
”جو حکم سائیں!“ ملازم نے موذی ہو کر جواب دیا۔



حرا نے خود کو اس شخص کے سامنے بے بس محسوس کیا وہ جتنا خود کو اس سے چھڑانے کی سعی کرتی اتنا ہی وہ اس پر حاوی ہوتا جا رہا تھا اور پھر آخر اس کی مزاحمت دم توڑ گئی۔ سچ کہتے ہیں نفس کی سرکشی انسان کو پاتال میں دھکیل دیتی ہے، اب حرا کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ لڑکیاں جو اپنی عزت کی حفاظت نہیں کرتیں خود کو نفس کا قلام بنا لیتی ہیں ان کا یہی انجام ہوتا ہے۔

اپنی بے بسی پر حرا رونا تک بھول گئی، اسے لگا وہ ایک زندہ لاش کی طرح ہے جس کو جانور نوح رہا ہے اس کے تمام احساسات جیسے مفلوج ہوتے جا رہے تھے یاد تھا تو صرف اتنا کہ کس طرح اس نے جذبات میں آ کر والدین اور اپنی عزت کو روند ڈالا، کس طرح اس نے اپنے نسوانی وقار کی بجلیاں نکھیر دیں اور پھر آہستہ آہستہ اس کا ذہن اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا اور نجانے کتنی دیر بعد اس کی آنکھ کھلی تو وہ کافی دیر خالی خالی نظروں سے چھت کوکتی رہتی جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو کہ وہ کہاں ہے؟ پھر اس کی نظر قریب سوئے وجود پر پڑی تو سب کچھ ایک دم ظلم کی طرح اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ اس نے بے ساختہ چودھری وقار کے ہاتھ کو خود سے پرے ہٹایا، اس کا لباس پھینچ کر اعلان کر رہا تھا کہ وہ اپنی عزت، اپنا نسوانی وقار کھو چکی ہے۔ حرا نے بے پناہ نفرت سے اس شخص کو دیکھا جو اس کی عزت سے کھیل کے چین سے سو رہا تھا۔ حرا کا سر چکرانے لگا، اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اس کا یقین تھا کہ محبت پاکیزگی کا دوسرا نام ہے۔ کیسی محبت کا اس نے ہاتھ تھاما جس نے اسے جنت سے جہنم میں دھکیل دیا۔ مگر یہ اچانک اس کی نظر بچلوں کی نوکری میں رکھی ہوئی چھری پر پڑی اس کے وجود میں جوار بھانا سا اٹھا، اس نے جنونی انداز میں جھپٹ کر چھری اٹھالی اور پھر پلٹ کر پے درپے دربار کے چودھری وقار کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

ہوئے کہا۔ حرا کا نام سننے ہی ثنائے حرم تک کر حیران نظروں سے چوہ دھری شہزاد کو دیکھا جس کی آنکھیں اس وقت لال انگارہ بنی ہوئی تھیں۔

”کون..... کون تھی وہ لڑکی؟“ دوسری طرف کی بات سننے کے بعد چوہ دھری شہزاد نے غصے سے پوچھا۔ ”ثنائے ہم کر شہزاد کو دیکھا۔“

”ثنا!“ جواب سننے کے بعد اس نے فوراً ثنا کی طرف دیکھا، کیونکہ انیس نے اس لڑکی کا نام بھی یہی بتایا تھا۔ ”حلیہ کیسا تھا؟“ چوہ دھری شہزاد نے پوچھا۔ ”بس بابا سامیں بس..... کافی ہے، یوں سمجھیں حرا لگی۔“ اس نے غور سے ثنا کو دیکھتے ہوئے کہا اور موہاٹل ایک طرف پھینک دیا۔ ثنا کو ایسا ڈاٹھیسے روح اس کا ساتھ چھوڑ کر جا چکی ہو۔ چوہ دھری شہزاد تیر کی طرح لپک کر اس کی طرف آیا۔ ”بولو کہاں ہے حرا؟ بولو کہاں ہے؟ میں جانتا ہوں، تم وہی ہو جس نے اس کی بڑوکی۔ بتاؤ ورنہ ایسا حشر کروں گا کہ آنے والی نسلیں بھی پتہ مانگیں گی۔“ اس نے غصے سے ثنا کے بالوں کو ٹھسی میں جھڑتے ہوئے کہا۔ اس کا ذہن یہ بات تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ انیس نے اسے دھوکا دیا ہے، نہ ہی یہ بات اس کے ذہن کے کسی گوشے میں آئی تھی کہ انیس نے جو دھری لڑکی اس کے دوست کو دی ہے وہ اس کی بہن حرا ہے۔ تکلیف کی شدت سے ثنا کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے لیکن خوف کی شدت سے اس کی زبان نے بٹنے سے انکار کر دیا۔

”بولو جواب دو کہاں ہے حرا؟“ چوہ دھری شہزاد نے ایک زوردار جانشا مارا جس سے ثنا کے ہونٹوں سے خون بہنے لگا لیکن وہ پھر بھی چپ رہی۔ ”تم ایسے نہیں بتاؤ گی.....“ اس نے بیلٹ اتار لی اور جنونی انداز میں ثنا کو پٹنے لگا، جہاں جہاں بیلٹ لگتی کپڑے پھٹ جاتے اور خون رسنے لگتا۔

”مت مارو مجھے..... خدا کے لیے مت مارو..... میرا کوئی قصور نہیں۔“ ثنائے چیختے ہوئے کہا اور پھر اسے شروع سے آخر تک ساری کہانی سنا ڈالی کہ کس طرح انیس نے انیس دن کا دیا، پہلے اس نے خود حرا کی عزت تار تار کی پھر اپنے دوست چوہ دھریوں کے بیٹوں کے لیے ادھر لے گیا۔ ساری روداد سن کر چوہ دھری شہزاد کا چہرہ لٹھے کے مانند سفید ہو گیا۔

”تمہارا مطلب ہے تم چوہ دھری قاخر کی بہن ہو اور میری بہن کو انیس نے اس وقت چوہ دھری قاخر کے پاس..... نہیں..... نہیں، یہ نہیں ہو سکتا.....“ چوہ دھری شہزاد کی تم کی شدت سے آواز بیٹھ گئی۔ اسے لگا زمین آسمان ایک ہو گئے ہیں پھر اس نے اچانک

ثنائے کسمائے کے جب آنکھ کھولی تو اس نے کسی شخص کو خود پر جھکے ہوئے دیکھا، اس کی دھڑکن کی رفتار ایک دم سے تیز ہو گئی، اس نے پھرتی سے اس شخص کو بیڈ پر دھکا دے کر کھڑا ہونا چاہا لیکن وہ شاید کوئی گھاک کھلاڑی تھا۔ اس نے فوراً ثنا کو بازو سے کھینچ کر بیڈ پر واپس گرا دیا اور اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے کر اسے خود سے اور قریب کر لیا۔ ”چھوڑ..... چھوڑو مجھے.....“ ثنا کی آواز کپکپائی، اس نے دونوں ہاتھوں کی قوت سے اسے دور کرنا چاہا۔ چوہ دھری شہزاد کو ایسا لگا جیسے مندر میں گھنٹیاں بج اٹھی ہوں، اس نے جھٹکے سے ثنا کو بالوں سے پکڑ کے اس کا چہرہ اوپر کیا۔ ”کیا کہا ذرا پھر سے کہو۔“ اور یہ کہہ کر نظرس اس کے چہرے پر جھنک گئیں، وہ مصور کا شاہکار تھی۔

”خدا کا واسطہ چھوڑ دو مجھے، جانے دو پلیز! میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں مجھے گھر جانے دو، کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟“

بے بسی سے ثنا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ چوہ دھری شہزاد بے خود سا اسے نکلے جا رہا تھا۔ اس کی تم آنکھیں، کپکپاتے ہونٹ، ماتھے پر پستے سے بھگی ہوئی چند لٹیں..... اس کا دل چاہا یہ سب کچھ ہمیشہ کے لیے بس اس کا ہو جائے صرف اسی کا بے اختیار اس نے اپنی انگلیوں کے پوروں سے ثنا کے گالوں پر بچتے آنسو صاف کیے۔ اس نے بھر پور مزاحمت کی لیکن چوہ دھری شہزاد کے سامنے بے بس ہو گئی مگر چوہ دھری شہزاد کی گرفت اس کے گرد مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔

اس کے ہونٹوں کا لٹس آہستہ آہستہ ثنا کی گردن تک پہنچ گیا تو ثنا جی جان سے کانپ کر رہ گئی اور پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور بہک جاتا، موہاٹل کی مسلسل بھتی رنگ نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ چوہ دھری شہزاد کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی ثنا تڑپ کر اس کے بازوؤں کے حصار سے نکل کر دوعار کے کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئی۔ چوہ دھری شہزاد نے بہت دہشتی سے اس کے کپکپاتے وجود کو دیکھا جو اس وقت اور زیادہ قیامت زحار ہا تھا۔

”ہیلو!“ اس نے ثنا کو اپنی نظروں کی گرفت میں لیتے ہوئے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف بابا سامیں کی آواز سننے ہی ایک دم مودب ہو گیا ”جی بابا سامیں! کیا..... کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ یہاں نہیں ہو سکتا..... حرا ایسا نہیں کر سکتی، وہ ہمارا خون ہے ہمارا..... وہ اس طرح عزت نہیں اچھا ل سکتی.....“ چوہ دھری شہزاد نے تم وغصے کی شدت سے چیختے

مچل کی دراز سے ہسپتال نکالا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔



واپسی کا کوئی سوال نہیں گھر سے نکلے ہیں آنسوؤں کی طرح! چودھری شہزاد کے باہر نکلنے ہی ثنائے فوراً آگے بڑھ کر دروازے کو کھڑی لگا دی۔ ”یا اللہ رحم! کیا کروں میں؟ ادا فاخر اور بابا سائیں کا پتہ نہیں کیا حال ہوگا، کتنا پریشان ہوں گے وہ اور جب انہیں پتا چلے گا مرے ساتھ..... نہیں..... نہیں..... ادا فاخر تو یقیناً مجھے مار ڈالیں گے اور اگر انہوں نے کچھ نہ کہا تو لوگوں کے طعنے مجھے جینے نہیں دیں گے۔ لیکن میرے مالک! آپ کو تو پتا ہے، میرا کوئی دوش نہیں میں تو..... میں تو صرف اپنی دوست کی مدد کر رہی تھی یا میرے مولا! میری مدد فرما یہ کیا امتحان ہے؟ یا اللہ حرا کو اپنی حفظ و امان میں رکھنا پتا نہیں اس کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ وہ ان حالات سے کیسے نمٹے گی۔“ ثنائے مسلسل ہی روتے ہوئے دعا میں مانگ رہی تھی۔ روتے روتے اس کی ذہنی روایک ہی بات پہ اٹک گئی اور وہ ایک ہی بات کی تکرار کرنے لگی۔

”میری وجہ سے میرے ویر اور بابا سائیں کا مر شرم سے جھک گیا ہے، مجھے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں..... کوئی حق نہیں..... کوئی حق نہیں۔“ اور پھر اس نے اپنی ساری کاٹھ کی چوڑیاں اتاریں اور انہیں توڑ کے پھانک لیا۔

”بابا سائیں! مجھے معاف کر دینا، میں آپ کے گھر کی زینت نہ بن سکی۔“



حویلی کے خانے میں چودھری اکرم اور چودھری وقار کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے امیں رسی سے بندھا ہوا زمین پر آڑھے ترچھے انداز میں لیٹا ہوا تھا، جگہ جگہ سے اس کی لمبیں پھنی ہوئی تھی جسم سے خون رس رہا تھا۔

”ہوش میں لے آؤ اس بد ذات کو.....“ چودھری اکرم نے اپنے ملازم کو حکم دیا۔ انہیں کے حلق میں پانی اٹھایا گیا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

چودھری وسا کو دیکھ کر خوف سے اس کی حالت پتلی ہو گئی۔ چودھری وقار چلتے ہوئے اس کے پاس آیا اور جھٹکے سے اس کے بال ٹھٹی میں پکڑ کے کہا۔ ”کہاں ہیں ہماری لڑکیاں؟ کیا کیا تو نے ان کے ساتھ؟“

چودھری اکرم کو چودھری وقار سے پتا چلا تھا کہ ان کی بیٹی بھی ساتھ بھاگ گئی ہے تو وہ غصے سے فوراً ان کی طرف آیا تاکہ دونوں مل کر ان کو ڈھونڈوا لیں اور اپنے ہاتھوں سے

انہیں موت کے گھاٹ اتار سکیں کیونکہ انہوں نے اپنے باپ کا شملہ بچا کر دیا تھا، اب سزا کی حق دار نہیں وہ۔

نفرت اور جلال سے چودھری اکرم کا جسم کانپ رہا تھا اس نے بھی آگے بڑھ کر زور سے انہیں کے منہ پر لانت ماری اور زخموں پر تمک چھڑک دیا۔ انہیں بے آب پھلی کی طرح تر پنے لگا اور تڑپ تڑپ کے رحم کی بجیک مانتے لگا۔

”بتاؤ ہماری لڑکیاں کہاں ہیں؟ بتاؤ، ورنہ اس سے بھی بھیا تک موت مرد گے۔“ چودھری وقار نے گرجدار غصیلے لہجے میں کہا تو انہیں نے اٹک اٹک کر تمام حال کہہ سنایا جسے سنتے ہی دونوں چودھری کے چہروں پہ موت کی زردی چھا گئی۔

چودھری وقار نے کھڑے کھڑے دیوار کا سہارا لیا اور دل میں درد محسوس کر کے بیٹھتا چلا گیا، ملازموں نے فوراً بڑھ کر اسے قہام لیا لیکن اس کی، آنکھیں بند ہوتی گئیں۔ خانے میں شور مچ گیا۔ ملازموں نے فوراً چودھری وقار کو اٹھایا اور اسپتال کی طرف بھاگے۔ اس تمام عرصے میں چودھری اکرم بن دماغ کے ساتھ انہیں کو یک ٹک دیکھتا رہا اور پھر اچانک ان نے ہسپتال نکال کر تمام گولیاں انہیں کے سینے میں اتا دیں۔



چودھری شہزاد انتہائی تغیر ڈرائیوٹک کرتے ہوئے چودھری فاخر کے فارم پر پہنچ گیا۔ اس جگہ کا چودھری شہزاد کے علاوہ صرف انہیں کو پتا تھا کوئی بھی اس قسم کا کام ہوتا، اس فارم پر ہی ہوتا تھا۔ فارم میں داخل ہو کر وہ تیزی سے ہال کمرے کی طرف بڑھ کر سے گا دروازہ بند تھا اس نے دروازہ بجانا شروع کر دیا لیکن چودھری فاخر نے کوئی جواب نہ دیا تو چودھری شہزاد کا غصہ انتہائی حدوں کو چھونے لگا آخر اس نے غصے سے لکڑی کے دروازے کو بجا بجا کر اس کی کنڈی توڑ ڈالی اور طوفان کی طرح اندر داخل ہو گیا لیکن اندر داخل ہوتے ہی حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔

سامنے ہی خون میں لت پت چودھری فاخر کی لاش پڑی ہوئی تھی اور قریب ہی حرا اپنے لباس سے بے پردا خاموش نظروں سے اس کی لاش کو دیکھ رہی تھی۔

”..... یہ سب کس نے کیا ہے؟“ چودھری شہزاد سے منہ سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔ لیکن حرا کی پوزیشن میں پھر بھی کوئی فرق نہ آیا۔ ”حرا!“ چودھری شہزاد نے ایک بار پھر اسے پکارا اور آگے بڑھ کے اس کو چادر اوڑھا دی، اس کو اب سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔

انہیں ہے؟ نہیں۔ ہم ہیں بابا سامیں، ہم..... بابا لڑکیاں
نازک آنگینوں کی طرح ہوتی ہیں جنہیں سنبھال کر بہت
احتیاط سے رکھا جاتا ہے، یہ ان نرم شاخوں کی طرح ہوتی
ہیں، جنہیں پیار سے جھڑپا چاہیں موڑ دیں اور سختی سے موڑیں
تو ٹوٹ جائیں گی اور ہم نے بھی یہی کیا، ہم نے بھی سختی کی
اور حرا پر اپنی مرضی مسلط کرنا چاہی اور اس سے اس کی
خواہش تک نہ پوچھی..... اور دوسری وجہ یقیناً ہمارے اپنے
اعمال بھی ہیں کہ ہم جیسے مرد جو اپنے رشتوں کا تو احترام
کرتے ہیں لیکن دوسروں کی بہو، بیٹیوں کو اپنا مال سمجھتے ہیں
، یہ نہیں سوچتے کہ جس طرح ہماری سوچ اس قدر گھٹیا اور غلیظ
ہے تو یقیناً باقی مردوں کی بھی ہماری بیٹیوں کے بارے میں
یہی سوچ ہو سکتی ہے اور بابا سامیں! میں بھی انہی مردوں میں
شامل تھا اس لیے مجھے بھی اپنے کیے کی سزا ملنی چاہیے۔

بابا سامیں!

میں بھول گیا تھا فرمان خدا کو کہ:

”بدکار عورتیں بدکار مردوں کے لیے ہیں اور بدکار
مرد بدکار عورتوں کے لیے، اور پاک عورتیں پاک مردوں
کے لیے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے۔ پاک
دامن رہو تمہاری عورتیں پاک دامن رہیں گی بے شک زنا
ایک قرض ہے جس نے بھی اسے لیا تو ادائیگی اس کے گھر
والوں ماں، بیوی، بہن، بیٹی سے ہوگی، اے ابن آدم!
اگر تو عقل مند ہے تو جان لے پس جو زنا کرتا ہے
اپنے گھر کی طرف راستہ دیتا ہے۔“

وہ راستہ میں نے خود پایا اپنے گھر کی طرف۔ میری حرا
تو محصوم تھی۔

بابا سامیں!

میں ساری عمر اپنے جرم کی یاداش میں ضمیر کی داکتی
ہوئی آگ کی لپٹوں میں نہیں جی سکتا۔ مجھے معاف کر
دینا..... مجھے معاف کر دینا..... شاید..... شاید اللہ کی ذات
کو مجھ گناہ گار پر ترس آجائے، میرے لیے دعا کیجیے گا۔

نقطہ

آپ کا گناہ گار بیٹا۔“

مرنے سے پہلے جو دھرمی شہزاد نے باپ کے نام خط
لکھ کر خود کو موت کے اندھیروں کے حوالے کر دیا۔
ایک ہی علاقے میں چار جنازے لوگوں کے لیے
”دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو“
کی تفسیر پیش کر رہے تھے۔

”بابا بابا.....“ اچانک حرا نے قہقہے لگانا شروع کر
دیے۔ جو دھرمی شہزاد نے چونک کر بہن کو دیکھا، پھر وہ ہنستے
ہنستے بے تحاشا رونے لگی، ایسے لگتا تھا جیسے اس کی ذہنی رو
بہک گئی ہوگی، وہ بے تحاشا ہنستی تو کبھی رونے لگتی۔ شہزاد بہن
کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا اس نے آگے بڑھ کر اسے
چپ کرانے کی کوشش کی تو وہ کرنٹ کے مانند پیچھے ہٹی۔

”ہاتھ مت لگانا مجھے..... ہاتھ مت لگانا، میں تمہیں
بھی مار ڈالوں گی بابا بابا..... مار ڈالوں گی..... م م میں.....
سب کو مار ڈالوں گی بابا بابا بابا..... اور پھر اس نے خود کو مارنا
شروع کر دیا اور اپنے بال کھینچنے لگی۔“ ایسا ہی ہونا چاہیے مجھ
جیسی لڑکیوں کے ساتھ..... ایسا ہی ہونا چاہیے۔“

جو دھرمی شہزاد بہن کی حالت دیکھ کر کتنے ہی لمحے اسے
بے یقین نظروں سے نکتا رہا اور پھر جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا
اس نے ہسٹول ڈالا ہاتھ سیدھا کر کے حرا کو زندگی کی قید سے
رہائی دے دی۔ جو دھرمی شہزاد کا پورا جسم ہولے ہولے کانپ
رہا تھا اس نے آہستہ سے بڑھ کر دیوار کا سہارا لیا، ہسٹول اس
کے ہاتھ سے نکل کر گر گیا۔ پھر وہ چلتا ہوا بہن کے نزدیک آیا
اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کے بہن کا سر گود میں رکھا۔

کافی دیر وہ خالی خالی نظروں سے بہن کا چہرہ دیکھتا رہا۔
وہ سوئے ہوئے محل کی شہزادی لگ رہی تھی جو بس ابھی
نیند سے جاگنے والی ہو، اسے لگا وہ ابھی اٹھ کر پوچھے گی۔ ”کیا
ہوا شہزاد لالہ؟“ اب ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟ آپ کی حرا کو
کچھ نہیں ہوا۔“ اور پیار سے ہمیشہ کی طرح مسکرا کے اس کے
گلے میں بانہیں ڈال دے گی مگر وہ اب خاموش تھی۔ حرا کے
چہرے پر بچوں کی سی مصومیت تھی وہ کافی دیر بہن کے بالوں
میں، اس طرح پیار سے ہاتھ پھیرتا رہا جس طرح وہ پیار سے
نیند سے جاگیا کرتی تھی۔ آج اس کی زندگی کا کل سرمایہ اس کے
ہاتھوں سے لٹ گیا تھا پھوڑی دیر بعد کانپتے ہاتھوں سے اس
نے ہسٹول اٹھا کر اپنی کپڑی پر رکھ کے فریگروا دیا۔

اس رات خوب بارش ہوئی ایسا لگتا تھا آسمان بھی ان
کے غم میں شریک ہے اس لیے خوب کھل کے رو رہا ہے۔

●●●

”بابا سامیں!

اپنے اس گناہ گار بیٹے کو اس کی آخری غلطی سمجھ کر
معاف کر دینا، میں حرا کو اس حال میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر
وہ زندہ رہتی تو اس کی زندگی جہنم سے بھی بدتر گزرتی۔ نہیں
بابا سامیں، میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

کیا آپ کو لگتا ہے کہ حرا کے ایسا کرنے کا ذمے دار



کی الدین نواب

پندرہویں نسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پر جوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا توڑ س قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا باد و باران کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم آیر کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنا یا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر ک لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی ہریان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پہنک سکتی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تخیل اور لطیف جذبوں میں سموٹی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی جلن میں رنگین و سنہلگین لمحات کی لمحہ لمحہ رو ناکو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تخیل خیز سنگ۔

کے ہر گام پر، ہر کامیابی کے لیے، ہر ناکامی کے لیے، ہر ناکامی کے لیے، ہر ناکامی کے لیے



Copied From Web



Copyright from Web



یہ داستان ہے دور بہرہ کی ماری اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھ گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماری، چاچا بھرا اور چاچا منگی کے ساتھ احمدیوں کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ گاؤں کا ڈیرا شہت جلالی ایک بدبخت انسان تھا جس نے ماری کا رشتہ دس ہزار روپے کے عوض مانگا تھا۔ چونکہ ماری مراد کی تنگ مگی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہذا وہ اس پر رضی نہیں گئی نتیجتاً انہیں گدھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا ڈیرا شہت کی شہی گیری کرتا تھا۔ ڈیرا شہت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جاگد اور بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زینت کی شادی قرآن سے کر دی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ بلی۔ زینت نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہا سہیلی کا سامنی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میں گھر آ گئے جہاں ماری اپنے چاچا، چاچا منگی کے ساتھ پہلے ہی آ چکی تھی۔ منگی مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوئی جو کہ میرا سہیلی اور بزنس پارٹنر تھے۔ لیکن وہ بھروسہ مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ شہت جلالی جو کہ خود بھی میرا سہیلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار سے بعد زینت نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کر لی اور خاموشی سے فرار ہو گئی۔ ڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پہچانا تو انہوں نے تلاش شروع کر لی۔ سکا کی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زینت کے ہی قاتل کاٹھ کی تھی براد کر کے نقل کر دیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے سخ کر کے اسے اپنی بیٹی کا چہرہ کر کے اڑا کر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا اور ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود کو شہنشاہ ہونا تھا۔ محبوب کے سر پرست اس کے والد کے زمانے کے معروف منگی تھے جو اس کے کا درباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل میجر کو ایک بٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماری کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی نکوت نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے یہ طور ماڈل ماری کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زینت کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ زینت مراد کے بیچے کو ختم دے کر دوسرے بیچے کی پیدائش کے دوران چل بس لیکن ڈیرا ہاپ اور بیٹوں کو بچھڑا نہیں گئی کہ زینت کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں راجہ جاتی تھی لیکن مراد سے ملائی تھی۔ وہ شہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس نگر کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماری کی خاطر اس کے مقدمے کی بھاری کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی ڈیرا شہت سے دشمن ہو گئی۔ یہ بات پائی کے لیے رنگ بچھڑ گئی نتیجتاً چانڈیو استغدادے کر چلا آیا۔ یوں ماری کے دشمنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسے انوار کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی کھلی کی شادی میں شرکت کے لیے گھر گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ لیٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین اکیٹ مرینہ بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نگر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مقدمے کو معلوم نہیں کب تک چلنا تھا لیکن محبوب نیک منگی سے ان کا مددگار تھا اور تھی کہ ماری محبوب کے احسانات سے بچنے کے لیے جان بوجھ کر قاتل ہو گئی۔ اس خبر کے بعد وہ دلیرانہ ہو کر خود مراد کی جگہ جیل میں قید ہو گیا جبکہ دوسری جانب ماری کی تلاش کا لالچ دے کر مراد کو مرینہ جیلر ہاپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہو گیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے کھنچے سے فرار ہو گیا۔ جبکہ دوسری جانب میرا اور منگی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ مرینہ اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ مگر قسمت کی دیوی مراد پر مہربان تھی جو مرینہ کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا، اتفاق سے راستے میں ماری چاچا اور چاچا اس کے ساتھ لگ گئے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو ہوا گیا کہ مرینہ ماری کو جام تھا رو کے چوڑھی کے پاس لے جا رہی ہے لہذا مشکلات سے خبردار آکر ماہوتے ہوئے وہ ماری کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیتا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے ماری کے سر میں چوٹ لگتی ہے جس کے باعث اس کی یادداشت جلی جاتی ہے۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے سزا داری کے ساتھ جیل سے نکال جانے پر آمادہ کر کے خود مسلاخوں کے پیچھے بند ہو جاتا ہے۔ مرینہ اور مراد میں تساد بڑھتا جا رہا تھا۔ مرینہ کے پانچوں غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کر لے جاتے ہیں۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مر جاتا ہے۔ ماری کا علاج ہوتا ہے مگر ماری محبوب اور مراد دونوں کو نہیں پہچانتی۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماہر کو یو کے ساتھ چل گیا۔ مرینہ کے راستے میں پھر رکاوٹ بن گیا۔ مرینہ کو چتا چل گیا کہ مراد ماہر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اوپر جگہ دیو مراد کو مراد پار کرانے کے لیے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ مرینہ آری والوں کو اطلاع کر دیتی ہے۔ جگہ دیو مارا جاتا ہے اور مراد مرینہ کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ مرینہ گولیاں مار کر مراد کو زخمی کر دیتی ہے اور۔۔۔ اپنا اسیر بنا لیتی ہے۔ اوپر ماری کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آ جاتی ہے۔ مراد مرینہ کے زیر اثر آ چکا تھا۔ ماری کو چتا چل گیا اور اس نے مراد کو جاننے سے انکار کر دیا تاہم مراد نے اسے اپنی پارسانی کا ٹھیک دلا یا اور کہا کہ وہ اس دلدل سے نکل آئے گا۔ ماہر خاتون نے مراد کے بیچے کو ماری کے پاس پہنچا دیا۔ اوپر مرینہ دوبارہ MET آفسر بن گئی ماری کے ساتھ ڈیٹیم تکمیل رہی تھی وہ مراد کو حاصل کر کے اور اس کے ساتھ کچھ وقت تاکر سے پڑا لٹ والوں کو پیش کرنے والی تھی جس کے بدلے اسے اور اس کے ڈیٹیمیشن کو بچا اس لاکھ ڈالرز کی رقم ملی۔ مراد نے سر جری کے ماہر ڈاکٹر ٹینی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروائی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے چہرے کو نئے بیٹے ایمان الی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے لگا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست عبداللہ کبڑی بھی آ گیا۔ مراد نے اس کی بھی سرجری کروا کے اسے اپنا چہرہ دے دیا اب یونا عبداللہ مراد بن گیا تھا۔ سن مراد کو یاد دیکھ کر چکا گئے۔ مراد کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے گنا گھر انٹرن نامی تنظیم کی مورٹس مہرم ہوئیں۔ وہ ایک پریس کانفرنس میں مراد کو بے قصور ثابت کرتیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

Copied From Web

رات تمہارے ساتھ رہتی ہوں اور میں نہیں جانتی؟“
 ”ایک ڈاکٹر عدیلہ میرا علاج کرنے آتی تھی۔ تم نہیں جانتیں۔ وہ عورت نہیں تھی۔ مرد تھا۔“
 منی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟“
 وہ عدیلہ عرف عدیل کے متعلق بتانے لگی۔ منی نے تمام باتیں سننے کے بعد کہا۔ ”یا اللہ! وہ مرد تھا اور میں اسے پہچان نہ سکی۔ تم مجھے بتاتیں تو میں اسے جھاڑو سے مار کر بھگاتی۔“

”میں کسی طرح کا ہنگامہ نہیں چاہتی تھی پھر وہ کئی دنوں تک میرے ساتھ تنہائی میں رہا۔ دوسروں کو معلوم ہوتا تو وہ طرح طرح کی باتیں بتاتے۔ اس مرد کا کچھ نہ جانتا۔ میں بدنام ہو جاتی۔“

”اچھا کیا بیٹی! اسے چپ چاپ بھگا دیا۔“
 ماروی ذرا چپ رہی پھر بولی۔ ”ایک مٹھی چھری مجھے مار ڈالنا چاہتی تھی۔“

منی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولی۔ ”سمیرا کتنی محبت کرنے والی ہے نا؟“

منی نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا پھر کہا۔ ”اس نے تمہیں محبوب سے دور کرنے اور مراد سے ملانے کے لیے ہماری مدد کی تھی۔“

رووی نے کہا۔ ”اس نے مجھے یہاں سے بھگانے کے لیے کتنا زبردست انخوا کا ڈراما کیا تھا۔“

منی نے کہا۔ ”اور ہمیں دو لاکھ روپے بھی دیے تھے۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔ وہ محبوب صاحب سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس لیے وہ سب ٹانگ کیا تھا۔“

”بلا سے ٹانگ کیا تھا۔ ہمارے لیے تو نیکی کی تھی۔“
 ماروی نے کہا۔ ”جب اس کی نیکی کام نہ آئی اور میں واپس آئی اور محبوب اسی طرح میرے دیوانے رہے تو وہ نیک عورت میری دشمن بن گئی۔“

”چاچی! میں غازی بابا کے دربار میں سیڑھیوں سے خود نہیں گری تھی۔ سمیرا نے مجھے دھکا دے کر گرایا تھا۔“

منی نے حیرانی سے منہ پر ہاتھ رکھا۔ ”ہائیں۔ یہ کیا کہہ رہی ہو؟ اس نے تمہیں دھکا دے کر اوپر سے گرایا تھا؟ لعنت ہے اس گھوٹی پر۔ ابھی محبوب صاحب کو فون کرو۔ یہاں بلاؤ اور اس جھاڑو پھری کی اصلیت بتاؤ۔“

منی نے ہاتھ بڑھا کر اس سے فون لینا چاہا۔ ”لاؤ میں فون کرتی ہوں۔“

ماروی نے ہاتھ سمجھ کر فون کو اس سے دور کرتے

ماروی صبح کی نماز کے بعد کلام پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔ وہ عربی زبان نہیں سمجھتی تھی۔ کلام پاک صحیح تلفظ سے پڑھنے کے لیے وہ ہر صبح تلاوت جاری رکھتی تھی۔ ایسا ہوتا تھا کہ وہ بڑی عنایت اور ایمان سے پڑھتی تھی لیکن خیالات کہیں اور بھٹکتے رہتے تھے۔ وہ ایسے وقت خیالات سے چونک کر توبہ توبہ برتی ہوئی رمل پر رکھے ہوئے قرآن مجید کو جھک کر چوم لیتی تھی۔

اس روز بھی یہی ہوا۔ تلاوت کے دوران میں اس کے خیالات مراد کی طرف بھٹکنے لگے تو اس نے توبہ کی پھر سر جھکا کر مقدس صفحات کو چوما تو یکا یک جیسے غائب و ماغ ہو گئی۔ سر قرآن مجید پر رکھا تو پھر اٹھانہ لگی۔

وہ چند ساعتوں تک سکتے میں رہی اور خود کو جیسے بھول گئی۔ پھر اسے کچھ یاد آنے لگا۔ اس نے خود کو سکر کے اسپتال میں دیکھا۔ وہ خود کو مراد کو، محبوب کو اور چاچی وغیرہ کو بھول گئی تھی۔

پھر اس نے دیکھا۔ ایک ڈاکٹر عدیلہ اس کا علاج کرنے آیا کرتی تھی۔ اس سے مردوں کے انداز میں محبت کرتی تھی پھر انکشاف ہوا کہ وہ سچ سچ مرد ہے۔ ماروی نے اسے بھگا دیا تھا۔ اسے بہت کچھ یاد آ رہا تھا اور یہ آخری واقعہ بھی یاد آیا جب وہ غازی بابا کے دربار گئی تھی۔ وہاں سمیرا نے اسے سیڑھیوں کی بلندی سے دھکا دیا تھا۔

اس نے چونک کر کلام پاک پر سے سر اٹھایا۔ اسے آٹھ ماہ کی گزری ہوئی تھی یاد آگئی تھی۔ اس نے قرآن مجید کو اٹھا کر چوما۔ اسے سینے سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ان لمحات میں وہ روحانیت سے سرشار ہو رہی تھی۔ وہ جیسے کلام پاک میں جذب ہو گئی تھی۔ جب جذب کے عالم میں تھی۔ بڑی دیر تک سوچ سے خالی ہو کر تم مسم سی بیٹھی رہی۔ پھر کلام پاک کو جزدان میں لپیٹ کر مصلے سے اٹھ گئی۔

یہ معلوم کر کے دکا ہو رہا تھا کہ عدیلہ بہن اور سمیٹی بن کر دھوکا دے رہی تھی بلکہ دے رہا تھا اور سمیرا مٹھی چھری ہے۔ اس نے اسے مار ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے چاچی منی کے پاس آکر کہا۔ ”مجھے آٹھ مہینے کی بھولی ہوئی باتیں یاد آ رہی ہیں۔“

منی نے کہا۔ ”یہ تو اچھی بات ہے تمہاری دماغی توانائی بڑھ گئی ہے۔ پھل اور میوے کھاتی رہا کرو۔“

وہ بولی۔ ”چاچی! ان آٹھ مہینوں میں میرے ساتھ کیا ہوا یہ آپ نہیں جانتیں۔ کوئی نہیں جانتا۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”ایسا کیا ہوا تھا۔ میں دن

”عورت جسے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہے اسے اپنا بنائے رکھنے کے لیے سوکن کی موت چاہتی ہے۔ مرینہ بھی تو مراد کو صرف اپنا بنائے رکھنے کی خاطر مجھے مار ڈالنا چاہتی تھی۔ یہ تم سکھر میں دیکھ چکی ہو۔ میں بھی دل میں سوچتی رہتی ہوں کہ وہ مر جائے تو میرے راستے کا کاٹنا کھل جائے گا۔ اسی طرح سمیرا بھی میری موت چاہتی تھی۔ بے شک وہ میری جان کی دشمن ہے لیکن محبوب کی وقادار ہے۔ اس کے اربوں کے کاروبار کو ڈوبنے سے بچا رہی ہے۔“

”میری بیٹی! تم اس دشمن عورت کے لیے کتنی محبت اور شفقت سے سوچ رہی ہو۔“

”سمیرا کے لئے نہیں محبوب کے لیے سوچتی ہوں۔ ہم پر ان کے بڑے احسانات ہیں۔ ان احسانات کا بدلہ چکانے کا یہ اچھا موقع ہے کہ میں سمیرا کے خلاف نہ بولوں۔ اسے محبوب کے کاروبار سے الگ نہ ہونے دوں۔ محبوب کا اس پر اعتماد بحال رہے۔ انہیں ایک پیسے کا بھی نقصان نہ پہنچے۔“

”نئی اس کی باتیں سن رہی تھی اور اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی پھر اس نے کہا۔ ”بیٹی! میری عقل میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ سمیرا دشمن بن کر محبوب صاحب کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ میں یہ بھی مانتی ہوں کہ وہ محبوب صاحب کے پیچھے پاگل ہے۔ اگر تم اس کے خلاف نہیں۔۔۔ زندگی تو وہ ہمیشہ ان کی وقادار بن کر رہے گی اور ان کے کاروبار کو سنبھالتی رہے گی۔“

”ٹھیک ہے اس دشمن عورت کو اللہ پر چھوڑ دو۔ اللہ نے چاہا تو تمہارا بھلا ہوگا۔ مراد و تاریخ سے پہلے آئے گا اور تمہیں اپنی دلہن بنائے گا پھر سمیرا کے دل سے حسد جلا پا ختم ہو جائے گا۔“

چاہتی قائل ہو گئی تھی کہ جس نے ماروی کو مار ڈالنا چاہا تھا اسے معاف کر دیا جائے۔ اس وقت شہزاد کے رونے کی آواز سنائی دے گی۔

”ہوئے کہا۔ ”رک جاؤ چاہتا ہوں مجھے ذرا سوچنے دو۔“

”اس میں سوچنا کہا ہے؟ محبوب صاحب کو اس کمپنی کی اصلیت نہ بتائی تو وہ پھر کوئی موقع پا کر تمہیں مار ڈالے گی۔“

”اللہ بچانے والا ہے۔ جب تک میرے نصیب میں زندگی ہے، مجھے کوئی نہیں مارے گا۔ ایک بات میرے دماغ میں پھنسی ہوئی ہے۔ میں اچھی طرح سوچ لوں پھر بولوں گی۔“

وہ مٹی کے پاس سے اٹھ کر بولی۔ ”شہزاد سو رہا ہے۔ میں دیکھ کر آتی ہوں۔“

وہ پھر اپنے کمرے میں آئی۔ شہزاد گہری نیند میں تھا۔ وہ مطمئن ہو کر ٹھیکے لگی۔ سوچنے لگی کہ محبوب کو سمیرا کی دشمنی کے بارے میں معلوم ہوگا تو کیا ہوگا؟

یہی ہوگا کہ ماروی کا وہ دیوانہ پیش میں آ کر اسے گولی مار دے گا اور پھانسی پر چڑھ جائے گا۔ اگر اسے گولی نہیں مارے گا تو اسے اپنے کاروبار سے اپنے دفتر سے باہر کر دے گا۔ جبکہ وہ محبوب کے اربوں روپے کے بزنس کو ایمانداری سے سنبھال رہی ہے۔

وہ پھر مٹی کے پاس آگئی۔ اس کے سامنے بیٹھ کر بولی۔ ”چاہتی ہوں کہ اس کی اصلیت نہ معلوم ہوتا چھاپے۔“

”کیوں نہ معلوم ہو؟ اللہ نے تمہیں بچایا ہے۔ مر جائیں تو وہ ابھی محبوب کی دلہن بن کر پیش کر رہی ہوتی۔“

”تم یہ سب نہ سوچو۔ محبوب کو معلوم ہوگا تو وہ اسے اپنے کاروبار سے نکال دیں گے پھر اس کی صورت نہیں دیکھیں گے۔ میری عقل کہتی ہے کہ وہ ان کے بہت سے کاروباری راز کو جانتی ہے۔ ان کی ملازمت سے نکل کر انہیں سو طرح سے نقصان پہنچا سکتی ہے۔“

”نئی قائل ہو کر سر ہلا رہی تھی۔ ماروی نے کہا۔ ”معروف صاحب نے سمیرا کو بیٹی بنایا ہے۔ وہ بھی محبوب کے خلاف بیٹی کا ساتھ دیں گے تو دیکھتے ہی دیکھتے



You have either reached a page that is unavailable for viewing or reached your viewing limit for this book.



ان آٹھ مہینوں میں ماروی کے ساتھ دھوکا ہوتا رہا ہے۔

میرا کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ اندر سے ہم گئی۔ ان لمحات میں وہاں سے نورانی آٹھ کر بھاگ جانا چاہتی تھی اور جیسے بھاگنے کے لیے اپنی کرسی پر پہلو بدل رہی تھی۔

محبوب نے کہا۔ "اسے آٹھ ماہ کی ایک ایک بات یاد آگئی ہے۔ آپ جس ڈاکٹر عدیلہ کو اس کے علاج کے لیے لائے تھے، وہ ایک بہرہ ویا تھا۔ عورت نہیں تھی ایک مرد تھا۔"

یہ دھماکا کرنے والی بات تھی۔ وہ دونوں اسے۔۔۔ بیٹھنی سے دیکھنے لگے۔ معروف نے کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ رحمان کو میں برسوں سے جانتا ہوں۔ وہ کوئی میرا پھیری کرنے والا شخص نہیں ہے۔ اپنے بیٹے کو بیٹی بنا کر ہمارے گھر کیوں بھیجے گا؟"

"اس نے بیٹے کو بیٹی بنا کر صرف ہمارے گھر نہیں بھیجا ہے۔ آپ ذرا سوچیں وہ ہمیشہ بیٹی بن کر رہتا ہوگا۔ تب ہی اس نے ڈاکٹر عدیلہ کے نام سے سائیکا فرسٹ کی سندیں حاصل کی ہیں۔"

معروف نے کہا۔ "اوگا ڈار رحمان دیکھتے ہیں تو چکر باز نہیں لگتا۔ میں ابھی اس سے بات کروں گا۔"

وہ بولا۔ "مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ جی چاہتا ہے ابھی جاؤں در اس کے بہرہ ویا بیٹے کو گولی مار دوں۔"

"نہیں محبوب۔ طیش میں آکر ایسی باتیں نہ سوچو۔ میں ان باپ بیٹے سے نمٹ لوں گا۔"

محبوب نیسے کی حالت میں کبھی معروف کو اور کبھی میرا کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی توجان نگی جا رہی تھی۔ دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ ماروی نے اس کے خلاف بھی زہر اگلا ہو گا۔ محبوب ڈاکٹر عدیلہ کے بعد اس کی خبر لینے والا ہے۔ اسی لیے بار بار غصے سے دیکھ رہا ہے۔

اس نے جھنجلا کر اٹھتے ہوئے ایک قائل کو میز پر پھینکا تو وہ میز پر سے ہوتی ہوئی میرا کی گود میں آئی۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ سمجھتی کہ اب اس کی شامت آگئی ہے۔

وہ غصے میں اس کی طرف دیکھے بغیر یہ بولتا ہوا وہاں سے گیا کہ وہ سچ کے بعد آئے گا پھر اور باتیں کرے گا۔ گویا یہ بول کر گیا تھا کہ سچ کے بعد میرا کی خبر لے گا۔ دل میں جو چور تھا وہ کجنت ہی بول رہا تھا اور اسے دوپہر سچ تک انتظار کی عولی پر لٹکا رہا تھا۔

محبوب ہر چلا گیا۔ جس دروازے سے گزر کر گیا تھا اسے میرا دیکھتی ہی۔ یہی سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ غصے سے

"کیا کہہ رہی ہو۔ میں نہیں سمجھا؟"

وہ عدیلہ کیسے مدیل تھا۔ عورت نہیں تھی مرد تھا۔ "تم واقعی چونکا رہے ہو۔ حیران کر رہی ہو۔"

وہ عدیلہ کے متعلق اسے تفصیل سے بتانے لگی۔ وہ تمام باتیں سننے کے بعد طیش میں آکر بولا۔ "اس بہرہ ویا کی یہ مجال کہ وہ عورت بن کر تمہارے ساتھ رہتا تھا۔ میں اس کی ایسی پٹائی کراؤں گا۔ ایسا سبق سکھاؤں گا کہ وہ عورت بن کر شریف لڑکیوں کو دھوکا دینا بھول جائے گا۔"

"آپ غصے میں نہ آئیں، اس سے جھگڑا کریں گے تو بات بڑھے گی۔ میں بدیام ہو جاؤں گی کہ اس مرد کے ساتھ روز آٹھ گھنٹے رہا کرتی تھی۔"

وہ درست کہہ رہی تھی۔ ایک ذرا وقفے سے بولی۔ "ایک تو میں یونہی آپ کی کوشی میں آپ کے سائے میں رہ کر بدنام ہوتی چلی آ رہی ہوں۔ پھر ایک دوسرا مرد بھی مجھ سے وابستہ کیا جائے گا تو میں کہاں منہ چھپانے جاؤں گی؟"

محبوب کا جوش اور غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ "تم درست کہتی ہو۔ میں تمہاری بدنامی کی طرف جانے والا کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ چلو اب تم آرام کرو۔ میں سچ کے وقت آؤں گا۔"

محبوب رابطہ ختم کر کے انکاروں پر لوٹنے لگا۔ اس سے یہ برداشت نہیں ہو رہا تھا کہ ایک مرد روزانہ آٹھ گھنٹے اس کی ماروی کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ انجانے میں اسے کبھی سمجھ کر اپنا ہاتھ پکڑنے دیتی ہوگی۔ مگر وہ کجنت بہرہ ویا اور کئی بہانوں سے چتا نہیں کہاں کہاں ہاتھ رکھتا ہوگا؟

ایسی باتیں سوچ کر غصہ ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا اور ہشک رہا تھا۔ وہ ٹھنڈا ہونے کے لیے ہاتھ روم میں آ گیا۔ شاور کھول کر ٹھنڈے پانی میں بھیجے لگا۔ اس طرح دماغ کچھ ٹھنڈا ہونے لگا۔

وہ دس بجے آفس پہنچا تو سیرا اور معروف کاروباری رپورٹس پیش کرنے آگئے۔ اس نے کہا۔ "معروف صاحب! میں بہت الجھا ہوا ہوں۔ کسی کاروباری مسئلے پر بات نہیں کروں گا۔"

معروف نے پوچھا۔ "خبریت تو ہے؟ تمہارے عشقیہ معاملات تو معمول پر آگئے تھے۔ اب کوئی نئی بات ہوگئی ہے؟"

"نئی بات یہ کہ ماروی آٹھ ماہ کی جو باتیں بھول گئی تھی وہ سب اسے یاد آگئی ہیں۔"

میرا نے چونک کر محبوب کو دیکھا۔ معروف نے کہا۔ "یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ تم بول الجھ رہے ہو؟"

ہوں۔ وہ آکر مجھے ایک پریس کانفرنس میں لے جائے گا۔
 ”اس کا مطلب ہے آزادی سے گھوم رہے ہو۔ کوئی
 تم پر مراد ہونے کا شبہ نہیں کر رہا ہے؟“
 ”خدا کا شکر ہے۔ میں ایمان علی کے چہرے کے
 ساتھ توجیح سے زیادہ محفوظ رہنے لگا ہوں۔“
 ”ایک بات سنو جو آٹھ ماہ کی باتیں میں بھول گئی
 تھی، وہ سب مجھے یاد آگئی ہیں۔“
 ”یہ تو بڑی اچھی بات ہو گئی۔ اب تمہارے ماضی
 کے کسی دور میں اندھیرا نہیں رہے گا۔ تمہارا دماغ کمزور نہیں
 رہا ہے۔ تمہیں گزارا ہوئی زندگی کی تمام باتیں یاد رہا
 کریں گی۔“

”میں اور بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں لیکن تم کہیں
 سڑک کے کنارے ہو۔ مجھے شور سنائی دے رہا ہے۔“
 ”کوئی بات نہیں۔ ہم پھر کسی وقت آرام سے باتیں
 کریں گے۔ میں فون بند کرتا ہوں۔“
 ”ٹھہرو۔ ایک بار کہہ دو کہ دو تاریخ سے پہلے
 آرہے ہو۔“

”میں ہر حال میں آؤں گا۔“
 پھر وہ دیکھی سرگوشی میں بولا۔ ”یونہی مراد بن کر...“
 وہ ہنسنے لگی۔ رابطہ ختم ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک
 نوجوان موٹر سائیکل پر آکر وہاں رگ گیا پھر بولا۔ ”میں
 ماما جی (بھتیجی بائی) کا بیٹا ہوں۔ انہوں نے مجھے بھیجا
 ہے۔ آؤ ہمیں۔“

وہ ہڈی، موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اس کے پیچھے چل
 پڑا۔ جب کچھ گھرا پلٹن کے علاقے میں پہنچا تو کانفرنس
 شروع ہو گئی تھی۔ عبداللہ کبڈی مائیک کے سامنے کھڑا ہوا
 بول رہا تھا۔ حاضرین کے سامنے اپنی ہسٹری بیان کر رہا تھا۔
 ویسے کے تمام چھوٹے بڑے اخبارات کے رپورٹر
 اور فوٹو گرافر آئے ہوئے تھے۔ وقفے سے کیمروں کی فلش
 لائٹس جل بھج رہی تھیں۔ ٹی وی چینلز کے کیمرے بھی پریس
 کانفرنس کو کوریج دے رہے تھے۔ لوگ اچھی خاصی تعداد
 میں آئے ہوئے تھے۔

عبداللہ کبڈی کے بعد جگنی بائی مائیک کے سامنے
 آکر کہہ رہی تھی۔ ”ہماری گھاگھرا پلٹن اپنے گرتو کا پالن
 کرتی ہے۔ ہماری منو کا منا ہے کہ جو مظلوم ہیں انہیں
 انصاف دلایا جائے۔ آپ نے مراد کے ہم شکل عبداللہ
 کبڈی کی جیون کہانی سنی ہے۔ جب اس بھارے نے جنم
 لیا تھا تو یہ اور اس کے ماں باپ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ

قابل کو اس پر پھینک کر گیا ہے۔ ابھی کچھ بول نہیں رہا
 ہے۔ لٹچ کے بعد بولے گا اور اسے لات مار کر ملازمت سے
 اور اپنی زندگی سے نکال دے گا۔“

معروف اپنے فون پر عدیلہ کے باپ رحمان کے نمبر
 سچ کر رہا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر بولی۔ ”میری طبیعت ٹھیک
 نہیں ہے۔ گھر جا رہی ہوں۔ آج کام نہیں کر سکوں گی۔“
 وہ جواب سے خیر وہاں سے نکل کر اپنے آفس کیمین
 میں آگئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ماروی کو بھولی ہوئی
 باتیں یاد آ جائیں گی۔ اس پر ہیبت طاری ہو رہی تھی۔ پیٹ
 میں گولا سا گھوم رہا تھا۔ دل کی دھڑکنیں ڈوب رہی
 تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں بھاگ کر جائے
 اور منہ پھپھالے۔

وہ کسی بھی طرح باتیں بنا کر ماروی کو جھٹلا نہیں
 سکتی تھی۔ ایک طرح سے ماروی مقولہ تھی۔ اسے قتل کیا گیا
 تھا۔ وہ چشم دید گواہ کہتی کہ کس نے اسے سیڑھیوں کی بلندی
 سے گرایا تھا تو عدالت بھی اس کے بیان کے مطابق قتل کی
 مرتکب ہونے والی کو ضرور سزا دیتی۔

وہ محبوب کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ اس کی شریک
 حیات بننے کے لیے پاگل ہو رہی تھی اور حالات تھے کہ
 اچانک بدل رہے تھے۔ وہ اس کی نظروں سے گرتا نہیں
 چاہتی تھی۔ یوں ذلیل ہو کر بے آبرو ہو کر اس کے دل سے
 لگتا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا
 کرے۔ ایک ہی بات اب اس میں آ رہی تھی کہ محبوب کی
 نظروں سے گرنے سے پیسے مر جائے۔

ماروی نے اسے ایسی دلدل میں گرا دیا تھا جہاں سے
 وہی اسے نکال سکتی تھی۔ ورنہ وہ تو دھنستی ہی چلی جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

مراد اندر روڈ کی فٹ پاتھ پر اپنی موٹر سائیکل
 کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ ایسے وقت ماروی نے اسے
 پکارا۔ وہ فون کو کان سے لگا کر بولا۔ ”ہائے مراد کی
 جان! کیا ہو رہا ہے؟“

”اپنے بچے کو پیار کر رہی ہوں۔ لوسنو۔“
 اس نے زوردار آواز کے ساتھ شہزاد کا بوسہ لیا۔ مراد
 نے کہا۔ ”ہائے یہ مجھ تک پہنچ گیا ہے۔ مجھ سے کہہ رہا ہے۔
 فوراً جاؤ اور بوسہ لینے والی کو پکڑو اور بازوؤں میں جکڑ لو۔“
 وہ ہنسنے لگی پھر بولی۔ ”ایک بات کہنے کو فون کیا
 ہے۔ ویسے تم کہاں ہو۔ ٹریفک کا شور سنائی دے رہا ہے۔“
 ”میں ایک سڑک کے کنارے کسی کا انتظار کر رہا

کسی مراد علی منگلی کا ہم شکل ہے۔
 ”ہم نے کبڑی کے بارے میں بڑی چھان بین کی ہے۔ تب یہ جانکاری آئی ہے کہ پچھلے برس سونامی میں اس کا پورا خاندان بچ بچ بے موت مارا گیا ہے۔“

”اپنے اپنے نصیب ہوتے ہیں۔ ایک یونی عورت بھی اپنے بچی اور اپنی بیٹی کے ساتھ زندہ بچ گئی تھی۔ میں انہیں آپ کے سامنے بلا رہی ہوں۔ آپ ان کا بیان بھی سن لیں۔“
 انہیں بلایا گیا۔ وہ تین یونے اسٹیج پر آئے۔ ان میں سے دو مہیاں بیوی تھے تیسری ان کی جران بیٹی تھی۔ بہت ہی خوبصورت تھی۔ عبداللہ کبڑی اسے بے اختیار دیکھنے لگا۔

جگنی بانی نے مائیک کو ڈرا نیچے کر کے یونوں کے سامنے رکھا۔ ایک معمر یونے نے کہا۔ ”میرا نام جان کر میر ہے۔ یہ میری بیوی ہیلنا ہے۔ اور یہ میری بیٹی فرمونا ہے۔ ہم عیسائی ہیں۔ ایک بار ہماری ملاقات عبداللہ کبڑی اور اس کے والدین سے ہوئی تھی۔ ہم سب مدراس سے ممبئی ایک ٹرین میں جا رہے تھے۔ ہمارا پندرہ گھنٹوں تک ساتھ رہا تھا۔“

اس کی بیوی ہیلنا نے کہا۔ ”ہم نے دو برس پہلے عبداللہ کبڑی کے ساتھ ٹرین میں بہت سارا وقت گزارا ہے اور اس کے تہاہ ہونے والے خاندان کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔“

فرمونا نے کہا۔ ”ہم یونوں کی دنیا میں عبداللہ کبڑی بہت ہی ریٹائم اور ہاڈی بلڈر ہے اور بہت سے کمالات دکھاتا ہے۔ ایک بار اس سے ملنے کے بعد کوئی اسے بھول نہیں سکتا۔“

کبڑی ایک طرف بیٹھا فرمونا کو دیکھے جا رہا تھا۔ انہوں نے پہلے کبھی ایسے دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔ شاید فرمونا نے کبھی اسے نہیں سے ٹھپ کر دیکھا ہو۔ اس وقت اس کی باتوں سے لگاوت ظاہر ہو رہی تھی۔

وہ تینوں یونے جگنی بانی کی پلاننگ کے مطابق بول رہے تھے۔ ان کی حمایت نے تصدیق کر دی کہ وہ یونا مراد علی منگلی نہیں ہے بلکہ پیدائشی طور پر اس کا ہم شکل ہے۔

کبڑی نے بہت پہلے کسی سے عشق کیا تھا۔ وہ اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ اس کے بعد وہ پھر بھی عشق و محبت کے بارے میں سوچتا ہی نہیں تھا۔ کئی برس گزر گئے تھے دل کسی کی طرف مائل نہیں ہوتا تھا۔ بہت عرصے بعد فرمونا اس کے دل کو چھو رہی تھی۔

اسٹیج کے پیچھے ایک چار زیواری میں کئی کمرے تھے۔ وہاں گھبراہٹوں کی عورتیں پریس اور الیکٹرونک میڈیا

کے لوگوں کے لیے میزوں پر کھانے پینے کا سامان رکھ رہی تھیں۔ وہ تینوں یونے بیان دینے کے بعد ادر چلے گئے تھے۔ کبڑی کا دل کھنچا جا رہا تھا۔ کانفرنس کا اختتام ہوتے ہی ادر جانے لگا۔ مہمان کھانے کی میزوں پر آرہے تھے اور کبڑی کے پاس آکر اسے روک روک کر اس سے سوالات کر رہے تھے۔ وہ مختصر سے جوابات دے کر ان سے بچتا ہوا ادر ہاتھ اڑاتا اور اسے جگہ جگہ موڑتا پھر رہا تھا۔
 مراد نے اسے روک کر پوچھا۔ ”کہاں بھٹک رہے ہو؟ کسے تلاش کر رہے ہو؟“

”پورا کیا پوچھتے ہو۔ تم نے فرمونا کو دیکھا ہے۔ بلا کی حسین ہے۔ ایسے ہی حسین وجود کے لیے کہتے ہیں.....“ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”اک تیر میرے سینے پر مارا کہہ ہائے ہائے۔“

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تم مجھے کام سے۔ ویسے یہ عشق دائمی ہے یا عارضی؟“

”دائمی ہے۔ میں تو اسے اپنی گھر والی بناؤں گا۔“
 وہ جھٹ کر اس کے کان میں بولا۔ ”یہ مت بھولو کہ یہاں سے کسی دن بھی ہمیں پاکستان جانا ہے۔ وہاں ایک طویل مدت کا ڈراما لپے کرنا ہے۔“

وہ گھست خوردہ انداز میں ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔ ”کیا کروں؟ ایسے وقت یہ کیا ہو گیا؟ یہ دل تو گزبڑ کر رہا ہے۔ اس کے لیے بھگ رہا ہے۔“

پھر اس نے مراد کو اشارے سے کہا کہ کان قریب لائے۔ وہ اس کے سامنے جھک گیا۔ اس نے کان میں کہا۔ ”یار! پاکستان میں کتنا لمبا ڈراما ہوگا؟ میرا خیال ہے ایک یا دو مہینے میں تمہارا کام ہو جائے گا اور تمہاری تو پلاننگ ہے کہ کتنا دوسرے ملک میں جا کر ماروی کے ساتھ زندگی گزارو گے۔“

وہ بولا۔ ”ہاں۔ وہاں دیر تک بونے مراد کا ٹانگ نہیں چلے گا۔ وہاں کی پولیس اور جاسوس بڑی رازداری سے تمہارے پیچھے مجھے ڈھونڈتے رہیں گے۔ یہ بات میرے دماغ میں ہے، ہمیں مجبوراً کسی دوسرے ملک میں جا کر رہنا ہوگا۔“

”بس تو پھر ٹھیک ہے۔ فرمونا کے لیے میرا پیغام لے جاؤ۔ بات چلی کرو۔ میں دو ماہ بعد یہاں آکر اس سے شادی کروں گا۔ پھر تم جس ملک میں ماروی کے ساتھ رہو گے وہاں فرمونا کے ساتھ آ جاؤں گا۔“

جگنی بانی کو بتایا گیا کہ اس کا بیٹا یونا مراد فرمونا کے

عشق میں گرفتار ہو گیا ہے۔ وہ حیرانی سے بولی۔ "مراد تم تو پاکستان میں ماروی سے شادی کرنے والے ہو؟"

وہ بولا۔ "تو کیا ہوا؟ ہمارے دین میں اجازت ہے کہ بہت مجبوری ہو تو دو شادیاں کی جاسکتی ہیں۔ میری مجبوری یہ ہے کہ وہ پاکستان میں رہتی ہے اور فرمونا انڈیا میں۔ میں دونوں ملکوں میں گھریلو ازدواجی زندگی گزاروں گا۔ پلیز میرا رشتہ بنا کر امیں۔ میں دو ماہ بعد آ کر اسے اپنی شریک حیات بناؤں گا۔"

پھر اس نے تنہائی میں جگتی کو سمجھایا۔ "میں یونا ہو گیا ہوں۔ فرمونا میرے مطابق بونی ہے۔ ادھر ماروی میرے قد سے اونچی ہوگئی ہے۔ پتا نہیں اس کے ساتھ گزارا ہوگا یا نہیں؟ اسی لیے میں فرمونا کو اپنی دلہن بنانا چاہتا ہوں۔"

بات سمجھ میں آگئی۔ جگتی نے کہا۔ "اطمینان رکھو۔ میں فرمونا کے ماں باپ سے تمہارے لیے اسے مانگ لوں گی۔"

مراد نے کہا۔ "تم فرمونا کے پتھر میں پڑ گئے ہو۔ اصل کام کی طرف بھی دھیان دو۔ مرینہ کل یہاں پہنچنے والی ہے۔ چھپتے راؤ نے کہا ہے وہ یہاں آنے سے پہلے تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔"

کبڈی نے کہا۔ "تو ابھی سم بدل کر بات کرتا ہوں۔" اس نے سم بدل کر مرینہ کے نمبر پر کال کی۔ وہ انجانے نمبر پڑھ کر بولی۔ "ہیلو کون؟"

"میں ہوں تمہارا ایا رولڈار۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "او گاڈ! پھر اسی بونے کی آواز سن رہی ہوں۔ دیکھو میں کہہ چکی ہوں کہ کبھی یقین نہیں کروں گی۔ تم مراد علی منگی ہو ہی نہیں سکتے۔"

"یقین نہیں کرو گی تو یہاں کس سے ملنے آؤ گی؟ جہاں جاؤ گی مجھے پاؤ گی۔ یہ ابھی طرح سن لو کہ مجھے تم سے ملنے کا شوق نہیں ہے اور نہ ہی میں تمہارے عشق میں مرا جا رہا ہوں۔ کل کا ٹکٹ کینسل کر آؤ اور لندن میں اپنے کام دھندے سے لگی رہو۔"

"نہیں۔ میں تو آؤں گی۔ تمہیں دیکھوں گی کہ کیا چیز ہو؟" "ضرور آ کر دیکھو۔ بن یاد رکھو۔ اگر تمہارے ساتھ جاسوس ہوں گے اور وہ دور سے میری نگرانی کرتے رہیں گے تو ان کے ساتھ تم بھی ماری جاؤ گی۔ تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ پیار سے آؤ۔ مجھ سے ملو۔ جب دیکھو کہ یونا ہو گیا ہوں اور تمہارے قابل نہیں رہا ہوں تو شرافت سے واپس چلی جاؤ۔ میرے سر کی قیمت تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔"

"تم درست کہہ رہے ہو۔ دشمنی ہر حال میں مہنگی پڑتی ہے۔ میں پیار سے آؤں گی۔ جیب یقین ہو جائے گا کہ واقعی تمہیں حادو سے گھٹا دیا گیا ہے تو تمہیں سوری بول کر واپس چلی آؤں گی۔ تم اپنا پتا تو بتاؤ؟"

"جلدی کیا ہے؟ یہاں پہنچو تو سہی۔ تمہیں میرے گھر کا پتا معلوم ہو جائے گا۔"

"او کے میں کل آر ہی ہوں۔"

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ فون کو مٹھی میں جکڑ کر سوچنے لگی۔ اسے ابھی طرح یقین ہو گیا کہ مراد چالیس چل رہا ہے۔ خود سامنے نہ آ کر کسی بونے کو آگے بڑھا رہا ہے۔

وہ اٹھ کر ٹہلنے ہوئے سوچنے لگی۔ "اس نے چہرہ بدل لیا ہے۔ وہ موت بن کر بالکل میرے قریب رہے گا تب بھی اسے پہچان نہیں سکوں گی۔ اس کی پلاننگ یہ ہوگی کہ وہ ایک بونے مراد کے ذریعے پہلے مجھے دوڑائے گا پھر کسی خفیہ پناہ گاہ میں بلائے گا اور مجھے تو خطرہ مول لے کر جانا ہی ہوگا۔ عقل کہتی ہے مجھے صرف جنگجو بن کر ہی نہیں معشوق بن کر بھی جانا چاہیے۔ اگر میں جوانی کے ہتھیاروں کو سامان پر جڑھاؤں گی تو اس کی کسی پناہ گاہ میں تنہا جانا مہنگا نہیں پڑے گا۔"

اس نے سینئر ٹیمیل پر رکھے ہوئے فون کو اٹھا کر ڈیکٹر جنرل کو مخاطب کیا۔ "سر! میں مراد سے تنہا ملنے کا رسک نہیں لوں گی۔ اپنے ٹیرا سکواڈ کے سرانفرسٹوں کے ساتھ جاؤں گی۔ ہم کل ہی اس کے سر کی قیمت وصول کریں گے۔" وہ خوش ہو کر بولا۔ "شاہاٹس مرینہ اب تم نے عقل سے صحیح فیصلہ کیا ہے۔ بولو۔ اسے گھبرانے کے لیے کیا کرنا چاہتی ہو؟"

وہ بولی۔ "ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں چار انتہائی شاطر سرانفرسٹ اور شوٹرز ہیں۔ کل کی فلائٹ میں ان کے بھی ٹکٹ اوکے کر امیں۔ وہ میرے ساتھ جائیں گے لیکن مجھ سے متعلق رہیں گے۔ میں انہیں اپنی پلاننگ سمجھاؤں گی۔ آپ بھی انہیں سمجھائیں۔"

"مراد کو ماسٹر کو یو بوی کی سرپرستی حاصل ہے۔ اس کے جاسوس ان رپورٹ سے میری نگرانی کریں گے۔ ہمارے سرانفرسٹوں کو ان کی نظروں میں نہیں آنا چاہیے۔ وہ انڈین کلچر کے مطابق لباس پہن کر جائیں گے۔ انہیں دیکھ کر یہی سمجھا جائے گا کہ وہ اپنے دیس میں رہنے یا رشتے داروں سے ملنے آئے ہیں۔ یہ یاد رکھیں کہ جب رشتے داروں سے ملنے آئے ہیں تو وہ ہونٹوں میں قیام نہیں کریں گے۔"

ڈائریکٹر جنرل نے کہا۔ ”وہاں انڈین فیملیز میں ان کی رہائش کے انتظامات ہو جائیں گے۔ ڈونٹ وری۔ بی ایزی۔۔۔“
وہ دونوں مراد سے نمٹنے سے زندہ یا مردہ حاصل کرنے کے سلسلے میں ایک ایک پہلو پر غور کر رہے تھے۔

☆☆☆

دوسرے دن پریس اور انیکٹروٹک میڈیا کے ذریعے بڑی ہلچل رہی۔ پورے ملک میں یونے مراد کا چرچا ہو رہا تھا۔ یہ تسلیم کیا جا رہا تھا کہ وہ مراد علی منگلی نہیں ہے۔ اکثریت کہہ رہی تھی کہ چھ فٹ سے بھی اونچا آدمی اچانک چار فٹ کا ہونا نہیں بن سکتا۔ ایسا سوچنا سراسر حماقت ہے۔ ایم این اے و حرم واس نے عبداللہ کبڈی کو آئی جی آف پولیس اور تحصیل جنس والوں کے سامنے پیش کر کے یہ سند حاصل کر لی کہ وہ پیدا کنی یونٹ ہے اور اتنا قمار مراد کا ہم شکل ہے۔ صرف جینی بائی اور اس کی تینوں بیٹیوں کو یہ قصہ سنایا گیا تھا کہ ایک تاجر مہاراج نے اسے یونٹ بنا دیا ہے۔ وہ دراصل مراد علی منگلی ہے۔ بعد میں مرینہ کو بھی تاجر مہاراج کی کہانی سنائی گئی تھی۔ جبکہ وہ یقین نہیں کر رہی تھی۔ وہ اسے آنکھوں سے دیکھنے اور اصل مراد علی منگلی تک پہنچ کر پچاس لاکھ ڈالرز حاصل کرنے آرہی تھی۔

وہ شام کو چار بجے وہاں پہنچنے والی تھی۔ مراد عبداللہ کبڈی اور ڈاکٹر منجی من کے علاوہ پوری گھاگھرا پلٹن بڑی نفرت سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

ڈاکٹر منجی من نے مراد سے کہا۔ ”تم مرینہ کو کئی بار عبرتناک سزا میں دے چکے ہو پھر بھی دیکھ رہے ہو کہ وہ دوستی کی آڑ میں دھنسی لڑتی ہوئی آرہی ہے۔“

مراد نے کہا۔ ”میں نے سوچ لیا ہے۔ اس بار اس کا قصہ ہی تمام کروں گا۔“

”نہیں بیٹے۔ اس کی جان نہ لو۔ اسے زیر کرنے کے بعد میرے فیصلے پر چھوڑ دو۔ میں اسے ایک انجکشن لگاؤں گا۔ وہ باقی زندگی پاگل خانے میں گزارے گی۔“

بدنام زمانہ تنظیموں اور انڈر ورلڈ کے سربراہوں کا ایک اجلاس سسلی کے سیون اسٹار ہوٹل میں ہوا تھا۔ وہاں شراب و شہاب کی مستیوں میں مراد علی منگلی تک پہنچے اور اسے ہلاک کرنے کی تدبیریں سوچتی گئی تھیں۔ مرینہ کو اور ماروی کو بھی ٹریپ کرنے کی پلاننگ کی گئی تھی۔ اب اس اجلاس کے خطرناک جاسوس اور شوٹرز بھی دہلی پہنچ گئے تھے۔ انہیں معلوم ہوا تھا کہ مرینہ انڈیا اپنے محبوب مراد علی منگلی سے ملنے

جا رہی ہے۔
جب لندن کی فلائٹ رن وے پر آکر زکی تو اس وقت ائر پورٹ کی عمارت کے باہر دور تک ناویدہ دشمن مورچے بنائے ہوئے تھے۔ وہ عام شہریوں کی طرح سیدھے سادے بے ضرر دکھائی دے رہے تھے۔

مرینہ گھج ہال سے باہر آئی تو اس کے چار جاں باز سرفروں اس سے ذرا دور آس پاس ہی تھے۔ جتنی باقی اور اس کی بیٹیاں بھی ادھر ادھر تھیں۔ گھاگھرا پلٹن کی جاسوس عورتیں بھی لندن سے آنے والے مسافروں کو تاڑ رہی تھیں۔ ورشائے ایک جاسوس کو تاڑ لیا۔ وہ اپنی انٹی فرزش پر رکھے دوڑ کھڑی ہوئی ایک خوبصورت اور اسٹارٹ لیڈی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہی مرینہ ہے۔ ورشائے جاسوس کو دیکھا۔ اس نے کال کی تو ادھر مرینہ نے کال اٹینڈ کی۔ وہ دونوں کو غور سے دیکھ رہی تھی اور اپنے فون پر ماں سے کہہ رہی تھی۔ ”ماتا جی! میں جہاں کھڑی ہوں وہاں ایک شخص نے بی بی بیوسٹاری سوٹ میں ہے۔“

وہ سٹاری سوٹ والا فون پر کہہ رہا تھا۔ ”مرینہ! ہمارے سفارت خانے کی گاڑی آئی تھی۔ جبری اس میں بیٹھ کر گیا ہے۔ یہ کسی نادانی ہے؟ اسے سمجھنا چاہیے تھا کہ ہماری یہ گاڑی دشمنوں کی نظروں میں ہوگی۔“

مرینہ نے کہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ اچھا ہوا تم اس گاڑی میں نہیں گئے۔ یہاں سے ایک ریغذ کار لے لو۔“

ورشائے دیکھا۔ مرینہ نے فون بند کیا تو سٹاری سوٹ والے نے بھی اپنے فون کو بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔

اس نے ماں سے کہا۔ ”وہ جو بلیک جینز اور جیکٹ میں خوبصورت سی عورت انگریز جیسی لگ رہی ہے، وہی مرینہ ہوگی۔ وہ پھر کسی کو فون کر رہی ہے۔“

مراد مرینہ کے قریب ہی کھڑا تھا۔ وہ فون پر اس کے نمبر بیچ کرنے لگی۔ رابطہ ہونے پر کبڈی کی آواز سنائی دی۔ مرینہ نے کہا۔ ”مراد! میں یہاں آگئی ہوں۔ تم کہاں ہو؟“

وہ بولا۔ ”پیٹ خراب ہو گیا ہے۔ ٹوائلٹ میں ہوں۔“
وہ ناگواری سے بولی۔ ”لعنت ہے۔ کیا تم ہمیشہ ٹوائلٹ سے ہی بولتے رہتے ہو؟“

”میں کیا کروں؟ تم ایسے ہی وقت کال کرتی ہو۔ جب میں یہاں آکر بیٹھتا ہوں۔“

”میں سمجھ رہی تھی تم مجھے ریسیو کرنے آؤ گے۔“
”کیا مجھے پاگل کہتے تھے؟ کاٹا ہے کہ گولیاں کھانے آؤں گا۔ تم کسی ہوٹل میں جاؤ۔ چپت راؤ کے آدمی چھپ

بھڑا صحت مند دکھائی دے رہا تھا۔ جبکہ مراد اس کے پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ بولی۔ ”شاباش تم نے مجھے ہوشیار کر دیا ہے۔ گاڑی چلاؤ۔ میں اس پر نظر رکھوں گی۔“
وہ اسٹیرنگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ وہ جانتا تھا کہ انٹر پورٹ پر ایک ٹیکسی ڈرائیور کی حیثیت سے مرینہ کے قریب جائے گا تو وہ اس کے قدامت کو دیکھ کر شہ کرے گی۔
اس نے خود کو تیسے سے بالاتر رکھنے کے لیے اپنے جیسے دو قد آور جوانوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ان میں سے ایک ابھی مرینہ کے پیچھے لگ گیا۔ دوسرا بعد میں کہیں نظر آنے والا تھا۔

سناری سوٹ والا ریٹائرڈ کار حاصل کر چکا تھا۔ وہ بھی مرینہ کی ٹیکسی کے پیچھے لگ گیا تھا اور ورثا مسلسل اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ جتنی اور اس کی دو بیٹیاں اور کئی جاسوس عورتیں مختلف گاڑیوں میں تھیں۔ انہیں جس پر شہ ہو رہا تھا۔ اس کے تعاقب میں وہ اپنی گاڑیاں دوڑا رہی تھیں۔
مرینہ کبھی پیچھے گھوم کر دیکھتی کبھی دائیں بائیں کھڑکیوں کے پار نظریں دوڑاتی تھی۔ وہ قد آور موٹر سائیکل والا قاصد رکھ کر پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔
اسے شہ ہوا کہ تعاقب کرنے والی گاڑیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ اس نے مراد سے کہا۔ ”ابھی ہوٹل کی طرف نہ جاؤ۔ ایسے راستوں پر چلو جہاں کم سے کم ٹریفک ہوتا ہے۔“

مراد راستہ بدل کر جانے لگا۔ ایسے وقت چھپت راؤ نے مرینہ کو فون پر مخاطب کیا۔ اس سے بولا۔ ”میں چھپت راؤ بول رہا ہوں، کیا تم دہلی پہنچ گئی ہو؟“
وہ بولی۔ ”انجان نہ بنو چھپت راؤ، تم یہاں موجود ہو اور مجھے دیکھ رہے ہو۔“

”یہ تمہارا غلط اندازہ ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مراد کے ساتھ کولکتہ میں ہوں۔ تم دہلی بونے مراد کو دیکھنے آئی ہو۔ اس سلسلے میں ہم خاموش تماشاکی بنے ہوئے ہیں۔“
”یہ کیا بکواس ہے؟ وہ بونا خود کو مراد کہہ رہا ہے۔ میرے اندر کی ایسی باتیں بتا رہا ہے جسے صرف مراد جانتا ہے۔ اگر مراد کولکتہ میں ہے تو وہ بونا دہلی میں خود کو مراد کیوں کہہ رہا ہے؟ کیسے میرے اندر کی باتیں جانتا ہے؟“
”تم آہی گئی ہو۔ اس بونے سے ملاقات ہو جائے تو اس سے ضرور معلوم کرنا کہ قد چھوٹا کیسے ہو گیا ہے؟ اور وہ تمہارے اندر کی خفیہ باتیں کیسے جانتا ہے؟“

”تم مجھے بلا کر چھپ رہے ہو۔ یہ غلط ہے۔ تمہیں ابھی آنا چاہیے۔ تم پہلے تو ایسے نہیں تھے۔“
”پہلے کی بات نہ کرو۔ میں پہلے چارٹ کا بھی نہیں تھا۔ حالات نے بدل ڈالا ہے۔ اور میں بدل گیا ہوں اور کیا کر سکتا ہوں؟ جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ کسی ہوٹل میں جاؤ۔ میں اچھی طرح مطمئن ہونے کے بعد تمہیں لینے آؤں گا۔“ کبڈی نے اس کا جواب سے بغیر فون بند کر دیا۔
وہ جھنجھلا گئی۔ کئی ٹیکسی ڈرائیور مسافروں سے پوچھتے پھر رہے تھے کہ وہ ٹیکسی میں جانا چاہیں گے یا پرائیویٹ ٹیکسی میں؟ مراد نے یہ بھی مرینہ کے پاس آکر پوچھا۔ ”میڈم! میرے پاس پرائیویٹ ٹیکسی ہے۔ اے سی بھی ہے۔ ویری کمفارٹبل ہے۔“

مرینہ سوچ میں تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک جوان بیٹھ سم ڈرائیور نیلی وردی میں کھڑا تھا۔ بڑی متاثر کرنے والی پرستانہ نگاہوں سے وہ بولی۔ ”ہاں۔ سامان اٹھاؤ۔“
اس نے ایک تاجدار کی طرح جلدی سے اس کی اپنی اور ایک گٹار کو اٹھایا۔ اس گٹار پر غلاف چڑھا ہوا تھا۔ وہ جرائم کی دنیا کا کھماڑی بن چکا تھا۔ یہ سمجھ گیا کہ مرینہ کو موٹوسائیکل کا شوق نہیں ہے۔ وہ گٹار کے اندر کن چھپا کر لے جا رہی ہے۔

برٹش انٹرا لائن سے عملے اور انڈین پولیس کی ٹلی بھگت سے گن لے جانے کی سہولت فراہم کی گئی ہوگی۔ اس نے گٹار اٹھایا تو مرینہ نے فوراً ہی ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ”یہ گٹار مجھے دے دو۔“

اس نے مراد سے گٹار لے کر اپنے شانے سے لٹکا لیا۔ ”نہ ہتھیار اس کا زیور تھے۔ اپنا زیور کسی کے ہاتھ میں جانے نہیں دیتی تھی۔ وہ کار کی پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ اسے حکم دیا۔ ”ہوٹل پہنچ چلو۔“

وہ مرینہ کے پاس آکر پچھلی سیٹ کی کھڑکی پر جھک کر بڑی رازداری سے بولا۔ ”میڈم! میں وزیٹرز لابی سے یہاں تک دیکھتا آ رہا ہوں۔ ایک شخص ادھر ادھر ٹپکتے ہوئے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ اب یہاں میری گاڑی کے پیچھے اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا ہے۔ میں دسوے سے کہتا ہوں۔ وہ آپ کا پیچھا کرے گا۔“

مرینہ نے فوراً ہی گھوم کر پچھلے شیشے کے پار دیکھا۔ اسے مراد کی طرح ایک قد آور شخص نظر آیا۔ وہ اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ہیلمٹ پہن رہا تھا۔ وہ مراد کی طرح

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریٹریوم ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر پو پو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

اب سفارت خانے کی گاڑی ورشا کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ مرینہ کے ساتھ آنے والے جاسوس اس گاڑی میں تھے۔ وہ کھڑکیوں سے ہاتھ نکال کر ورشا کی گاڑی کو نشانہ بنا رہے تھے۔

ایسے وقت جگنی ہائی اور جاسوس عورتوں کی گاڑیاں فائر کرتی ہوئی آگئیں۔ ان کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔ گھرے والیاں دو گاڑیوں میں تھیں، دو اطراف سے گھیر رہی تھیں۔ پھر جگنی ہائی نے ایک دستی بم پھینکا تو وہ کھڑکیوں کے راستے گاڑی کے اندر پہنچ گیا۔

پھر اس سے پہلے کہ اس بم کو واپس باہر پھینکا جاتا۔ ایک زبردست دھماکا ہوا۔ اس گاڑی کے چوتھے اڑ گئے۔ گھاگھرے والیاں دور رک گئی تھیں۔ پھر وہ گاڑیوں کو موز کرواپس جانے لگیں۔

مرینہ ان سے بہت دور دوسری سڑک پر تھی۔ اس کے ساتھ آنے والے ایک جاسوس نے فون پر کہا۔ ”مرینہ! سوئیڈ۔ سفارت خانے کی گاڑی تباہ ہو گئی ہے۔ ہمارے دو ساتھی مارے گئے ہیں۔ جبری کی کار کو بھی تباہ بنا دیا گیا ہے۔ ایک لڑکی اس پر بھی فائر کرتی ہوئی گئی تھی۔ پتا نہیں جبری زندہ بھی ہے یا نہیں؟“

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”ہم خسارے میں پڑ گئے ہیں۔ تم محتاط رہو۔ یہ معلوم کرو کہ کن لوگوں نے ہمیں نقصان پہنچایا ہے۔“

”وہ ساری کی ساری عورتیں ہیں۔ پتا نہیں یہ عورتیں کس تنظیم سے تعلق رکھتی ہیں۔“

وہ بولی۔ ”تجربے ہم نے پہلے بھی سنا نہیں کہ عورتیں اتنی زیادہ تعداد میں کسی سٹریٹ یا ریکٹ کے لیے کام کرتی ہیں۔ وہ بھی انڈیا میں؟“

”مرینہ! اب تک مراد کہیں نظر نہیں آ رہا ہے اور دوسرے دشمن ہمیں نقصان پہنچا رہے ہیں۔“

اسی لمحے تڑا تڑا فائرنگ کی آواز آئی۔ دو گولیاں جیسی کی باڈی سے گھرا کر گزر گئیں۔ مرینہ فون کو ایک طرف پھینکتے ہوئے جھک گئی۔ شاٹ گن کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

مراد نے سیٹ کے نیچے کھینکتے ہوئے جیسی کو سڑک کے کنارے روک دیا۔ وہ چیخ کر بولی۔ ”یو ایڈیٹ! تم نے گاڑی کیوں روکی ہے۔ وہ ہمیں گھیر لیں گے۔“

وہ بولا۔ ”میں مرنے کے لیے گاڑی نہیں چلاؤں گا۔“

”اگر وہ یونا مراد ثابت ہوگا تو میں اسے کسی کیڑے کی طرح عیروں میں مسل دوں گی۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ مراد ڈرایو کرتا ہوا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میڈم! دو دلوں سے ہمارے دل میں یونے مراد کی بہت دھوم مچا ہے۔ کیا آپ اسی یونے سے ملنے آئی ہیں؟“

وہ ابھی ہوئی تھی۔ سخت لہجے میں بولی۔ ”گاڑی چلاؤ اور اپنے کام سے کام رکھو۔“

اس کے فون سے پھر رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے ٹن واپا کر اسے کان سے نکال دیا۔ ڈیجیٹل ریکٹ کے ڈی بلیک نے کہا۔ ”مرینہ! مجھے آپ ایک مل کی رپورٹ مل رہی ہے۔ اس وقت کئی گاڑیاں تمہاری گاڑی کے تعاقب میں ہیں۔ میں پھر سمجھاتا ہوں۔ فنی فنی پر راضی ہو جاؤ۔ تم جہاں بھی مراد سے ملنے جا رہے ہو میرے آدی تمہیں سکیورٹی دیتے ہوئے وہاں تک پہنچا دیں گے۔“

وہ بولی۔ ”میں مراد سے ملنے نہیں جا رہی ہوں۔ تم اپنے آدمیوں کی لاشیں گنتے کا انتظار کرو۔“

اس نے فون بند کر کے غلاف کے اندر سے گٹار کو نکالا۔ مراد عقب نما آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے گٹار کے اندر سے ایک پستول نکال کر جینز کی کمر ڈھیلی کی پھر اندر ہاتھ ڈال کر پستول کو اپنی جاکٹ سے لگے ہوئے بیلٹ میں اٹکا دیا۔ پھر ایک شاٹ گن نکال کر اسے لوڈ کرنے لگی۔

مراد نے سہم کر کہا۔ ”یہ کیا کر رہی ہو؟ یہ تو بندوق ہے۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ کیا مجھے...“

وہ ڈانٹ کر بولی۔ ”یوشٹ اپ! تان سنس۔ میں تمہیں کیوں ماروں گی؟ تم گاڑی چلا رہے ہو اور آئینے میں مجھے دیکھ رہے ہو؟ فوراً آئینے کا رخ بدلنا اور سامنے دیکھتے رہو۔ اور خبردار! میرے معاملے میں بالکل خاموش رہو۔“

”میں کیسے خاموش رہوں؟ میں بہت دیر سے سمجھ رہا ہوں کہ آپ کوئی گڑبڑ دہلی میڈم ہیں۔ کتنی ہی گاڑیاں ہمارے پیچھے لگ گئی ہیں اور آپ نے بندوق نکال لی ہے۔“

وہ پھر سخت لہجے میں بولی۔ ”تم چپ رہو گے یا نہیں؟“

اسی وقت فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ مرینہ نے فوراً گھوم کر دیکھا۔ اس سڑک پر گاڑیاں کم تھیں۔ ایک کار دوسری کار پر تڑا تڑا فائر کرتے ہوئے فرار لے بھرتے ہوئے بائیں طرف جانے والی سڑک پر مڑ کر بھاگی جا رہی تھی۔

ورشانے ریفلکس کار پر گولیاں چلائی تھیں۔ اس کار کا پتہ برسٹ ہوا تھا۔ ایک گولی سفاری سوٹ والے کو زخمی کر

وہ اجاڑنے کی دیوار کے ساتھ ٹیکسی ڈرائیو کرتا ہوا ایک بڑے آہنی گیٹ کے پاس آیا۔ وہ گیٹ کھلا ہوا تھا اور اندر وہی موٹر سائیکل دکھائی دے رہی تھی۔ وہ فوراً ہی ٹیکسی سے باہر آتے ہوئے بولی۔ ”یہ اس کی گاڑی ہے۔ وہ یہاں آیا ہے۔“

اس نے گیٹ کے اندر آ کر دیکھا۔ وہاں دور تک ویرانی تھی۔ فارم ہاؤس کا کوئی ملازم بھی نہیں تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک خوبصورت سارہانشی بنگلا تھا۔ اس بنگلے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی بنگلے کے برآمدے میں آئی پھر اس نے آواز دی۔ ”یہاں کوئی ہے؟“

اسے جواب نہیں ملا۔ وہ شاٹ گن کو مضبوطی سے تمام کر کے کھلے ہوئے دروازے پر آئی۔ کمر اخالی تھا۔ اس نے پھر آواز دی۔ ”مراد! میں جانتی ہوں۔ تم یہاں ہو۔ یہ آنکھ مچولی بند کرو۔ دیکھو میں آئی ہوں۔ دروازے پر آ جاؤ۔“

وہ آ گیا۔ دروازہ کھلا تو وہاں یونٹا مراد کھڑا ہوا تھا۔ وہ گھور کر بولی۔ ”مراد کہاں ہے؟“

وہ کمرے میں واپس جاتے ہوئے بولا۔ ”میں ہوں مراد۔ میں انرپورٹ سے یہاں تک لائشیں گرانٹا اور خون کی ندیاں بہاتا آیا ہوں پھر بھی تم پہچان نہیں رہی ہو۔“

وہ اس کے سامنے ایک طرف سے دوسری طرف جاتے ہوئے بولا۔ ”تازہ ترین اطلاع کے مطابق ریڈ الارٹ کے پانچ اور ڈیٹا سٹریٹس ریکٹ کے چار جیلے مارے جا چکے ہیں۔ تمہارے ساتھ آنے والے تین جاسوس بھی جہنم میں پہنچ گئے ہیں۔“

”ایسا کب تک ہوتا رہے گا؟ خدا جانتا ہے میں اپنی مارڈنا تک پہنچنے کے لیے کب تک آگ اور لہو سے کھیلتا رہوں گا۔“

وہ گرجنے کے انداز میں بولی۔ ”زیادہ نہ بولو۔ مجھے فوراً بتاؤ مراد کہاں ہے؟“

”تمہارے سامنے ہے۔ تمہیں یقین دلانے کا ایک ہی راستہ رہ گیا ہے۔“

وہ پھر بنگلے کے انداز میں ادھر سے ادھر جاتے ہوئے بولا۔ ”لندن میں تمہارا سرورس ریکارڈ کہتا ہے کہ تم ناقابل شکست اور ناقابلِ تسخیر ہو۔ اس زمین پر صرف ایک مراد ہی ہے جو تمہاری ہڈیاں اور پسلیاں چھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔“

وہ اس کے سامنے بیٹنزا بدلتے ہوئے بولا۔ ”تو پھر آؤ۔ ابھی تمہاری ہڈیاں توڑ کر ثابت کروں گا کہ میں ہی مراد

مراد نے دیکھ لیا تھا۔ ٹینٹا اور ڈولی کی گاڑیاں سروس روڈ پر تھیں اور وہ دشمنوں کی طرف فائر کر رہی تھیں۔ دشمن اپنی گاڑیوں سے نکل کر فائر کرتے ہوئے دور جا رہے تھے۔ وہ ٹینٹا اور ڈولی کو اپنا حمایتی پا کر مراد کی ٹیکسی سے نکل آئی تھی، اسے انجانی حمایت اور حوصلہ مل رہا تھا۔ وہ بھاگنے والوں پر فائر کرنے لگی۔

ایسے وقت گھانٹا پلٹن کی دو گاڑیاں اور آگنی تھیں۔ چاروں طرف سے فائرنگ کے نتیجے میں وہ سب کے سب مارے گئے۔ ٹینٹا نے مرینہ کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ”اسے جاؤ۔ بھاگو یہاں سے۔ ابھی اور دشمن ہیں۔ وہ دیکھو ادھر تمہارا کوئی درست ہے یا دشمن وہ دوسرے سروس روڈ پر جا رہا ہے۔“

مرینہ نے سر ہٹا کر دیکھا۔ ایک قد آور شخص ہیلمٹ پہنے موٹر سائیکل پر جا رہا تھا۔ وہ فوراً ہی ٹیکسی میں بیٹھتی ہوئی مراد سے بولی۔ ”گاڑی چلاؤ۔ وہ دیکھو۔۔۔۔۔۔ سروس روڈ پر اس موٹر سائیکل والے کو جانے نہ دو۔ اسے پکڑو۔“

مراد نے ٹیکسی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ دن دے ہے اور وہ دوسری طرف کے سروس روڈ پر ہے۔ آگے چوراہے پر اس کی طرف جا سکیں گے۔“

وہ سخت لہجے میں بولی۔ ”باتیں کم کرو۔ رفتار بڑھاؤ۔“

وہ بولا۔ ”آپ مجھے ڈانٹتی ہیں تو اچھا لگتا ہے۔ اتنی مرحوم یاد آ جاتی ہیں۔ کیا آپ اپنے بچوں کو اسی طرح ڈانٹتی ہیں؟“

”یونٹا سنس! کیا میں بچوں والی لگتی ہوں۔ ابھی میری شادی نہیں ہوئی ہے۔“

”پلیز ایک بات بتادیں۔ وہ موٹر سائیکل والا کون ہے؟ میں دو دنوں سے بھی پورے مراد کا ذکر سن رہا ہوں۔ بھی آدھے مراد کا۔ یہ کون ہے؟“

”یہ پورا ہے۔ اسپینڈ اور بڑھاؤ۔“

پھر وہ چونک کر بولی۔ ”ارے وہ دیکھو۔ وہ ادھر گلی میں مڑ گیا ہے۔ اسے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دو۔ اسے پکڑو۔“

”کیسے پکڑوں؟ کیا ٹیکسی کو ہوا میں اڑا کر لے جاؤں؟“

وہ بری طرح مضطرب ہو کر کھڑکی سے باہر سر نکال کر دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک گلی میں مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ مراد ایک یوٹرن کے کٹ پر آ کر ٹیکسی کو ادھر لے جانے لگا۔ اس گلی میں مڑ کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہ سب اس کی پلاننگ کے مطابق ہو رہا تھا۔ گلی کے دوسرے سرے پر چھٹی بائی کے فارم ہاؤس کی حد شروع ہو گئی تھی۔

علی منگی ہوں۔“

وہ شاٹ گن سے اس کا نشانہ لیتے ہوئے بولی۔ ”میں ایک بونے سے مقابلہ کر کے اپنی انسلٹ نہیں کروں گی۔ تجھے کوئی مار کر یہاں مراد کو ڈھونڈ نکالوں گی۔“ کبڑی اپنی عادت کے مطابق دونوں بچوں پر اچھلتے ہوئے جو لنگ کرتے ہوئے بولا۔

”ہاؤ ہو۔ ہاؤ ہو“

کہاں کا میں اور کہاں کی تو

چل ہو جا چھو منتر چھو چھو چھو۔“

وہ فضا میں اچھل کر قلابہ زنی کھاتے ہوئے اس کے دائیں سے بائیں گیا پھر قلابہ زیاں کھاتا ہوا بائیں سے دائیں آیا۔ مرینہ کی نظریں ایک جگہ ٹھہر نہیں رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ادھر سے ادھر بھنگ رہی تھیں۔

پھر اس کے حلق سے اچانک ہی کراہ نکل۔ کبڑی نے فضا میں چھلانگ لگاتے ہوئے اس کے ہاتھوں پر لگ ماری تھی۔ جیسے پتھر آ کر لگا ہو۔ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر دور فرس پر گئی۔ وہ قلابہ زیاں کھاتا ہوا گن کو اٹھاتا ہوا اس کے دو برو کھڑا ہو گیا۔ اب وہ نشانے پر گئی۔

یہ مرینہ کے لیے لگے لگے یہ تھا۔ اس کی توقع کے خلاف بونا خود کو قد آور مراد ثابت کر رہا تھا۔

اس نے کیا عجب تماشا دکھایا تھا۔ پلک جھپکتے ہی اس کی گن اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ اس نے ایسی لگ ماری تھی کہ اب تک ہاتھوں میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی پھر بھی یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ جس سے ہمیشہ شکست کھاتی آئی ہے، وہی مراد سامنے کھڑا ہے۔

وہ حیرانی سے بولی۔ ”نارگلا سیک۔ کچ بولو تم۔ کون ہو؟“

اس نے کہا۔ ”پہلے مراد علی منگی تھا۔ اب اپنا نام عبداللہ کبڑی رکھ لیا ہے۔ دشمنوں سے چھپنے کے لیے صورت بھی بدل دی۔ نام بھی بدل چکا ہوں۔“ وہ ایک صوفے سے ٹیک لگا کر بولا۔ ”ہائے مرینہ! دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہو جاتا ہے؟ جو چھٹانک بھر کا نظر آتا ہے، وہ پل بھر میں سوا میر ہو جاتا ہے۔“ وہ گن کو خالی کرتے ہوئے بولا۔ ”تم مجھے مراد تسلیم نہ کرو۔ میں نے تو تمہارے ساتھ راتیں کالی کی ہیں، میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ یہ جانتا ہوں کہ جینز کے اندر ایک پستول ہے۔ وہ ایک پلٹ کے ذریعے تمہاری جاگم سے بندھا ہوا ہے۔ تم میدان میں اترنے سے پہلے اسی طرح تیار ہو کر آتی ہو۔“

وہ اسے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ کہنت

اندر تک پہنچا ہوا ہے۔ پستول نکالنے نہیں دے گا۔ پھر کوئی بازی گری دکھائے گا، بہت ہی پھرتیلا ہے۔ ویسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس نے گن خالی کر دی تھی۔

وہ بولی۔ ”ہاں میں نے پستول چھپائی ہے۔ اسے نکال رہی ہوں۔ گھمڑی اولاد! کیا مجھے روک سکے گا؟“

اس نے ہنسی جینز کی کمر ڈھیلی کی۔ وہ بچوں کے بل اچھلتے لگا۔ اس نے اپنا ہاتھ جینز کے اندر پہنچایا۔ وہ جو لنگ کرتے ہوئے بولا۔

”ہاؤ ہو۔ ہاؤ ہو۔ کہاں کی گن اور کہاں کی گن“

چل ہو جا چھو منتر۔ چھو چھو چھو۔“

وہ فضا میں اچھلتا ہوا قلابہ زنی کھاتا ہوا اس کے سر کے اوپر سے گزرتا ہوا پیچھے گیا۔ مرینہ نے فوراً ہی پیچھے پلٹ کر دیکھا وہ پستول کو نکال نہیں پائی تھی۔ پہلے اس کے حملے سے بچنا چاہتی تھی۔

وہ پیچھے جا کر ایک صوفے پر کھڑا ہوا تھا پھر وہاں سے اچھل کر اس نے قلابہ زنی کھائی اور اس کے شانوں پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ اسے آسانی سے گرا سکتی تھی لیکن اچانک ہی اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ کبڑی نے گردن کے اطراف دونوں ٹانگوں کو پھندے کی طرح کس دیا تھا۔

وہ کبڑی کی دونوں راتوں کے درمیان ہاتھ ڈال کر پھندے کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کرنے لگی، لیکن وہ تو جیسے آہنی ٹکڑو تھا۔ کھل نہیں رہا تھا اور اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ ہار ماننے والی نہیں تھی۔ یکبارگی پیچھے کی طرف دوڑتے ہوئے دیوار سے ٹکرائی تو کبڑی کے حلق سے کراہ نکل۔ وہ بھی ٹکرایا تھا۔ ٹکڑو کھلتے ہی وہ شیرنی بن گئی۔

اس نے دونوں ٹانگوں کو پکڑ کر آگے کی طرف جھکا دیا تو وہ فرس پر آ کر اونڈھے منہ گرا۔ دن میں تارے نظر آنے لگے۔ آخر وہ بھی تربیت یافتہ فائرنگی۔ اب تک کسی نے اسے زیر نہیں کیا تھا پھر ایک بونے کی کیا بساط تھی؟

وہ اس کے پاس آئی پھر ایک زور کی ٹھوکر مارنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے ہی وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ٹھوکر خالی جانے کے باعث وہ ایک طرف گھوم گئی۔ اسی لمحے کبڑی نے اس کی ٹانگ پر ٹانگ ماری تو اس کے قدم فرس پر سے اٹھ گئے۔ وہ چاروں شانے چت ہوئی لیکن کمال پھرتی سے گھوم کر ایک ہاتھ کے بل اٹھ کر اس کے منہ پر ایک لگ ماری، وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے جا کر گرتے گرتے سنبھل گیا۔ دونوں ہی پھر تیلے اور تیز رفتار تھے۔ ذرا بھی رک کر مقابل کو سنبھلنے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔

سراغزسانوں کو ساتھ لے کر کیوں آئی تھیں؟
 ”میں انہیں ساتھ نہیں لائی تھی۔ وہ اپنی روشنی کے
 مطابق ڈیوٹی کرنے آئے ہیں۔“
 ”ڈیوٹی یہی ہے کہ مجھے زندہ یا مردہ، کسی بھی حالت
 میں۔ یڈارٹ کے حوالے کیا جائے گا۔“
 ”تم مجھ پر شبہ کیوں کر رہے ہو؟“

اس نے پوچھا۔ ”یاد ہے، جب ہم ڈرگا پر ساد کی کوشی
 میں چھپے ہوئے تھے۔ وہاں تم نے اپنے ڈائریکٹر جنرل سے
 فون پر باتیں کی تھیں پھر انگریزی بولتے بولتے اچانک ہی
 فریج بھاشا بولنے لگی تھیں کیا مجھے بتاؤ گی کہ فرانسیسی زبان
 میں کیا بول رہی تھیں اور مجھے کس طرح انو بتا رہی تھیں؟“
 ”میں تمہیں کیوں انو بتاؤں گی؟ میری سمجھ میں نہیں
 آتا کیوں مجھ پر شبہ کر رہے ہو؟“

وہ اس سے لگی ہوئی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے الگ
 کرتے ہوئے کہا۔ ”سچ بولو گی تو یہاں سے زندہ جاسو گی۔“
 مرینہ پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ یہ سمجھ رہی تھی کہ
 فرانسیسی زبان کا ترجمہ اسے معلوم ہو گیا ہے۔ لیکن مراد کو کون
 ترجمہ سنائے گا؟

وہ بولی۔ ”کسی نے میرے خلاف تمہیں بھڑکایا ہے۔“
 مراد نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر مارا۔ وہ ایک
 قدم پیچھے چلی گئی، جھنجھلا کر بولی۔ ”میں جھوٹا الزام اٹھانے
 اور مار کھانے نہیں آئی ہوں۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا
 جانتی ہوں۔ جیڑ مراد! میرے پیار کو میری وفاؤں کو سمجھو۔
 مرینہ... جیسی جان دینے والی عورت بھی تمہیں نہیں لے
 گی۔ میری قدر کرو۔“

”تمہیں ایک نہیں کئی بار آزما چکا ہوں۔ تم فطرتاً
 نائن ہو۔ ڈسنے سے باز نہیں آتی ہو۔“

یہ کہہ کر اس نے پھر ایک ہاتھ مارنا چاہا۔ مرینہ نے
 اس حملے کو روک دیا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے حملہ کیا۔ وہ
 ڈانٹتی پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”کیا تمہیں اپنی طاقت پر تمہیں
 ہے؟“ وہ ہینٹر ابدلنے کے انداز میں بولی۔ ”اس لیے مغرور
 ہو کہ دشمنوں کو مارتے آئے ہو۔ ان کے حملوں سے بچتے
 رہے ہو اور.....“ اس نے ہات اداوری چھوڑ کر اچانک ہی
 اچھل کر ایک گنگ ماری۔ وہ لات اس کے سینے پر لگی۔ وہ
 زمین پر گڑی ہوئی بھاری چٹان کی طرح تھا۔ ایک ذرا سا
 ڈگمگا کر پھرتن کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اداوری ہات کو آگے
 بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”اور میں بھی کئی بار تم سے مات
 کھا چکی ہوں۔ آخری بار تم پر حاوی ہو گئی تھی۔ تمہیں زخمی اور

اس وقت کہ نہیں جاسکتا تھا کہ کون کس پر حاوی
 ہوگا۔ قدر اور جسامت کے لحاظ سے مرینہ بھاری کم تھی۔
 کبڈی اپنی مہارت کے باعث اس کے مقابلے پر ٹھہرا ہوا
 تھا۔ اسی وقت مراد اور واژہ کھول کر کمرے میں آیا۔ اس نے
 کبڈی کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ”بہت ہو چکا تم جاؤ۔ مجھے
 اپنا کام کرنے دو۔“

مرینہ اس فیکسی ڈرائیور کو گھور کر سوالیہ نظروں سے
 دیکھ رہی تھی۔ کبڈی وہاں سے چلا گیا۔ مرینہ نے پوچھا۔
 ”تم ایک دوسرے کو جانتے ہو؟“

وہ بولا۔ ”اس کی بات چھوڑو۔ یہاں ہم تم ہیں اور ہم
 بھی ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔“
 اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ ”کون ہو تم؟“
 وہ مسکرا کر بولا۔ ”ائر پورٹ سے یہاں تک میری ..
 ہم سفر رہی ہو۔ مجھ سے باتیں کرتی رہی ہو۔ پھر بھی پہچان نہ
 سکتیں۔“

وہ اپنے اصل لب و لہجے میں بولا۔ ”مراد علی سنگی کو
 نہیں پہچانو گی تو اس کے سر کا سودا کیسے کرو گی؟“
 وہ ایک دم سے تڑپ کر اس کے قریب آ کر اسے غور
 سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم مراد ہو۔ میرے مراد ہو۔“
 وہ اس کے چہرے کو ادھر ادھر سے چھو کر بولی۔ ”تم
 چہرہ بدل چکے ہو۔ بانی گاڈ! جب میں تمہیں پہچان نہ سکی تو
 کوئی دشمن تمہیں نہیں پہچان سکے گا۔“

وہ اس کی گردن میں ہاتھیں ڈال کر ٹھوڑی کے نچلے حصے
 پر اپنا منہ رگڑتے ہوئی بولی۔ ”ہاں یہ تم ہی ہو۔ تمہارے سینے کی
 جھک کہہ رہی ہے کہ تم میری راتوں کے ہم سفر رہے ہو۔“
 وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”میں نے سنا ہے، تم میرے
 بچے کی ماں بننے کے لیے باؤلی ہو رہی ہو۔“

”ہاں میرے ہاتھ لے پن کا یہ کھلا ثبوت ہے۔ میں
 پھر تمہارے ساتھ دتت بتانے کے لیے آفس سے چھٹی لے کر
 سات سمندر پار سے آئی ہوں۔“

”مجھے یقین ہے۔ اتنی محبت کوئی نہیں کرے گا، جتنی تم
 کرتی ہو۔ میرے ساتھ مستیاں کرنے کے لیے بچا اس لاکھ
 کی خطیر رقم کو بھی ایک طرف رکھ دیا ہے۔ وہ رقم نہیں نہیں
 جائے گی۔ جب میرے بچے کی ماں بننے کے آثار پیدا
 ہوں گے۔ تب میرے سر پر رکھی ہوئی رقم وصول کر لو گی۔“
 ”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا میں تمہارے سر کا سودا کروں
 گی..... ہرگز نہیں۔ کسی کو کرنے بھی نہیں دوں گی۔“
 ”تو پھر اپنے ڈیپارٹمنٹ کے چار شوٹرز اور

شہ پارہ

ہماری مگی میں ایک فقیر آتا ہے، وہ صد اوتتا ہے
 ہر چند منٹ کے بعد اس کی صد اگی میں گونجتی ہے۔
 ”میری باری کیوں اتنی دیر کر دی۔“
 اس کی صد اسن کر مجھے غصہ آتا ہے۔ میرے
 اندر کی بھڑان چڑچڑ، داسنے بھونتی ہے۔ ایک روز
 میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے دوڑ کر فقیر
 کو پکڑ لیا۔
 ”یہ تو کیا مرد ہے؟“ میں نے غصے سے پوچھا۔
 ”صد اے رہا ہوں یا بونجی۔“ وہ بولا۔
 ”کیا مطلب ہے تیرا اس صد ا سے؟“ میں
 نے اسے ڈانٹا۔

”میں سکتا ہوں، مانگ رہا ہوں۔“ فقیر بولا۔
 ”کیا ایسے مانگا کرتے ہیں؟ حق پہلے مانگنا
 سیکھ۔ جو مانگتا ہے منت کر کے مانگ۔ ترے لے کر دینے
 والے کا ادب کر، احترام کر تو، تو اس کے خلاف
 شکایت کر رہا ہے کہ میری باری کیوں اتنی دیر کر دی۔
 بے وقوف دینے والے کی مرضی ہے، چاہے جلدی
 دے چاہے دیر سے دے۔ چاہے کم دے، چاہے
 زیادہ دے، چاہے دے چاہے نہ دے۔“
 فقیر بولا۔ ”جاہا بونجی! اپنا کام کر۔ مانگنے
 والا جانے اور دینے والا جانے۔ تو مانگا لکھا ہے کیا؟
 میں نے ساری زندگی یہی صد ا دی ہے۔ اس نے
 کبھی بیسے ٹوکا نہیں، کبھی غصہ نہیں کیا، الٹا وہ مجھے دیتا
 رہا ہے، دیتا رہا ہے۔“

ملتی ممتاز کا حسین شہ پارہ

کالج میں رزلٹ کا دن تھا۔ ایک دوست
 دوسرے سے یار میرے ابو میرے ساتھ کھڑے ہیں،
 تو جا اور جلدی سے میرا رزلٹ دیکھ کر آ، اگر میں ایک
 بیچر میں ٹیل ہوا تو کہنا ایک مسلمان بھائی تم کو سلام کہتا
 ہے اور اگر 2 میں ٹیل ہوا تو کہنا 2 مسلمان بھائی سلام
 کہتے ہیں۔

دوست گیا اور واپس آ کے بولا۔ ”یار پوری
 امت مسلمہ تجھے سلام کہ رہی ہے۔“

مرسلہ: رضوان مولیٰ کریدوی،

اور فی ٹاؤن، کراچی

ہے دست دیا کر کے اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ”وہ اس کے سامنے
 دائیں سے بائیں جاتے ہوئے بولی۔“ ”اگر مرد کے بچے ہو
 اور تمہا مجھے زیر کرنے آئے ہو تو ابھی دیکھ لو گے۔ تمہیں اپنا
 بنا کر یہاں سے لے جاؤں گی۔“

اس نے کہا۔ ”میں تمہا نہیں زیر کروں گا۔ یہاں کوئی
 ہمارے درمیان نہیں آئے گا۔“

وہ جدھر جا رہی تھی۔ وہ ابھر گھوم کر اسے دیکھتا جا رہا
 تھا۔ اپنی ٹانگ ہی سرینے نے فرش پر گرتے ہی اس کی ٹانگ پر
 ٹانگ ماری۔ اس کے پاؤں فرش پر سے اٹھ گئے۔ وہ
 اچھل کر اس کے قریب ہی چاروں شانے جیت ہو گیا۔

پھر دونوں ہی بڑی بھرتی سے اچھل کر کھڑے
 ہو گئے۔ وہ اس کے مقابلے میں ہلکی پھلکی سی تھی۔ اس سے
 چند سینکڑ پہلے اٹھتے ہی اس کے منہ پر لگ ماری۔ منہ دوسری
 طرف گھوم گیا پھر دوسری لگ اس کے پاؤں پر لگی تو وہ
 سنبھال نہ سکا۔ دوسری بار زمین یوں ہو گیا۔

وہ بے شک بہت ہی تربیت یافتہ تھی۔ ہتھیاروں کے
 بغیر لڑنے کی تکنیک جانتی تھی لیکن ایک تباہت تھی۔ عورت
 ہونے کے باعث پتھری ادا ہوا تو لاد تھا۔

مرینہ کے حملے سے بار بار گرا رہے تھے اور چوٹ
 پہنچا رہے تھے لیکن وہ چوٹیں بے اثر ہو رہی تھیں۔ اس کے
 کئی کامیاب حملوں کے بعد مراد کا ایک گھونسا منہ پر پڑا تو وہ
 چکرا کر رہ گئی۔ آنکھوں کے سامنے لگاتی اندھیرا چھا گیا۔ وہ
 فوراً ہی پیچھے دیوار سے لگ کر سنبھل گئی تھی سنبھلنے کے بعد فوراً
 ہی حملہ نہ کر سکی۔ مراد نے اس کا موقع نہیں دیا۔ اس کے
 پیٹ پر ایک زور کی لات ماری۔ اس کے حلق سے چیخ نکل
 گئی۔ وہ تکلیف کی شدت سے پیٹ پکڑ کر جھکتے لگی۔ اس نے
 تکلیف سے کراہتے ہوئے فرش پر گھٹنے ٹیک دیے۔ مراد
 نے اس کے جھکے ہوئے پیروں پر ایک زور کی ٹھوک ماری پھر
 کہا۔ ”سوتار کی، ایک لوہار کی۔ اب اٹھو اور حملے کرو۔“

وہ ٹھوک کھا کر فرش پر گر کر تڑپ رہی تھی۔ ناک سے
 اور ہاتھوں سے لہوس، ہاتھ کی تکلیف الگ تر پارہی
 تھی۔ اب وہ اسے ڈھیل دینا نہیں چاہتا تھا۔ اسے وہاں
 سے اٹھنے اور کچھ بولنے کے قابل نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس
 نے پھر اس کے منہ پر ٹھوک ماری تو وہ جھپٹیں مارتی ہوئی مانی
 بے آب کی طرح پھڑپھڑانے لگی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ کچھ نظر
 نہیں آ رہا تھا۔ وہ گہری گہری سانس لیتے ہوئے کراہتے
 ہوئے اوپر سے ادھر فرش پر لوٹتے ہوئے بولی۔ ”آہ“

انجیشن کی سولی بازو میں جیوست ہوتے ہی مرینہ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ ڈاکٹر نے کہا اب آنکھیں کھولے گی تو ایک نئی مرینہ ہوگی۔ اس کی نئی زندگی پاگل خانے سے شروع ہوگی۔“

☆☆☆

سیرا کا بہت برا حال تھا۔ ماروی کو بھولے ہوئے آٹھ مہینے یاد آگئے تھے۔ وہ واردات بھی یاد آگئی تھی جو غازی بابا کے دربار میں ہوئی تھی یہ انکشاف ہونے والا تھا کہ سیرا نے اسے ہلاک کرنے کی دسٹر کیا تھی۔

اب سیرا کی گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ چلتی تو لڑکھڑانے لگتی تھی جیسے پیروں تلے سے زمین نکل رہی ہو۔ بھوک آگئی تھی۔ پانی بھی حلق سے نہیں اتر رہا تھا۔ اس نے طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کیا اور دفتر سے بھاگ کر گھر آگئی۔ اسے محبوب کے فون کا انتظار تھا۔ وہ فون پر گالیاں سننے کی خاطر تھی۔

وہ دل میں کہہ رہی تھی۔ ”مجھے بڑی سے بڑی اذیت ناک سزا ملے۔ لیکن محبوب کی نفرت نہ ملے۔ میں برداشت نہیں کر سکیں گی۔ ایک کمزور امید کے سہارے بن رہی ہوں کہ کسی نہ کسی دن ان کی وہن بنوں گی۔ اگر محبوب نفرت کرنے لگیں گے تو امید دم توڑ دے گی۔ میرا بھی دم نکل جائے گا۔“

یہ سوچ کر بھی پریشان ہو رہی تھی کہ محبوب آفس میں ڈاکٹر عدیلہ کے خلاف بول رہے تھے۔ بہت غصے میں تھے لیکن میرے خلاف کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔

اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ کیا ماروی نے محبوب کو آٹھ مہینوں کی تمام باتیں نہیں بتائی ہیں؟

کیا بعد میں خوب تکمرج لگا کر محبوب سے تنہائی میں بولنے والی ہے؟ وہ ہر روز اس کے ساتھ لُج کرتے ہیں۔ ابھی اس کے ساتھ بیٹھے مزے سے بول رہے ہوں گے۔ جبکہ آفس سے غصہ دکھا کر گئے ہیں۔ اس کے ساتھ خوب چٹخارے لے کر کھا رہے ہوں گے۔ یہاں میرے حلق سے ایک دانہ نہیں اتر رہا ہے۔

اوگاڈا یہ ماروی کتنی خوش نصیب ہے۔ اس کے ایک نہیں دو عاشق ہیں۔ ایک دور ہو جاتا ہے تو اس کا غم بھلانے کے لیے دوسرا موجود رہتا ہے۔ اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو دونوں میں سے کوئی نہ کوئی اس کا پاڈی گاڑ بن کر حفاظت کرنے چلا آتا ہے۔ وہ بڑی سے بڑی مصیبتوں سے گزرتی

ہیں۔ بس کرو مراد..... میں مرجاؤں گی۔“ وہ ایک بار نہیں کئی بار اس پر رحم کھا چکا تھا۔ اسے گولی نہیں ماری تھی۔ صرف سزائیں دی تھیں۔ اس بار وہ رحم سے خالی ہو گیا تھا۔ اس نے پھر ایک زور کی لات اس کے پیٹ پر ماری۔ وہ تکلیف ناقابل برداشت تھی۔ اس کے حلق سے ایک فلک شکاف چنچ نکلیا۔ وہ کچھ بولنے اور کراہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس کا جسم ہولے ہولے جھٹکے کھا رہا تھا۔ پھر اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ مراد نے فون نکال کر ڈاکٹر نمینی سن کو مخاطب کیا۔ ”ڈیڈ آ جاؤں گی۔ یہ بے ہوش ہو گئی ہے۔ آپ کے آنے تک ہوش میں آجائے گی۔“

اس نے رابطہ ختم کر کے مرینہ کو دیکھا۔ وہ فرش پر اپنے آپ سے غافل پڑی تھی۔ انسان جس زمین پر زیادہ اچھلتا ہے اسی زمین پر زندگی سے خالی ہو کر سو جاتا ہے۔ وہ اس کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ بے چاری.... اسے بے حس و حرکت دیکھ کر بہت فسوس ہو رہا تھا۔ پھر وہ صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ مرینہ ہوش میں آ رہی تھی۔ اس کے منہ سے ہائے کے انداز میں ایک لمبا سانس نکلی اس کے قریب آ کر اس پر جھک گیا۔ وہ بول رہی تھی۔ ”مہو۔ مجھے۔ سن۔ نا۔ مارو.....“ وہ ذرا چپ ہو کر لمبی سانس لے کر بولی۔ ”جو پونجی.... ساری دنیا سے... چھپا کر رکھی تھی وہ..... وہ تمہیں دیتی رہی۔“ وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولی۔ ”ہائے۔ ہائے مراد.....! اس پونجی کے صدمے معاف کر دو.....“

اس نے ہمدردی سے اس پر ہاتھ رکھا۔ بے شک اس نے اپنی آبرو کا سہرا یہ اس پر لٹایا تھا۔ وہ محبت کے قابل تھی لیکن پچاس لاکھ ڈالر بھی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ یوں اس نے بچار کرنے والے کی نفرتیں سول لی تھیں۔

وہ اس کا ہاتھ تمام کر بولا۔ ”پھر ایک بار تمہیں زندہ چھوڑوں گا لیکن سزا ضرور دوں گا۔ اب جو سزا ملے گی وہ بہت ہی عبرتناک ہوگی پھر شاید تم راہ راست پر آ جاؤ گی۔ میں تمہارا سرمایہ ٹوٹ کر تم سے اتنی ہی ہمدردی کر سکتا ہوں۔“

ڈاکٹر نمینی سن آ گیا۔ مراد نے مرینہ کو بازوؤں میں اٹھا کر ایک بیڈ پر لٹا کر لٹا دیا۔ وہ آنکھیں کھولے دیکھ رہی تھی لیکن کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ اسے یاد نہیں تھا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے نیم بے ہوشی کی حالت میں کیا بولتی رہی تھی۔ اب وہ مراد کو چپ چاپ رقم طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

ڈاکٹر نمینی سن دوا سے بھری ہوئی ایک سرنج لے آیا۔ اس کے بازو پر چھتے ہوئے بولا۔ ”ڈونٹ وری ایجی تمہیں آرام آ جائے گا۔“

اپنے بیٹے کی غلطیوں کو سدھارنے کے بجائے جارحانہ انداز اختیار کر رہے ہو۔“

رحمان نے کہا۔ ”دیگر اس نصیحت خود را فضیحت۔ پہلے محبوب اور ماروی کی غلطیاں درست کرو۔ پھر میرے بیٹے کو سدھارنے کی باتیں کرو۔“

یہ کہہ کر رحمان نے فون بند کر دیا۔ معروف سر جھکا کر سوچنے لگا۔ رحمان نے بڑی سچی اور کھری باتیں کی تھیں۔ وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ ہزار نیک نیتی کے باوجود کوئی ماروی اور محبوب کو پاک دامن اور پارسانہ نہیں کہہ سکتا تھا۔

معروف نے محبوب کے نمبر شیخ کیے پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ ”رحمان بیٹے کو بیٹی بنا کر دھوکا دے رہا ہے میں نے اسے باتیں سنائیں تو اس نے بھی مجھے باتیں سنا ڈالیں۔“

محبوب نے کہا۔ ”وہ آپ کو کیا باتیں سنائے گا۔ آپ تو کسی سے فراڈ نہیں کرتے ہیں۔“

”میں بعض اوقات اپنی ہی غلطی اپنی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ تمہیں الزام دے رہا تھا کہ جب ماروی تمہاری داشتہ بن کر رہ سکتی ہے تو اس کا بیٹا، ماروی کے پاس کیوں نہیں جاسکتا۔“

”یہ کیا بکواس ہے؟ آپ نے اسے کہا نہیں کہ میں نے اسے کتنی عزت آبرو سے رکھا ہے؟“

”وہ کہہ رہا تھا، میں ثابت کروں کہ ایک ارب بیٹی تا جرایف باپ بن کر یا بھائی بن کر اس پر لاکھوں کروڑوں روپے لٹا رہا ہے۔ محبوب..... تم سچی بات نہ ثابت کر سکو گے، نہ دنیا مانے گی۔ اگر قانونی طور پر تمہارا محاسبہ کیا جائے تو تم ماروی کے ساتھ گناہ آلود زندگی گزارنے والے بدکار کہلاؤ گے۔“

”ہیئر آپ تو ایسی باتیں نہ کریں۔“

”میں نہیں کروں گا۔ رحمان کو اس کے بیٹے کے معاملے میں چھیڑا جائے گا تو وہ سرعام عدالت میں تمہیں چیلنج کرے گا، اس بات کو آگے نہ بڑھاؤ۔ اسے یہیں ختم کرو۔“

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔ ”آپ درست فرماتے ہیں۔ میں ڈاکٹر عدیلہ بن کر آنے والے پر مٹی ڈالتا ہوں۔“

”شباباش، فینشن فری رہو۔ دو تاریخ کو تو وہ تمہاری وائف بننے والی ہے پھر ماروی کو بدنام کرنے والے بھی چپ ہو جائیں گے۔ کیا میں امید کروں کہ تم پھر سے ہشاش

بشاش ہو کر ابھی آفس آؤ گے؟“

”جی ہاں۔ میں ایک گھنٹے میں آ رہا ہوں۔ کیا سمیرا وہاں ہے؟“

آ رہی ہے لیکن اس پر ذرا بھی آنچ نہیں آ رہی ہے۔ بڑے آرام و سکون سے زندگی گزار رہی ہے اور میں یہاں عذاب میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ اپنی غلطی کی سزا پارہی ہوں۔

کیا ضرورت تھی اسے سڑھیوں پر سے دھکا دینے کی۔ اب فکرو پریشانی اور خوف، دہرا اس کے دھکے کھا رہی ہوں۔ اب پچھتا رہی ہوں۔ نہ اس کی جان لینے کی کوشش کرتی۔ نہ ابھی.....

وہ آگے کچھ سوچ نہ سکی۔ اگر محبوب کال کرتا، اسے گالیاں دیتا تو ایک ذرا سلی ہوتی۔ وہ طرح طرح کی باتیں بنا کر اپنی صفائی میں بہت کچھ کہتی۔ اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا اور الزام سے بچنے کا کچھ تو موقع ملتا۔

لیکن بات تو اُدھے تیر کی طرح سینے میں ماروی نے اٹکا دی تھی۔ اگر بول دیتی تو تیر آ رہا ہو جاتا پھر جو ہوتا دیکھا جاتا۔

ادھر معروف بھی نے رحمان سے فون پر کہا۔ ”تم نے برسوں کی دوستی کا لحاظ نہیں کیا اور بیٹے کو بیٹی بنا کر ایک شریف گھرانے کی لڑکی کے علاج کے لیے بھیجے رہے ہمیں اندھا بناتے رہے۔“

رحمان نے کہا۔ ”میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ میں بیٹے کو بیٹی یا بیٹی کو بیٹا بناؤں، یہ میرا پرسنل گھریلو معاملہ ہے۔ یہ مان لو کہ میں نادان نہیں ہوں۔ میں نے قانون کی گرفت میں آنے والی کوئی حرکت نہیں کی ہے۔“

”بھیس بدل کر شریف گھرانوں میں جانا جرم ہے۔“

وہ طنز یہ انداز میں بولا۔ ”کس شریف گھرانے کی بات کر رہے ہو۔ میرا بیٹا جس ماروی کا علاج کرنے جاتا تھا۔ اس کا گھرانہ کیا ہے؟ اس کا تو گھر ہی نہیں ہے۔ اسے تو محبوب علی چاندیوں نے اپنی داشتہ بنا کر ایک کوٹھی رہنے کو دی ہے۔“

”یوشٹ اپ رحمان! تمہیں کسی شریف زاوی پر کچھ نہیں اچھا لانا چاہیے۔“

”کیا ثابت کر سکتے ہو کہ وہ اس کوٹھی میں راتیں رنگین کیے بغیر اس کی داشتہ نہیں اس کی بہن بن کر رہتی ہے؟“

”پلیز رحمان! وہ لڑکی بہت ہی نیک اور پاک دامن ہے۔ وہ اپنے سنگتیر کا اقتدار کر رہی ہے۔ اس کی منکوحہ بننے ہی اس کوٹھی سے چلی جائے گی۔“

”اگر وہ نیک اور پاک دامن ہے تو تم نے اسے بیٹی بنا کر اپنے گھر میں کیوں نہیں رکھا؟ اسے کس رشتے سے محبوب کی کوٹھی میں چھوڑا ہوا ہے؟“

معروف اس بات کا معقول جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں تمہیں فون پر نہیں سمجھا سکوں گا۔ تم

”نہیں۔ وہ اچانک ہی کچھ آپ سیٹ ہو گئی تھی۔ تمہارے جانے کے بعد اس نے کہا کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آفس میں کام نہیں کر سکے گی۔ وہ گھر چلی گئی ہے۔“

”معروف صاحب! وہ چپ چپ سی کم مسمی رہنے لگی ہے۔ آپ اسے سمجھائیں۔“

”میں کیا سمجھاؤں۔ وہ تمہارے پیار کی بہت اہم بازی ہار رہی ہے۔ بڑے مہر سے اپنی شکست کا تماشا دکھ رہی ہے۔ کہہ رہی تھی۔ دو تاریخ سے پہلے چھٹی نے کر چڑھ چلی جائے گی وہاں دو چار نئے گزارنے کے بعد آئے گی۔“

”معروف صاحب! وہ بہت اچھی ہے۔ مجھے دل کی گھرائیوں سے چاہتی ہے۔ میں جانتا ہوں، وہ ایک بہترین لائف پارٹنر ثابت ہوگی لیکن میں کیا کروں؟ میرا دل، میرا دماغ میرا نہیں رہا ہے۔ یہاں صرف اور صرف ماروی ہے۔ میں سیرا کو اپنی تمام دولت دے سکتا ہوں لیکن ماروی کے حقوق نہیں دے سکوں گا۔“

”میں سیرا کے حق میں تمہیں سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا ہوں۔ اب کچھ نہیں کہوں گا۔ دل ہی دل میں دعا مانگتا رہتا ہوں کہ دو تاریخ سے پہلے میری بیٹی سیرا کے لیے کوئی معجزہ ہو جائے۔“

”یعنی آپ چاہتے ہیں کہ کوئی گڑبڑ ہو جائے اور ماروی مراد کی دلہن بن جائے۔“

”میں تم سے بحث نہیں کروں گا ایک ہی بات کہوں گا کہ تمہارے کاروبار کو سنبھالنے والی سیرا تمہارے شایان شان ہے۔ میں نے ماروی کو ذہانت سے دیکھا ہے اور سمجھا ہے۔ وہ مراد کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ اسی کی دیوانی ہے۔“

یہ بڑی رازِ حقیقت تھی۔ محبوب سمجھتا تھا کہ وہ مراد کے بیٹے کو کیوں کیلے سے لگائے رکھتی ہے۔ مراد کے لیے جیسی دیوانی ہوتی رہتی تھی، ایسی دیوانگی کی مثال کوئی چاہنے والی پیش نہیں کر سکتی تھی اور محبوب کی دیوانگی کہتی تھی کہ ماروی اسے بھی چاہتی ہے۔ خواہ احسان مند ہو کر چاہتی ہو۔ اس کی نگاہیں جب اسے دیکھتی تھیں تو ان لمحات میں وہ آنکھیں صرف محبوب کے لیے ہوتی تھیں۔

محبوب نے کہا۔ ”معروف صاحب! آپ درست فرماتے ہیں۔ ماروی آج مراد کی دیوانی ہے۔ کل جب میری منگوانہ بننے کی تو اس کی شرم و حیا اور اس کی شرافت اسے صرف میری ذات تک محدود رکھے گی۔ پھر اس کے دل میں مجازی خدار ہے گا۔ مراد قصے پارینہ بن جائے گا۔“

”میں نے کہا نا، تم سے کوئی بحث نہیں کروں گا۔ ابھی

آفس آؤ گئے تو ہم صرف کاروباری باتیں کریں گے۔“

”ابھی فون بند نہ کریں۔ پلیز یہ بتادیں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں ماروی کو جبراً اپنی دلہن بنا رہا ہوں؟“

”میں کیا بولوں؟ لوگ داستان کا عمر بھی نہیں سمجھتا تھا کہ وہ ماروی پر جبر نہیں کر رہا ہے۔ اس غریب لڑکی کی زندگی سنوار رہا ہے۔ اس نے ایک عالی شان محل میں اسے قید کر رکھا تھا۔“

”آپ اس کی مثال نہ دیں۔ میں نے ماروی کو اپنی کوٹھی میں قید نہیں کیا ہے۔ اسے شادی کے لیے مجبور نہیں کیا ہے۔ وہ خود ہی مجھ سے متاثر ہوئی رہی ہے۔“

”وہ تمہاری اس کوٹھی میں قیدی ہے۔ تم نے اپنی دوست کی اور احسان مندی کی ناپیدہ زنجیریں اسے پہنائی ہیں۔ اسے اپنی شرافت سے محروم کر دیا ہے۔“

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ”محبوب! ایمان سے سمجھو، تم نے دور کے عمر ہو۔ تم نے ایسی زنجیریں پہنائی ہیں جو دکھائی نہیں دیتیں تو وہ توڑے گی کیسے؟“

یہ کہہ کر اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ محبوب سر جھکا کر سرچنے لگا۔ اپنے آپ کو سمجھانے لگا۔ ”نہیں، میں نے ماروی کو ناپیدہ زنجیریں نہیں پہنائی ہیں۔ خود ماروی نے ایک بار کہا تھا کہ میری دولت اور احسانات نے اسے مجبور نہیں کیا ہے۔ وہ میری نیک نیتی اور شرافت سے متاثر ہو کر جیسے چاہنے لگی ہے۔ اگر معروف صاحب میری نیکی اور شرافت کو جادو کہہ رہے ہیں تو کیا شریف لوگ اپنی شرافت چھوڑ دیں؟ نہیں۔۔۔ اللہ تعالیٰ نیکی اور شرافت کا صلہ دیتا ہے اور مجھے وہ صلہ دو تاریخ کو ملے گا۔“

☆☆☆

ڈاکٹر عدیلہ عرف عدیل لندن میں تھا۔ وہ محتاج کی منیٹ سے کچھ روز ماروی کے ساتھ رہ چکا تھا اور چند روز میں ہی اس کی قربت سے محروم ہو گیا تھا۔ وہ سبلی بن کر اس کا ہاتھ پکارتا رہا تھا۔ کبھی کبھی اسے نطفہ بہانوں سے چھو لیا کرتا تھا۔ کیا حسن تھا، جیسے ہی انکشاف ہوا کہ وہ عدیلہ نہیں عدیل ہے۔ عورت نہیں مرد ہے، ماروی طیش میں آگئی تھی۔ اس نے غصہ برداشت کرتے ہوئے اس سے کہا تھا کہ چپ چاپ وہاں سے چلا جائے۔ کبھی پلٹ کر نہ آئے۔ آئے گا تو وہ ڈاکٹر عدیلہ کا بھانڈا پھوڑ دے گی۔ پھر مراد اور محبوب اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

وہ ڈاکٹر عدیلہ کا راز رکھنے اور اپنی عزت برقرار رکھنے کے لیے خاموشی سے آگیا تھا لیکن تمہیں کھاتا رہا تھا

سے متاثر رہے گی تو میں اسے سیر و تفریح کے بہانے کہیں لے جاؤں گا۔ وہاں کرائے کے بد معاش اسے اٹھا کر ہماری کسی خفیہ جگہ پہنچا دیں گے۔“
 ”ہاں بیٹے! تم ماروی کے لیے چل رہے تھے۔ اب یہاں پہنچاؤ۔ تم چلے آؤ۔“
 ”بس ڈیڈا، دیکھ ایڈ کے بعد کسی بھی فلائٹ میں آؤں گا۔“

”یعنی چار دنوں کے بعد آؤ گے۔ اتنی دیر کیوں کرو گے؟ آج ہی کسی فلائٹ میں سیٹ لیتی ہے تو آج ہی آ جاؤ۔“
 ”یہاں سرسبزین کا بہت بڑا فیشن شو ہو رہا ہے میں اس شو میں نئے ڈیزائنز پہن کر کیٹ واک کروں گی۔“
 ”یوشٹ اپ۔ تم پھر لڑکیوں کی طرح بول رہے ہو۔“
 ”سوری ڈیڈا! آپ کے سامنے بیٹا ہی بن کر بولوں گا آج سے جو جسے دن جو شو ہونے والا ہے۔ اس کی بڑی دھوم مچی ہے۔ وہاں میرے حسن کو اور میری چال کو دیکھ کر سب ہی دیوانے ہو جائیں گے۔ آپ ٹی وی پر یہ پروگرام ضرور دیکھیں۔“

اس نے باپ سے رابطہ قائم کیا۔ پھر فیشن شو کی رپورٹ میں جانے کی تیاری کرنے کے لیے سنگار میز کے سامنے آ گیا۔
 وہ بہت خوب صورت تھا۔ اس کی خوب روئی میں مردانہ وجاہت نہیں بلکہ نسوانیت تھی۔ وہاں کی حسین لڑکیوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اس کے بدن میں زمانہ لوج اور چمک تھی۔ اس کی چال دیکھ کر مرد آہیں بھرتے تھے اور لڑکیاں اس سے حسد کرنے لگتی تھیں۔

اس کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے فون سے اسکرین کو پڑھنے کے بعد فون کو کان سے لگا کر کہا۔
 ”ہائے سسر! برٹ! میں ابھی تمہیں ہی یاد کر رہی تھی۔“
 وہ ہنسی لیتے ہوئے بولا۔ ”ہاں مجھے چکیاں آرہی تھیں تب ہی میں سمجھ گیا کہ تم مجھے یاد کر رہی ہو۔“
 وہ مسکرا کر بولا۔ ”میرے فیشن شو میں آرہے ہونا؟“
 ”وہاں تو سر کے بل آؤں گا۔ یہ بتاؤ، تم دور رہ کر مجھے یاد کرتی ہو جب تریب آتا ہوں دور، دور رہتی ہو۔ یہ کیسی تڑپانے والی ادا کیں ہیں؟“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”اس طرح میری کشش اور بڑھ جاتی ہے۔ ابھی تم میرے لیے تڑپ رہے ہو، مجھے اچھا لگ رہا ہے۔“
 ”کم از کم ایک کس تو دیا کرو۔“

کہ اسے ضرور حاصل کرے گا۔ اسے چھونے کے بعد اس کے پورے بدن کو حاصل کرنے کا جہن سوار ہو گیا تھا۔
 اس کے باپ رحمان نے مشورہ دیا تھا۔ ”اب تم عدیلہ کا غول اتار دو اور اپنی مردانہ شخصیت سے اسے متاثر کرو۔“
 لیکن وہ مراد اور محبوب کی تند آواز اور بھاری بھر کم شخصیات کے سامنے صفر ہو سکتا تھا۔ اس نے کہا۔ ”نو ڈیڈا! میں نے لیڈی ڈاکٹر عدیلہ کی جو پرنالٹی بتائی ہے۔ یہی مجھے بہتر لگتی ہے۔ جب بھی ماروی کو حاصل کرنے کا موقع آئے گا تو میں مرد بن جاؤں گا۔“

وہ اپنی ماں کے سامنے میں بچپن سے نسوانی لب و لہجہ اور چال ڈھال سیکھتا آیا تھا۔ عورت پن اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ وہ بچپن ہی سے لندن کی اونچی سوسائٹی کی خواتین کے درمیان پرورش پاتا رہا تھا۔ وہ خواب میں دیکھے یا آئینے میں دیکھے، خود کو ایک حسین لڑکی کے روپ میں دیکھتا تھا۔ وہ اس حد تک حسین تھا کہ کئی مرد اس پر عاشق ہو گئے تھے۔
 اس کے اندر مرد بننے کی تمنا اس حد تک رہی کہ آئندہ نسل پیدا کرنے کے لیے اس نے ایک بار شادی کی ایک بیٹی کا باپ بھی بن گیا۔ پھر وہ بیوی مر گئی۔ وہ واقعی مرد جو ہو گیا تھا، اسے ماروی کی قربت نے، جگا دیا تھا۔ اس کے ماں باپ ضد کر رہے تھے کہ نسل بڑھانے کے لیے اسے ایک بیٹے کا باپ بننا چاہیے۔ جب اس نے ماروی کو دیکھا اور اسے چھو لیا تو تب ماں باپ کی ضد اچھی لگی۔ اس کے اندر کے مرد نے بھی ضد کی کہ اب ایک بیٹے کا باپ بننا ہی پڑے گا۔ باپ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کرائے کے بد معاشوں کے ذریعے ماروی کو اغوا کرے گا پھر اسے بیٹے کے پاس پہنچا دے گا۔

وہ صبر کر رہا تھا لیکن ایسا کوئی موقع ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ پھر ایک دن رحمان نے بیٹے کو خوشخبری سنائی کہ ماروی کو حضرت عبداللہ شاہ قازی کے دربار میں حادثہ پیش آیا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ پچھلی باتیں بھول گئی ہے۔ یعنی یہ بھی بھول گئی ہے کہ لیڈی سائیکاٹرسٹ عدیلہ اس کا علاج کرنے آیا کرتی تھی۔ وہ بھول گئی ہے کہ کوئی مرد عدیلہ سے عدیلہ بن کر اسے دھوکا دیتا رہا تھا۔

عدیلہ نے خوش ہو کر کہا۔ ”ڈیڈا! یہ تو کمال ہو گیا میں اس بار ایک مرد عادل بن کر اس کے سامنے جاؤں گا تو وہ نہیں پہچانے گی کہ میں عدیلہ بن کر اس کے پاس آیا کرتا تھا۔ میں تمہیں سے اسے دوست بنا کر اس کی محبت حاصل کروں گا۔ وہ محبت نہیں کرے گی اپنے دو عاشقوں

”سوری رابرٹ! میں تم سے کہہ چکی ہوں۔ میرا ایک ایک بوسہ اور میرا انگ انگ صرف میرے ہونے والے ہر ہینڈ کے لیے ہے۔ اچھا مجھے دیر ہو رہی ہے، میں ریہرسل کے لیے جا رہی ہوں۔ پھر کسی وقت باتیں ہوں گی۔“

اس نے توان بند کر دیا۔ جب تک وہ جاگتی رہتی دل پھینک جوانوں کی درجنوں کالیں آتی رہتی تھیں۔ ان سے چمٹکارا پانے کے لیے وہ سونے سے پہلے اگلی صبح تک کے لیے فون کا سوئچ آف رکھتی تھی، پھر کسی کی مداخلت کے بغیر گہری نیند میں ڈوب جاتی تھی۔

اسے عورتوں کی طرح بولتے ہوئے، عورتوں کی طرح سوچتے ہوئے بہت اچھا لگتا تھا۔ اس روز جوان لڑکیوں اور لڑکوں کی کالیں آرہی تھیں۔ جوان لڑکے اس سے ڈیٹ مانگ رہے تھے۔ وہ فخر سے ہنستے ہوئے زیر لب بڑبڑاتی۔

”ماروی! تیرے تو صرف دو ہی دیوانے پروانے ہیں۔ یہاں تو میرے پیچھے پروانوں کی قطار تلی رہتی ہے۔“

وہ ریکارڈنگ کو آن کر کے موسیقی سننے لگی اور دھن میں مست ہو کر رقص کر رہی تھی۔ ایسے وقت کال بیل کی آواز سنائی دی۔ اس نے ریکارڈنگ کو آف کیا۔ وہی گیت سنکھاتی ہوئی اپارٹمنٹ کے ایک کمرے اور کورڈور سے گزرتی ہوئی بیرونی دروازے تک آئی پھر اسے کھولا۔ باہر اس کی دو سہیلیاں اور تین بوائے فرینڈز کھڑے تھے۔ عدیلہ نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ ایک سیلی سلٹھیانے پوچھا۔

”کہیں جا رہی ہیں؟“

وہ بولی۔ ”ہاں فیشن شو کار ریہرسل اینڈ کرنا ہے۔“

دوسری سیلی رونی نے کہا۔ ”تم بہت لگی ہو۔ فیشن شو میں ماڈلنگ کے لیے تمہارا انتخاب کیا گیا ہے۔“

عدیلہ نے کہا۔ ”تمہارا انتخاب نہیں کیا گیا۔ تمہیں مایوسی ہوئی تھی۔ اس روز تو تم رو پڑی تھیں۔“

رونی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں اس وقت ایسوشل ہو گئی تھی۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ تم حسین اور پرکشش تو ہو ہی تمہیں ادا میں دکھانا بھی خوب آتا ہے۔“

سنٹھیانے ایک بوائے فرینڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ جان برگ تو تم پر مرنا ہے۔“

جان برگ نے مسکرا کر کہا۔ ”ہائے عدیلہ.....!“

عدیلہ نے ناگواری سے ہائے کہا۔ وہ اچھی خاصی عمر والا تھا۔ لیکن نوجوانوں کی طرح سنٹھیانے کا بوائے فرینڈ کہلاتا تھا۔ وہ سنٹھیانے سے بولی۔ ”اگر تمہارا بوائے فرینڈ مجھ پر مرنا ہے تو یہ غلط ہے۔ اپنے اس اولڈ بوائے کو اپنے ہی بیٹی کوٹ

سے باندھ کر رکھا کرو۔“

جان برگ نے مسکرا کر کہا۔ ”کوئی حسینہ مجھے نظر انداز کرے اور خڑے دکھائے تو وہ اور زیادہ میرے دل میں گھس جاتی ہے۔ آئی لو یو عدیلہ!“

اس کی ڈھٹائی پر سب ہنسنے لگے۔ ایک انڈین بوائے فرینڈ دیوکار نے کہا۔ ”عدیلہ! تمہیں اصولاً آئی لو یو تو کہنا چاہیے۔ بھی سوسائٹی کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔“

عدیلہ نے منہ پھیر کر جاتے ہوئے کہا۔ ”میں تم لوگوں کے لیے ڈرنک لے کر آتی ہوں۔“

ایک اور بوائے فرینڈ جیری نے کہا۔ ”شام ہو گئی ہے۔ واڈ کالے آؤ۔ پینے کا مزہ آ جائے گا۔“

وہ جاتے ہوئے بولی۔ ”میں ایک پیگ سے زیادہ کسی کو نہیں دوں گی۔ مجھے ابھی ریہرسل میں جانا ہے۔“

وہ ڈرائنگ روم کی طرف چلی گئی۔ روٹی نے منہ بنا کر کہا۔ ”فیشن شو میں سلیکٹ کیا ہو گئی ہے زمین پر پاؤں نہیں پڑ رہے۔ میں صرف دو نمبر سے پیچھے رہ گئی۔ یہ آگے نکل گئی۔“

جان برگ نے کہا۔ ”سلیکشن لسٹ میں اب بھی تمہارا نام ہے لیکن ایکسٹرا کی حیثیت سے۔ اگر عدیلہ نہ رہی تو شو میں پر فارم کے لیے تمہیں ہی کال کی جائے گی۔“

عدیلہ کیوں نہیں رہے گی۔ سب نے بڑی خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ عدیلہ شراب کی ٹرالی دکھائی ہوئی آگئی۔ جان برگ نے کہا۔ ”سنٹھیانے تمہارے اصرار کرنے سے یہاں چلا آیا۔ اگر تمہارے ساتھ نہ آتا تو عدیلہ مجھے دیکھ نہ کرتی۔ بہر حال میں نفرت کا جواب نفرت سے دینا جانتا ہوں۔ میں اس گھر کی ایک گھونٹ شراب بھی نہیں پیوں گا۔ میں جا رہا ہوں۔ کلب میں تمہارا انتظار کروں گا۔“

جیری نے کہا۔ ”اوہ لو جان تمہیں نہیں جانا چاہیے۔ ہم عدیلہ سے تمہاری صلح کرائیں گے۔“

وہ جاتے ہوئے بولا۔ ”میں جھکنا اور صلح کرنا نہیں جانتا۔ سوری تم لوگ انجوائے کرو۔“

سنٹھیانے اس کے ساتھ جاتے ہوئے بولی۔ ”اسے جانے دو۔ یہ بہت ضدی ہے۔ میں اسے دروازے تک چھوڑ کر آتی ہوں۔“

وہ دونوں چلے گئے۔ وہ سب اپنے لیے پیگ بنانے لگے۔ عدیلہ نے بھی اپنے لیے ایک پیگ بناتے ہوئے کہا۔ ”اوہہ! انگاروں پر لوٹ رہا ہے۔ کل ہی کی بات ہے۔ اس

ہے تم نو بجے آؤ۔ ورنہ یہاں پور ہو جاؤ گی۔“
اس نے شکر یہ ادا کر کے رابطہ ختم کر دیا پھر اس نے
ثرانی کی طرف دیکھ کر سوچا۔ ”دو گھنٹے بعد جانا ہے..... کیوں نہ
ایک پیگ اور ہو جائے۔“

اس نے بیگ لیبل کا ایک پیگ بتایا۔ اسے چاہے
جانے کا نشہ تھا۔ اس نے مست ہو کر ایک گھونٹ پیا۔ فون
پھر بولنے لگا۔ اس نے تھی سی اسکرین کو دیکھا۔ ایک انجانا
نمبر تھا۔ لیکن اسے کان سے لگاتے ہی وہ انجانا نہ رہا۔
دوسری طرف سے جان برگ کی آواز سنائی دی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ”میری آواز سن کر فون بند نہ کرنا۔
ورنہ دروازہ توڑ کر چلا آؤں گا۔“

وہ نفرت سے بولی۔ ”تمہارا باپ بھی دروازہ نہیں توڑ
سکے گا۔ ٹوٹنے سے پہلے پولیس آ جائے گی۔“
”تم مجھ سے نفرت کیوں کرتی ہو؟“

”آئینہ دیکھو۔ تم سے محبت کرنے والی کوئی بات نہیں
ہے۔ چاہئیں۔ سنبھالو تم پر کیوں مرتی ہے۔“

”ایک بار تمہاری میں بلاؤ پھر تم بھی مجھ پر مرنے لگو گی۔“
”تم خواب دیکھتے رہ جاؤ گے۔ مجھے بھی تمہاری میں
حاصل نہیں کر سکو گے۔“

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ اسی وقت جان
برگ اس کے پیچھے ڈرائنگ روم کے دروازے پر آ گیا۔ وہ
تھوڑی دیر پہلے اپارٹمنٹ سے باہر نہیں گیا تھا۔ وہیں ایک
کمرے میں چھپ گیا تھا۔ یہ سنبھالو، روٹی اور ان کے
بوائے فرینڈز کی... پلاننگ کے مطابق ہو رہا تھا۔

جان برگ نے اپنے بند ہو جانے والے فون کو
دیکھا پھر عدیلہ کو دیکھا اور دل میں کہا۔ ”سالی خیرے والی.....“

اس نے ری ڈائل کیا پھر وہ بے قدموں اس کے پیچھے
آنے لگا۔ عدیلہ کے فون سے رنگ ٹون ابھر رہی تھی۔ وہ
اسے کٹا اٹھا رہی تھی۔ اپنے جام کا آخری گھونٹ پی رہی
تھی۔ وہ اس کے صوفے کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔

عدیلہ کے سامنے فون چیختے چیختے چپ ہو گیا۔ جان
برگ نے پھر نمبر ری ڈائل کیے پھر اس کا فون چیختے لگا۔ وہ
اس کی چیخ سے بے نیاز ہو کر پھر ایک پیگ بتانا چاہتی تھی۔
اسی وقت وہ دیکھی آواز میں بولا۔ ”ہائے عدیلہ! فون نہ
اٹھاؤ۔ تب بھی بولوں گا۔“

اس نے حیرانی سے فون کو دیکھا پھر یکبارگی صوفے
سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ پلٹ کر پیچھے دیکھا تو مارے
دہشت کے چیخ پڑی۔ اس نے ایک الٹا ہاتھ رسید کیا۔ وہ

نے مجھے کس کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک طمانچہ رسید کر دیا تھا۔
تب سے یہ خار کھا رہا ہے۔“

اس نے شیشے کے جام کو ہونٹوں سے لگا کر ایک گھونٹ
نیا پھر کہا۔ ”میرے یہ گلابی ہونٹ صرف میرے ہونے
والے لائف پارٹنر کے لیے ہیں۔“

روٹی اسے کینہ پرور لگا ہوں سے دیکھ رہی تھی۔ عدیلہ
نے غناخت بیٹے کے بعد کہا۔ ”میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔
ان لہجہ ہوں۔ کسی کا باپ بھی مجھے ہاتھ نہیں لگائے گا۔“

سنبھالو نے آ کر اپنے لیے ایک پیگ لیا۔ پھر ایک
گھونٹ پی کر کہا۔ ”تم بہت بولتی ہو عدیلہ! ہم لڑکیاں کسی نہ
کسی مرد سے زیر ہونے کے لیے پیدا ہوتی ہیں۔ ضروری

نہیں ہے کہ وہ زیر کرنے والا خاوند ہی ہو۔ یہ تو جانتی ہو،
ہز بیٹے کے آنے سے پہلے کتنے ہی ہمارا بیٹہ بچا دیتے ہیں۔“
عدیلہ نے دل میں کہا۔ ”اوفہ! نہ میرا کوئی ہز بیٹہ ہوگا

اور نہ ہی بوائے فرینڈ۔ نہ میں لڑکی ہوں۔ نہ کسی سے زیر ہونا
ہے۔ مجھے تو ماروی کو زیر کرنا ہے۔“

وہ شیشے کے جام کو سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے دل میں
پورے یقین سے کہہ رہی تھی۔ ”میں عدیلہ کی حیثیت سے
ایک کامیاب زندگی گزار رہی ہوں۔ پاکستان جا کر ماروی
کے لیے عدیلہ بن جاؤں گی۔ وہ میری سچ پر آنے کے لیے
پیدا ہوئی ہے۔“

اس نے کن اکھیوں سے سنبھالو اور روٹی کو دیکھ کر
سوچا۔ ”عدیلہ کی لائف میں کتنا مزہ آرہا ہے۔ یہ لڑکیاں
میری اداؤں بھری جوانی کو دیکھ کر جلتی کڑھتی ہیں اور لڑکے
میرے لیے آہیں بھرتے رہتے ہیں۔ میں سچ سچ بہت
انجوائے کر رہی ہوں۔“

ان سب نے ایک ایک پیگ لے کر جام خالی کر
دیے۔ عدیلہ نے کہا۔ ”ڈیش آل۔ مجھے ریہرسل کے لیے
جانا ہے۔“

سنبھالو نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آل
رائٹ، ہم بھی جا رہے ہیں۔ اب تمہارے فیشن شو میں
ملاقات ہوگی۔“

عدیلہ ان سب کو سی آف کرنے کے لیے بیرونی
دروازے تک آئی پھر ان کے جاتے ہی دروازے کو اندر
سے بند کر لیا۔ ایسے وقت رنگ ٹون نے اسے پکارا۔ وہ
تیزی سے چلتی ہوئی شراب کی ٹرائی کے پاس آئی۔ وہاں
سے فون اٹھا کر بٹن ہا کر کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے
فیشن شو کے منتظم نے کہا۔ ”عدیلہ! ریہرسل کا ٹائم پہنچ ہو گیا

کنا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی راز ہائے نہاں بھی کھل گیا۔ پھر اس نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر مار دیا۔ پوچھا۔ ”سے یہ کیا ہے؟“

بڑا زبردست ہاتھ پڑا تھا۔ ناک سے لہو کے چند قطرے نکل آئے۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”میں تو پہلے ہی بتانا چاہتی تھی مگر تم نے سنا ہی نہیں۔“

وہ اب سننے والا نہیں تھا۔ چاقو ایک طرف پھینک کر دونوں ہاتھوں سے اس کی پٹائی کرنے لگا۔ کہنے لگا۔ ”کتے کی اولاد! مجھے اب تک دیوانہ اٹو بنا رہا تھا۔ میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔ اب یہ چاقو تجھ میں ہیوست ہوگا۔“

وہ اپارٹمنٹ باہر سے بند تھا۔ فی الحال کوئی آنے والا نہیں تھا اور اندر سے کسی کی آواز بھی باہر نہیں آرہی تھی۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ تکلیف کی شدت سے نکلنے والی آواز اس کمرے میں دم توڑ رہی تھی۔

اس آواز میں بڑی بے بسی تھی۔ رحم کی التجا تھی۔ تو یہ تھی کہ اب فطرت کے خلاف مرد سے عورت نہیں بنے گی لیکن تو یہ کا وقت گزر چکا تھا۔ پھر ایک بڑی ہی کرناک دم توڑتی ہوئی آخری آواز ابھری اور گہری خاموشی چھا گئی۔

بعض حالات میں اندازہ ہوتا ہے کہ آواز مر جائے تو زندگی بھی مرجاتی ہے۔ توڑی دیر بعد دھیمی سی آواز ابھری۔ ”ہیلو۔ تمہیں! میں نے قصہ تمام کر دیا ہے۔ روٹی سے بولو، عدلیہ کی عدم موجودگی میں اب اسے فیشن شو میں طلب کیا جائے گا۔ میں ابھی آرہا ہوں۔“ پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ بند اپارٹمنٹ میں کوئی بولنے والی نہ رہی۔

☆☆☆

مرین ایئر کنڈیشنڈ بیڈروم میں فوم کے چکدار بستر پر سونے کی عادی تھی۔ اس وقت کچرا گھر کے باہر پھیلے ہوئے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ کم سے کم لباس میں رہنے کی عادی تھی۔ اس وقت بھی بالشت بھر کے لباس میں وہاں پڑی تھی۔ پھر بھلا لوگوں کی بھیڑ کیسے نہ لگتی۔ وہاں سے گزرنے والے لوگ رک رک کر اسے دیکھ رہے تھے اور طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔

”ہتا نہیں بچاری کون ہے؟ بد معاشوں نے اسے اغوا کیا ہوگا۔“

”ہاں اغوا کیا ہوگا۔ اس کے ساتھ زیادتی کی ہوگی۔ پھر وہ حرا حرا دے اسے یہاں پھینک کر چلے گئے ہیں۔“

پھر وہ سب چپ ہو گئے۔ وہ بہت ہولے سے کسمپاسی تھی۔ نیند میں تھی تو بیدار ہو رہی تھی۔ لوگوں نے

بیچے جا کر شراب کی شرابی سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑی۔ وہ سونے کے ایک طرف سے گھوم کر اس کے پاس آ گیا۔ وہ حواس باختہ ہی اسے دیکھ رہی تھی۔

اس نے اپنے لباس میں سے ایک چاقو نکال کر اسے ایک جھکے سے کھولا۔ اسٹین لیس اسٹیل کا تیز دھاری دار پھل روگنی میں چمک رہا تھا۔

وہ سہم کر فرش پر بیٹھے بیٹھے کھسک کر دوڑ ہونے لگی۔ جان برگ نے اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھایا پھر کہا۔ ”فطرت موت دے گی۔ زندگی چاہتی ہو تو ہاتھ تمام لو۔“

ہاتھ تھامنے میں ہی خیریت تھی۔ عدلیہ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جان برگ نے اسے تمام کر ایک زور کا جھکا دیا تو وہ فرش پر سے اٹھی ہوئی اس کے سینے سے آ کر لگ گئی۔

”میں نے پیار سے کس کرنا چاہا تھا تم نے ٹھانچہ مار دیا۔ اب مارو۔“

وہ اسے ایک ہاتھ سے جکڑ کر اس کے لیوں پر اتر گیا۔ دوسرے ہاتھ میں چاقو تھا۔ وہ دم سادھے ہوئے تھی جب اس نے چھوڑا تو وہ لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے بولی۔ ”مہ۔ میں وہ نہیں ہوں، جو تم سمجھ رہے ہو۔“

”ہاں۔ میں سمجھ رہا ہوں، تم بہت پارسا ہو۔ بڑے فخر سے کہتی ہو کہ ان ٹیوڈ ہو۔ ابھی یہ گزرتا ہوا وقت کہہ رہا ہے کہ تمہاری پارسانی کے جو تھڑے اڑ جائیں گے۔“

یہ کہتے ہی اس نے بلاؤز کے گریبان کو پکڑ کر اس پر چاقو کی دھار رکھی تو وہ سانسے سے کنا چلا گیا اور پھر وہ چمک گیا۔ وہ چاقو کو دیکھ رہی تھی اور بری طرح سبھی ہوئی تھی۔

جان برگ نے کہا: اب سے دو برس پہلے میں نے ہی رینکا کا مریڈ کر لیا تھا۔ وہ سالی بھی میرے ساتھ سونے سے انکار کر رہی تھی۔

وہ ہنکھاتے ہوئے بولی۔ ”جیسا تم سوچ رہے ہو، میں ویسی نہیں ہوں۔“

وہ بولا۔ ”کونسی بات نہیں۔ میں نے ایک ایسی لڑکی کے ساتھ بھی وقت گزارا ہے، جو تمہاری طرح بھرپور نظر آنے کے لیے مصنوعی چیزیں استعمال کرتی تھی۔“

وہ اسے بازوؤں میں بھرتے ہوئے اپنے جنون کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”میں سمجھیں کسی حال میں نہیں چھوڑوں گا۔ تم نے مجھے بہت سلگا یا ہے۔“

وہ پھر کچھ بولنا چاہتی تھی۔ اس نے پٹنی کوٹ کی کمر کو پکڑ لیا۔ اس نے پٹنی کوٹ پر چاقو کی دھار رکھی تو وہ دور تک

تھی۔ کبھی وہ خود کو بھولنے والی تھی کبھی یاد کرنے والی تھی۔ وہ کچرے کے ڈمپر سے اٹھ کر کھڑی ہوئی تو اچانک اسے یاد آیا۔ وہ بیکار ایک چیخ کر بولی۔ "میں مرینہ ہوں مجھے یاد آ گیا ہے۔ میں لندن کی بہت بڑی پولیس آفیسر ہوں۔ اے انسپکٹر مجھے سیلوث کرو۔"

اس بات پر سب مسکرانے لگے۔ ایک نے کہا۔ "لندن کی پولیس آفیسر وہلی کے کچرا گھر میں، وہ بھی تھی....."

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ وہ حیران اور پریشان تھی کہ ابھی ایک فارم ہاؤس میں تھی۔ اب اچانک اس کچرا گھر میں کیسے پہنچ گئی۔ اس نے کہا۔ "انسپکٹر! یقین کرو میں لندن کی MET آفیسر ہوں۔ میرا نام مرینہ ولاور ہے۔"

انسپکٹر نے اسے چھو لینے کے لیے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "مجھے یقین ہے۔ تمہارے چلو، وہاں باتیں ہوں گی۔"

"بھئی فون دو۔ میں اپنے ڈائریکٹر جنرل سے بات کروں گی۔ ابھی فون کروں گی۔"

انسپکٹر نے اس کے شانے اور بازو کو سہلاتے ہوئے کہا۔ "فون یہاں نہیں ہے۔ تمہارے میں ہے۔ وہاں چلو۔"

وہ اس کا ہاتھ تمام کر گاڑی کے پاس آیا۔ مرینہ اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھنے لگی۔ انسپکٹر نے کہا۔ "یہ میری سیٹ ہے تم پیچھے سپاہیوں کے ساتھ بیٹھو۔"

وہ بولی۔ "سپاہیوں کے ساتھ مجرموں کو بیٹھایا جاتا ہے۔ میں آگے بیٹھوں گی۔"

وہ اگلی سیٹ پر جم کے بیٹھ گئی۔ انسپکٹر بھی اس سیٹ پر آکر اس سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اگرچہ اس کے بدن سے

کچرے کی بو آرہی تھی۔ تاہم دل کے ارمان پورے ہو رہے تھے۔ مرینہ انسپکٹر کی طرف ایک ذرا توجہ نہیں دے

رہی تھی وہ یاد کر رہی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ وہ کئی بار مراد سے جنگ لڑ چکی تھی۔ پچھلی لڑائی کسی

فارم ہاؤس میں ہوئی تھی۔ پہلے ایک بوٹا مراد اس سے مقابلہ کرتا رہا پھر اصلی مراد ایک نئے چہرے کے ساتھ آگیا تھا وہ

ہمیشہ ہی اس سے مات کھاتی رہی تھی۔ پچھلی بار مراد نے خوب ہٹائی کی تھی۔ وہ مار کھاتے کھاتے بے ہوش ہو گئی تھی۔

پھر جب ہوش آیا تو اس نے ایک ڈاکٹر کو دیکھا اس نے بازو میں ایک انجکشن لگایا تھا۔ اس کے بعد وہ خود سے قائل ہو گئی

تھی۔ پتا نہیں کتنا وقت گزر گیا ہوگا۔ ابھی کچرے کے ڈمپر میں اسے ہوش آیا تھا۔

پولیس کی گاڑی تیز رفتاری سے جارہی تھی۔ اچانک

دیکھا۔ وہ پھر ساکت ہو گئی تھی۔ قبض بڑھتا جا رہا تھا۔ سب ہی چاہتے تھے کہ وہ آنکھیں کھولے۔ اٹھ کر بیٹھے اور اپنے بارے میں کچھ بتائے اور وہ ان کے قبض کو بھڑکار رہی تھی۔ ایک بار پھر کسمانے لگی۔ اس بار حلق سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ شاید وہ کچھ بولنے والی تھی۔

سب ہی لوگ اس کے قریب آنے لگے۔ دو چار آدمی رضا کارانہ انداز میں قریب آنے والوں کو روک رہے تھے۔ انہیں دور کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ "اس سے دور رہو۔ یہ اتنی بھیڑ دیکھ کر گھبرا جائے گی۔ جھگوان کے لیے پیچھے ہٹ جاؤ۔"

ایسے وقت پولیس کی موبائل گاڑی آگئی۔ کئی سپاہی گاڑی سے اتر کر لوگوں کو دور کرنے لگے۔ انسپکٹر نے قریب آکر اسے دیکھا تو منہ میں پانی آگیا۔ وہ آنکھیں کھول کر اسے دیکھ رہی تھی پھر سر گھما کر ہر طرف عورتوں سے زیادہ

مردوں کی بھیڑ دیکھ رہی تھی۔

انسپکٹر نے پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھونے لگی۔ پھر بولی۔ "کون ہوں میں؟"

انسپکٹر نے اس کی طرف جھک کر کہا۔ "ہاں بولو۔ کون ہو؟ یہاں کیسے آگئیں۔ اور ایسی حالت میں کیوں ہو؟"

ایک عورت نے کہا۔ "اے انسپکٹر! اس کے بدن کو لپٹا کر دیکھ رہا ہے۔ پہلے اسے کپڑے تو پہنا۔ پھر انگوٹھی کر۔"

انسپکٹر نے جھنجھٹا کر کہا۔ "کیا بکواس کر رہی ہو۔ میں اس کا تن ڈھانپنے کے لیے کہاں سے کپڑا لاؤں گا۔ اتنی ہی

ہمدردی ہے تو اپنی چادر اسے دے دو۔"

وہ بولی۔ "میرے پاس ایک ہی چادر ہے۔"

مرینہ ان سب کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے پہلی بار انسانوں کو دیکھ رہی ہو۔ اس نے ایک بوڑھی خاتون سے

پوچھا۔ "اے مائی! میں کون ہوں؟"

وہ بولی۔ "بھئی! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ خود کو نہیں پہچان رہی ہو؟ کیا تمہارا داغ الٹ گیا ہے؟"

ایک جوان عورت نے پوچھا۔ "اے بہن! تمہارے کپڑے کیا ہوئے؟ کچھ تو یاد کرو، یہاں کیسے آئی ہو اور کہاں سے آئی ہو؟"

انسپکٹر نے کہا۔ "اشو ہمارے ساتھ تمہارے چلو۔ وہاں تم اٹھان کرو گی۔ چلو اشو، یہاں تمنا شاہین رہی ہو۔"

ڈاکٹر ٹینی سن نے پتا نہیں کیسی دوا اس کے ہانڈ میں انجیکٹ کی تھی۔ آٹھہ اس کی دماغی حالت بدلتی رہنے والی

کر سانس لیتا رہا ہے جہاں بڑھاپے کا دم نکل جاتا ہے۔
 صرف جوانی وہاں سے بخیریت واپس آتی ہے۔
 وہ ڈرائیو کر رہی تھی اور ونڈ اسکرین پر مراد کی صورت
 دیکھ رہی تھی۔ وہ پہلے بھی اسے برہنہ کر کے بیچ بازار میں چھوڑ
 گیا تھا۔ اس بار پھر اس نے کچرے میں اسے پھینکنے سے پہلے
 بے لباس کر دیا تھا۔ صرف بالشت بھر کی ستر پوشی رکھی تھی۔
 مرینہ کو ایسے شرمناک سلوک پر غصہ آنا چاہیے تھا
 لیکن پھر ایک بار اپنے مرد سے ہار کر اس پر پیار آ رہا تھا۔
 پیار اس لیے بھی آ رہا تھا کہ اس نے پھر اسے زندہ چھوڑ دیا تھا
 جبکہ وہ دونوں اس بار ایک دوسرے کو مار ڈالنے کا آخری
 فیصلہ کر چکے تھے۔

وہ دونوں ارادے کے پتے تھے لیکن ایک دوسرے
 کے معاملے میں کچے ہو جاتے تھے۔ وہ لندن سے صرف
 اس کے سر کا سودا کرنے اور پچاس لاکھ ڈالرز حاصل کرنے
 آئی تھی۔ یہ سوچ رکھا تھا کہ اس سے سامنا ہوگا تو مقابلہ نہیں
 کرے گی۔ اسے دیکھتے ہی گولی مار دے گی اور مراد بھی اس
 کی دو ٹوٹی حرکتوں سے بیزار ہو گیا تھا۔ وہ جس طرح پیار کا
 فریب دے کر اس کی زندگی کا سودا کرنے والی تھی اس کے
 پیش نظر یہی فیصلہ کرنا تھا کہ اس بار اس سے کوئی رعایت نہیں
 کرے گا۔ سامنا ہوتے ہی اسے گولی مار دے گا لیکن پھر
 ایک بار اس نے بخش دیا تھا۔ پتا نہیں کیا سوچ کر ایسے زندہ
 چھوڑ دیا تھا۔ وہ گاڑی ڈرائیو کرتی ہوئی سوچ رہی تھی۔ وہ
 مجھے کبھی ہلاک نہیں کرے گا۔ ماروی کی محبت میں مجھ سے
 کتراتا ہے اور مجھ پر مرتا بھی ہے اور میں بھی تو اس کے لیے
 پاگل ہوئی رہتی ہوں۔

اس نے گاڑی کو برطانوی سفارت خانے کے سامنے
 لا کر روک دیا۔ گن مین سے کہا۔ ”گیٹ کھولو۔ میں
 MET آفسر مرینہ ہوں۔ اندر انتظار کرو۔“
 گن مین نے کیمین میں آ کر برطانوی سفیر کو اطلاع
 دی۔ ”اندن کی میٹ آفسر برہنہ حالت میں آئی ہے۔ اس
 کے ہاتھ میں گن ہے اور وہ انڈین پولیس آفسر کو گن پوائنٹ
 پر لاتی ہے۔ مجھے گیٹ کھولنے کا حکم دے رہی ہے۔“
 سفیر نے کہا۔ ”مجھ سے فون پر بات کراؤ۔“

گن مین نے کہا۔ ”میڈم! آپ یہاں آ کر فون پر
 بات کریں۔“
 وہ بولی۔ ”پہلے تم یہاں آ کر اس کیمینٹ کو گن پوائنٹ
 پر رکھو۔ پھر میں کیمینٹ میں آؤں گی۔“
 گن مین نے اس کے حکم کی تعمیل کی پھر اس نے کیمینٹ

اس نے اسپیکر کی طرف توجہ دی۔ وہ اس سے چپک کر بیٹھا
 ہوا تھا اور اس کی گوری۔۔۔۔۔ ران پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔
 یلکھت اس کے اندر کی فائزر بیدار ہو گئی۔ اس نے ایک کہنی
 زور سے اس کے پیٹ میں ماری وہ ”اوٹک“ کی آواز نکالتا
 ہوا تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ اس نے وہی کہنی اس کے جھکے
 ہوئے چہرے پر ماری تو ناک سے لہو پھلکنے لگا۔ اسے سنبھلنے کا
 موقع نہیں مل رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے تارے ناچ رہے
 تھے۔ ساتھ پیٹھے ہوئے ڈرائیو سپاہی نے چیخ کر کہا۔ ”اے
 پاگل کی بیٹی ایہ کیا کر رہی ہے؟“

اس نے اچانک ہی بیک لگا کر گاڑی روکی۔ مرینہ
 نے اسپیکر کے ہولشیر سے ریو الور نکال لیا۔ گاڑی کے رکتے
 ہی سپاہی دوڑتے ہوئے اگلے حصے کی طرف آئے۔ ڈرائیو
 چھلانگ لگا کر باہر چلا آیا۔ مرینہ نے اسپیکر کی گردن میں
 ایک بازو کا پھندا ڈال کر ریو الور کو اس کی کہنی سے لگا کر کہا۔
 ”خبردار! کوئی قریب آئے گا یا گولی چلائے گا تو مجھ سے
 پہلے تمہارا افسر مرے گا۔ فوراً اپنی گنیں چھینو اور یہاں سے
 دور بھاگتے جاؤ۔“

وہ سب اپنے افسر کو بے بسی کی حالت میں چھوڑ کر جانا
 نہیں چاہتے تھے۔ اسپیکر کی گردن پھنسی ہوئی تھی۔ اس نے
 یہ مشکل کہا۔ اس کی بات مانو۔ ہتھیار پھینک کر جاؤ۔ نہیں تو یہ
 مار ڈالے گی۔ یہ پاگل ہے، کچھ بھی کر سکتی ہے۔“

سپاہیوں نے ہتھیار پھینک دیے۔ وہاں سے دور
 جانے لگے۔ مرینہ کھسکتی ہوئی ڈرائیو تک سیٹ پر آئی۔ وہ
 بھی اپنی گردن کے ساتھ گھسٹا ہوا اس کے گھٹنے میں ہی رہا۔
 وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ آگے اسے کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے؟
 اس نے اسپیکر کی گردن کو چھوڑ کر اس کے منہ پر
 ریو الور کی نال رکھتے ہوئے کہا۔ ”تجھے میرا چکنا بدن اچھا
 لگتا ہے۔ چل اپنا سر میری چکنی رانوں کے درمیان لے آ۔
 چل جلدی کر۔“

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ اپنا منہ ادھر لے گیا۔ مرینہ
 نے اس کی گردن کو دو تری رانوں کے درمیان دیوچ کر کہا۔
 ”یہاں سے حیرا پاپ بھی نہیں نکل سکے گا۔ اب وہاں سانس
 لیتے رہنا۔“

یہ کہہ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر اسے آگے بڑھا
 کر اس کی رفتار بڑھاتی چلی گئی۔ وہ عیاشی بھول گیا تھا۔ یہ
 دھڑکا لگا ہوا تھا کہ وہ پاگل ہے کہیں گولی نہ چلا دے۔ اگر وہ
 زندہ رہ جاتا تو شراب پیتے وقت یا دوستوں کے سامنے اکر
 کر کہتا کہ لندن والی کوجیت کر آیا ہے۔ وہ ایسے جہنم میں پہنچ

وہ لات کھا کر پیچھے گیا تھا۔ پھر سنبھل کر دیکھا تو اپنے ہی ہسپتال کے نشانے پر آ گیا تھا۔ وہ بولی۔ ”مسٹر جان! میں دشمن نہیں ہوں۔ ابھی تم سے زیادتی کرنے کی سعادت چاہتی ہوں۔ تم نہیں سمجھ سکتے میرے ساتھ کسی زیادتی ہو رہی ہے۔ یہاں آئینہ ہو تو مجھے دکھاؤ۔ مجھے شہ ہو رہا ہے کہ میری صورت بدل دی گئی ہے۔“

وہ بولا۔ ”آئینہ میری تیسری دراز میں ہے۔“

اس نے دراز کو کھول کر آئینہ نکالا۔ پھر اپنی صورت دیکھتے ہی حیرت سے چیخ پڑی۔ ”اوگاڈا! مراد نے کسی مکاری کی ہے۔ مجھے ہی زندگی دی ہے۔ مگر تھے چہرے کے ساتھ تاکہ میں پہچانی نہ جاؤں اور آئینہ میٹ آفسر کا عہدہ حاصل نہ کر سکوں۔“

اس نے آئینے کو میز پر پھینک کر سفیر سے کہا۔ ”بلڈ فورڈ انزیکٹر جرنل جان اتھوٹی سے بات کراؤ۔“

اس نے فون اٹھا کر رابطہ کیا۔ مرینہ نے اس سے فون لے کر اسے اپنے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے جان اتھوٹی کی آواز سنائی دی۔ وہ بولی۔ ”سر! میں مرینہ بول رہی ہوں۔“

وہ ایک دم سے جوش میں آ کر بولا۔ ”مرینہ! تم کہاں قابو ہو گئی تھیں۔ تمہارے ساتھ یہاں سے جانے والے ہمارے اہم سراسر افسران مارے گئے۔ میں کل سے تمہیں کال کر رہا ہوں لیکن تمہارا فون بند پڑا ہے۔“

وہ بولی۔ ”میرا فون، آئی ڈی کارڈ، میٹ آفسر کا بیج اور پاسپورٹ سب ہی چھین گیا ہے حتیٰ کہ میرے تن کا لباس بھی اتار لیا گیا ہے اور کیا بولوں، مجھ سے میرا چہرہ بھی چھین لیا گیا ہے۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو؟“

”مراد سے مقابلہ بہت مہنگا پڑا ہے۔ میری جان بچ گئی ہے۔ یہی نعمت ہے۔ وہ مکار چاہتا ہے کہ میں مرینہ کی حیثیت سے پہچانی نہ جاؤں۔ میں نے ابھی آئینہ دیکھا ہے۔ میرے چہرے پر پلاسٹک سرجری کے ذریعے تبدیلی لائی گئی ہے۔“

”تم ابھی جان لیور کے فون سے بول رہی ہو؟“

”جی ہاں۔ مسٹر جان مجھے مرینہ تسلیم نہیں کر رہے ہیں۔ میں مراد کی چال کو کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ پہلے میں آپ کو خطیہ کوڈ نمبرز بتا رہی ہوں۔ آپ یہ نمبرز کر نہیں کر لیں گے کہ میں ہی میٹ آفسر ہوں۔“

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ ڈاکٹر مینی سن کی دوائے

میں آ کر سفیر سے فون پر کہا۔ ”مسٹر جان لیور! میں میٹ آفسر مرینہ ہوں۔ مراد ہی سنگلی نے میرے کپڑے اتار دیے ہیں۔ ایک انسپکٹر میرے راستے میں رکاوٹ بن رہا تھا۔ میں اسے گن پوائنٹ پر یہاں لے آئی ہوں۔ ابھی آپ کے سامنے آ کر اپنی روداد بیان کروں گی۔“

”ٹھیک ہے تم اپنا گن بیگورٹی گارڈ کو دے کر خالی ہاتھ یہاں آؤ۔“

اس نے اپنی گن بیگورٹی گارڈ کو دی۔ پھر سفارت خانے کی عمارت میں داخل ہوئی۔ اس وقت جہاں سے گزر رہی تھی، وہاں کا عمر اسے حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ سفیر کے آفس کا دروازہ بند تھا۔ وہاں ایک چہرہ اسی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں میٹ آفسر مرینہ ہوں۔“

پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آئی تو سفیر جان لیور سے دیکھتے ہی اپنی ہلکے سے اٹھ کر بولا۔ ”کون ہو تم؟“

مرینہ نے ہنسنے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر جان! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ میں مرینہ ہوں۔ ہم لندن میں کئی بار مل چکے ہیں۔“

سفیر نے فوراً ہی میز کی ذرا سے ہسٹول نکال کر کہا۔ ”نوٹ اپ۔ فوراً بولو۔ کون ہو؟ اور یہاں کس ارادے سے آئی ہو۔“

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”میں حیران ہوں۔ تم مجھے پہچاننے سے انکار کیوں کر رہے ہو؟“

”اس لیے کہ تم مرینہ نہیں ہوں۔ میں اس کی صورت لاکھوں میں پہچان سکتا ہوں۔“

وہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ”تم یہ کہہ رہے ہو کہ میری یہ صورت مرینہ کی نہیں ہے؟ میں کوئی دوسری عورت ہوں؟“

وہ اٹکر کام کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”ابھی گارڈز آ کر تمہیں یہاں سے لے جا کر پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ تمہیں تار چڑھایا جائے گا۔ تب تم بیچ بولو گی کہ ایک انڈین پولیس افسر کو یہاں گن پوائنٹ پر کیوں لائی ہو؟ اور کس ارادے سے مرینہ بن کر آئی ہو؟“

اس کی بات ختم ہوتے ہی مرینہ نے میز پر رکھے ہوئے پیپر ویٹ کو اٹھا کر اس کے ہاتھ کا نشانہ لیا۔ اس کا نشانہ درست کیسے نہ ہوتا۔ ہسٹول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ایسے وقت، وہ بجلی کی تیزی سے ایکشن میں آتی تھی۔ وہ چھلانگ لگا کر میز کے اوپر سے گزرتی ہوئی سفیر کو لگ مارتی ہوئی اس کی جگہ پہنچی پھر جھک کر فرش پر سے ہسٹول کو اٹھا لیا۔

دیر پہلے باتیں کرتے وقت تم ہوش و حواس میں تھیں۔ اچانک ایٹارل ہو گئی ہو۔ میرا اعزاز ہے کہ مراد نے تمہارے ساتھ ایسا کچھ کیا ہے کہ تم خود کو اجنبی سمجھ رہی ہو اور تمہیں اجنبی بن کر رہنے کے لیے اس نے تمہارا چہرہ بدل دیا ہے۔ پلیز یہ فون مسٹر لیور کو دو۔“

اس نے فون جان لیور کی طرف بڑھایا۔ وہ اسے لے کر کان سے لگا کر بولا۔ ”جی فرمائیے؟“

جان اتھونی نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ یہ مرینہ ہے، آپ اس پر خصوصی توجہ دیں۔ اسے سخت سکیورٹی میں رکھتے ہوئے سینٹرل اسپتال میں داخل کرائیں۔ منگے اور تجربہ کار دماغی امراض کے ماہرین سے علاج کرائیں۔ ایک بار پھر کہتا ہوں سکیورٹی سخت ہونی چاہیے۔ مراد علی مطلق اس کی تاک میں رہے گا۔ ہمارے جاسوس بھی اس کی تاک میں رہیں گے۔ آپ کو بہت محتاط رہنا ہوگا۔“

مراد نے پلاننگ کی تھی کہ اسے ایٹارل بنا کر کسی کچرا گھر میں پہنچا کر اسے پگلی کے طور پر پیش کیا جائے۔ ڈاکٹر ٹینیسن نے کہا تھا کہ وہ انجکشن کے اثر سے بھی ایٹارل رہے گی۔ بھی نارمل ہو جائے گی۔ اگر اس کے ڈیپارٹمنٹ والے اس سے غافل رہیں گے۔ چہرے کی تبدیلی کے باعث اسے پہچان نہیں سکیں گے تو قانون کے محافظ اسے ایک لاوارث دماغی مرینہ سمجھ کر کسی پاگل خانے میں پہنچادیں گے۔

مرینہ کی قسمت اجنبی تھی، اس نے نارمل رہنے کے دوران ڈائریکٹر جنرل سے حواس میں رہ کر فون پر باتیں کی تھیں اور اسے اپنے اہتمام میں لے لیا تھا۔ اب وہ سخت سکیورٹی میں رہ کر منگے اور تجربہ کار ماہرین کے زیرِ علاج رہنے والی تھی۔

☆☆☆

جینی بانی بڑی دیانت داری سے مراد کی ہم راز بن کر اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس کے باوجود مراد نے اسے پوری طرح راز دار نہیں بنایا تھا۔ اسے دھوکے میں رکھا تھا کہ عبداللہ کبڑی ہی مراد علی مطلق ہے اور ایک تاحترک مہاراج نے اسے یونان بنا دیا ہے۔

اب وہ دل سے تسلیم کر رہا تھا کہ جینی بانی پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر سکتا ہے۔ اس نے کبڑی کو مراد سمجھ کر اسے بیٹا بنایا تھا اور ایک ماں بننے کا حق ادا کرتی آرہی تھی۔ اس نے پریس کانفرنس کے ذریعے پورے اٹلیا میں یہ بات پھیلا دی تھی کہ بونا کبڑی مراد کا ہم شکل ہے لیکن مراد نہیں ہے۔ قانون کے محافظ اسے مراد سمجھ کر گرفتار نہ کریں اور اس

ری ایکٹ کیا۔ اس نے اچانک کمزوری محسوس کی۔ اس کے ساتھ ہی ہاتھ سے فون چھوٹ گیا۔ پستول چھوٹ گیا۔ وہ میز پر جھکتے جھکتے فرش پر گر پڑی۔ جان لیور نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ”کیا ہوا میڈم؟“

وہ فرش پر گرنے کے بعد تھوڑی دیر تک ساکت پڑی رہی۔ سفیر نے فون اٹھا کر کہا۔ ”مسٹر اتھونی! یہ آپ سے باتیں کرتے کرتے اچانک ہی گر پڑی ہے۔“ پھر وہ مرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ اٹھ کر بیٹھ رہی ہے۔ میں آپ سے بات کراتا ہوں۔“

وہ فرش پر مرینہ کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ”آریو آل رائٹ؟ لو بات کرو۔“

وہ فون کو اور جان لیور کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کس سے بات کروں؟ کون ہوں؟“

”ہائیں؟“ وہ حیرانی سے بولا۔ ”مجھے جانتے ہوئے بھی پوچھ رہی ہو کہ میں کون ہوں؟“

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”میرے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ابھی میں کچرا گھر میں تھی، یہاں کیسے آ گئی؟“

جان لیور نے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ”مسٹر اتھونی! آپ اس کی باتیں سن رہے ہیں۔ یہ ایٹارل ہے۔ چند لمبے پہلے مجھے پہچان رہی تھی۔ اب مجھے اجنبی سمجھ رہی ہے۔“

پھر وہ مرینہ سے بولا۔ ”تم مجھے نہیں پہچانتیں۔ اپنے ڈائریکٹر جنرل جان اتھونی کو تو پہچانتی ہو؟“

”یہ کون ہے؟ کہاں کا ڈائریکٹر جنرل ہے؟“ وہ فون پر بولا۔ ”یہ آپ کو بھی پہچانتے سے انکار کر رہی ہے۔ آپ اس سے بات کریں گے۔“

جان اتھونی نے کہا۔ ”اس سے پوچھو کہ وہ کون ہے؟“

جان لیور نے اس سے بھی سوال کیا۔ وہ بولی۔ ”بھی تو میں کچرا گھر میں اسپتال سے پوچھ رہی تھی۔ لوگوں سے بھی پوچھ رہی تھی کہ میں کون ہوں؟ شاید وہ مجھے جانتے ہوں۔ انہوں نے بتایا ہوگا کہ میں کون ہوں؟ مگر میں یہاں کیسے آ گئی۔ وہ بہت سارے لوگ تھے، کہاں چلے گئے؟“

”میڈم! ہم بھی جانتے ہیں، تم کون ہو؟ تمہارا نام مرینہ ولاور ہے۔ ابھی تم خود ہی کہہ رہی تھیں۔ پھر اچانک ہی اپنے آپ کو نہیں پہچان رہی ہو۔“

اس نے جان لیور کے ہاتھ سے فون چھین کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ”اے تم کون ہو؟ کیا میرا نام مرینہ ہے؟ کیا تم مجھے جانتے ہو؟“

”تمہاری آواز اور لہجے سے پہچان رہا ہوں۔ تھوڑی

وہ بولا۔ ”مراد جیسے خطرات سے کھینٹا آ رہا ہے اس کا تقاضا ہے کہ وہ کسی کو اچھی طرح آزمائے بغیر اس پر بھروسا نہ کرے اور اپنا راز دار نہ بنائے۔“

”ٹھیک کہتے ہو۔ مراد کو اپنے سائے پر بھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔“

”آپ برا نہ مانیں۔ ہم نے اب تک آپ پر بھی بھروسا نہیں کیا تھا لیکن اب کر رہے ہیں۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں سمجھی نہیں؟“

اس نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ وہ بولا۔ ”وہ سچ سچ عبداللہ کبڈی ہے، مراد نہیں ہے۔“

جگنی بانی نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ”اب میں آنکھیں بند کر کے آپ پر بھروسا کر رہا ہوں اور پیدائے بتا رہا ہوں کہ مراد علی منگی میں ہوں۔“

وہ بڑے غور سے اس کی صورت دیکھنے لگی۔ مراد نے کہا۔ ”وہ تاحترک مہاراج والی کہانی جھوٹی ہے۔ ہم نے دشمنوں کو الجھائے رکھنے کے لیے کبڈی کے چہرے پر مراد کا چہرہ یعنی میرا چہرہ بنایا ہے۔“

”تم مراد ہو؟ ڈاکٹر منگی سن کے بیٹے نہیں ہو؟“

وہ دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو چھونے لگی۔ اس نے کہا۔ ”یہ کبڈی، ڈاکٹر ڈیڈی اور دھرم داس جی جانتے ہیں آج فائنٹ کرتے وقت مرینہ کو معلوم ہوا کہ یہ میرا موجودہ چہرہ ہے اور اب آپ کو راز دار بنا رہا ہوں۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”اب مجھ پر اعتماد ہوا ہے اور سچ سچ اپنا راز دار بنا رہے ہو۔“

اس نے کہا۔ ”آپ سے ایک التجا ہے۔ یہ راز اپنی کسی بیٹی کو نہ بتائیں۔“

”کبھی نہیں بتاؤں گی۔ میں ماں ہو کر جانتی ہوں۔ وہ تینوں مراد علی منگی کی دیوانی ہیں۔ تمہارا جینا دو بھر کر دیں گی۔“

اس بات پر دونوں ہنسنے لگے۔ یہ صرف ہنسنے کا ہی نہیں رونے کا بھی مقام تھا۔ کمرے کے باہر ورشا کھڑکی سے لگی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ ماں کو اطمینان تھا کہ تینوں بیٹیاں اپنے اپنے بیڈروم میں سو رہی ہیں۔

اتفاق سے ورشا کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ جماعتی لٹی ہوئی پانی پینے کے لیے ڈائیننگ روم میں آئی تھی پھر ان کی باتوں سے کھٹکتی گئی تھی۔

اس نے واضح طور پر سنا تھا اور سنتے ہی دل کی دھڑکنیں پاگل ہونے لگیں۔ جسے تصور میں دیکھتی تھی، وہ سامنے کچھ قاصطے پر چہرے پر چہرہ لگائے بیٹھا تھا۔ اگر ماں

کی تلاش میں جھنگنے والے بے بدنام زمانہ قاتل اور جاسوس اس بونے کو مراد کے دھوکے میں گولی نہ ماریں۔ عقل سے سوچیں کہ کوئی قدا اور جادو سے بھی بونا نہیں بن سکتا۔

تمام خطرناک تنظیموں کے شوٹرز اس بونے کو دیکھ کر الجھ گئے تھے۔ انہوں نے اسے ٹارگٹ نہیں بنایا تھا وہ قدا اور مراد کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

دشمنوں کو یقین تھا کہ مرینہ دہلی آ کر مراد سے ضرور ملے گی۔ درجنوں شوٹرز اور مرینہ کے اپنے جاسوس مراد کو پکڑنے کے لیے ائر پورٹ سے مرینہ کی نگرانی کرتے رہے تھے۔ ایسے وقت جگنی بانی کی گھاگرا پلٹن نے کام دکھایا تھا۔

دہلی کی سڑکیوں پر کئی انیس گرا دی تھیں۔ مراد کو بھرپور سیکورٹی دی تھی۔ جس کے نتیجے میں وہ ایک گولی چلائے بغیر مرینہ کو فارم ہاؤس میں لے گیا تھا۔

اس نے مرینہ کے کس بل ڈھیلے کر دیے تھے اور ڈاکٹر نے اسے ایک انجکشن کے ذریعے بے ہوش کر دیا تھا۔ تب وہ مرینہ کو سر جری کے لیے وہیں چھوڑ کر جگنی بانی کے ساتھ اس کی رہائش گاہ میں آ گیا تھا۔

اس نے جگنی بانی کو بتایا کہ مرینہ کا چہرہ تبدیل کیا جا رہا ہے۔ انجکشن کے اثر سے وہ نیم پاگل رہا کرے گی۔

کبھی تارل رہے گی کبھی خود کو بھول جایا کرے گی۔ جگنی نے پوچھا۔ ”اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

وہ بولا۔ ”اب تو رات ہو گئی ہے۔ صبح ہونے سے پہلے آپ اپنی تابعدار خواتین کو حکم دیں کہ وہ مرینہ کو کسی گھرا گھر میں ڈال کر چلی جائیں۔ میں دور سے اس کی نگرانی کرتا رہوں گا۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گی۔ دیکھوں گی کہ وہ اپنا راز رہ کر کس طرح پاگل خانے میں پہنچائی جائے گی۔“ پھر وہ بولی۔ ”میرا بیٹا مراد بہت ہی عاشق مزاج ہے۔ پاکستان میں ماروی سے عشق کرتا رہا۔ یہاں فرمونا کا دیوانہ ہو گیا ہے۔“

مراد نے پوچھا۔ ”کیا فرمونا کے ماں باپ اسے داماد بنانے پر راضی ہو جائیں گے؟“

”راضی ہو گئے ہیں۔ میرے مراد جیسا داماد ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا۔ میں نے بات کئی کر دی ہے۔“

وہ بہت خوش ہو رہی تھی۔ اپنے بیٹے کے لیے اس کے قدم کے برابر یونی بھولانے والی تھی۔ مراد نے اس کی محبت اور ممتا کو دیکھ کر کہا۔ ”آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں کہو۔ تم بھی میرے بیٹے جیسے ہو؟“

ہوگی۔“

مراد نے کہا۔ ”اس کے والدین راضی ہیں لیکن ہمارے حالات ایسے ہیں کہ تمہاری شادی کھٹائی میں پڑ سکتی ہے۔“
مراد جتنی باتیں سے ہونے والی باتیں اسے بتاتے لگا۔ اس نے تمام باتیں سننے کے بعد کہا۔ ”میں ابھی فرمونا کے والدین سے بات کروں گا۔ ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں کہ دوپہر دونوں میں ہماری شادی ہو جائے۔ ورنہ فرمونا کے والدین اسے ایک آدھ ماہ بعد لندن لے کر آئیں وہاں اسے میری دلہن بنا لیں۔ واقعی میں پاکستان میں قدم رکھنے کے بعد انڈیا واپس نہیں آسکوں گا۔ بہر حال میں ابھی بات کرتا ہوں۔“

کیڑی سے بات ہو گئی۔ مراد نے کہا۔ ”ماتا جی! کافی دیر ہو چکی ہے۔ میں گھر جا کر عشا کی نماز پڑھوں گا۔“
”اب رات کے وقت کہاں جاؤ گے؟ یہاں نماز پڑھ لو۔“

”بہنیں رات گزارو۔ صبح چلے جانا۔“
دو دونوں ہاتھ جوڑ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”مخاف کریں ماتا جی! آپ کے گھر میں خطرے کی ایک نہیں تین گھنٹیاں ہیں۔ صبح تک بچتی رہیں گی۔ مجھے سونے نہیں دیں گی۔“
جتنی باتیں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تمہیں اصل بات بتاؤں کہ یہ لڑکیاں ایک دوسری کو مات دینے اور نچا دکھانے کے لیے تم سے عشق کر رہی ہیں۔ وہ نہیں چاہتیں کہ ان کے مقابلے میں کوئی دوسری تمہیں جیت لے۔“
”لیکن وہ تو قریب آ کر کچھ زیادہ ہی اور ہو جاتی ہیں۔“

”میں ماں ہوں، دعوے سے کہتی ہوں کہ وہ اپنے آپ پر بہت کنٹرول رکھتی ہیں۔ انہوں نے آج تک نہ کوئی گناہ کیا ہے نہ کریں گی۔ اب سے پہلے بھی وہ تینوں ایک نوجوان کے پیچھے پڑ گئی تھیں۔ آخر بڑی بیٹی ٹیٹا نے اسے جیت لیا پھر جیتنے کے بعد ٹیٹا کا دکھا کر کہا۔ تمہا ختم، ابھی شادی کا ارادہ نہیں ہے۔ ہمیں گھاگرا پلشن میں ماتا جی کی گدی سنبھالنی ہے۔“

وہ بڑے فخر سے بولی۔ ”میری بیٹیاں زبردست فائزر ہیں صرف کسی مرد کے لیے نہیں، میری گدی حاصل کرنے کے لیے بھی تینوں ہمیشہ ایکشن میں رہتی ہیں اور زیادہ سے زیادہ نمایاں کارنامے انجام دے کر میری گدی کی حق دار بنتا چہتی ہیں۔“

پھر اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں دیر ہو رہی ہے چلو میں چھوڑ آتی ہوں۔“

”آپ اتنی رات کو مجھے چھوڑنے جائیں گی اور تمہا

وہاں موجود نہ ہوتی تو وہ ددڑتی ہوئی جا کر اس سے لپٹ جاتی۔ اسے یقین دلاتی کہ اس کی رازدار بن کر رہے گی اور اس کی آئیڈیل دھرم پتی بن کر اس کی سیوا کرتی رہے گی۔
وہ دبے قدموں اپنے بیڈروم میں واپس آ گئی۔ سوچنے لگی کہ ایسا کیا کرے، کہ بہنوں کو یہ راز معلوم نہ ہو۔ اس نے بیڈ کے سرے پر چبھ کر ایک ٹکڑے کو اٹھا کر اسے اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ اس کے اندر ایسی آہل اور بے چینی تھی کہ ابھی جا کر اس کے سینے سے لگ جانا چاہتی تھی۔

ادھر مراد جتنی باتیں سے باتیں کر رہا تھا۔ دونوں اس بات سے بے خبر تھے کہ ایک سر پھری لڑکی کو یہ راز معلوم ہو گیا ہے۔ جتنی باتیں نے مراد سے باتیں کرنے سے پہلے تینوں بیڈروم میں جا کر دیکھ لیا تھا اور تینوں بیٹیوں کو گہری نیند میں دیکھ کر مطمئن ہو گئی تھی۔

مراد نے کہا۔ ”میرا پاسپورٹ اور اہم کاغذات تیار ہو چکے ہیں۔ کل تک عہد اللہ کبڈی کا پاسپورٹ مل جائے گا۔“
جتنی باتیں نے کہا۔ ”کبڈی تمہارا ہم شکل ہے۔ اس پر اگر چہ شبہ نہیں کیا جا رہا کہ وہ پاکستانی جاسوس مراد علی منگلی ہے۔ پھر بھی وہ یہاں سے پاسپورٹ کے ذریعے پاکستان جائے گا تو شبہ ہوگا کہ وہ پاکستان کیوں جا رہا ہے؟“

”ہم نے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کیا ہے۔ ہم یہاں سے سیدھے پاکستان نہیں جائیں گے۔ ڈاکٹر ڈیڈی کے ساتھ پہلے لندن جائیں گے ڈیڈی وہیں رہ جائیں گے۔ میں کبڈی کے ساتھ پاکستان چلا جاؤں گا۔“

”وہ فرمونا سے شادی کرنے یہاں آئے گا تو اس کا پاسپورٹ چیک کرنے والے سوال کریں گے کہ وہ پاکستان کیوں گیا تھا؟ اٹلی جسر والے اس کے پیچھے پڑ جائیں گے۔“
مراد ذرا چپ رہا۔ سوچا رہا پھر بولا۔ ”آپ فرمونا کے والدین سے بات کریں، آج کل میں بیٹی کی شادی کبڈی سے کروں وہ اسے لندن لے جائے گا۔ آئندہ وہیں اس کے ساتھ زندگی گزارے گا۔ انڈیا واپس نہیں آئے گا۔“

”بیٹے! یہ تو گڑے گڑیا کا کھیل ہوتا ہے۔ صبح سوچا اور شام کو شادی ہو گئی۔ وہ راضی نہیں ہوں گے پھر بھی میں ان سے بات کروں گی۔“

مراد نے کبڈی سے فون پر پوچھا۔ ”کہاں ہو؟“
وہ بہت خوش تھا۔ بڑی ترنگ میں بولا۔ ”فرمونا کے پاس ہوں۔ وہ لیکن نیس ہے۔۔۔۔۔ مجھے اپنے ہاتھ کا پکوان کھلا کر یہاں سے جانے دے گی۔ یارا خدا مجھ پر مہربان ہے۔ یہ بہت اچھی لڑکی ہے بہترین شریک حیات ثابت

واپس آئیں گی۔ مجھے اچھا نہیں لگے گا۔ آپ کار کی چابی دیں۔ ویسے بھی صبح یہاں آنا ہے اور ہمیں کسی کچرا گھر میں جانا ہے۔“

اس نے مسکرا کر کہا۔ ”وہ بہت اچھلتی ہوئی لہرن سے آئی تھی۔ میں دیکھوں گی کہ وہ بدبو سے ڈبیر میں خود کو پا کر کیسے ری ایکٹ کرے گی؟“

وہ دونوں کوٹھی کے باہر آئے، کار احاطے میں کھڑی ہوئی تھی۔ جگنی بائی نے کہا۔ ”میری ہلٹن کی تین عورتیں ڈاکٹر کے پاس ہیں، وہی مرینہ کو وہاں سے کسی کچرا گھر میں پہنچائیں گی پھر مجھے اطلاع دیں گی۔ تب میں تمہیں کال کروں گی۔“

”میں آپ کی کال سنتے ہی یہ گاڑی لے آؤں گا۔“ وہ اسٹیرنگ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا پھر کار اسٹارٹ کر کے ”شعبہ راتری“ کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ جگنی بائی نے کوٹھی کے اندر آ کر ماں جگدہ سے کی مورنی کے آگے سر جھکایا۔ ہاتھ جوڑ کر زیر سب پر اترنا کی۔ پھر اپنے بیڈروم کی طرف جاتے جاتے رگ گئی۔ اسے تینوں بیٹیوں کا خیال آیا۔ اس نے ٹیٹا کے کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ وہ سو رہی تھی۔ دوسرا دروازہ کھولا تو ڈولی بھی گہری نیند میں تھی۔ اس نے تیسرا دروازہ کھولا تو بیڈ خالی تھا۔ درشا نہیں تھی۔

اس نے کمرے میں آ کر واٹش روم کے بند دروازے سے کان لگا کر سنا۔ اندر خاموشی تھی۔ اس نے ہلکی سی دستک دے کر پوچھا۔ ”تم یہاں ہو.....؟“

اسے جواب نہیں ملا۔ ماں نے دروازے کے ونڈل پر دباؤ ڈالا تو وہ کھل گیا۔ درشا وہاں نہیں تھی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی اسٹور روم کے دروازے پر آئی۔ اسے کھول کر دیکھا تو یقین ہو گیا کہ وہ اتنی رات کو گھر سے باہر گئی ہے۔

تینوں لڑکیوں کو دن رات کہیں بھی جانے کی آزادی تھی لیکن وہ ماں سے کہہ کر جاتی تھیں کہ کہاں جا رہی ہیں اور کیوں جا رہی ہیں۔ درشا کبھی بار ماں کو اطلاع دے بیٹھ گئی تھی۔ دل میں ہات آئی، کیا مراد کے پیچھے گئی ہے؟ آج تک ایسا نہیں ہوا۔ کوئی بیٹی اتنی رات کو اجازت لیے بغیر نہیں جاتی۔ یہ کیمت گئی کہاں ہے؟

اس نے اپنے اون پر اس کے نمبر پر کیے۔ پھر اسے کان سے لگایا اور سنا۔ دوسری طرف تیل جا رہی تھی۔ ایسے وقت اس نے چونک کر بیڈ کی طرف دیکھا۔ بجے کے نیچے سے فون جھانک رہا تھا اور وہاں سے رنگ ٹون ابھر رہی تھی۔ جگنی نے اپنا فون بند کیا تو ادھر سے رنگ ٹون بھی بند

ہو گئی۔ وہ اپنا فون چھوڑ کر گئی تھی۔ ماں نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ مراد کے پیچھے گئی ہے لیکن کیسے گئی ہے؟ مراد تو عجا کار میں گیا ہے۔ کیا وہ پہلے ہی اس کے گھر پہنچ گئی ہے؟ اس نے سوچا، تھوڑی دیر انتظار کرے جب مراد گھر پہنچ جائے گا تو فون پر معلوم کرے گی کہ درشا وہاں پہنچی ہوئی ہے یا نہیں؟

مراد ونڈا سکرین کے پار دیکھتا ہوا کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ ڈرائیو تک کے اصولوں کے مطابق دائیں بائیں آگے پیچھے بیک وقت توجہ دینی پڑتی ہے۔ وہ اس وقت اپنے راستے پر جا رہا تھا جہاں زیادہ گاڑیاں نہیں چل رہی تھیں اور کوئی دشمن خاقب میں نہیں تھا۔ اس لیے وہ کسی اندیشے میں مبتلا نہیں تھا۔ پیچھے نہیں دیکھ رہا تھا۔

وہ ایسے ہی وقت پیچھے سے سیٹوں کے درمیان سے چپ چاپ طلوع ہوئی، ٹھیک اس کے پیچھے سیٹ پر بیٹھ کر مسکرانے لگی۔ جسے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ وہ ایک ہاتھ کے قاصدے پر تھا۔ ایسے وقت مراد نے محسوس کیا جیسے کار کی محدود فضا میں اور تنہائی میں بہت ہلکی سی آہٹ یا لباس کی سرسراہٹ ابھری ہو۔ پھر اس نے سوچا یہ فریب ساعت ہے۔ میں کار میں تنہا ہوں۔ کسی کی آہٹ کہاں سے پیدا ہوگی؟

وہ اگلی سیٹ کی پشت پر دونوں ہاتھ رکھ کر اس کی گردن پر جھک گئی۔ اس کے پسینے کی بھک کو سونگھنے لگی۔ ایسے وقت اس نے اپنی گردن پر گرم سائیس محسوس کیں۔ یکبارگی اسٹیرنگ بھک گیا۔ گاڑی ادھر سے ادھر ٹکنے لگی اس نے بڑی پھرتی سے اسے قابو میں کرتے ہوئے سڑک کے کنارے روکا۔ فوراً ہی پلٹ کر دیکھا تو گاڑی کے ٹکنے سے وہ بھی ادھر ادھر ہوتی ہوئی سیٹوں کے درمیان گر پڑی تھی۔ اب کراہتی ہوئی وہاں سے اٹھ رہی تھی۔ وہ حیرانی سے بولا۔ ”درشا..... تم؟“

وہ کمر پکڑ کر کراہتے ہوئے بولی۔ ”ہائے! تم نے تو مجھے مار ہی ڈالا ہے۔ کیا پریم کرنے والی سے ایسا برتاؤ کرتے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”مجھ گیا۔ تم پہلے سے یہاں آ کر چھپ گئی تھیں۔ یہ کیا حرکتیں ہیں درشا؟ تم تینوں اچھی طرح جان گئی ہو کہ نہ مجھے حسن و شباب کی رنگینوں سے دلچسپی ہے۔ نہ میں تم تینوں میں سے کسی سے بھی جسمانی تعلق رکھوں گا۔“ ”پہلے مجھے معلوم نہیں تھا۔ ابھی معلوم ہوا ہے کہ تم کسی بھی لڑکی کو منہ کیوں نہیں لگاتے ہو۔ میں بہت حسین ہوں اور نوجوان ہوں، یہ مجھے آئینہ کہتا ہے اور دنیا بھی کہتی ہے

تمہارے ہی لیے جنم لیا ہے۔ اگلے سات جنموں تک تمہارے ہی۔ بے پیدا ہوئی رہوں گی۔“

وہ اپنی گردن سے اس کی ہانہوں کو الگ کرتے ہوئے بولا۔ ”کیا کر رہی ہو؟ یہ سڑک ہے۔ کیا تماشا بناؤ گی؟“

بھینڑ لگاؤ گی؟“

اسی وقت ایک پولیس افسر نے کار کی باڈی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”اے باہر نکلو۔ کیا چومنے چاہنے کے لیے گھر چھوٹا پڑ گیا تھا کہ کھلی سڑک پر آگئے ہو؟“

مراد نے گھور کر درشا کو دیکھا، پھر کار سے باہر آ کر بولا۔ ”آفسر! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ یہاں ایسا کچھ نہیں ہو رہا ہے۔“

وہ بولا۔ ”میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، کیا تم بہن سمجھ کر اسے گلے لگا رہے تھے؟“

مراد نے دیکھا۔ دو سیاہی اس کے دائیں بائیں آ کر یوں کھڑے ہو گئے تھے جیسے ترقار کر کے نئے جانے والے ہوں، اس نے جیب سے توٹوں کی چھوٹی سی گڈی نکالی۔

اس میں سے سوسو کے پانچ نوٹ وردی کی اوپری جیب میں رکھے۔ دو سیاہیوں کو سوسو روپے دیے، پھر کچھ کہے سنے بغیر اسٹریٹنگ پر آ کر بیٹھ گیا۔ کار کو اسٹارٹ کیا، باہر جیسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا وہ قانون کے محافظوں کے سامنے سے گزرتا چلا گیا۔

درشا اگلی سیٹ پر اس کے برابر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”اگر رشوت کام نہ آتی تو ابھی ہم حوالات میں ہوتے۔ فارگاڈ سیک، چپ چاب بیٹھی رہو۔ اب کوئی تماشا نہ کرو، میں گھر پہنچ جاؤں گا تو تم اپنی ماتائی کی یہ گاڑی لے جاؤ۔ اگر انہیں معلوم ہوگا کہ تم گھر میں نہیں ہو تو وہ پریشان ہو جائیں گی۔“

وہ بڑے عزم سے بڑے ہی ٹھوس لہجے میں بولی۔

”میں واپس جانے کے لیے نہیں آئی ہوں۔“

اس نے ناگواری سے پوچھا۔ ”پھر کہاں جانے کے لیے آئی ہو؟ خواہ مخواہ فضول باتیں کر رہی ہو۔“

”میں تمہاری رازدار بن چکی ہوں۔ مجھ سے دوستی کرو۔ ہم آج کی رات گزاریں گے پھر میں صبح چلی جاؤں گی۔ اس کے بعد ہم ملتے رہا کریں گے۔ تم پاکستان جا کر مازوی کو اپنی دلہن بناؤ گے۔ پھر یہاں آؤ گے تو میں تمہاری دھرم پتی بن جاؤں گی۔“

وہ گاڑی کو ایک سڑک پر موڑتے ہوئے بولا۔ ”جیسا سوچ رہی ہو، ویسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں اپنی مازوی کے اعتماد

لیکن تم میری طرف مائل نہیں ہوتے، اس کی وجہ ابھی معلوم ہوئی ہے۔“

اس نے گھور کر پوچھا۔ ”تمہیں کیا معلوم ہوا ہے؟“

”یہی کہ.....“ وہ بڑے سچے تھے انداز میں بولی۔

”تم صرف مازوی کے دیوانے ہو۔ اس کے سوا کسی کو منہ نہیں لگاؤ گے۔ ہے نا یہی بات؟“

وہ ٹھنک گیا، ذرا سنبھل گیا۔ پھر بولا۔ ”یہ کیا بول رہی ہو؟ مازوی کا دیوانہ تو وہ مراد ہے۔“

”مراد یونہی نہیں ہو سکتا۔ تاہم مہاراج کی جھوٹی کہانی سنائی گئی ہے، پھر یہ کہ وہ مراد ہوتا تو اپنی مازوی کو بھول کر فرمونہ پر عاشق نہ ہوتا اور اب تو وہ اس سے شادی کرنے والا ہے۔“

وہ اس کی طرف جھکتی ہوئی بولی۔ ”کیا مراد ایسا ہے؟“

وہ ہنچکھاتے ہوئے بولا۔ ”حالات انسان کو بدل دیتے ہیں ہمارے دین میں بحالت مجبوری دوسری شادی کرنے کی اجازت ہے۔ اس کی مجبوری یہ ہے کہ اسے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق پاکستان میں رہنا ہوگا اور تمہارے اس دین میں بھی آتے جاتے رہنا ہوگا۔ اس لیے مازوی وہاں اس کی شریک حیات رہے گی اور یہاں فرمونہ اس کا گھر بسائے گی۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”یعنی مازوی وہاں تمہاری شریک حیات بن کر رہے گی اور یہاں میں تمہاری دھرم پتی بن کر تمہاری سیوا کرتی رہوں گی۔“

وہ پھر ٹھنک گیا۔ ہنچکھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ..... یہ کیا کہہ رہی ہو؟ میں مازوی سے شادی کیوں کروں گا؟ اس سے تو مراد شادی کرے گا۔“

وہ اس کے سینے پر ایک انگلی چھوٹے ہوئے بولی۔ ”اور مراد تم ہو۔ اب کھل جاؤ، زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ ابھی تم نے ماتا جی سے جتنی باتیں کی ہیں، وہ سب میں نے سن لی ہیں۔“

وہ اس کا منہ ٹکنے لگا۔ پریشان ہونے کی بات تھی۔ ایک انتہائی غیر سنجیدہ اور خود فرض لڑکی اس کا راز معلوم کر چکی تھی۔

وہ بولی۔ ”پریشان کیوں ہوتے ہو؟ کیا میں پیٹ کی ہانگی ہوں کہ دوسروں سے تمہارے اندر کی بات بولتی پھروں گی؟ تم مجھے کسی بھی طرح آزما لو۔ میں اپنی جان دے دوں گی لیکن تمہارا یہ راز اپنی زبان تک نہیں آنے دوں گی۔“

وہ پھیلی سیٹ سے اگلی سیٹ کی طرف جھک گئی۔ اس کی گردن میں ہاتھیں ڈال کر بولی۔ ”آج سے ہم ایک دوسرے کے رازدار بن کر رہیں گے مراد.....! میں نے

ڈھونڈ نہیں سکیں گی۔ میں تمہیں بھی نظر نہیں آؤں گی لیکن میری دشمنی تمہیں دکھائی دیتی رہے گی۔ یہ لکھ لو کہ تم بھی پاکستان اپنی ماروی کے پاس نہیں جاسکو گے۔“

وہ اسے گہری سنجیدگی سے دیکھنے لگا۔ ویسے بھی بدترین حالات سے گزر رہا تھا۔ اب ایک نازک موڑ پر آن پہنچا تھا۔ اس نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ”اچھی بات ہے۔ میں تمہارا ماتاجی سے بات نہیں کروں گا۔“

وہ کارڈ دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ”باہر نکلو۔“

پھر باہر آ کر بولا۔ ”نہیں۔ بیٹھی رہو۔ ابھی ڈیڑی دروازہ کھولنے آئیں گے۔ تمہیں ان کی نظروں میں نہیں آنا چاہیے تم۔ بس بیٹھی رہو۔“

”میں یہی کہنے والی تھی، مجھے ان کی نظروں میں نہیں آنا چاہیے لیکن میں کب تک بیٹھی رہوں گی؟“

”میں کوشش کروں گا کہ وہ جلد ہی اپنے بیندوم میں سونے کے لیے چلے جائیں، پھر میں یہاں آ کر تمہیں لے جاؤں گا۔“

وہ الجھ کر رہ گیا تھا۔ وہ جوان چھوڑی بہت بڑا چیلنج بن گئی تھی۔ اگر اس کی بات نہ مانتا تو واقعی وہ دشمنی پر اتر آتی۔ اس وقت وہ اتنی پادری ہو گئی تھی کہ اسے اس کی جان حیات ماروی کے پاس جانے سے روک سکتی تھی۔

اس نے دروازے کے پاس آ کر کال بیل کے بیٹن کو دبایا پھر سر گھما کر کار کی طرف دیکھا۔ وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ سیٹوں کے درمیان جا کر چھپ گئی تھی۔ ڈاکٹر نے دروازہ کھول کر اسے دیکھا پھر کہا۔ ”آؤ بیٹے! بڑی رات کر دی ہے۔ معلوم ہوتا ہے جتنی باقی کے ساتھ تھے۔ ان کی کار لے کر آئے ہو۔“

وہ باتیں کرتے ہوئے اندر آئے۔ ڈاکٹر نے دروازے کو بند کیا۔ مراد نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”ڈیڑی! بڑی مشکل میں ہوں۔ ورشا میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔ اس کار میں چھپی ہوئی ہے میرے ساتھ یہاں رات گزارنا چاہتی ہے۔ میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”میں سمجھ گیا۔ میرا بیٹا گناہوں سے دور بھاگتا ہے۔ ویسے ایک بالشت بھر کر چھوڑی سے کیوں ڈر رہے ہو؟ یہاں سے بھاگاؤ، اس کی ماں برا نہیں مانے گی۔“

”ڈیڑی.....! وہ میرا راز جان گئی ہے، اسے معلوم ہو گیا ہے کہ میں اس چہرے کے پیچھے چھپا ہوا ہوں۔ وہ میری اس کمزوری سے کھیل رہی ہے۔ مجھے یہ کہہ کر بلیک میل کر

لو نہیں نہیں پہنچاؤں گا۔ اس پر کوئی سوکن نہیں لاؤں گا۔“ اس نے چیلنج کرنے کے انداز میں پوچھا۔ ”کیا تم نہیں چاہتے کہ میں تمہارا راز اپنے سینے میں چھپا کر رکھوں؟“

اس نے پوچھا۔ ”صاف صاف بولو۔ کیا میں تمہارے ساتھ راتیں کاٹا کرتا ہوں گا تو میرا راز چھپا کر رکھو گی ورنہ نہیں؟“

”تم ہی بولو۔ جب تم سے بیار نہیں ملے گا تو کیوں راز دار بن کر رہوں گی۔“

”یعنی دشمنوں کو بتا دو گی کہ میں مراد علی منگلی ہوں۔“

”اتنی جلدی ایسی دشمنی نہیں کروں گی۔ پہلے تمہارے راستے کی رکاوٹیں بنتی رہوں گی، تمہیں مجبور کرتی رہوں گی۔“

”معلوم تو ہو کس طرح مجبور کرتی رہو گی؟“

”تمہارا پاسپورٹ اور ضروری کاغذات تیار ہو چکے ہیں، انہیں اٹھا کر پیچھنک دو۔ میں تمہیں پاکستان جانے نہیں دوں گی۔ جب میرے نہیں بنو گے تو ماروی کے بھی نہیں بنو گے۔ مجھے ٹھنکا کر جانا چاہو گے تو تمہیں بارڈر پر روک لیا جائے گا۔ آری اور ایشی جنس والے سرجری کے ماہر ڈاکٹر یعنی سن کو حراست میں لیں گے۔ اس کے بعد تمہارے اس چہرے کے پیچھے چھپا ہوا مراد آسانی سے باہر آ جائے گا۔“

وہ ڈرائیو کرتا ہوا ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اچھا تو تم بخبری کرو گی۔ دشمنی کا ارادہ کر چکی ہو۔ ان لحاظ میں تم بہت خوش نصیب ہو کہ ماتاجی کی بیٹی ہو۔ اس ماتاجی کی، جو کسی غرض یا لالچ کے بغیر میری ماں بننے کا ثبوت دیتی آ رہی ہیں۔ ان کی مہربانیوں سے ہی میں بہ آسانی اپنی ماروی کے پاس جاسکوں گا۔“ اس نے کن انگیوں سے ورشا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شکر کرو کہ ان کی بیٹی ہو۔ کوئی اور ہو تو ابھی ایک کے بعد دوسری سانس نہیں لے پاتیں۔“

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ ”کیا تم مجھے ایک کمزور لڑکی سمجھ رہے ہو؟ میں مرینہ سے زیادہ خطرناک ہوں۔ پکیز بات نہ بڑھاؤ، دوستی کرو، پھر کسی رکاوٹ کے بغیر ماروی کے پاس جا کر عیش کرو۔“

اس نے ڈاکٹر ڈیڑی کے بیٹھے کے احاطے میں آ کر کار روک دی وہ بولی۔ ”اور یہ بات یاد رکھو، تم ماتاجی کو میرے بارے میں فون نہیں کرو گے۔ انہیں معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

”مجھے تو ان سے بات کرنی ہو گی۔ یہ بتانا ہو گا کہ تم مجھے بلیک میل کر رہی ہو۔“

”تو پھر فون کرو۔ میں جارہی ہوں۔ وہ مجھے کہیں

ہر حال میں گناہ سے بچتا چاہتا تھا اور یہ فی الحال ناممکن نظر آ رہا تھا۔ وہ سوچتا ہوا باہر کار کے پاس آیا پھر دروازہ کھول کر بولا۔ ”آجاؤ، ڈیڈی اپنے کمرے میں ہیں۔ چپ چاپ چلی آؤ۔“

وہ باہر آئی۔ خوش ہو کر اس سے لگ کر بولی۔ ”آئی لو۔“

وہ بولا۔ ”یہ لو اسپاٹ نہیں ہے، اندر چلو۔“ وہ اندر آگئے۔ درشا بیڈروم میں آ کر پھر اس سے لپٹنا چاہتی تھی، وہ اسے دور کرتے ہوئے بولا۔ ”ابھی میرے پاس نہ آؤ، میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔“

وہ بھینچلا کر بولی۔ ”یہ نماز پڑھنے کا کون سا وقت ہے۔“

”ہم اللہ تعالیٰ کے آگے کسی وقت بھی سجدہ کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے محبت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔“

وہ پاؤں شیخ کر بولی۔ ”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، میں محبت کرنے آئی ہوں اور تم نماز پڑھنے جا رہے ہو۔“

”بھینچلاؤ مت۔ صبر کرو، وہاں کرسی پر جا کر بیٹھو اور انتظار کرو۔“

”یہ تو بتاؤ، کتنی دیر تک پڑھو گے؟“

”آج تو میں چاہتا ہوں قیامت تک پڑھتا رہوں۔ میں نے کہا نا، صبر کرو۔“

وہ وضو کرنے کے لیے واش روم میں چلا گیا اور اسے یہ اطمینان ہوا کہ وہ اس کے ساتھ راضی ہو گیا ہے۔ لہذا وہ بے جا ضد نہیں کر رہی تھی۔ بے چینی سے ادھر ادھر ٹھیل رہی تھی۔ وضو کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا لیکن درشا کو یوں لگ رہا تھا کہ وقت گزرتا جا رہا ہے اور وہ واش روم سے واپس آتا بھول گیا ہے یا جان بوجھ کر دیر کر رہا ہے۔

وہ کمرے میں آ کر مصلیٰ کو بچھا کر نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ وہ اس کے ایک طرف فرش پر بیٹھ کر بولی۔ ”تم شاید مجھ سے کترار ہے ہو۔ میں بھی دیکھتی ہوں، کب تک بھاگتے رہو گے۔“

وہ عبادت کے لیے جینا کی طرح کھڑا ہوا تھا۔ وہ نیچے بیٹھی سر اٹھا کر اس کے قدم اور جسامت کو دیکھ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا، پہاڑ تلے بیٹھی ہے۔ وہ اور زیادہ اس کے حواس پر چھار ہا تھا۔

وہ اپنی عبادت میں مصروف تھا۔ یہ اپنی پریم پوجا میں لگی تھی۔ کہتے ہیں، جو ہونی ہے، وہ ہو کر رہتی ہے اور وہ ہو کر رہنے کے لیے ہی پاس بیٹھی تھی۔

رہی ہے کہ اسے خوش نہیں کروں گا تو مجھے پاکستان نہیں جانے دے گی۔ میرے خلاف تجری کرے گی، میں بارڈر پار نہیں جاسکوں گا۔“

ڈاکٹر بھی پریشان ہو گیا۔ اس کا منہ تھکنے لگا پھر بولا۔ ”یہ درشا تو بہت ہی سنگین مسئلہ بن گئی ہے، تمہارا پاسپورٹ اور تمام اہم کاغذات تیار ہو چکے ہیں، کل تک کبڈی کے کاغذات بھی مل جائیں گے۔ میں سوچ رہا تھا اہم تینوں اسی ہفتے لندن کے لیے روانہ ہو جائیں۔ وہاں سے تم اور کبڈی پاکستان جاسکو گے۔“

”ہمارے راستے کی تمام رکاوٹیں دور ہو چکی تھیں۔ ہم بڑی بھاگ دوڑ کے بعد آسانی سے جانے والے تھے لیکن اب..... اب درشا کو ناراض کرنے سے ہماری تمام محنت پر پانی پھر جائے گا۔ میں اپنی ماروی کے پاس نہیں جاسکوں گا۔“

”کیا تم نے جگنی، بی کو یہ باتیں بتائی ہیں؟“

”میں بتانا چاہتا تھا لیکن درشانے چیلنج کیا ہے کہ ماما جی کو بلاؤں گا تو وہ یہاں سے بھاگ جائے گی۔ ماں سے بھی دور ہو جائے گی، پتا نہیں کہاں چھپ کر مجھ سے دھسلی کرتی رہے گی؟“

وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”آؤ ڈانگ ٹیل پڑھو۔ وہاں کھاتے بھی رہو اور باتیں بھی کرتے رہو۔“

”تو ڈیڈی! میں پہلے نماز پڑھوں گا۔ اس سے پہلے اسے اندر بلاؤں گا ورنہ وہ تسلطی رہے گی۔ آپ بیڈروم میں چلے جائیں۔ ادھر نہ آئیں، اس سے انجان بنے رہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں سونے جا رہا ہوں۔ آج تمہیں عقل سے کام لینا ہوتا۔ صرف ایک ہفتے کی بات ہے، ہم تینوں یہاں سے چلے جائیں گے تو یہ بلا بھی ہمیشہ کے لیے نل جائے گی۔ ابھی نکار کرو گے تو اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارو گے۔“

وہ اپنے بیڈروم کی طرف چلا گیا۔ مراد تھوڑی دیر تک کھڑا سوچتا رہا۔ وہ حالات سے مجبور ہونا نہیں جانتا تھا۔ درشا کو ایک چٹلی میں مسل کر شمشان گھاٹ پہنچا سکتا تھا لیکن یہ اس ماں کی کوکھ اجاڑنے والی بات ہوتی جو صحیح معنوں میں ایک ماں بن کر اسے اپنے گھر اپنی ماروی کے پاس پہنچانے کے راستے ہموار کر چکی تھی۔

وہ بھی اس کی بیٹی کو نہ ہلاک کرنا چاہتا تھا نہ اس کی عزت سے کھیلنا چاہتا تھا۔ اسے صرف اپنے اللہ پر بھروسا تھا۔ اس نے اپنے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا، اس کے مطابق

آگے نماز تھی۔ پیچھے گناہ گویا وہ انڈین پاسپورٹ تھی۔ اس پاسپورٹ پر مہر لگانے کے بعد ہی مراد پاکستان جاسکتا تھا۔

اس نے بڑے صبر سے انتظار کیا۔ اس کی بے چینی کہہ رہی تھی کہ بہت وقت گزر چکا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جوانی گزر جائے اور وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ جائے۔

وہ نماز کے بعد دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا۔ "اے میرے معبود! تو میری مدد فرما رہا ہے۔ جو بندے گناہوں سے دامن بچانے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں، ان کی کوششوں کا انعام تو ہی دیتا ہے۔ میں بچے پورے یہاں تک، مرینڈا اور نیوزیک سے لے کر ورشائیک دامن بچاتا آ رہا ہوں۔ تیری کرم نوازی سے میں اپنی کوششوں میں کامیاب رہا ہوں۔"

وہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر دل ہی دل میں بولا۔ "میں تیرے آگے ہاتھ پھیلا کر ورشا سے نجات چاہتا ہوں اور یہ عہد کرتا ہوں کہ نجات نہ ملی تب بھی گناہ گار نہیں بنوں گا۔ ابھی ورشا کو ٹھکرا کر اس کی دشمنی مول لوں گا۔"

وہ بڑے عزم سے کہہ رہا تھا۔ "ایمان علی کے چہرے کے پیچھے چھپا نہیں رہ سکوں گا۔ آرمی اور اسیلی جنس والوں سے اور تمام دشمنوں سے چھپتا پھروں گا۔ اپنی ماروی کے پاس پاکستان نہیں جاسکوں گا۔ کوئی بات نہیں، ماروی سے دور ہو جاؤں گا اور دشمنوں سے جنگ جاری رکھوں گا۔ میں حوصلہ کر رہا ہوں، کسی میں کسی بھی حال میں گناہ گار نہیں بنوں گا۔"

ورشائیک نے بیزار ہو کر کہا۔ "بس بھی کرو۔ کب تک دعائیں مانگتے رہو گے۔ مانگنے سے ماروی نہیں ملے گی یہاں تمہیں ورشائیک ملے گی۔"

یہ کہتے ہوئے وہ پیچھے سے آ کر اس کی گردن میں بائیس ڈال کر اس سے لپٹ گئی۔ گویا جہنم کا شعلہ آ کر لپٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے کراہ نکلے۔ بانہوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ کراہتی ہوئی آہستہ آہستہ جھکتی ہوئی فرش پر گر پڑی۔

مغز وہ ہو گیا۔ وہ آپ ہی آپ مصلے اور مراد سے دور ہو گئی۔ مراد نے اسے نہیں ٹھکرایا تھا۔ وہ تقدیر کی ٹھوک کھا کر گری تھی۔

مراد اسے تکلیف میں دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "یہ اچانک تمہیں کیا ہو رہا ہے؟" وہ کششوں کو پیٹ سے لگا کر کراہتی ہوئی بولی۔ "ماتا

جی کو کال کریں، جلدی کریں۔" اس نے ابھی چیخ کیا تھا کہ وہ جتنی بائی کوفون کرے گا تو وہ ماں کو بھی چھوڑ کر نہیں چلی جائے گی اور چھپ کر اس سے دشمنی کرے گی۔ مراد نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ اب وہ خود ہی ماں سے بات کرنا چاہتی تھی۔

اس نے جتنی بائی سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "ورشائیک ڈاکٹر ڈیڈی کے ہنگامے میں ہے۔ اچانک شدید تکلیف میں مبتلا ہو گئی ہے۔ آپ اس سے بات کریں۔"

اس نے فون کو ورشا کے کان سے لگایا۔ وہ ہائے ہائے کرتی ہوئی بولی۔ "وہی سینے والی پرائیم ہے، آپ فوراً دوا لیں۔ لے کر آ جائیں۔ مجھ سے تکلیف برداشت نہیں ہو رہی ہے۔"

ماں نے کہا۔ "برداشت کرو، میں ابھی آ رہی ہوں۔"

ماں آنے والی تھی۔ مراد کی سمجھ میں کسی حد تک آیا کہ وہ کس مسئلے سے دوچار ہے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ کیا خدا کی قدرت ہے۔ جو نہ سوچو، وہ ہو جاتا ہے۔ مراد سوچ سکی نہیں سکتا تھا کہ بندوق آپ ہی آپ خالی ہو جائے گی۔

اس نے ڈاکٹر کے دروازے پر آ کر دستک دی وہ دروازہ کھول کر بولا۔ "خیریت تو ہے؟"

وہ مسکرا کر بولا۔ "ہماری توجیح سے زیادہ خیریت ہی خیریت ہے۔ ابھی ماما جی یہاں آ رہی ہیں۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ اچانک کیا ہو گیا؟ وہ ورشا تو صبح کر رہی تھی؟"

مراد نے اسے بتایا کہ اس پر مسلط ہونے والی لڑکی کس طرح اچانک خاص مسئلے کے دوچار ہو گئی ہے۔ ہوس کا تیز رفتار گاڑی آگے نہ بڑھ سکی تھی۔ اسے سرخ مٹی نے روک دیا تھا۔ دونوں ورشائیک کے پاس آئے۔

وہ تکلیف کی شدت سے بے حال ہو رہی تھی۔ رہ رہ کر درد کی بیسیں اٹھ رہی تھیں۔ مراد اس کی حالت دیکھتے ہوئے کمرے سے واپس جانے لگا، وہ تڑپ کر بولی۔ "تم میرے لیے خیر مرد نہیں ہو۔ میرے پاس رہو مجھے حوصلہ دو۔ پائیز نہ جاؤ۔"

ڈاکٹر چلا گیا۔ مراد نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "قدرت کا تماشا دیکھ رہی ہو؟ تم کہہ رہی تھیں، مانگنے سے ماروی نہیں ملے گی یہاں ورشائیک ملے گی۔ یولو، ورشا ابھی مل رہی ہو؟ کاتب تقدیر سے لڑ سکتی ہو تو پیڈ پر

جینی بائی کو کچھ ایسا کرنا تھا کہ مراد بہ آسانی سرحد پار چلا جائے اور درشاہی نہ کرے اور یہ ممکن نہیں تھا۔ عورت جب ناگن بنا جاتی ہے تو ڈستی ضرور ہے۔

☆☆☆

اس رات ماروی نے خواب میں دیکھا۔ اس کا مراد آگیا ہے۔ اگرچہ اس نے فون پر کہا تھا کہ اس کا چہرہ بدل چکا ہے لیکن خواب میں وہی بچپن کے مراد کا چہرہ تھا۔ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

وہ اسے بازوؤں میں اٹھائے، اپنے سینے سے لگائے ایک پھولوں بھرے ماحول سے گزر رہا تھا۔ خوش لمبھی ان پر پھولوں کی پتیوں نچھاور کر رہی تھی۔ وہ اس کے کان کے پاس جھک کر کہہ رہا تھا۔ "میں نے وعدہ کیا تھا۔ لو میں آگیا۔ اب جلدی سے میری دلہن بن جاؤ۔"

یہ کہتے ہی اس نے چوم لیا۔ وہ ایک دم سے شرمائی۔ ہٹ سے آنکھ کھل گئی۔ وہ ابھی تک نظر آ رہا تھا اور وہ چومنے والی شہزاد سے گدگدا رہی تھی۔ وہ بھرپور انگریزی لیتی ہوئی شہزاد کی طرف آگئی۔ تھا مراد اس کے پہلو میں سو رہا تھا۔ اس نے بے اختیار اس پر جھک کر اسے چوم لیا۔ باپ کا پیار بیٹے کو دے کر اچھا لگا۔

محبوب نے بھی خواب دیکھا۔ ماروی دلہن بنی ہوئی تھی۔ قاضی صاحب اس کا نکاح اس سے پڑھاتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ "ماروی تمہیں مراد علی منگی کے نکاح میں دیا جاتا ہے۔ تمہیں قبول ہے؟"

ماروی نے کہا۔ "قبول ہے۔"

محبوب نے تڑپ کر کہا۔ "میں ڈلہا ہوں۔ نکاح مجھ سے پڑھاؤ، مراد سے کیوں پڑھا رہے ہو؟"

اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ مگر اس نے دیکھا ماروی اس کی دلہن بنی سہاگ کی بیچ پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ محبوب اس کی طرف کھنچا چلا آیا۔ پھر قریب آ کر ٹھٹک گیا۔ اس دلہن کے پیچھے مراد علی منگی بیٹھا ہوا تھا۔

محبوب نے کہا۔ "مراد! یہ کیا حرکت ہے؟ ماروی میری دلہن ہے۔ جاؤ یہاں سے۔"

مراد جواباً ہنسنے لگا۔ ایسے ہی وقت محبوب کی آنکھ کھل گئی۔ وہ چاروں شانے چت پڑا ہوا تھا۔ خالی خالی نظروں سے محبت کو دیکھنے لگا۔ اس کے اندر یہ اندیشہ چھپا ہوا تھا کہ ماروی کو منگوجہ بنانے سے پہلے مراد اسے اپنی دلہن بنانے کا مقصد کبھی تھی کہ مراد کسی خود کو جرائم سے اور گناہوں سے

آؤ۔۔۔"

"پلیز ہٹنے نہ دو۔ میری محبت کو سمجھو۔ مجھے گلے لگا کر پیار کرو، میری تکلیف کم ہو جائے گی۔"

"یہ سچ ہے، کتے کی دم بھی سیدھی نہیں ہوتی، میں اپنے پروردگار کا شکر گزار ہوں۔ آئندہ چار پانچ دنوں تک تمہارے شر سے محفوظ رہوں گا اور تب تک یہاں سے چلا جاؤں گا۔ گیند اب ماتہ جی کے کورٹ میں ہے وہ تمہیں کھیلنے کا موقع ہی نہیں دے سکتی۔"

اسی وقت ماں آگئی۔ ڈاکٹر باہر ہی سے یہ وضاحت کرتا آرہا تھا کہ درشاہی طرح مراد کی کار میں چھپ کر یہاں تک آئی ہے اور کس طرح اسے بلیک میل کر رہی گی۔

ماں اس کا لباس اور اس کی دوا میں نے کر آئی تھی۔

اس نے مراد اور ڈاکٹر سے کہا۔ "آپ دونوں باہر جائیں پلیز۔" وہ دونوں باہر آئے۔ جینی بائی نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا پھر سیدھی جینی کے پاس آ کر اس کے منہ پر ایک لالت ماری۔ "مر جا حرا مزادی! میں نے تم تینوں کو پن (نیکی) کمانے کی تعلیم دی اور تو پاپ کار رہی ہے۔ میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ کس طرح ایک ہندوستانی عورت پڑوسی ملک کے ایک بیٹے کو اپنا بیٹا بنا کر اس کی مشکلیں آسان کرتی ہے۔ میں جو کر رہی ہوں تو اس کا الٹا کر رہی ہے۔"

بیٹے کے سر ہانے ایک جگہ میں پانی رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک گلاس میں پانی نے کر درشاہی کے پاس آئی۔ اسے کھانے کے لیے دوا میں دیر پھر کہا۔ "تیرے لیے کپڑے لائی ہوں۔ واش روم میں جا۔" جینی جی ایک غیر مرد کے کمرے میں آ کر یہ بے شرمی پھیلائی ہے۔ میرا سر جھکا دیا ہے۔ کمر چل پھر تیری خیر لیتی آوں۔ دیکھتی ہوں تیرے اندر جوانی کی کتنی آگ بھری ہے۔ تجھے راکھ کر کے رکھ دوں گی۔"

وہ اپنا لباس اٹھا کر واش روم کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ "تم کیا کرو گی؟ مارو کی؟ بیٹو کی اور بڑی تکلیف وہ سزا میں دو گی۔ زیادہ کرو گی تو جان سے مار ڈالوں گی اور میں مرتے دم تک مراد کا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔ اگر وہ میرا تہ ہوا تو ماروی کا بننے کے لیے پاکستان بھی نہیں جاسکے گا۔"

اس نے چپقلچ کیا پھر واش روم میں جا کر دروازے کو بند کر دیا۔ جینی بائی گہری سنجیدگی سے بند دروازے کو دیکھنے لگی۔ وہ بیٹی ماں کی منگی اور شرافت کو جانتی تھی اور اس کی متا کو بھی مانتی تھی کہ اس کی متا بیٹی کو زیادہ اذیتیں نہیں پہنچائے گی۔ وہ سر پھری ماں سے خوف زدہ نہیں تھی۔ مراد کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔

پاک ثابت نہیں کر سکے گا۔ یہاں چہرہ ہڈن کر بھی آئے گا تو کسی نہ کسی دن پکڑا جائے گا۔

وہ خود کو پوری طرح مطمئن کرنا چاہتا تھا کہ دو تاریخ کو ماروی اس کی دلہن بنے گی اور دو تاریخ صرف چند روزوں کے فاصلے پر رہ گئی تھی لیکن اطمینان قلب نہیں تھا۔ وہ لیٹا ہوا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پریشان ہو کر سوچنے لگا، کیا کرے؟ کس طرح ابھی جا کر ماروی کو فوراً منکوحہ بنا کر لے آئے؟ وہڑ کا سالگا تھا کہ دو تاریخ سے پہلے قیامت آجائے گی اور وہ قیامت مراد کی صورت میں آئے گی۔ محبوب مانتا تھا کہ ماروی اس کی فرماں بردار ہے اس کی ہر بات مانتی ہے لیکن یہ بات نہیں ماننے کی کہ آج ہی اس سے نکاح پڑھوا لے۔ وہ منکوحہ بن کر محبوب کے پاس آتی تو مراد کے بیٹے کو بھی ساتھ لاتی۔ یعنی یار کو کسی صورت اپنے پاس ضرور رکھتی۔ اس نے کئی بار سوچا کہ ماروی کو جبراً اپنی شریک حیات بنا رہا ہے۔ محبوب حقائق کو تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ وہ ایک ہی بات کہتا تھا کہ شادی کے بعد ماروی اسے دل و جان سے چاہنے لگے گی۔ وہ حیا دالی ہے۔ شادی کے بعد بے حیائی سے مراد کا نام نہیں لے گی۔ مختصر یہ کہ وہ ماروی کی طلب سے باز آنے والا نہیں تھا۔

سیرا نے بھی خواب میں دیکھا تھا کہ مراد اس سے ملنے آیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”تم نے ماروی کی جان لینے کی حماقت کی لیکن میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔“

سیرا نے کہا۔ ”تم مجھے کیوں معاف کر رہے ہو؟“ وہ بولا۔ ”میں چاہتا ہوں جب ماروی میری دلہن بن جائے تب محبوب تنہا نہ رہیں۔ تم ان کی زندگی کی ساتھی بن جاؤ۔ محبوب کے ہم پر بڑے احسانات ہیں۔ ہم ان کی خاطر تمہارے جرم کو معاف کر رہے ہیں۔“

پھر سیرا نے خواب دیکھا۔ مراد اس کا ہاتھ پکڑ کر ماروی کے سامنے لایا تھا۔ ماروی اس سے ناراض تھی لیکن مراد کو دیکھتے ہی خوش ہو کر بولی۔ ”تم میری جان کی دشمن ہو مگر میرے مراد کو مجھ سے ملانے لائی ہو اس لیے تمہیں معاف کرتی ہوں۔ اب تم یہاں سے محبوب کی زندگی میں جاؤ۔“

اس وقت سیرا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ پچھلے دو دنوں سے کھلی ہوئی تھی۔ اس انتظار میں تھی کہ محبوب جب بھی آئے گا تو اس سے نفرت کرے گا۔ لیکن محبوب نے اس سے فون پر جب بھی باتیں کیں تو اسے الزام نہیں دیا کہ اس نے ماروی کو ہلاک کرنے کی کوشش کی

تھی۔ یوں اطمینان ہوا کہ ماروی نے اس کے خلاف شکایت نہیں کی ہے۔ اس کے اندر حوصلہ پیدا ہوا اس نے سوچا کہ خود ماروی کے پاس جائے اور اس سے معافی مانگے۔ اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پھر اس خواب نے حوصلہ دیا تو وہ شاور لے کر اچھا سا لباس پہن کر صبح سویرے ہی ماروی کی کوشی میں آگئی۔ وہ ڈرائنگ روم میں نئے شہزاد کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ سیرا کو دیکھ کر سنجیدہ ہو گئی۔ اس کے تیور بدل گئے۔ وہ ناگواری سے بولی۔ ”اعلیٰ طرفی کا تقاضا ہے کہ دروازے پر آئے ہوئے دشمنوں کو بھی خوش آمدید کہو۔ اس لیے میں رکی طور پر کہہ رہی ہوں، آؤ بیٹھو۔“

وہ دروازے پر کھڑی تھی۔ سر جھکا کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک صوفے کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ایسے وقت مٹی چاچی آن اسے دیکھتے ہی ٹھنک گئی پھر اس نے ماروی کو دیکھا۔ وہ بولی۔ ”چاچی! سیرا کے لیے شربت لے آؤ۔“ سیرا کچھ بول نہیں پاری تھی۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ماروی نے کہا۔ ”میں سمجھ گئی اتنی صبح آئی ہو۔ کچھ کھایا بھی نہیں ہوگا۔ یہ ہمارے ساتھ ناشتا کریں گی۔ تم ناشتا تیار کراؤ۔“

وہ اچانک ہی دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ ماروی اور چاچی اسے چپ چاپ دیکھ رہی تھیں۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”میں معافی کے قابل نہیں ہوں پھر بھی اٹھا کرتی ہوں مجھے معاف کر دو۔“

سیرا نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹایا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ وہ بولی۔ ”ماروی! تم بہت عظیم ہو۔ تم نے محبوب سے میری شکایت نہیں کی۔ اگر کرتیں تو میں اب تک ان کی نظروں سے گر چکی ہوتی۔ میں نے تمہیں میزبانیوں پر سے گرایا۔ تم مجھے نظروں سے گرنے سے بچا رہی ہو۔ تمہاری عظمت کے سامنے میں بہت چھوٹی بہت حقیر ہو گئی ہوں۔“

ماروی جیسے اس کے آنسوؤں کو اور اس کی باتوں کو اہمیت نہیں دے رہی تھی۔ وہ اسے نظر انداز کرتی ہوئی چاچی سے بولی۔ ”آج سڈے ہے، محبوب بھی یہاں ناشتا کرنے آئیں گے۔“

مٹی نے کہا۔ ”ہاں بیٹی! مجھے یاد ہے۔“ سیرا پریشان ہو کر بولی۔ ”کیا محبوب ابھی آئیں گے، میں روتی ہوئی صورت لے کر ان کا سامنا نہیں کروں گی۔“

ماروی نے کہا۔ ”ہاں، انہیں معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تم

”میں جانتی ہوں، وہ برسراقتدار پارٹی کا بہت ہی معروف سیاستدان تھا اور وزیر تھا لیکن اس کے گل کے وقت مراد پاکستان میں نہیں تھا۔“

وہ بات کاٹ کر بولا۔ ”ہم اس موضوع پر پہلے بھی بحث کر چکے ہیں۔ تم نہیں مانو گی کہ وہ یہاں آئے گا تو گرفتار کر لیا جائے گا۔ پھر اسے رہائی دلانے کے لیے اور مقدمہ لانے کے لیے جو بھاگ دوڑ ہوگی اس کے نتیجے میں ہماری شادی التوا میں پڑ جائے گی۔“

وہ بڑے یقین سے بولی۔ ”ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ مراد گرفتار نہیں ہوگا۔ جب وہ ثابت کر دے گا کہ اب وہ مجرم نہیں رہا ہے اور مرینہ سے یا کسی عورت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ گناہوں سے توبہ کر کے پانچوں وقت کا نمازی ہے، تو آپ دونوں کا پلازہ برابر ہو جائے گا۔ پھر تو آپ دو تاریخ کو مجھے اپنی منگولہ نہیں بنا سکیں گے۔“

”ایسا نہ کہو۔ میں دو تاریخ کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں، مراد اب مرتے دم تک جرائم کی دنیا سے نہیں نکل سکے گا۔ میں کئی پہلوؤں سے غور کرتا رہا ہوں وہ ایسی دلیل میں دھنسا ہوا ہے کہ وہ مجرم بن کر ہی زندگی گزار سکے گا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔“

ماروی نے سر جھکا لیا۔ چہرے سے ظاہر کرنے لگی کہ مراد کے لیے بہت پریشان ہو رہی ہے۔ جبکہ اندر سے مطمئن تھی۔ یہ جانتی تھی کہ وہ بونا مراد بن کر ایسا تماشا کرنے آئے گا کہ قانون کا کوئی محافظ اسے مجرم مراد علی منگلی ثابت نہیں کر سکے گا اور جرائم کی دنیا کے سب ہی مجرم اسے حمد اللہ کبڈی سمجھ کر نظر انداز کریں گے۔ وہ ثابت کرنے والا تھا کہ اب مجرم مراد نہیں رہا ہے۔

☆☆☆

نہیں حیرا نعین قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں
اور شاہین مراد پرواز کے لیے پرتول رہا تھا۔ اس کا نشین انڈیا میں نہیں پاکستان میں تھا۔ اس کے پاسپورٹ اور دیگر اہم متعلقہ کاغذات پر کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ انڈیا کی ایک فلائٹ میں اس کی سیٹ بھی اوکے ہو گئی تھی۔

اب تو دو چار ہاتھ لب با م رہ گیا تھا، ایسے ہی وقت در شا بہت بڑی رکاوٹ بن گئی تھی۔ جتنی باقی اسے مراد سے بیڈروم سے پکڑ کر گھر لے آئی تھی۔ وہ عارضی روگ لگنے کے باعث مجبور ہو گئی تھی۔ لیکن ماں سے صاف

کیوں رو رہی ہو؟ نہ میں نے تمہارے خلاف ان سے کچھ کہا ہے اور نہ تم خواجواہ اعتراف جرم کرو۔“

اس نے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں نے تمہاری جان لینے کی کوشش کی اور تم مجھ پر مہربان ہو رہی ہو۔ کیا میں قابل نفرت نہیں ہوں؟“

”جب میں معاف کر چکی ہوں تو پھر قابل نفرت نہیں ہو۔ اگر ایک طرف تم نے مجھے مار ڈالنے کی کوشش کی تھی تو دوسری طرف تم محبوب کے اربوں روپے کے کاروبار کو ڈوبنے سے بچا رہی ہو۔ معروف صاحب کی راہنمائی میں بڑی دیانتداری سے ان کا کاروبار سنبھال رہی ہو۔ میری دشمن سبھی محبوب کے لیے دیانت دار ہو۔ لہذا میں تمہارے خلاف کچھ نہ بول کر تمہاری وقاداری کا انعام تمہیں دے رہی ہوں۔“

وہ بڑی عقیدت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ماروی! تمہاری عظمت کے سامنے میرا سر جھک گیا ہے۔“

”صرف خدا کے آگے سر جھکاؤ۔ وہ مجھے دو تاریخ کو اپنی دلہن بنانے والے ہیں۔ میں دعا مانگ رہی ہوں کہ کسی طرح تم ان کی دلہن بن جاؤ۔ یہ صاف سمجھ میں آتا ہے کہ تم ان کی بہترین شریک حیات ثابت ہوگی۔ خدا کرے یہ بات محبوب کی سمجھ میں آ جائے۔“

ماروی کس قدر تعمیری انداز میں اس کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اسے محبوب کی دلہن بنانا چاہتی تھی اور وہ اس کے خلاف کیا کر چکی تھی؟ اس کا جھکا ہوا سر مارے شرم کے نہیں اٹھ رہا تھا۔

اسی وقت باہر بار کے آنے کی آواز سنائی دی۔ ماروی نے کہا۔ ”محبوب آگئے ہیں۔“

سیرا نورانی اپنا حلیہ درست کرنے کے لیے اندر کمرے کے واش روم میں چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی محبوب دروازہ کھول کر آیا۔ پھر ماروی سے بولا۔ ”باہر سیرا کی کار کھڑی ہے۔“

وہ بولی۔ ”ہاں وہ اندر ہے ابھی آئے گی آج وہ بھی ہمارے ساتھ ماشا کرے گی۔“

”میں تم سے مراد کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں تم یقین نہیں کرو گی، وہ یہاں آ کر اپنے آپ سے دشمنی کرے گا۔ وہ کسی بھی جہس میں رہے گا۔ ایشلی جنس والوں سے چھپ نہیں سکتے گا۔ اس پر کئی گل کے علاوہ عالی جناب کے گل کا بھی سنگین الزام ہے اور عالی جناب کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔“

کے ساتھ مستقل ایک باڈی گارڈ کو رکھنا چاہیے۔ وہ ہوش میں رہ کر جو بھی حکم دے اس پر کسی تاخیر کے بغیر فوراً عمل کرنا چاہیے۔

وہ جب بھی نارمل ہوتی تھی ایک کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر قدم اور مراد کو اور بونے مراد کو ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ ایسے وقت برقع پہن کر رہتی تھی کیونکہ وہ دونوں ہی مراد کے تبدیل شدہ چہرے سے اسے پہچان سکتے تھے۔ اس نے تیسرے ہی دن بونے مراد کو ایک انٹرویو ایجنسی کے باہر ڈاکٹر ٹینی سن کے ساتھ دیکھا۔ فارم ہاؤس میں جب مراد نے اس کی پٹائی کر کے نیم بے ہوشی کی حالت میں پہنچا دیا تھا۔ جب ڈاکٹر نے آکر اسے انجکشن لگایا تھا۔

وہ ڈاکٹر کو پہچان نہ سکی، کیونکہ اس وقت نیم بے ہوشی طاری تھی۔ وہ اس کے چہرے کو یاد نہ رکھ سکی۔ وہ انٹرویو ایجنسی کے دفتر میں آگئی۔ وہاں ایک کمپیوٹر کے سامنے ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سے بولی۔ ”کیا انٹریڈیا کی کوئی فلائٹ کل لندن جا رہی ہے؟“

خاتون نے کہا۔ ”کل نہیں پرسوں صبح دس بجے ایک فلائٹ ہے۔“

مرینہ نے مسکرا کر کہا۔ ”مجھے بونے بہت اچھے لگتے ہیں ابھی میں نے آفس کے باہر ایک بونے کو دیکھا ہے۔ کیا وہ بھی کہیں جا رہا ہے؟“

”ہاں پرسوں دس بجے کی فلائٹ سے لندن جانے والا ہے۔“

مرینہ نے حیرانی سے کہا۔ ”میں حیران ہوں، کیا وہ یونانیلا اتنی دور جائے گا؟“

”نہیں اس کے ساتھ اور دو افراد ہیں۔“

”میں اس بونے سے ایک لمبی ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو اس کا رہائشی پتہ بتائیں گی۔“

”ڈاکٹر ٹینی سن بہت مشہور ہیں۔ کھڑک سنگھ روڈ کے پیچھے ان کا کلینک اور بنگلا ہے۔“

”وہ کس شعبے کے ڈاکٹر ہیں؟“

”وہ پلاسٹک سرجری کے ماہر ہیں۔“

وہ آگے سن نہ سکی۔ اس کے ذہن میں روشنی کا ایک جھمکا سا ہوا۔ چشم زدن میں یہ بات سمجھ میں آگئی کہ اس ڈاکٹر نے ہی مراد کو ایک خوب رو جوان بنایا ہے اور بونے کو مراد کا چہرہ دیا ہے۔

اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ ”صرف اتنا ہی نہیں۔ میرا یہ

صاف کہہ دیا تھا کہ مراد سے شادی کرے گی۔ اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔

ماں نے کہا۔ ”کیا دنیا میں وہی ایک مرد رہ گیا ہے؟ ہمارے دس میں کتنے ہی گہرو جوان ہیں۔ کسی کا بھی ہاتھ پکڑ لے۔“

وہ بولی۔ ”تم بھی جوانی میں پتاجی کے پیچھے پڑ گئی تھیں۔ تمہارے ماں باپ اور پوری برادری پتاجی کے خلاف تھی لیکن تم نے اپنی ضد منوالی۔ میں بھی تمہاری بیٹی ہوں۔ مراد کو یہاں سے بھاگنے نہیں دوں گی۔“

ماں سوچ میں پڑ گئی پھر بولی۔ ”اچھا جو تیرے جی میں آتا ہے، وہ کر لیکن مجھ سے یہ وعدہ کر کہ ٹینا اور ڈولی کو مراد کا بھید نہیں بتائے گی۔“

”میں پاگل نہیں ہوں کہ انہیں بتاؤں گی۔ انہیں معلوم ہوگا تو وہ بھی مراد کے پیچھے پڑ جائیں گی۔“

جتنی بائی بیٹی کو باغی اور مراد کا دشمن نہیں بنانا چاہتی تھی۔ اسکا تدبیر سوچا رہی تھی جس پر عمل کر کے مراد کو کسی رکاوٹ کے بغیر سرحد پار کرادے۔

دوسری دشمن مرینہ تھی۔ اسے بھلا یا نہیں جاسکتا تھا۔ ڈاکٹر یکٹر جنرل جان انتھونی نے پہلے دن اسے ایک سینٹل اسپتال میں ٹریٹمنٹ کے لیے بھیجے کو کہا تھا۔ وہاں کے ڈاکٹروں کی رپورٹ نے بتایا کہ کسی مہلک دوا کے ذریعے اس کے دماغ کو ناکارہ اور کمزور بنایا گیا ہے جس سے وہ ایک آدھ گھٹے کے لیے غائب دماغ ہو جاتی ہے پھر نارمل ہو جاتی ہے اس کے بعد پھر غائب دماغ ہو جاتی ہے اور اپنے آپ کو بھول جاتی ہے۔

مرینہ نے ایک بار نارمل ہو کر ڈاکٹر یکٹر جنرل جان انتھونی سے فون پر بات کی تھی اور وہ غصے کو ڈنبرز بتائے تھے جو صرف وہ جانتا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہی مرینہ ہے اور مراد نے اپنے دشمنوں کو سمٹکانے کے لیے اس کا چہرہ بدل دیا ہے۔

مرینہ نے ڈاکٹر یکٹر جنرل سے کہا تھا کہ صرف وہی مراد کو نئے چہرے سے پہچان سکتی ہے۔ آئندہ وہ جب بھی ہوش و حواس میں رہے گی تو کسی باڈی گارڈ کے ساتھ اسے تلاش کرنے نکلے گی اور اسے کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ نکالے گی۔

جان انتھونی نے انڈیا میں اپنے سفیر سے کہا تھا کہ ایک جھگڑے میں مرینہ کی رہائش کا انتظام کیا جائے۔ میٹھے اور تجربہ کار ڈاکٹروں سے اس کا علاج کرایا جائے۔ اس

دیکھا ہے؟“
 ”نہیں وہ آگرہ گیا ہے۔“
 اس نے باڈی گارڈ سے کہا۔ ”فورا گاڑی نکالو۔ ہم آگرہ جا رہے ہیں۔“

وہ اپنا ضروری سامان اور دوا میں ایک بیگ میں رکھ کر باہر آئی، پھر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دوا میں کھار ہی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ جلد ہی اس کی دماغی کمزوری دور ہو جائے گی۔

اس نے آگرہ تک ووڑ لگائی۔ شام ہو چکی تھی ایک رات وہاں رہی، دوسرے دن پورے شہر میں گھومتی رہی۔ عشق کرنے والے تاج محل کو دیکھنے ضرور آتے ہیں۔ اس کا خیال تھا، مراد وہاں ضرور آئے گا لیکن وہ دوسری رات تک وہاں بھٹکتے رہنے کے بعد بھی اپنے یار کی ایک جھلک نہ دیکھ سکی۔ وہی واپس آگئی۔ دوسری صبح وہ اسے انرپورٹ پر پکڑنے والی تھی۔

درشا بھی اسے تلاش کر رہی تھی۔ اس نے ایک بار اسے فون کیا تو رابطہ نہ ہو سکا۔ اس نے دوپہر کو پھر شام کو کال کی تب اس کی آواز سنائی دی۔ ”ہاں درشا یولو۔ کیا بات ہے؟“

وہ بولی۔ ”تم کہاں ہو، میں ابھی ملنا چاہتی ہوں۔“
 ”کیا یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی کہ خدا کو ہمارا ملنا منظور نہیں ہے۔ تم نے بلیک میٹنگ کے ذریعے مجھے پوری طرح مجبور کر دیا تھا۔ میں تمہارے ٹکٹے سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اس کے باوجود تم پر قدرتی آفت نازل ہوئی اور تم مجھے چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو گئیں۔ اب پرسوں کا ٹکٹ اوکے ہو گیا ہے۔ میرے جانے تک تم سرخ فیتے سے بندھی رہو گی۔ میرے ساتھ راتیں گزارنے کی حسرت ہی رہ جائے گی۔“

”ہاں ابھی مجبور ہوں۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہم ایک ساتھ راتیں گزاریں۔ صرف ملاقات کرو۔ ہم ٹھوٹے پھرتے پیار سے اچھا وقت گزاریں گے۔“

”میں تم سے کہہ چکا ہوں، مجھے بھول جاؤ۔ تم مجھے چھوڑ بھی نہیں سکو گی۔ میرے جانے کے بعد سوچتی رہو گی کہ سائے کے چھبے بھاگتی رہی ہو۔“

”یہ خوش نہیں دل سے نکال وہ کہ سیٹ اوکے ہو گئی ہے تو آسانی سے چلے جاؤ گے۔ یہ لکھ لو کہ مجھ سے نہیں ملو گے تو پاکستان جا کر ماروی سے بھی نہیں مل سکو گے۔ انڈین انٹیلی جنس والے تمہیں جانے نہیں دیں گے۔“

چہرہ بھی اس سمجھت ڈاکٹر نے تبدیل کیا ہے۔
 وہ آفس سے باہر آ کر اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ”مجھے ڈاکٹر ٹھنی.....“

وہ آگے نہ بول سکی۔ اپنی روشنی کے مطابق غائب دماغ ہو گئی۔ خود کو بھول گئی۔ باڈی گارڈ نے کہا۔ ”سڈم! آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم آپ کو پہچانتے ہیں۔ ابھی گھر لے چلتے ہیں۔“

وہ تقریباً دو گھنٹے تک خود سے غافل رہنے والی تھی، موجودہ حالات میں ایک انار کے پیچھے دوپہار تھیں۔ درشا کی طبیعت دوسرے دن سنبھل گئی تھی۔ اس نے جگنی پائی سے کہا۔ ”میں باہر گھومنے پھرنے جاؤں گی۔“

”میں جانتی ہوں، کہاں جاؤں گی۔ وہ تمہیں نظر نہیں آئے گا۔“

”کیوں نظر نہیں آئے گا؟ کیا کہیں بھاگ گیا ہے؟“
 ”بھاگ کر کہاں جائے گا؟ پرسوں فلائٹ کی سٹیش اوکے ہو گئی ہیں۔ ابھی وہ آگرہ گیا ہے۔“

”وہ آگرہ ضرور جائے لیکن اس دس دن سے باہر نہیں جاسکے گا۔ اگر تم میری ماں ہو اور بیٹی کے جذبات کو ابھی طرح سمجھتی ہو تو میرے لیے اسے راضی کرو۔ وہ تمہیں ماں کہتا ہے تمہاری ہر بات مانتا ہے۔“

”میں ماں ہوں۔ صرف بیٹیوں کے نہیں، بیٹے کے جذبات کو بھی سمجھتی ہوں۔ میرا یہ بیٹا ماروی کا دیوانہ ہے۔ تم اسے اگلے جنم میں بھی حاصل نہیں کر سکو گی۔“

”میں آخری بار کہتی ہوں۔ اگر تم چاہتی ہو کہ وہ ہماری آرمی اور انٹیلی جنس والوں کے ہتھے نہ چڑھے تو اسے ابھی فون کرو۔ اسے میرے پاس آنے کو یولو۔ آگے تم سمجھا رہے۔“

وہ منہ پھیر کر باہر چلی گئی۔ ماں نے کہا۔ ”میرے پیٹ کی بیٹی، میرے آگے بھدک رہی ہے۔ ٹھوکر لگے گی تو نکل آئے گی۔“

مرینہ ہوش میں آگئی۔ اس نے فوراً ہی ادارے کے جاسوس کو طلب کیا اور کہا۔ ”ڈاکٹر ٹھنی سن کے کلینک میں جاؤ۔ معلوم کرو، وہاں جو یونا ہے وہ پرسوں کن افراد کے ساتھ دس بجے والی فلائٹ سے جائے گا، ہو سکے تو تینوں کے نام معلوم کرو۔“

جاسوس نے ایک گھنٹے کے بعد ہی فون پر کہا۔ ”ڈاکٹر ٹھنی سن اپنے بیٹے اور ایک باندے کے ساتھ جائے گا۔“
 مرینہ نے پوچھا۔ ”کیا تم نے اس کے بیٹے کو

اس سے کچھ قاصدے پر اس کی نگرانی کے لیے موجود تھے۔
ایسے وقت ورشا تیزی سے چلتی ہوئی آئی۔ اس کے ساتھ
دو انگلی جنس والے سادے لباس میں تھے۔ اس نے
عبداللہ کبڈی کے پاس آکر اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔
”مراد کہاں ہے؟“

کبڈی نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر کہا۔ ”میں
کسی مراد کو نہیں جانتا۔ اپنی ماں سے بات کرو۔“
ماں نے کہا۔ ”ورشا! یہ تم کن لوگوں کے ساتھ قماش
کرنے آئی ہو اور وہ مراد کون ہے، ہم نہیں جانتے۔ تم جانتی
ہو تو بتاؤ، کیا تمہیں کہیں نظر آ رہا ہے؟“

وہ بولی۔ ”میں دور سے دیکھتی آ رہی ہوں۔ وہ جوئے
چہرے کے ساتھ خود کو ایمان علی کہتا ہے، نظر نہیں آ رہا ہے۔“
وہ ڈاکٹر اور کبڈی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”وہ کہاں
ہے؟ وہ بھی تو اسی فلائٹ سے جا رہا ہے۔“

ماں نے کہا۔ ”وہ تو پہلے ہی پرسوں دوپہر کی
فلائٹ سے جا چکا ہے۔ آج تو صرف ڈاکٹر اور عبداللہ
کبڈی جا رہے ہیں۔“

اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ مرینہ برقع میں قریب ہی
کھڑی سن رہی تھی۔ اسے بھی شاک پہنچا۔ ورشا پریشان
ہو کر بولی۔ ”نہیں ماما جی! تم جھوٹ بول رہی ہو۔“

”تو پھر اسے ڈھونڈ نکالو۔ میری بچی! میں نے تمہیں
جہنم یا ہے تم نے مجھے پیدا نہیں کیا ہے۔ تمہیں آج کے
دھوکے میں رکھ کر اسے پرسوں ہی یہاں سے روانہ کر دیا
تھا۔“ وہ ہنستی ہوئی بولی۔ ”دیکھو میں نے کیسے کھیل ختم کیا
ہے اب کھیلو، کس سے کھیلو گی؟“

مرینہ سوچ رہی تھی، مراد واقعی دو دن پہلے جا چکا ہے
یا پھر کوئی چال چلی جا رہی ہے۔ وہ بوسے مراد کہلانے والے
کبڈی کو روک کر حقیقت معلوم کر سکتی تھی۔

اس مقصد کے لیے وہ کبڈی کی طرف بڑھی پھر لڑکھڑا
کر فرش پر گر پڑی۔ ڈاکٹر کا انجکشن اثر دکھا رہا تھا۔ وہ پھر
ہوٹا دھواں سے بیگانی ہو گئی تھی۔ اپنے آپ کو بھول گئی تھی۔
ڈاکٹر یعنی سن اور عبداللہ کبڈی سامان کی ٹرائی دیکھتے
ہوئے بورڈنگ کارڈ لینے اندر جا رہے تھے۔ ایک ہندوستانی
ماں پاکستانی بیٹے کو چھو منتر کر چکی تھی۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور
سنسنی خیز گردنیں ایام کی دلچسپ داستان
کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیے

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ فون بند کر دیا۔ ورشا
نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر اپنے فون کو دیکھا۔ وہ گھاس
نہیں ڈال رہا تھا۔ اس کی بلیک میٹنگ سے ہر اسام نہیں تھا
اور وہ آخری فیصلہ کر رہی تھی کہ اسے یہاں سے جانے نہیں
دے گی۔

مرینہ بھی آگروہ سے واپس آ کر تھک ہار کر بڑبڑا رہی
تھی۔ ”مجھ سے کہاں چہچہے گا؟ کل ان رپورٹ پر اسے میں ہی
نئے چہرے کے ساتھ پہچان سکوں گی۔ اسے جانے نہیں
دوں گی۔“

اس نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کے جاسوسوں کو یہ نہیں
بتایا تھا کہ مراد دوسری صبح انراٹھیا کی فلائٹ سے جا رہا
ہے۔ اس نے صرف بتایا تھا کہ وہ مراد کو نئے بہروپ
میں پہچان سکتی ہے اور اسے تلاش کرتی پھر رہی ہے۔

اب اس کا من مزاج بدل گیا تھا۔ وہ مرد ہی کیا جو
خواس پہ چھانہ جائے؟

وہ پھر سے دل کو جکڑ رہا تھا۔ مرینہ اپنے ڈائریکٹر
جنرل کو بھی فریب دے رہی تھی۔ مراد کے سر کا سودا کرنے کا
خیال ہوا ہو گیا تھا۔ ہوا کا رخ بدل گیا تھا۔ عجب جادو گری
تھی پھر اس کی مراد آئی اسے متاثر کر رہی تھی اور کیسے نہ کرتی؟
اس مرد نے پھر ایک بار اسے ہلاک نہیں کیا تھا۔ اسے نیم
پاگل بنا کر چھوڑ گیا تھا۔

جبکہ وہ قسم کھا کر آئی تھی کہ اسے زندہ
نہیں چھوڑے گی۔ اب دل پر ہاتھ رکھ کر سوچ رہی
تھی۔ ”اس زمین پر اور کوئی ایسا مرد نہیں ہے جو مجھے زیر
کر سکے۔ ایک وہی ہے جو مجھے بار بار موت کی دہلیز پر
پہنچا کر زندہ چھوڑتا رہتا ہے۔“

اب اس نے قسم کھائی کہ اس کے سر کا سودا نہیں
کرے گی۔ اسے انڈیا سے کہیں جانے بھی نہیں دے گی
اسے کسی طرح گھیر کر اپنے ہی پاس چھپا کر رکھے گی۔

دوسری صبح انیر پور شہر دوستوں اور دشمنوں کی بھیڑ لگ
گئی۔ ریڈ الٹ اور ڈیجس ریکٹ کے جاسوسوں کو بھی ہتک
مل گئی تھی کہ مراد انراٹھیا کی فلائٹ سے لہن جا رہا ہے۔

جتنی بانی اپنی دو بیٹیوں ٹیٹا اور ڈولی کے ساتھ نہیں
الوداع کہنے آئی تھی۔ ایک بیٹی ورشا نہیں تھی۔ وہ پچھلی رات
کو ہی گھر سے چلی گئی تھی۔ فون پر ماں سے کہہ دیا تھا کہ
اسے تلاش نہ کیا جائے وہ کل صبح انگلی جنس کے آدمیوں کے
ساتھ آئے گی۔

مرینہ وہاں برقع میں چھپی ہوئی تھی۔ دوسرا کارڈز

کے سوتے پھونٹے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں حیران رہ گیا۔
مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے تاثرات یکا یک بدل گئے، اب
ایسا نظر آتا تھا جیسے وہ سوتے سوتے اچانک بیدار ہو گیا ہو۔
”صوف کرنا، میں نے سنا نہیں تم کیا کہہ رہے تھے؟“
چارلی سے میری واقفیت جہاز پر ہی ہوئی تھی۔ وہ
میں کچھ اور خوش گفتار ہونے کے ساتھ ساتھ دوسرے کی
بات بھی پوری توجہ سے سنتا تھا۔ ایسے لوگ سماجی حلقوں میں
بے حد مقبول ہوتے ہیں اور بڑی آسانی سے دوسروں کو
دوست بنا لیتے ہیں۔ پیٹھے کے اعتبار سے وہ انجینئر تھا اور
اس کی ابتدائی زندگی بہت سخت گزری تھی۔ کبھی کبھی مجھے اس
پر اتنا رشک آتا کہ میں اس جیسا نظر آنے کی خواہش کرنے
لگتا۔ جہاز کے عملے کے علاوہ دوسرے تمام مسافر بھی اسے
پسند کرتے تھے۔

لندن سے جہاز روانہ ہوتے ہی ہم دوست بن
گئے تھے۔ ہماری شاہیں تاش کھیلنے میں گزرتی تھیں لیکن
جب سے نووارڈ نے اس کمرے میں قدم رکھا تھا، چارلی
پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ اطمینان اور سکون کی جگہ اضطراب
نے لے لی تھی، کھیل کے دوران وہ بار بار نووارڈ کی طرف
دیکھتا رہتا جس کا نام راسن تھا۔ کھیل کے علاوہ بھی چارلی
جہاز پر یہاں کہیں بھی ہوتا، اس کی نظریں راسن کے جسم
سے چپکی رہتی تھیں۔

جب نووارڈ تاش کھیلنے والے کمرے میں داخل ہوا تو
میں اور چارلی برج کھیل رہے تھے۔ ہم دونوں لندن سے
اس بحری جہاز پر سوار ہوئے تھے اور ہماری منزل آسٹریلیا
کی بندرگاہ سڈنی تھی۔ نووارڈ یوزی لینڈ کی بندرگاہ آکلینڈ
سے سوار ہوا تھا جہاں سے وہ پہرے کے وقت ہمارا جہاز روانہ
ہوا تھا۔ ہمیں لندن سے پہلے ہوئے ایک مہینا ہو گیا تھا اور
اب صرف پانچ دن کا سفر باقی تھا۔

نووارڈ کا لباس بے حد قیمتی اور رکھ رکھاؤ کا نشانہ تھا۔ وہ
قریباً اندام تھا، جہاں اس کے چہرے پر بھی چڑھی ہوئی تھی
جس کی وجہ سے اس کی چوٹی چھوٹی آنکھیں اندر کی جانب
دھنس گئی تھیں۔ گردن پر گوشت کی زیادتی نے اسے تقریباً
معدوم کر دیا تھا۔ وہ ٹھٹھا ہوا اس میز کی طرف بڑھا جہاں کئی
افراد شام ہی سے پوک کر گھس رہے تھے۔ ان میں ایک شخص
اس کا واقف کار تھا جس نے اٹھ کر نووارڈ سے پہلے مصافحہ
کیا اور پھر اپنے ساتھیوں سے اس کا تعارف کرانے لگا۔

میں نووارڈ کو فراموش کر کے دوبارہ کھیل کی طرف
متوجہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے چارلی کی طرف دیکھتے
ہوئے پوچھا کہ کپڑا وہ کچھ پتلا پسند کرے گا۔ وہ نووارڈ کو کنگی
باندھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا لیکن اس
مرتبہ بھی اس نے میری آواز نہیں سنی۔ چند لمحوں بعد جب
چارلی میری طرف پلٹا تو مجھے اس کی آنکھوں سے نظروں

کسی کی زندگی کے شب و روز میں ایسا کس دیکھنے والے شخص کی ذہانت کا ثبوت

کہتے ہیں کہ ہر اکا رخ دیکھ کر موسم کا اندازہ لگانے والے، بامعنی لفظوں
سے گفتگو کے معنی کو سمجھ لینے اور آنکھوں سے دلوں کے اندر جہان کھنڈنے
والے بہت ذہین اور تہ نشین ہوتے ہیں۔۔۔ اس کا شمار بھی انہی زہرک
انسانوں میں ہوتا تھا مگر اس مقام پر تمام ذہانت دھری کی دھری رہ
گئی۔

تہ نشین

شام جیل



Copied From Web

دکھایا ہے چوڑی کرسی پر جھکا بہت غور سے یہ شعبہ دیکھ رہا تھا۔
 ”میں نے یہ کرسی آخری پارسل ڈگن میں دیکھا
 تھا۔“ چارلی نے پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے بلند آواز
 میں کیا۔
 کمرے میں موجود تمام افراد پلٹ کر اس کی طرف
 دیکھنے لگے۔

کروڑ ہتی ڈینی سن نے کہا۔ ”تم دونوں ہمارے
 ساتھ شامل کیوں نہیں ہو جاتے، آج ہماری آخری رات
 ہے۔ ہمیں سفر کے اختتام کی خوشی میں جشن منانا چاہیے۔“
 ہم اس پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ڈینی سن نے اسٹیو وارڈ کو
 ہمیں برائڈی اور ویکسی کی بوتلیں لانے کا حکم دیا۔

”تو دوست تم بھی سٹ ڈگن میں جیتی پتھر نکالتے
 ہو؟“ میک نے پوچھا۔ وہ بھی کروڑ ہتی تھا۔
 ”اب تو نہیں لیکن بیس سال پہلے۔“

”وہ بڑا خطرناک علاقہ ہے، میں نے کچھ عرصے وہاں
 کان کنی کی ہے۔“ میک نے سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔
 ”وہ علاقہ ہر قسم کی آبادی سے سیکڑوں میل کے فاصلے پر ہے اور
 عظیم صحرا کے کنارے پر واقع ہے۔ گرمی تو... بہت
 شدید ہے اس علاقے میں کھدائی کرنے کے لیے انتہائی سخت
 جان ہونا لازم ہے، کیوں دوست، ٹھیک ہے نا؟“

چارلی نے اثبات میں سر ہلایا۔
 ”تم نے بھی دولت جمع کی؟“ ڈینی سن نے پوچھا۔
 ”ہاں اور نہیں۔“ چارلی نے آہستگی سے کہا اور
 راسن کی طرف لمبے بھر کے لیے دیکھا جو سر جھکائے تاش
 کے سچے پھینٹ رہا تھا۔ چارلی نے پائپ سلگایا اور ایک
 گہرا کس لے کر چاروں طرف دیکھا۔

”میں نے سٹ ڈگن کے علاقے میں تقریباً ایک
 سال تک قسمت آزمائی کی تھی۔“ چارلی نے کہانی بیان
 کرنے والے انداز میں کہا۔ ”میرے ساتھ دو شریک کار
 تھے ایک کا نام ہورگن تھا، وہ ان معاملات میں خاصا تجربہ
 کار تھا اور دوسرا ایک کم عمر نوجوان تھا، اس کا نام ڈان تھا۔ وہ
 بالکل نا تجربہ کار تھا لیکن سخت جان اور محنتی تھا۔ ہم تینوں
 نے مل کر ایک سال کے عرصے میں بہت بڑے علاقے کی
 کھدائی کر ڈالی تھی۔“

”وہاں زیادہ گہری زمین کھودنی نہیں پڑتی۔“ میک
 نے کہا ”صرف چھ فٹ۔“

”چھ فٹ؟ بس۔“ ڈینی سن نے حیرت بھرے لہجے
 میں کہا اور تصدیق طلب نظروں سے چارلی کی طرف دیکھا۔
 ”درست ہے۔“ چارلی نے جواب دیا۔ ”اس

راسن کو پوکر کھیلنا پسند تھا، وہ جس پارٹی کے ساتھ رہتا
 تھا، میں اس کے تمام افراد سے واقف تھا۔ وہ سب تاجر یا
 صنعت کار تھے ان کا تعلق کان کنی، دعوات کی خرید
 و فروخت، جہاز سازی اور ہی قسم کی صنعتوں سے تھا۔ وہ
 سب بہت دولت مند تھے لیکن ان میں دو افراد کروڑ ہتی
 تھے۔ ان میں سے کوئی بھی اپنی امارت کی نمائش اس طرح
 نہیں کرتا تھا جس کا راسن عادی تھا۔ وہ کھیل کے دوران
 ٹونوں کی گڈیاں اپنے سامنے رکھ کر کھیلتا تھا۔ اس کی انگلیوں
 میں کئی انگوٹھیاں تھیں اور ان سب میں بڑے بڑے ہیرے
 جڑے ہوئے تھے۔ سارے کھنے والا کس مگر مجھ کی کھال سے
 بنا ہوا تھا۔ سگار جلانے کا لائٹر پورا کا پورا سونے کا تھا اور سگار
 کاٹنے کا کٹڑ بھی ٹھوس سونے کا بنا ہوا تھا۔ کھیل کے دوران وہ
 بہت شور کرتا تھا۔ ہر پانچ منٹ بعد چیخ کر اسٹیو وارڈ کو آواز دیتا
 جو دوڑ دوڑ کر برائڈی اور ویکسی کی بوتلیں لاتا رہتا تھا۔ جیتنے
 کے دوران زور زور سے اپنی مہارت اور ذہانت کا ذکر کرتا
 اور ہارتے ہوئے بد قسمتی کو کوستا، راسن کی ان عادتوں کے
 پیش نظر کوئی بھی اسے پسند نہیں کر سکتا تھا لیکن مجھے یقین تھا
 چارلی کی ناپسندیدگی کا وجہ کچھ اور ہی تھی۔

جوں جوں ہمارا جہاز آسٹریلیا کے براعظم کے قریب
 ہوتا جا رہا تھا، سمندر کی گہرائی میں کمی واقع ہو رہی تھی۔
 لہروں کی سرکشی بڑھتی جا رہی تھی اور جہاز بھی ہچکولے لینے
 لگتا تھا۔ وہ آخری رات تھی، دوسرے روز دوپہر کے وقت
 جہاز سڈنی کی بندرگاہ پر ٹکر انداز ہونے والا تھا۔ طویل سفر
 کے بعد تمام مسافر زمین پر قدم رکھنے کے لیے بے قرار
 نظر آ رہے تھے۔ اس رات کوئی بھی تاش کھیلنے کے موڈ میں
 نظر نہیں آتا تھا۔ راسن جن لوگوں کے ساتھ پوکر کھیلتا تھا
 انہوں نے بھی کھیلنا ترک کر دیا تھا۔ اس وقت راسن سب
 کی نظروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس کی انگلیاں موٹی ضرور تھیں
 لیکن میں یہ اعتراض کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا
 کہ وہ تاش کے پتوں کا کوئی پیشہ ور ماہر نظر آ رہا تھا۔ اس
 نے وہ سارے کرسی دیکھائے جو شعبہ بے باز دکھاتے ہیں
 اور پھر ایک ایسا نکال دیکھا یا جو میں نے پہلے کبھی نہیں
 دیکھا تھا۔

راسن نے تاش کی گڈی میں سے پان کا نکال کر
 سب کو دکھایا اور پھر وہ پتا گڈی میں شامل کر کے انہیں پیشکش
 شروع کیا۔ اس نے چھ جگہ پتوں کو تقسیم کیا، تمام پتے اٹلے
 رکھے تھے، پھر اس نے چھ میں سے ایک ڈیسر پر انگلی رکھ دی۔
 ان پتوں کو دیکھا گیا تو ان میں پان کا اکا موجود تھا۔ کسی کی
 سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس نے یہ شعبہ کس طرح

نے بارے ہوئے پتھر واپس لینے کے چکر میں بلف کرنا شروع کر دیا اور واؤ پر لگے ہوئے پتھروں کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی۔ آخر کار میں نے اسے پتے دکھانے کو کہا اور اس طرح ہورگن آخری بازی بھی ہار گیا۔ اس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو گیا اور وہ بری طرح اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ میں نے واؤ پر لگے ہوئے پتھروں کو اپنی طرف سینٹے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا یا ہی تھا کہ ہورگن نے بڑی سرعت کے ساتھ چاقو نکال لیا۔ میری توجہ پتھروں کی طرف مرکوز تھی اس لیے میں وقت پر اس کی حرکت نہ دیکھ سکا۔ اس نے ہاتھ فضا میں بلند کیا اور پوری قوت سے میری پھلی کی پشت پر وار کیا۔ ہورگن میں بلا کی قوت تھی، چاقو پھلی سے آ رہا تھا ہوا لکڑی کی میز میں دھنس گیا۔

چارلی کا تنفس تیز ہو گیا تھا، اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے پھوٹ آئے تھے۔ اس نے اپنا سیدھا ہاتھ سب کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ اس کا ہاتھ بہت بڑا تھا جس پر گھنے سیاہ بال نظر آ رہے تھے۔ پھلی کی پشت پر ایک لمبے اور گہرے زخم کا نمایاں نشان نظر آ رہا تھا جو کلائی تک پھیلا ہوا تھا۔ زخم بھر چکا تھا لیکن اس جگہ دوبارہ بال نہیں آگے تھے۔ زخم کا نشان درمیانی جگہ پر ایک چوتھائی انچ چوڑا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ چاقو کا پھل چوڑا ہونے کے ساتھ دودھاری تھا۔ کمرے پر گہرا سکوت طاری ہو گیا تھا۔

”پھر تم نے کیا کیا؟“ کسی نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔
 ”چاقو میز کی سطح میں کافی گہرا دھنس گیا تھا اس لیے میں پتھر نہیں کر سکتا تھا۔“ چارلی نے جواب دیا۔ ”ہورگن نے چاقو کر کہا، دھوکے باز اذلیل، کہینے، پھر وہ جنگل درندے کی طرح اپھل کر نشست سے کھڑا ہو گیا اور میرے قریب آیا، اس نے جھک کر زمین پر کچھ ٹھولا اور جب وہ کھڑا ہوا تو اس کے ہاتھ میں دو تین معمولی سے پتے تھے۔ اس نے وہ پتے ڈان کے سامنے پھینک دیے اور چیخ چیخ کر اول قول کہنے لگا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں نے ایک اکا چھپایا ہوا تھا اور موقع دیکھ کر میں نے اپنے چھوٹے پتے نیچے پھینک دیے اور اکا اپنے پتوں میں شامل کر لیا۔ اس وقت درد کی شدت سے میرا ذہن مفلوج ہو چکا تھا، اس کے باوجود میں اس کا کھیل سمجھ گیا۔ میں نے کم عمر ڈان کو صحیح صورت حال بتانے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھ پر یقین نہیں کیا۔ چلو اپنا سامان اٹھاؤ، ہورگن نے مستقل انداز میں ڈان سے کہا۔ ہم ابھی اور اسی وقت یہاں سے جا رہے ہیں۔ میں ایسے شخص کے ساتھ ایک منٹ بھی رہنا پسند نہیں کرتا جو اپنے دوستوں کو دھوکا دے سکتا ہو۔ اس پر ڈان نے اعتراض کیا کہ وہ مجھے

علائے میں صرف چھوٹ کھائی کرنے پر آہنی پتھروں کی یہ نکل آتی ہے اور اس کے بعد اصل کام شروع ہوتا ہے۔ اس سے کو توڑ کر مزید کئی فٹ کھدائی کرنی پڑتی ہے۔ تھکے نیچے سرنگ بنا کر پشت کے بل لیٹ کر ایک ایک انچ کھسکا پڑتا ہے اور موسم جی کی روشنی میں آہنی پتھروں کی تھکے میں چپکے ہوئے قیمتی پتھر اوپل نکالنے پڑتے ہیں۔ اس میں بھی بڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی سے اوپل میں بال آجاتا ہے جس کے بعد اس کی قیمت ایک چوتھائی بھی نہیں رہتی۔ یہ بڑا ہی صبر آزما اور اعصاب شکن کام ہوتا ہے لیکن ہم نے ہمت نہیں ہاری اور مسلسل ایک سال تک اوپل نکالتے رہے۔ اس طرح ہم نے بارہ سو اونس پتھر جمع کر لیا۔ اس وقت تو آپ کہہ یہ مقدار کچھ زیادہ نظر نہیں آئے گی لیکن بیس سال قبل بھی اول درجے کا اوپل اتنی ڈالر فی اونس کے حساب سے فروخت ہوتا تھا، اب اس کی قیمت ہزار ڈالر کے لگ بھگ بنتی ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کا حصہ پچیس ہزار ڈالر سے اوپر ہوتا تھا اور بیس سال قبل یہ رقم بہت بڑی شمار ہوتی تھی۔“

میں نے اس سے پہلے چارلی کو کبھی اس طرح بے نشان بولتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی خاص مقصد کے تحت اپنی کہانی بیان کر رہا ہے۔ میں نے رائسن کی طرف دیکھا، وہ بالکل پرسکون نظر آ رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پر رلی پر جمی ہوئی تھیں۔

”میں زندگی بھر وہ آخری شب نہیں بھول سکتا جو میں نے سمٹ ڈگن میں... گزاری تھی۔“ چارلی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم تینوں میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بغیر ناگوں کی میزگی یا یوں کہہ لیں کہ میز کا صرف اوپری حصہ تھا جو لکڑی کے تختے جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ اس علاقے میں ہم سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے قسمت آزمائی کی تھی اور چلتے وقت وہ لوگ انتہائی ضروری اشیاء کے علاوہ سب کچھ وہاں چھوڑ جاتے تھے۔ ہم میز کے گرد موسم تپوں کے خالی ڈبوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے پتھروں کا وزن کر کے انہیں برابر کے حصوں میں تقسیم کر لیا تھا اور ہمارے حصے ہمارے سامنے رکھے تھے۔ موسم تپوں کی روشنی میں ان پتھروں سے تاریخی شعلوں کی لپٹیں اٹھتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ وہ ایسا منظر تھا جو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ہم نے سونے سے پہلے کچھ دیر پوکر کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ ایک گھنٹے کے کھیل کے دوران میں برابر جیتتا رہا۔ کم عمر ڈان بہت کم پتھر ہار لیا لیکن ہورگن خاصی بڑی تعداد میں پتھر ہار چکا تھا۔ کچھ لوگ کھیل میں ہارنا برداشت نہیں کر سکتے۔ اس

میں نقابت محسوس کر رہا تھا میرا ہاتھ جو تمام دن درد کی آگ میں جلتا رہا تھا، شام کے وقت سن ہو گیا تھا جس کی وجہ سے تکلیف کے احساس میں کمی واقع ہو گئی تھی۔ میں نے پہلی بار جھک کر غور سے اپنے ہاتھ کا جائزہ لیا۔ چاقو کا دستہ میری ہتھیلی کی پشت تک دھنسا ہوا تھا اور جب مجھ پر انکشاف ہوا کہ میرے ہاتھ کی ہڈیاں چاقو کے پھل سے محفوظ تھیں شاید ایک آدھ رگ کٹ گئی تھی، جس کی وجہ سے اس قدر خون بہا تھا۔ وہاں ایسے اوزار موجود نہیں تھے جن کی مدد سے چاقو میز کی سطح سے باہر نکال لیا جاتا۔ میرا خیمہ شاہراہ سے تین میل اندر تھا لیکن قریب ترین بس سٹاپ سے زیادہ فاصلے پر تھی۔ اگر میں اسی طرح خیمے میں بیٹھا رہتا تو چند روز میں میری موت واقع ہو جاتی۔ اگر میں کسی نہ کسی طرح تین میل دور شاہراہ پر پہنچ جاتا تو میرے زندہ بچنے کے کافی امکانات تھے۔ وہ شاہراہ مجھ جیسے قسمت آزما اور سرکاری ملازمین ہی استعمال کرتے تھے۔ گو اس سڑک پر آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی لیکن میں اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ اگر میں شاہراہ پر پہنچ جاؤں تو ممکن ہے اس سڑک پر سفر کرنے والا میرے مرنے سے پہلے اس طرف نکل آئے اور مجھے طبی امداد مل جائے۔“

چارلی نے خاموش ہو کر پانسپ سلگایا اور دوبارہ کہانی شروع کرنے سے پہلے کئی کس لیے۔ ”عام طور پر کوئی بھی تین میل کا فاصلہ ایک گھنٹے میں پیدل طے کر سکتا ہے لیکن مجھے وقتاً فاصلہ طے کرنے میں دو دن لگ گئے کیونکہ میز کا اوپری حصہ بہت وزنی تھا اور خون نکلنے کی وجہ سے میں بہت کمزور ہو گیا تھا۔ میں نے میز کو سر پر اٹھا رکھا تھا اور میرا ہاتھ بدستور اس کی سطح سے جڑا ہوا تھا۔ دو روز بعد جب میں نڈھال ہو کر زمین پر گر گیا اور مجھے احساس ہو گیا کہ اب میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا تو بے اختیار میرے منہ سے قہقہے بلند ہونے لگے کیونکہ میں سڑک کے کنارے پہنچ گیا تھا جس کا احساس مجھے زمین پر گرنے کے بعد ہوا۔ تکلیف کی ایک شدید لہر میرے اندر سے بلند ہوئی اور میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو سفید قام ہاشموں کے درمیان پایا، ان کے ساتھ بڑا عظیم آسٹریلیا کا ایک مقامی ہاشموں بھی تھا۔ وہ میری طرح قسمت آزما تھے۔ میں نے انہیں اپنی کہانی سنائی تو وہ فوراً ہورگن اور ڈان کا تعاقب کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ان کے پاس گھوڑے تھے جو تیز رفتاری سے سفر کر سکتے تھے لیکن ہمارے درمیان ڈھائی دن کا وقفہ حائل تھا۔ مجھے احساس تھا

اس حالت میں کس طرح چھوڑ کر جاسکتے ہیں۔ اس پر ہورگن نے ڈان کا کندھا پکڑ کے چھوڑا۔ جنگ میں جنگل کا قانون ہی چلتا ہے ڈان۔ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ جو دوستوں کو دھوکا دے اسے جبر تباہی سزا ملنی چاہیے۔ ہم اسے ہمیں چھوڑ جائیں گے اور اس کا حصہ بھی آپس میں بانٹ لیں گے۔ یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ ہم اسے زندہ چھوڑ رہے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے ہورگن نے ڈان کو خیمے سے باہر نکال دیا۔“

چارلی خاموش ہو گیا اور اکٹری ہوئی سانپوں کو احتیاط پر لانے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے سلسلہ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”جس وقت ان کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی، میں اٹنے ہاتھ سے چاقو میز کی سطح سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ ہر کوشش پر درد کی ایک لہر میرے وجود کو آگ کے شعلوں میں دھکیل دیتی تھی اور تازہ لہو زیادہ تیزی کے ساتھ اٹنے لگتا تھا۔ ڈان کو خیمے سے نکال کر ہورگن نے زمین پر پڑا ہوا ہتھوڑا اٹھایا۔ جیسے ہی میری نظر ہتھوڑے پر پڑی، میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ بے اختیار میرے حلق سے ایک بھیا تک چخ نکلی لیکن ہورگن کو وہ چخ نہیں روک سکی۔ اس نے چاقو کے دستے پر ہتھوڑا مارا کہ چاقو کو میز کی سطح میں خوب اچھی طرح گھسا دیا۔ جس طرح لکڑی میں کیل ٹھونکی جاتی ہے فرق یہ تھا کہ اس نے کیل کا کام اس دودھاری چاقو سے لیا تھا۔ درد کی شدت جب ناقابل برداشت ہو گئی تو میں بے ہوش ہو گیا اور جب مجھے ہوش آیا تو وہ دونوں مجھے اس ویرانے میں تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔“

چارلی نے ہاتھ بڑھا کر اپنا گلاس اٹھایا اور پی گئی شراب جلدی سے حلق میں اٹھ لی۔ کروڑہتی میک کا چہرہ خوف سے سپید پڑ گیا تھا۔ ”میں ہورگن کو انسان تسلیم نہیں کر سکتا۔“ اس نے جڑے سے بھینچتے ہوئے کہا۔

ہماری نظریں چارلی پر جمی ہوئی تھیں اور ہم بے تابی سے اس کی کہانی کا بقیہ حصہ سننے کے منتظر تھے۔

”شاید آپ میں سے کسی کو بھی ایسی صورت حال کا سامنا کرنا نہیں پڑا ہوگا۔ مجھ پر اس کا ناقابل فہم ردعمل ہوا۔ مجھ پر نیم غنودگی کی کیفیت طاری ہو گئی اور دوسرے دن میں تمام وقت اوجھتا رہا۔ میرے حواس مفلوج ہو گئے تھے اور ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ شام کو ٹھنڈی ہوا کے جھوکوں نے مجھے اس کیفیت سے بیدار کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں غیر شعوری طور پر تمام دن خود کو ایک آخری کوشش کے لیے تیار کرتا رہا تھا۔ بے تحاشا خون بہہ جانے کی وجہ سے

میں کامیاب ہو گئے جہاں ایک اسپتال بھی تھا۔ ڈان مہیوں اسپتال میں زیر علاج رہا لیکن صحت یاب ہو گیا۔“
جب تک چارلی اپنی کہانی سنا رہا تھا میں کچھ نہ کہہ ہونے کا اقرار کرتا رہا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے لیکن مجھے یقین تھا کہ کچھ ضرور ہوگا لیکن اگر یہی کہانی کا اختتام تھا تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کہانی کے بیان کرنے کا کیا مقصد تھا۔ میں نے راسن کی طرف دیکھا، وہ مسکوزدہ انداز میں چارلی کو نظرس جمائے دیکھ رہا تھا۔

”تم ہورگن کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے؟“
کر وڈ ہٹی میک نے دریافت کیا۔

”نہیں۔ اسے فرار ہونے کے لیے بہت وقت مل گیا تھا۔ میرا انجیل ہے کہ وہ آسٹریلیا سے فرار ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کسی نے بھی ہورگن کو نہیں دیکھا۔“

کس نے گہرا سانس لیا۔ ”اور ڈان کا کیا ہوا؟“

”صحت یابی کے بعد وہ کافی عرصے بے کار رہا۔ وہ کام کرنے کے قابل نہیں تھا۔ آج کل وہ خوب صحت مند ہے، لندن میں رہتا ہے۔ ایک خوبصورت بیوی کا شوہر اور تین پیارے بچوں کا باپ ہے۔۔۔۔۔“ اس واقعے کے بعد ہم دونوں جنگل کے قانون کے قائل ہو گئے ہیں۔ کیونکہ جنگل کا قانون انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ آپ لوگوں کو یہ سن کر شاید مسرت ہوگی کہ کل جب ہمارا جہاز سنڈنی کی بندرگاہ پر ٹکرا انداز ہوگا تو ڈان وہاں میرے استقبال کے لیے موجود ہوگا۔ آپ لوگ اسے دیکھ کر یقین نہیں کریں گے کہ یہ وہی شخص ہے جسے ہم غلطی سے زندہ دفن کرنے جا رہے تھے۔“

اس سے پہلے کہ کوئی شخص اپنے خیال کا اظہار کرتا، راسن چانک نشست سے کھڑا ہو گیا۔ ٹھیک اسی وقت جہاز تیزی سے ایک طرف جھکا۔ ہم لوگوں نے جلدی سے اپنے اپنے گلاس پکڑ لیے۔ راسن نے میز کا کنارہ پکڑ کے خود کو گرنے سے بچایا۔ اس کا سرخ و سفید چہرہ نیلا پڑا ہوا تھا۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں اپنے کیمین میں جا رہا ہوں۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

ایک اسٹیوارٹس سے سہارا دے کر لے جانے لگا، ہم خاموشی سے اسے جاتا ہوا دیکھتے رہے۔

پھر چارلی نشست پر کھڑا ہو گیا۔ ”بہت دیر ہو گئی ہے، میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے بلند آواز میں اعلان کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ چارلی کے رخصت ہونے پر ہر شخص اپنے کیمین کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہر شخص کسی

کہ ہم ہورگن کو نہیں پکڑ سکیں گے، اس کے ساتھ مجھے ڈان کی بھی فکر تھی۔ مقامی باشندے ماہر کھوجی ہوتے ہیں، ہم اس کی رہنمائی میں سفر کر رہے تھے۔ ایک جگہ وہ رک گیا۔ سڑک سے ہٹ کر چٹانوں کا سلسلہ تھا اور وہاں ایک تنگ درے میں ہورگن اور ڈان نے ایک رات کے لیے قیام کیا تھا۔ ہمیں درے میں ڈان کی لاش پڑی ہوئی نظر آئی۔“

چارلی خاموش ہو گیا۔ اس کی جذباتی کیفیت ایسی تھی کہ وہ اپنی کہانی جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس واقعے سے قائدہ اٹھا کر ہم لوگ بھی مشروبات اور تمباکو نوشی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سب خاموش تھے ہمارے ذہن اس ہولناک کہانی کے تانے بانے میں الجھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد چارلی نے ایک بار پھر لب کشائی کیا۔

”ڈان کی لاش دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ ضرور چٹان پر چڑھا ہوگا اور پیراگلے کی وجہ سے وہ سر کے تل نیچے درے میں گر گیا۔ اس کا سر بری طرح پکلا ہوا تھا جس سے اس کی موت واضح ہوئی تھی لیکن مجھے ایک لمحے کے لیے ڈان کی حادثاتی موت پر یقین نہیں آیا۔ ہورگن نے سونے کی حالت میں ڈان پر بہت بڑا پتھر پھینک کر اس کا سر پھل دیا تھا۔ ہم نے وہ پتھر تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ اس طرح ہورگن اوہل کی ساری مقدار کا مالک بن گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ میں صحرا میں زندہ نہیں بچوں گا اور ڈان کو اس نے قتل کر دیا تھا۔ ہم نے ڈان کو دفن کرنے کے لیے قبر کھودی اور جس وقت ہم اسے قبر میں لٹا رہے تھے، اس کے حلق سے کراہنے کی دہمکی سی آواز نکلی۔ اس آواز سے ہم خوفزدہ ہو گئے۔ اور دو افراد ڈان کی لاش چھوڑ کر بھاگ لیے لیکن بقیہ دو افراد مضبوط دل کے آدمی تھے، انہوں نے آہستگی سے ڈان کو زمین پر لٹا دیا۔ پھر کسی نے دل کے مقام پر کان لگا کر دھوکہ سننے کی کوشش کی تو ڈان زندہ تھا لیکن اس کا دل بہت آہستہ آہستہ دھوکہ رہا تھا۔ اگر اس وقت ڈان کے حلق سے کراہنے کی آواز نہیں نکلتی تو ہم اسے مردہ تصور کرتے ہوئے زندہ ہی دفن کر دیتے۔“

”ہم نے اسی جگہ خیمے لگا دیے اور ہر ممکن ڈان کی ہمدرداری میں لگ گئے۔ جب اس کی حالت سفر کے قابل ہو گئی تو ہم نے ہورگن کا تعاقب کرنے کا خیال ملتوی کر دیا اور قریب ترین آبادی کی جانب چل دیے لیکن اس مرتبہ ہمارا سفر سست رفتاری سے طے ہو رہا تھا کیونکہ ڈان کی حالت گھوڑوں کی تیز رفتاری کی تحمل نہیں ہو سکتی تھی خوش قسمتی سے ہم اسے زندہ حالت میں آبادی تک لے جانے

گہرے خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔

اس رات میں دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ پتا نہیں کب آنکھ لگ گئی۔ رات کے کسی حصے میں اچانک میں بستر سے اٹھ گیا۔ میں نے کیمین کی روشنی جلائی، اس وقت صبح کے پانچ بجے تھے۔ مجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کس وجہ سے میری آنکھ کھلی ہے، تب اچانک مجھے احساس ہوا کہ جہاز کا انجن بالکل خاموش ہے۔

میں نے جلدی سے لباس تبدیل کیا اور عرشے پر نکل آیا۔ باہر بہت سردی تھی اور سمندر پر کبر چھائی ہوئی تھی۔ آسمان پر سپیدہ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ کچھ لوگ عرشے پر ریٹک پکڑے جھک کر سمندر میں کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پتا کرنے پر معلوم ہوا کہ راسن عرشے پر ٹھٹھا رہا تھا اور کچھ دیر قبل اس نے اچانک سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ جہاز کو واپس موڑا گیا، اس وقت صبح سورج نکل آیا تھا۔ کئی کشتیاں پانی میں اتاری گئیں لیکن گھنٹوں کی تلاش کے باوجود راسن کا کونسا پتا نہیں چلا۔

مجھے یقین تھا کہ راسن ہی چارلی کی کہانی والا ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود مجھے اس کی موت پر افسوس ہوا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ عرشے پر چارلی کے علاوہ ہمارے مسافر موجود ہیں، میں نے اسے تھمتے کے وقت بھی نہیں دیکھا۔ دوپہر کو وہ تاش کھینچنے والے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ہشاش بشاش اور سرد نظر آ رہا تھا۔ بہ ظاہر وہ خوب گہری نیند سوچا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب قسم کے تاثرات تھے جنہیں لفظوں میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ کچھ ایسے تاثرات جو کوئی بہت بڑا اور مشکل کام کامیابی کے ساتھ انجام دینے پر کسی کے چہرے پر نظر آتے ہیں۔

اس کی آمد سے قبل ہم لوگ راسن کی خودکشی پر قیاس آرائی کر رہے تھے، اسے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ چارلی نے سب کے لیے شردبات کا آرڈر دیا اور تاش کی گڑھی نکال کر..... کھیل کے پتے جمانے لگا۔ اس کی بے نیازی دیکھ کر کروڑپتی میک سے برداشت نہیں ہو سکا۔ ”سنو چارلی۔“ اس نے میز پر آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ”کل رات جو تم نے کہانی سنائی تھی..... اس میں جو شخص ہو رہا تھا..... وہ راسن ہی تھا نا؟“

چارلی نے ایک پتا پلٹا اور اسے صبح جگہ پر لگانے لگا پھر اس نے آہستگی سے سر اٹھا کر میک کو دیکھا۔ اس نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا، بس اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”دیکھا میں نے کہا تھا۔“ میک نے فاتحانہ انداز میں

دوسروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ڈینی سن نے چارلی کی طرف دیکھا: ”اگر تمہیں یہ معلوم ہوتا کہ تمہاری کہانی سننے کے بعد راسن خودکشی کر لے گا تو تم یقیناً اپنی کہانی نہیں سناتے، ٹھیک ہے نا؟“

”میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس رد عمل کا یقین تھا۔“ چارلی نے ڈینی سن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہونے کے لیے نکل رہی تھی، یا شاید میری نظریں دھوکا کھا گئی تھیں۔ ”لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس کے خودکشی کرنے کی توقع تھی۔“

کمرے پر اچانک اعصاب شکن خاموشی چھا گئی۔ ”مجھ میں نہیں آتا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟“ میک نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ ”تم نے بیس سال بعد بھی راسن کو پہچان لیا تھا۔ شاید وہ بھی تمہیں پہچان گیا تھا لیکن اس توقع پر خاموش رہا کہ تم اسے شناخت نہیں کر سکو گے۔ تم گزشتہ شب اگر اپنی کہانی نہیں سناتے تو اس وقت راسن زندہ ہوتا۔ بندرگاہ پر اترتے ہی تم اسے پولیس کے حوالے کر سکتے تھے، اس طرح تمہیں اور تمہارے دوست ڈان کو وہ حصہ بھی مل جاتا جسے ہو رہا نے بیس سال قبل تم سے چھینا تھا اس کے علاوہ عدالت تم دونوں کو جرمانہ بھی دلواتی اور اسے کم از کم دس سال کی سزا بھی ہو جاتی جس سے تمہارا انتقام بھی پورا ہو جاتا۔ اس کا زندہ رہنا ہر لحاظ سے بہتر تھا۔“

میک نے میرے خیالات کی ترجمانی کی تھی، شاید ہر شخص یہی سوچ رہا تھا۔ چارلی اس دوران بڑی توجہ سے تاش کے پتوں سے کھیلتا رہا۔ ہم خاموشی سے اس کے جواب کا انتظار کر رہے تھے۔ آخر کار چارلی نے سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ ”عدالت تک یہ معاملہ لے جانے کے لیے گواہ کی ضرورت تھی۔ کسی گواہ کے بغیر میں اپنی کہانی سچ ثابت نہیں کر سکتا تھا۔“

میں اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ چارلی کی کہانی سچ ثابت کرنے کے لیے سب سے بڑا معنی شاہد اس کا دوست ڈان تھا اور وہ افراد تھے جنہوں نے اسے اور ڈان کو بچایا تھا۔

”بات یہ ہے۔“ چارلی نے نرم لہجے میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”کہ ڈان زندہ نہیں بچ سکا تھا۔ جب ہم اس درے تک پہنچے تو وہ مر چکا تھا۔“

شاید وہ کسی مشرقی علاج کے کالج کے فارغ التحصیل بھی تھے۔
میں نے اکثر وہاں مریضوں کو بھی دیکھا تھا۔ یعنی حکیم
صاحب کے ہاتھ میں شفا تھی۔ اس لیے مریضوں کا آنا جانا
لگا رہتا تھا۔

اس دن شاید میری قسمت مجھے حکیم صاحب کی طرف
لے گئی تھی۔ خوش گوار قسم کے حادثات اسی انداز سے ہوا
کرتے ہیں جب اچانک ہی کوئی نعمت آپ کے ہاتھ لگ

حکیم صاحب کی لڑکی بہت خوبصورت تھی۔
میں صرف ایک بار ہی اپنے بخار کا علاج کروانے
حکیم صاحب کے مطب کی طرف گیا۔ حالانکہ میں جب بھی
بیمار پڑتا کسی ایلو پیتھ ہی کے یہاں جایا کرتا تھا لیکن اس دن
نہ جانے کیوں حکیم شمشاد کے مطب میں ٹھس گیا۔

میں یہ مطب ایک عرصے سے دیکھتا آ رہا تھا۔ میرا راستہ
بھی یہی تھا اسی لیے حکیم صاحب کے بورڈ پر نظر پڑ جاتی تھی۔

قطعہ کہانی

منظر امام

کبھی کبھی لفظوں کے الٹ پھیر سے جملہ ایک الٹ ہی معنی پہن لیتا ہے
جیسا کہ یہاں... گھر کسی اور کاء دستک کسی اور کی... بڑا گمبھیر
مسئلہ درپیش تھا جبکہ مکین کے دل میں ایک الگ جہان آباد تھا... ایسے
میں ملاپ بھلا کس طرح ممکن تھا۔

آنکھوں کے رستے دل میں گھر کرنے والوں کی گمشدگی کا ماجرا



Copied From Web

جائے اچانک ہی کوئی محتول جائے اور قحط وہاں موجود تھا۔ ایک بہت نازک اور خوبصورت سی لڑکی جو مریضوں کو دوا بنانا کر دے جا رہی تھی۔ وہ یقیناً کپاؤ نڈر قسم ہی کی تھی۔ اس نے میرا نام پوچھا۔ رجسٹر میں درج کیا اور ایک نوکن میری طرف بڑھا دیا یعنی حکیم صاحب کا کام ٹھیک ٹھاک ہی چل رہا تھا۔ میں بھی قطار کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں مریضوں کے درمیان بیٹھا تو تھا لیکن میری نگاہیں اس لڑکی کا طواف کر رہی تھیں۔ بلا کی جاؤ بیت تھی اس میں۔ وہاں بیٹھے بیٹھے مجھے اس کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ اس کا نام جمیلہ تھا۔ حکیم صاحب بار بار اسے آوازیں دیتے تھے۔

”جمیلہ، ادھر آنا۔ جمیلہ کلاں کو بھیج دو۔ جمیلہ پھاٹھا کر لے آؤ۔“ کچھ دیر انتظار کے بعد میری باری بھی آگئی۔ جمیلہ نے میرا نام پکار کر مجھے اندر بھیج دیا۔ حکیم صاحب کا کمر مختلف قسم کی دواؤں کی بویا خوشبو سے رچا ہوا تھا۔

”تشریف لے گئیں۔“ حکیم صاحب نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

”جی فرمائیں، کیا تکلیف ہے آپ کو؟“
”حکیم صاحب، تکلیف تو یہاں آنے کے بعد ہوئی ہے۔“ میں نے دیر سے سے کہا۔

”کیا مطلب؟“ حکیم صاحب نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”جناب، گھر سے چلا تو صرف بخار تھا۔ یہاں بیٹھنے کے بعد سینے میں جلن بھی شروع ہوگئی ہے۔“

”اوہ۔“ حکیم صاحب نے میری بغض دیکھتی شروع کر دی۔ ”میاں، کچھ تیزابیت معلوم ہوتی ہے اور معدے میں گڑبڑ ہے۔“

”ہو سکتا ہے جناب۔“

”ہو نہیں سکتا بلکہ ہے۔ اب تم ایسا کرو کہ اپنے قارورے کی جانچ کروا کے لے آؤ۔ اس کے بعد تمہارا عمل علاج شروع کروں گا۔“ اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ قارورہ کسے کہتے ہیں۔ اس لیے میں حکیم صاحب کے کمرے سے نکل کر اس لڑکی جمیلہ کے پاس آ گیا۔

”لائیں اپنا نسخہ دیں۔“ اس نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

”حکیم صاحب نے نسخہ تو دیا ہی نہیں۔“ میں نے بتایا۔ ”کہہ رہے تھے کہ قارورہ جانچ کروا کے آؤ۔ اب میں نہیں جانتا کہ یہ قارورہ کیا ہوتا ہے؟“

”کیا آپ قارورہ نہیں جانتے؟“ وہ زیر لب مسکرا

رہی تھی۔
”بالکل نہیں، اتنی مشکل چیز میرے پاس نہیں ہوتی۔“ میں نے کہا۔

”یورین کو کہتے ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے بتایا اور دوسری طرف متوجہ ہوگئی۔

مجھے اس وقت سخت سخت ہوئی تھی۔ میں جلدی سے مطلب سے باہر نکل آیا۔ میں ان چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا لیکن اب تو قارورہ جانچ کروانا ضروری تھا۔ ورنہ اس لڑکی سے دوپارہ ملاقات کیسے ہوتی۔

میں نے الٹا سیدھا کر کے قارورہ کی جانچ کر دانی اور رپورٹ لے کر حکیم صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ یہ اتفاق تھا کہ اس وقت حکیم صاحب بھی نہیں آئے تھے اور کوئی مریض بھی نہیں تھا جبکہ وہ لڑکی بہت محنت سے دواؤں کو سجا کر رکھ رہی تھی۔ مجھے پہچان کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

اس وقت اسے اتنی محنت کرتے دیکھ کر میرے ذہن میں ایک خیال آ گیا۔ پچھلے دنوں میرے دفتر میں ایک لڑکی کی جگہ خالی ہوئی تھی۔ خواہ بھی محتول ہی تھی جبکہ حکیم صاحب اس بے چاری کو کیا دیتے ہوں گے۔

”سنیں۔“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”آپ سے ایک بات کہنی ہے۔ اگر آپ برانہ مانیں؟“
”جی فرمائیں۔“

”آپ کو یہاں سے کتنے پیسے ملتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔
”کیوں؟“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”آپ کو اس سے کیا مطلب؟“
”آپ بتائیں تو کسی پھر میں آپ کو بتاؤں گا۔“
”پندرہ سو روپے ملتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”اوہ..... صرف پندرہ سو۔ یہ تو آپ کے ساتھ بہت زیادتی ہے۔ ویسے اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو پانچ ہزار روپے دلواسکتا ہوں۔“

”وہ کس طرح؟“ وہ اب پوری طرح میری طرف متوجہ ہوگئی تھی۔

”میرے دفتر میں ایک جگہ خالی ہے۔“ میں نے بتایا۔
”میں اگر چاہوں تو ایک دن میں تمہیں وہ جاہل مل سکتی ہے۔“
”آپ کا بہت بہت شکر ہے لیکن میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ میں حکیم صاحب کو چھوڑ نہیں سکتی۔“

”کیوں؟ ایسی بھی کیا مجبوری ہے؟“
”مجبوری یہ ہے کہ حکیم صاحب میرے ابو ہیں اور میں ان کی بیٹی ہوں۔“ اس نے بتایا وہ شرارت بھرے

انداز میں مسکرا رہی تھی۔

میں ایک بار پھر اس کے سامنے شرمندہ ہو گیا۔ اس بار یہ شرمندگی اچھی خاصی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اور شرمندہ ہوتا حکیم صاحب یعنی اس کے ابو تشریف لے آئے اور میں ان کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔

میں نے اپنی رپورٹ ان کے سامنے رکھ دی۔ رپورٹ دیکھ کر انہوں نے ایک نسخہ لکھا اور میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ”دوا میں بھی بنوا لیں اور میری ٹیس بھی دے دیتے گا۔“

میں نے باہر آ کر نسخہ لڑکی کے حوالے کر دیا۔ جب وہ نسخہ بنانے میں مصروف تھی تو میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”آپ کو میری بات بری لگی ہو، معاف کر دیجیے گا۔“

”نہیں تو۔ اس میں برا ماننے والی کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”بہت سے لوگ لڑکیوں کو دیکھ کر اسی قسم کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔“

”اب زیادہ شرمندہ نہ کریں۔“

اس نے دوائی تیار کر کے میرے سامنے رکھ دی۔ ”دیکھیں عالم بے خودی میں پیسے ادا کرنا مست بھول جائیے گا۔“

اوہ..... میں تو جیسے قربان ہی ہو کر رہ گیا۔ کیا بات تھی اس لڑکی میں، کیا زبان تھی اور کیا شائستگی تھی۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے دو سو روپے اس کے حوالے کیے اور مطلب سے باہر آ گیا۔ اس دوران میں دوسرے مریض بھی آ چکے تھے۔ اس لیے رکنا مناسب نہیں تھا۔

میں نے حکیم صاحب کی دوائی استعمال بھی نہیں کی۔ عام سا نزلہ بخار تھا۔ اس لیے ٹھیک بھی ہو گیا تھا لیکن ایک ہفتے کے بعد پھر حکیم صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ اس دن اگرچہ مطلب میں اور مریض بھی تھے اس کے باوجود اس لڑکی کو مجھ سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔

”میرا خیال ہے کہ اب آپ ابو کے مستقل مریض ہو گئے ہیں۔“

”وہ کیسے؟“

”آپ کا دوبارہ آنا ہی ظاہر کرتا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ورنہ مجھے یقین ہے کہ آپ کو کوئی مرض نہیں ہے اور اب آپ بالکل ٹھیک ہیں۔“

”پھر تو آپ مجھے اپنے ابو کا نہیں بلکہ اپنا مریض سمجھیں۔“ وہ زبردست مسکرا دی۔ یعنی اس نے میری بات کا برا نہیں مانا تھا۔ بہر حال وہاں اس سے زیادہ بات نہیں ہو سکتی تھی پھر میرا نمبر بھی پکار لیا گیا تھا۔ اس لیے میں حکیم

کرشمہ

قرآن پاک کو آواز سے پڑھنے سے Thyroid Problem اور سانس کی بیماری نہیں ہوتی۔

قرآن پاک کو سننے سے Cancer نہیں ہوتا بلکہ Cancer کے جراثیم ہوں بھی تو وہ بھی مر جاتے ہیں۔ سبحان اللہ۔

والد کی عظمت

ماں کی خدمت سے جنت تول جاتی ہے مگر جنت کا دروازہ اس وقت کھلتا ہے جب باپ کی عزت کی جائے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

خوب صورت ہدایات

رات کے وقت جب کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دے تو اللہ پاک کی پناہ مانگو کیونکہ وہ ایسی مخلوق دیکھتے ہیں جو ہم نہیں دیکھ سکتے۔ جب رات کو ضروری کام نہ ہو تو باہر کم ہی نکلا کرو کیونکہ رات کے وقت اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا ہے پھیلا دیتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر دروازے بند کیا کریں کیونکہ شیطان وہ دروازہ نہیں کھول سکتا جسے بسم اللہ..... پڑھ کر بند کیا جائے۔

پانی کا برتن ڈھانپ کے رکھا کریں، خاص طور پر رات کے وقت کیونکہ رات کے وقت وہاں آسمان سے اترتی ہیں۔

اچھی اور پرسکون نیند کے لیے درود پاک پڑھ کر سویا کریں۔

مرسلہ۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور

پیاری بات

ایک آدمی نے ایک مرتبہ حضرت علیؑ سے پوچھا۔ ”جب ہماری قسمت پہلے سے لکھی ہوئی ہے تو ہمیں دعا مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟“ تو آپؑ نے جواب دیا۔

”ہو سکتا ہے میری قسمت میں یہی لکھا ہو کہ جب تو مانگے تو تجھے ملے گا۔“

مرسلہ۔ عبدالجبار روٹی، انارک، چوہنگ لاہور

حکیم صاحب کے پاس جانے کے لیے ان سے بہتر اور کون ہو سکتا تھا۔ میں ان کے گھر پہنچ گیا۔
 ”تایا ابو، آپ سے ایک بہت ضروری کام ہے۔“
 میں نے کہا۔

”بتاؤ بیٹے، کیا کام ہے؟“
 ”تایا ابو، آپ کو رشتے کی بات کے لیے جانا ہے۔“
 میں نے انہیں تمام باتوں سے تفصیلاً آگاہ کیا۔
 ”ادھو، تو یہ سلسلہ ہے۔ حکیم مراد صاحب کی اکلوتی بیٹی ہے۔ کیا بہت اچھی ہے؟“

”جی ہاں تایا ابو بہت اچھی ہے۔ آپ دیکھ کر خوش ہو جائیں گے لیکن ابو کو پتہ نہ چلے۔“
 ”خیر۔ اس کی تو فکری مت کرو۔ میں کل ہی چلا جاؤں گا۔“

میں اب مطمئن ہو گیا تھا کہ اب تو سارے معاملات تایا یوسف جمال لیں گے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ایک ہفتے تک نہ تو میں تایا کی طرف گیا اور نہ ہی حکیم صاحب کی طرف۔ ایک ہفتے بعد تایا ابوائے تو بہت خوش تھے۔ مجھے ایک طرف بلا کر کہنے لگے۔
 ”بیٹے تمہاری ہدایت کے مطابق میں نے اب تک کسی کو نہیں بتایا ہے حالانکہ شادی کو آج پانچ ماہ دن ہے۔“
 ”شادی لیکن..... کس کی شادی تایا ابو؟“

”ارے بھئی میری شادی۔ تم ہی نے تو بھیجا تھا حکیم صاحب کی لڑکی سے شادی کرنے۔ تو میں نے شادی کر لی۔“
 ”کیا..... آپ نے جیلہ سے شادی کر لی؟“
 ”ہاں بیٹے، تمہارے ہی کہنے پر کی ہے۔“

”تایا ابو، آپ پاگل تو نہیں ہو گئے۔ میں نے تو اپنے رشتے کے لیے آپ کو بھیجا تھا۔“
 ”کیا..... او خدا۔ یہ کیا گڑ بڑ ہو گئی۔ میرے تو دھیان ہی سے نکل گیا کہ تم نے اپنے لیے بھیجا ہو گا۔ میں تو اس سے شادی بھی کر چکا ہوں۔ اب بتاؤ کیا ہو سکتا ہے؟“
 ”کچھ نہیں ہو سکتا تایا ابو..... اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ صرف ایک قطعہ ہو سکتا ہے۔“

”چلو بیٹا وہی سادو۔“
 ”شیں۔“
 رشتے کی بات کرنے کو بھیجا تھا شوق سے پر کیا کہوں کہ اپنی تو قسمت خراب ہے خود ہی بہا لائے وہ میری جیلہ کو تایا کے بھول جانے کی عادت خراب ہے۔

صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔
 اس بار میں ان کے پاس بدھنسی کی شکایت لے کر گیا تھا۔ حکیم صاحب نے نسخہ لکھ کر دیا اور جیلہ یعنی ان کی لڑکی نے اپنے خوبصورت ہاتھوں سے دو دوا بنا کر دے دی۔
 اس کے بعد وہاں میرا مستقل آنا جانا شروع ہو گیا۔ کبھی سردرد، کبھی کمر کا درد، کبھی بدھنسی۔ شاید حکیم صاحب کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں۔ اس لیے انہوں نے ایک دن مجھ سے کہا۔
 ”برخوردار میرا خیال ہے کہ تم کسی شریف خاندان کے فرد ہو۔“
 ”جی حکیم صاحب، میرے والد صاحب پروفیسر ہوتے تھے۔ اب ریٹائر ہو گئے ہیں۔“
 ”تو میاں ایسی حرکتیں تمہیں زیب نہیں دیتیں۔“
 ”جی۔“ میں کچھ پریشان ہو گیا۔
 ”میں سب سمجھتا ہوں میاں۔ میں نے یہ بال و سبب میں سفید نہیں کیے۔“ حکیم صاحب نے فرمایا۔ ”میاں، اگر ایسا ہی ہے تو نکل کر کے لیے اپنے کسی بڑے کو بھیج دو۔“
 ”جناب۔“ میری آواز شدت جذبات سے لرزنے لگی۔
 ”ویسے کرتے کیا ہو؟“
 میں نے بتا دیا کہ میری ستنی تعلیم ہے، جا ب کیا ہے۔ حکیم صاحب بہت خوش ہوئے۔ خاص طور پر انہیں میرا خاندانی پس منظر بہت پسند آیا تھا۔
 جیلہ نے بھی شاید حکیم صاحب کی کچھ باتیں سن لی تھیں۔ اس لیے جب میں کمرے سے باہر نکلا تو وہ شرمائی شرمائی سی تھی۔ میں مسکراتا ہوا مطلب سے باہر آ گیا۔
 اس جھٹی لڑکی سے شادی میرے لیے بہت اچھی بات ہوتی کیونکہ وہ تو پہلی ہی نگاہ میں بقول شاعر دل سے جگر تک اتر چکی تھی۔ اس جیسی مہذب اور پڑھی لکھی لڑکی سے شادی میرے لیے خوش نصیبی کی بات ہوگی۔
 سوال یہ تھا کہ رشتے کی بات کرنے کے لیے کس کو بھیجا جائے۔ والد صاحب کے بارے میں یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں جائیں گے کیونکہ ان کی یہ خواہش تھی کہ میں ان کے دوست کی بیٹی سے شادی کر لوں۔ جو مجھے بالکل پسند نہیں تھی پھر مجھے تایا کا خیال آ گیا۔ امجد حسین نام تھا میرے تایا کا۔ وہ بھی ایک عجیب کردار کے مالک تھے۔ انہوں نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی حالانکہ ان کے پاس بہت دولت بھی تھی۔ ان کی کم از کم دس دکانیں اور چار پانچ فلیٹ تھے اور ہر مہینے ہزاروں روپے کرائے کے طور پر آتے تھے۔ وہ مجھ سے محبت بھی بہت کرتے تھے۔

ضیائیں بگراہی

حق پر اڑنے اور لڑنے کے لیے انسان کو جن مصمم ارادوں اور
مستقل مزاجی کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہر کس و ناکی کے بس
کی بات نہیں... اور جنہیں یہ دولت مل جائے وہ اللہ کے برگزیدہ
بندوں کی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں... آپ کا تعلق بھی
انہی محبوب انسانوں میں سے تھا جنہیں عبادت
وریاضت کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل ہو جاتا ہے۔

اللہ کے ایک نیک بندے کے بے قول و فعل اور

کھری میزان کا قصہ



Copied From Web

تھا۔ چنگیز خاں مرچا تھا مگر اس کے بیٹے تونی خاں کا بیٹا ہلا کو خان لٹل و خون ریزی میں اس کی نیابت کر رہا تھا۔ وہ تیان شان سے بلخ کی طرف بڑھا ہوا تھا۔ راستے میں ہلا کو خاں کے خو خوار دستے آگ و خون کا کھیل کھیلے سروں کے مینار کھڑے کرتے ہوئے فتح مندی کے نشے سے بدست ہو رہے تھے۔ بلخ کے صلح پسندوں نے ترک مکانی کیا تا مورقاروقی خاندان نے بھی سنت نبوی پر عمل کرتے ہوئے ہندوستان کا رخ کیا۔ برصغیر میں یہ عہد خطمی تھا۔ علاؤ الدین خطمی کا زمانہ، بادشاہ کو ان مہاجروں کی آمد کا حال معلوم ہوا تو اس نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور چند دن مہمان رکھ کر اوہ میں ردولی کی جاگیر عطا کر دی۔

یہ خاندان ردولی میں بس گیا۔ فکر معاش سے آزادی اور منگولوں کی دستبرد سے دوری نے انہیں علمی میدانوں میں گامزن کر دیا۔ زہد و تقویٰ میں بھی ان کا کوئی شریک نہ تھا۔ نالہ نیم شبی اور گریہ سحر گاہی کی تپش نے انہیں کندن کر دیا تھا۔ اس خاندان کا ایک سات سالہ لڑکا احمد اس وقت اپنی ماں کی توجہ کا خاص مرکز بن گیا جب انہوں نے اس کو نصف شب کے بعد اپنے پیچھے تہجد کی نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ احمد اپنے ماحول سے بے نیاز، دنیا سے غافل انتہائی انہماک سے تہجد کی نماز اس طرح ادا کرتا کہ اس طرح کوئی بڑا بھی نہ پڑھتا ہوگا۔ ماں اپنے بیٹے کو کئی بیٹے اس حال میں خاموشی سے دیکھتی رہی۔ احمد پوری رات مصروف عبادت رہتا اور صبح فجر کی نماز پڑھ کر تلاوت کلام پاک میں مشغول ہو جاتا۔ عبادت گزار ماں کا دل اپنے بیٹے کی عبادت گزاراں سے بہت خوش تھا مگر اس خوشی میں یہ تشویش بھی موجود تھی کہ اس نوعمری میں اس کو اتنی شدید ریاضت نہیں کرنا چاہیے۔ انہوں نے کئی بار یہ ارادہ کیا کہ اپنے بیٹے احمد کو سمجھائیں اور شب بیداری سے باز رکھنے کی کوشش کریں لیکن ان کی ہمت نہیں بڑی۔ اس کم ہمتی میں خدا کا خوف بھی شامل تھا اور اپنے بیٹے کی نظر میں شرمندہ ہو جانے کا تکلیف دہ احساس بھی۔

ایک دن بیٹے کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ ماں کا خیال تھا کہ ان کا بیٹا احمد آج کی رات آرام کرے گا لیکن بیٹے کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس نے عشا کی نماز بھی پڑھی اور پھر تہجد کے لیے بھی کھڑا ہو گیا۔ ماں کو خود بھی تہجد پڑھنا سکتی اس نے چند رکعتوں کے بعد اپنے بیٹے کے جسم کو ٹٹول کر بخار کی حدت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ پورا جسم بخار کی گرمی سے تپ رہا تھا۔ وہ بیٹے کے داہنی طرف بیٹھ کر سلام پھیرنے کا انتظار کرنے لگیں۔ کچھ دیر بعد احمد نے جیسے ہی سلام پھیرا۔ ماں نے گریہ سے کہا۔ "بیٹے احمد! تو بخار میں تپ رہا ہے۔"

احمد نے بہ پروائی سے جواب دیا۔ "ہاں ماں، آج شام ہی سے طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

ماں نے کہہ۔ "بیٹے! میں ڈرتی ہوں، کہیں تجھے چکر نہ آجائے۔"

بیٹے نے جواب دیا۔ "نہیں ماں، اب اتنا تیز بخار بھی نہیں کہ مجھے چکر آجائے۔"

ماں نے اصرار کیا۔ "بیٹے احمد! اگر تو میری بات مانتے تو میں تجھے یہی مشورہ دوں گی کہ تو آج کی رات آرام کر لے۔"

لیکن احمد نے ناگواری سے پوچھا۔ "ماں! اگر میں آرام کر لوں گا تو اس سے مجھ کو کیا فائدہ پہنچے گا؟"

ماں نے جواب دیا۔ "اس سے یہ فائدہ پہنچے گا کہ صبح ہوتے ہوئے تیری طبیعت سنبھل جائے گی اور بخار اتر جائے گا۔"

احمد نے کہا۔ "ماں! اس معاملے میں، میں آپ سے اتفاق نہیں کروں گا آپ کو معلوم نہیں کہ مجھ کو شب بیداری میں کیا مزہ ملتا ہے۔ ماں! اس میں ایک نشہ ہے، سوز ہے، لذت ہے، ناقابل بیان لذت۔ اگر میں اس لذت سے محروم کر دیا جاؤں تو بیمار پڑ جاؤں گا۔ یہی وہ لذت ہے جو مجھے ہر شب بیدار رکھتی ہے۔ اگر مجھ سے یہ لذت چھین لی جائے تو میں کچھ بھی نہیں رہوں گا۔ میں خالی اور شرمندہ رہ جاؤں گا ماں۔"

ماں نے خفت زدہ لہجے میں کہا۔ "بیٹے احمد! میں اس لذت اور سوز سے واقف ہوں جس کا تو ذکر کر رہا ہے لیکن میرے لالہ ابھی تو سات سال کا ہے۔ ابھی تو تجھ پر نماز بھی فرض نہیں نہ کہ تہجد کی نماز۔ اتنی کم سنی میں اتنی شدید محنت، بخدا میرا دل کا پتلا رہتا ہے، میں اندر ہی اندر لرزتی رہتی ہوں خدا کے لیے اپنے آپ پر اور مجھ پر رحم کر۔"

بیٹے نے جواب دیا۔ "ماں میری بھی یہی دعا ہے کہ خدا آپ پر رحم فرمائے اور مجھ پر بھی۔ رہی یہ بات کہ ابھی میں سات سال کا ہوں اور ابھی مجھ پر نماز کی ادا بھی فرض نہیں ہے تو میری فکر مجھے کچھ اور ہی بتاتی ہے۔ میں اس پر یقین رکھتا ہوں ماں کہ انسان جب عدم سے وجود میں آتا ہے اور نیست سے ہست میں قدم رکھتا ہے تو اس پر اپنے رب کی بندگی فرض ہو جاتی ہے۔"

ماں اپنے سات سالہ بچے کی زبان سے حکمت و معرفت کی باتیں سن کر رنگ رہ گئی۔ انہوں نے بے ساختہ کہا۔ "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ بچے کو اپنے رب سے کیا ہوا وعدہ ابھی طرح یاد ہے، الست برکم۔"

یہ کہتے کہتے وہ سجدے میں گر گئیں اور بڑی دیر تک رو رو کر اپنی نادانی اور سہو کی اپنے رب سے معافی مانگتی رہیں۔ وہ

گڑگڑا کر اپنے رب سے کہہ رہی تھیں "خدا یا! میں نادان ہوں، مجھ کو اپنے بیٹے کے مرتبے کا علم نہیں تھا، یہ میری کتنی بڑی چوک تھی کہ میں اس کو تیرے ذکر سے محروم کر دینا چاہتی تھی۔ میں اسے تیری بزرگی سے روکنے کی غلطی کر رہی تھی۔ مجھے معاف کر دے اور میرے بیٹے کے دل سے اس کدورت کو دور کر دے جو اس وقت کی باتوں سے پیدا ہو گئی ہوگی۔"

بیٹا ماں کی گریہ و زاری سن رہا تھا۔ جب ماں نے سجدے سے اپنا سر اٹھایا تو اس نے عاجزی سے عرض کیا۔ "ماں! آپ اتنی غمزہ کیوں ہیں، میں اور میرا خدا دونوں ہی آپ کے اس جذبے سے واقف ہیں جو مانتا کہ جذبہ کہلاتا ہے آپ نے جو کچھ فرمایا اپنی مانتا کے زیر اثر فرمایا۔ اگر میرے اور آپ کے درمیان رب کی ذات نہ ہوتی تو میرے لیے آپ کا حکم ماننا ہی عبادت قرار پاتا۔"

ماں نے بیٹے کو اپنے سے لگایا اور فرط جذبات سے رونے لگیں، احمد کا دل بھی بھر آیا۔ وہ بھی رونے لگا۔ روتے روتے دونوں ہی ہلکان ہو گئے ورنہ کو دبانے والے بوجھ نے آنسوؤں کی شکل میں بہہ کر انہیں ہلکا کر دیا۔

☆☆☆

کچھ عرصے بعد پھر ایسی ہی صورت حال پیش آئی۔ ماں ایک بار پھر بیٹے کی صحت کی طرف سے فکر مند ہو گئیں۔ احمد کی عبادت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ رات کو تہجد، دن کو ذکر الہی، آرام کا کوئی وقت ہی نہ تھا۔ ماں کو ہر وقت یہی لگتا تھا کہ کھائے جا رہی تھی کہ اس محنت شاقہ کا ان کے بیٹے احمد کی صحت پر کیا اثر پڑے گا۔ ان دونوں میں اس موضوع پر کئی بار گفتگو بھی ہوئی، دونوں ہی دلیلوں اور نظیروں سے ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے اور تقریباً ہر بار بیٹے کی بڑا اثر باتوں نے ماں کو لا جواب اور جذباتی کر دیا۔ انہیں اپنے بیٹے پر فخر تھا لیکن وہ کبھی بھی بیٹے کی دلیلوں سے اپنی وہ فکر دور نہیں کر سکیں جو انہیں اپنے بیٹے کی صحت کی طرف سے مستحلاً لاحق ہو چکی تھی۔

ماں نے اپنے شوہر کو بھی اس معاملے میں شریک کر لینا چاہا اور زور دے کر مجبور کیا کہ وہ احمد پر وہاں ڈال کر شب بیداری سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔

لیکن سلجھے ہوئے باپ نے ہر بار یہی کہا کہ "بیوی! میں بندے اور اس کے رب کے تعلقات میں کیونکر دخل دے سکتا ہوں۔ وہ جو کچھ کر رہا ہے اس کو کرنے دو۔ معلوم نہیں خدا کو کیا منظور ہے اور میرا تو خیال ہے کہ احمد مادر زاد ولی ہے اور وہ جو کچھ کر رہا ہے کوئی غیر معمولی طاقت اس سے یہ کراتی ہے۔"

بیوی نے کہا۔ "آپ میرے دل میں جھانک کر دیکھ لیں میں اپنے بیٹے کو شب و روز بیدار نہیں دیکھ سکتی۔ خدا انخواستہ اس کو کچھ ہو گیا تو؟"

شوہر نے جواب دیا۔ "بیوی! اس کو کچھ نہیں ہوگا، خدا اس کا محافظ ہے۔ یاد رکھو، خدا کسی بھی شخص سے اس کی استطاعت اور صلاحیت سے زیادہ کام نہیں لیتا۔ احمد جو کچھ کر رہا ہے خدا نے اس میں اتنی صلاحیت اور استطاعت رکھ دی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ راتوں کو اپنے گرم گرم بستر میں دیکا آرام کر رہا ہوتا۔"

لیکن ماں کو قرار نہیں آیا اور وہ سیدھی بیٹے کے پاس پہنچ گئیں۔ بیٹے احمد! افسوس کہ میں ایک بار پھر وہی فرسودہ موضوع لے کر آ گئی ہوں۔

بیٹے نے لائق نظروں سے ماں کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر کے یا اللہ یا اللہ کا ورد شروع کر دیا۔ ماں کچھ دیر خاموش کھڑی بیٹے کی کیفیت ملاحظہ کرتی رہی۔ آخر کچھ دیر بعد کہا۔ "بیٹے احمد! میں نے کیا کہا؟ میں کچھ کہہ رہی ہوں، کیا تو نے میری بات نہیں سنی؟ میں کیا کہہ رہی ہوں؟"

بیٹے نے ٹٹی میں سر ہلا دیا۔ "مجھے کچھ پتا نہیں کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔"

ماں نے جواب دیا۔ "میرے لال! میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تو اس کم سنی میں اتنی زیادہ عبادت نہ کر، ورنہ تیری صحت جواب دے جانے کی عبادت کے لیے پوری عمر پڑی ہے۔"

بیٹے نے کہا۔ "خوب خوب! کیا فرمایا آپ نے عبادت کے لیے پوری عمر پڑی ہوئی ہے۔"

"ہاں میں نے یہی بات کہی ہے کہ عبادت کے لیے پوری عمر پڑی ہے۔"

بیٹے نے مسکرا کر عرض کیا۔ "ماں زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں پھر آپ کس طرح کہہ سکتی ہیں کہ عبادت کے لیے پوری عمر پڑی ہوئی ہے، اگر آپ کسی طرح مجھ کو ایسی عمر کا یقین و لادیں اور یہ ثابت کر دیں کہ میں طویل عرصے تک زندہ رہوں گا تو میں شب بیداری ختم کیے دیتا ہوں۔"

ماں نے جواب دیا۔ ”یہ یقین تو کوئی ولی بھی نہیں دلا سکتا۔ پھر میں کس طرح دلاؤں۔“

”تب پھر آپ خاموش رہے ماں! مجھ کو عبادت سے نہ روکیے اگر میں نے ایسا کیا تو میں یاد حق سے بہت دور ہو جاؤں گا اور اگر ایسا ہوا مار تو آپ یقین کیجئے کہ میں بھی شاید یہ بہت بھی نہ کر سکوں کہ اپنی شب بیداری سے باز آ جاؤں۔ کیا میں نے شب بیداری کی لذتوں سے آپ کو آگاہ نہیں کیا؟ کیا آپ میری وہ بات جیت بھلا چکی ہیں؟ شاید نہیں، اگر میں آپ کی سیدھی سچی بات مان بھی لوں تو اس سے آپ کے بقول صحت کے علاوہ اور کیا فائدہ پہنچے گا۔“

بیٹے نے لا جواب کر دیا تو ماں نے ایسا سکوت اختیار کیا کہ پھر زندگی بھر اس موضوع پر بات ہی نہیں کی۔

دہلی میں احمد کے بڑے بھائی شیخ تقی الدین مستقل رہ رہے تھے، ان کی علمی قابلیت کا بڑا شہرہ تھا گھر میں شیخ تقی الدین کا بڑا ذکر رہتا۔ ماں اکثر کہتی رہتیں کہ اگر میرا بیٹا شیخ تقی الدین کے گھر میں ہوتا تو احمد کو شاندار تعلیم دلاؤں۔ شیخ احمد ان کی باتیں بغور سنتے اور اپنے بھائی سے ملاقات کے لیے سراپا شوق بن جاتے لیکن یہ شوق پرواز سے محروم ہی رہتا۔ چھوٹے سے دل و دماغ میں شوق اور دلورے کی لہریں اٹھتی بیٹھتی رہتی تھیں لیکن ان لہروں نے طوقان کی شکل ایک عرصے تک نہیں اختیار کی۔ ان کے دل و دماغ متفقہ طور پر ایسی تجاویز اور تدابیر پر غور کرتے رہتے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ بھائی تقی الدین سے ملاقات کس طرح کی جائے۔

شب و روز کی عبادت میں سوز بھی باقی نہیں رہا تھا۔ شیخ احمد سوچتے رہتے کہ آخر میں اپنی عبادت اور ریاضت میں کس کی راہنمائی اختیار کروں۔ جب ماں کو اس ضمن کا پتا چلا تو وہ شیخ احمد کے پاس جا بیٹھیں اور پوچھا۔ ”بیٹے! کیا بات ہے آج کل تو پریشان کیوں رہتا ہے؟ کسی سے کوئی جھگڑا یا کوئی رنجش؟“

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”نہیں ماں ایسی کوئی بات نہیں؟“

ماں نے پوچھا۔ ”پھر تو گھر مند اور اداس اداس کیوں رہتا ہے؟“

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”ماں! بات یہ ہے کہ میں عبادت ریاضت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا اور ہمیشہ اس کوشش میں رہتا ہوں کہ طمانیت قلب حاصل کروں لیکن روح کی ترقی دور ہی نہیں ہوتی، پیاس بجھتی ہی نہیں۔ میں ہمیشہ اپنی ذات میں کوئی کمی محسوس کرتا رہتا ہوں، آخر ایسا کیوں ہے؟“

ماں نے کہا۔ ”احمد! ابھی تیری عمر ہی کتنی ہے، کل بارہ سال۔ اس عمر میں تو نے جو کچھ بھی حاصل کر لیا ہے، بہت ہے رہا عقلی کام مسئلہ تو یہ ہے کہ باقی رہے گی۔“

لیکن بیٹے کو ماں کی باتیں مطمئن نہ کر سکیں، اضطراب اور اضطراب میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ انہوں نے ماں سے پوچھا۔ ”ماں! دہلی میں بھائی تقی الدین کیا کر رہے ہیں؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”بیٹے! تقی الدین ایک عالم فاضل انسان ہیں معلوم نہیں کہاں کہاں سے طالبان علم اس کے پاس پہنچ کر تحصیل علم کرتے ہیں۔ اس کی طبیعت مسکدہ ہے، خشک و شہے سے بالاتر۔“

شیخ احمد نے کہا۔ ”پھر تو ماں میں دہلی جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا۔ بھائی تقی الدین میری عقلی دور کر دیں گے۔“

ماں نے تشویش ظاہر کی۔ ”لیکن بیٹے ایک بارہ سالہ لڑکا اتنا باسز کیونکر کرے گا۔ میرا تو یہ سوچ کر ہی دل بیٹھا جاتا ہے کہ تو جہاں سز کس طرح کرے گا؟“

شیخ احمد نے عرض کیا۔ ”ماں! میں سز کے لیے آپ کی اجازت کا طالب ہوں۔ تلاش فضل اور طلب علم میں اس فاصلے کی اہمیت ہی کیا ہے مجھ سے پہلے تو ایک ملک سے دوسرے ملک تک کے سفر کیے گئے ہیں۔“

ماں خود کو بہ بس محسوس کر رہی تھی آخر کچھ دیر بعد چھیا رڈال دیے اور دہلی جانے کی اجازت دے دی۔ شیخ احمد ایک قافلے میں شامل ہو گئے۔ یہ قافلہ مغربی حصوں میں جا رہا تھا۔ شب و روز کی صعوبتیں جھیلتے، مصیبتیں اٹھاتے آپ دہلی میں داخل ہو گئے۔ تلاش کرتے ہوئے اپنے بھائی شیخ تقی الدین کے پاس پہنچ گئے۔ شیخ احمد اس بات سے بہت متاثر ہوئے کہ ان کے بھائی کا دہلی میں بڑا شہرہ تھا اور ہر شخص ان کا نام عزت و احترام سے لیتا تھا۔ بڑے بھائی نے ایک بارہ سالہ اجنبی لڑکے کو اپنے سامنے کھڑے دیکھا تو یہ گمان گزرا کہ یہ بھی کوئی طالب علم ہے جو ان کے آگے زانوئے تلمذتہ کرنے آیا ہے۔ شیخ احمد نے بھی اپنے بھائی کی یہ کیفیت محسوس کر لی کہ وہ انہیں پہچان نہیں سکے، انہوں نے سکوت اور تامل اختیار کیا۔

شیخ تقی الدین نے اپنے چھوٹے بھائی کو بغور دیکھ کر سوال کیا۔ ”صاحبزادے! آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں اور میرے پاس کیوں آئے ہیں؟“

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”حضرت! میرے پاس آپ کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔ ہاں یہ ضرور جانتا ہوں کہ میں آپ کی خدمت میں کیوں آیا ہوں؟“

نقی الدین نے اس عجیب و غریب بڑے کو ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ بولے۔ ”آدمی تو بچھے لگتے ہو۔ اچھا اگر تم یہ نہیں بتانا چاہتے کہ کہاں سے آئے ہو تو کوئی حرج نہیں، میرے لیے یہی جان لینا کافی ہے کہ تم مجھ سے تعلیم حاصل کرنے آئے ہو۔“

شیخ احمد نے عرض کیا۔ ”جناب! میں پانچ چھ سال سے ایک اندرونی کرب میں مبتلا ہوں، اگر آپ اس کو دور فرما دیں تو میں آپ کا زندگی بھر ممنون رہوں گا۔“

بڑے بھائی نے پوچھا۔ ”تمہارا قیام کہاں ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”حضرت! یہاں میں ایک لاوارث ہوں، مجھ کو تو رہنے کے لیے ٹھکانا بھی درکار ہے، میں اس شہر میں بالکل اجنبی ہوں۔“

نقی الدین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو بڑا عجیبہ مسئلہ ہے تم کو اپنے رہنے کا انتظام خود ہی کرنا چاہیے۔ میرے پاس اتنی محتاجتیں کہاں کہ طلبہ کی اقامت کا انتظام بھی کروں۔“

شیخ احمد نے مصیبت سے کہا۔ ”نہ صرف یہ کہ آپ مجھے پڑھائیں گے اور اقامت کا انتظام بھی کریں گے بلکہ کھانے پینے کی ذمہ داری بھی قبول کرنا ہوگی۔“

نقی الدین نے ایسا عجیب طالب علم پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ذرا فحشی سے کہا۔ ”یہاں صاحبزادے یہ تو بتاؤ تمہارے ماں باپ کیسے ہیں جو انہوں نے تم کو تنہا ہی چلا آنے دیا۔ آخر تم کسی خوشحال گھرانے ہی سے تعلق رکھتے ہو گے ورنہ غریب انسان تو یہاں تک آنے کا خیال تک دل میں نہیں لاسکتا۔“

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”جناب والا! آپ مجھ سے بحث تو کیجئے نہیں بس یہ بتا دیجیے کہ آپ مجھ کو میری مانند کردہ شرطوں پر پڑھا سکتے ہیں یا نہیں؟“

نقی الدین نے تھکے ہارے لہجے میں کہا۔ ”میں انکار نہیں کر سکتا۔ اگر تو تیار ہے تو میں تیرے قیام و طعام کی ذمہ داری بھی اپنے ہی سر لے لوں گا۔ تو میرے پاس ہی رہ جا۔“

شیخ احمد نے خوش ہو کر عرض کیا۔ ”بھائی صاحب! مجھ کو آپ سے یہی امید تھی۔ ہاں نے آپ کو بہت بہت پوچھا ہے اور یہ معلوم کیا ہے کہ آپ ردولی کب تشریف لارہے ہیں؟ وہ آپ کو یاد کر کے اداس ہو جاتی ہیں۔“

نقی الدین نے شیخ احمد کے چہرے پر اپنے باپ کا عکس دیکھ لیا۔ بے اختیار اٹھے اور بھائی کو سینے سے لگا لیا۔ بولے۔

”احمد! تو نے کمال کر دیا، کیا جس پیدا کیا۔ واہ واہ خوب!“

شیخ احمد نے حرف مدعا گوش گزار کیا۔ ”بھائی صاحب! میں ایک عرصے سے مضطرب اور پریشان ہوں کہ میں اپنی روح کی پیاس کس طرح بجھاؤں۔ اپنی کھلی کس طرح دور کروں؟“

بھائی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں اس وقت تیری رہائش کا بندوبست کرتا ہوں۔ اس کے بعد کچھ اور کروں گا۔“

شیخ احمد وہیں بیٹھ گئے اور نقی الدین ان کے قیام اور طعام کا انتظام کرنے چلے گئے۔ رات ہو گئی تو شیخ احمد کو تشویش ہوئی کہ یہ بھائی کہاں چلے گئے؟ آخر وہ نصف شب کو وہاں آئے تو بہت خوش خوش، بولے۔ ”احمد! افسوس کہ میں اپنے مدرسے میں تم کو نہیں رکھ سکتا۔ ہاں ایک دوسری جگہ کا انتظام کر لیا ہے۔“

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”بھائی صاحب! آپ بھی کن چکروں میں پڑ گئے۔ میں کہیں کسی گوشے میں پڑا رہتا۔“

بھائی نے کہا۔ ”یہ کیا بات ہوئی۔ تو میرا بھائی ہے اور بھائی عزت و احترام سے رہے گا۔ تو خرچ اور مصارف کی تو بات ہی نہ کر اس کو مجھ پر چھوڑ دے۔“

احمد نے پوچھا۔ ”بھائی صاحب! پھر مجھے کون سا وقت مرحمت فرمائیں گے؟“

بھائی نے جواب دیا۔ ”ہر وقت، کسی بھی وقت تمہ کو تو میں اپنے بھائی کی حیثیت سے تعلیم دوں گا۔“

احمد کو بڑے بھائی کے پاس قیام و طعام کی سہولتیں مل گئیں اور جب انہیں پہلے دن بڑے بھائی نے پڑھانا شروع کیا تو شیخ احمد نے ان سے سوالات کرنا شروع کر دیے۔

نقی الدین نے کہا۔ ”احمد! تو مجھ سے پڑھنے آیا ہے یا سوالات کرنے؟“

احمد نے جواب دیا۔ ”بھائی صاحب! علم وہی نہیں ہے جو کتابوں میں موجود ہوتا ہے بلکہ میں جو علم حاصل کرنا چاہتا ہوں شاید وہ اس درس گاہ سے نہیں ملے گا۔“

بڑے بھائی نے کہا۔ ”میاں صاحبزادے! مجھ کو یہ بات سخت ناہنہ ہے کہ میری تدریس میں کوئی تخل ہو، مجھ کو اپنی مرضی کا نصاب پڑھانے سے روکا جائے۔“

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”اور بھائی صاحب! مجھ کو بھی یہ قطعاً ناپسند ہے کہ کوئی معلم میرے اندر کی بے چینی نہ دور کر سکے، روح کی تفسیر نہ بجا سکے۔ میں یہاں علوم ظاہری کی تحصیل کے لیے نہیں آیا۔ میں اپنی روح کو تسکین اور آسودگی دینا چاہتا ہوں۔“

نقی الدین نے اسوس سے کہا۔ ”احمد! افسوس کہ میں ظاہری علوم تو پڑھا سکتا ہوں علوم باطنی میں، میں تقریباً گورا ہوں۔“

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”پھر مجھے بھی افسوس ہے کہ میں یہاں علوم ظاہری حاصل کرنے نہیں آیا۔ میری بیماری علوم باطنی سے دور ہوگی۔ میرے لیے آپ کا مدرسہ کارآمد نہیں۔“

نقی الدین نے پوچھا۔ ”پھر کیا ارادے ہیں؟“

چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔ ”میں کسی مرشدِ کامل کی تلاش میں ہوں اور میں اس کی جستجو میں یہاں سے بھی چلا جاؤں گا۔ بھائی صاحب بس ایک رات۔ اس سے زیادہ نہیں۔ میں آپ کے برصیبت نہیں بننا چاہتا۔“

بھائی کی محبت انہیں روکنے پر مجبور کر رہی تھی۔ کہا۔ ”احمد! تم یہیں میرے پاس ہی رہو۔ اگر تمہیں کسی مرشدِ کامل کی تلاش ہے تو میں خود بھی تمہارا ساتھ دوں گا اور اس کو تلاش کر کے دم لوں گا۔“

”بھائی صاحب!“ چھوٹے بھائی نے کہا۔ ”صاف کوئی کی معافی چاہتا ہوں جو آگ میرے سینے میں روشن ہے آپ اس سے محروم ہیں اور جب آپ کے دل میں مرشدِ کامل کے لیے تڑپ ہی نہیں تو اس کو تلاش کہاں اور کس طرح کریں گے؟“

بھائی نے آہستہ سے کہا۔ ”پھر بھی تو رات بھر اس سلسلے میں غور و فکر میرا خیال ہے تجھ کو میرے پاس سے جدا نہیں ہونا چاہیے۔ کسی ٹھکانے کو مرکزی حیثیت دینا ہی پڑے گی کیونکہ بے گھر و بے در انسان منزل مقصود نہیں پاسکتا۔“

چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔ ”اپنی اپنی سوچ، اپنی اپنی فکر کی بات ہے کیونکہ مرشدِ کامل کی تلاش میں جب تک آدمی بے گھر اور بے در نہیں ہوگا اپنی منزل نہیں پاسکتا۔“

بڑے بھائی نے رعب سے کہا۔ ”میں کہتا ہوں سوچنے میں حرج ہی کیا ہے؟ بے سوچے سمجھے اتنا بڑا قدم اٹھانا کسی طور مناسب نہیں۔“

شیخ احمد خاموش ہو گئے جس کا بڑے بھائی نے یہ مطلب لیا کہ شاید ان کی بات مان لی گئی ہے۔

شیخ احمد بستر پر گئے تو ان کے ذہن میں مرشدِ کامل کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ وہ اس کے بارے میں سوچتے رہے معلوم نہیں کب تک جاگتے رہے۔ اس کیفیت میں انہیں نیند آگئی۔ سوتے میں انہیں کسی کی آواز سنائی دی، کوئی کہہ رہا تھا۔ ”میاں صاحبزادے! آپ کی منزل زیادہ دور نہیں ہے۔ پانی پت جائے اور قطبِ ربانی سے بیعت ہو جائے۔“

شیخ احمد نے سراپا شوق بن کر سوال کیا۔ ”ان قطبِ ربانی کا نام؟ میں پانی پت میں انہیں کہاں تلاش کروں گا؟“

جواب ملا۔ ”آپ پانی پت جائیں تو سکی۔ اللہ نے چاہا تو ان تک پہنچ کر ہی قدم رکھیں گے۔“

اس کے بعد آپ کی آنکھ کھلی اور دیر تک اس خواب پر غور کرتے رہے، کبھی فیصلہ کرتے کہ پانی پت فوراً ہی چلے جانا چاہیے اور کبھی تساہل سے سوچتے کہ کہیں یہ دوسرے شیطانی تو نہیں جو ہر جو یائے حق کی راہ روکنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے لیکن صبح ہوتے ہوتے یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ انہیں بہر حال پانی پت پہنچنا ہے۔

وہ صبح الصبار اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔ بڑے بھائی کو کچھ پتا نہ تھا کہ شیخ احمد کہاں چلے گئے۔ دوسری طرف قطبِ ربانی شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء کشفِ باطن سے اس مادرزاد ولی کی آمد سے باخبر ہو چکے تھے۔ انہیں شیخ احمد کا امتحان لینا مقصود تھا۔ اس لیے اپنے مریدوں کو حکم دیا۔ ”لوگو! ہمارے پاس ایک مہمانِ خاص آ رہا ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس کا شاندار استقبال کیا جائے۔“

مریدوں نے جواب دیا۔ ”حضرت! ہم سب ہر طرح حاضر ہیں۔ آپ جو حکم دیں گے، بجالائیں گے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”مہمان کی جگہ میں چولہے روشن کیے جائیں اور ان پر دو گیس چڑھا دی جائیں۔ لطیف و لذیذ کھانے پکوائے جائیں۔“

ایک مرید نے بعد ادب عرض کیا۔ ”حضرت! یہ سب ابھی ہوا جاتا ہے مرید اور کچھ؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”اور دوسرے مریدوں سے کہہ دو کہ خانقاہ کے در پر حسین اور خوبصورت گھوڑے ساز و سامان سے لیس کر کے کھڑے کر دیے جائیں۔“

ایک مرید نے کھڑے ہو کر عرض کیا۔ ”حضرت! یہ انتقام بھی ہو جائے گا بس حضور کے ارشاد کے مطابق میں چندہ میں ہاتھی کھڑے کر دوں گا۔ اسی تعداد میں گھوڑے بھی کھڑے کر دیے جائیں گے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”کھڑے کر دیے جائیں نہیں، جو کچھ ہونا ہے فوراً ہی ہونا ہے اس لیے ان پر فوراً عمل در آمد ہوگا۔“
مرید ادھر ادھر پھیل گئے۔ کسی نے چولہے جلانے۔ کسی نے دیگیوں میں مال ڈالا اور کسی نے ہاتھی گھوڑے اپنے قبضے میں کیے اور انہیں خانقاہ کے دروازے پر سجا کر کھڑا کر دیا۔ جب قطب ربانی کو اس کا علم ہوا کہ ہاتھی اور گھوڑے در پر کھڑے کر دیے گئے ہیں تو آپ ان کے معائنے کو نکل کھڑے ہوئے اور خانقاہ کے در پر شاندار منظر دکھ کر بے حد خوش ہوئے اور مریدوں سے فرمایا۔ ”لو! میرا ایک بارہ تیرہ سال کا مہمان آ رہا ہے اس طرح میں اس کو مرعوب کرنا چاہتا ہوں، چنانچہ چند باتوں کا نہیں بھی خیال رکھنا ہوگا۔“

مریدوں نے بیک آواز سوال کیا۔ ”کن باتوں کا حضرت، ارشاد!“
آپ نے جواب دیا۔ ”میں آنے والے مہمان کی تعریف نوازی اور صاف گوئی کی قدر کرتا ہوں۔ اس لیے اگر میرا مرید کوئی ایسی ویسی حرکت کرے تو تم لوگ اس کا کوئی خیال نہ کرو گے۔“

مریدوں نے عرض کیا۔ ”حضرت، یہ آج آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم آپ کے مہمان کی شان میں کسی قسم کی گفتاخی کریں گے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

آپ اندر جاتے ہوئے بولے۔ ”اچھا میں اندر جا رہا ہوں، میرا مہمان بس آیا ہی چاہتا ہے، تم لوگ اس کو سنبھالنا۔“
مرید خاموش ہو گئے اور آپ اندر تشریف لے گئے۔

کچھ ہی دیر بعد شیخ احمد خانقاہ کے در پر پہنچ گئے۔ وہاں بہت ساری دہلیزیں چڑھی ہوئی تھیں اور ان میں سے لندیہ کھانوں کی نکلنے والی خوشبو سے گرد و پیش کی فضا مہک رہی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے سامنے ہاتھیوں اور گھوڑوں کی قطاریں دیکھیں، یہ دونوں مویشی نہایت شان سے کھڑے گویا کسی کے منظر تھے۔ شیخ احمد کو ذرا سی دیر کے لیے یہ شہ گزرا کہ یہ مکان قطب ربانی کا ہی ہے، یہ کسی امیر کبیر شخص کا۔ وہ انہی دوسوں میں جلا تھے کہ ایک مرید نے چند قدم چل کر کسی مرید سے پوچھا۔ ”بھائی! پھر مرثا اندر تشریف رکھتے ہیں کیا؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”تو کیا مہل سوال کر رہا ہے۔“

دوسرے مرید نے کہا۔ ”مہل سوال؟ کیا کہا تم نے؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”آج کل بھی اگر.....“

آپ چند قدم آگے بڑھے اور دونوں سے سوال کیا۔ ”حضرات! میں ایک پر دہلی انسان ہوں، یہاں کے ماحول اور لوگوں سے قطعاً ناواقف ہوں، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ کس امیر کا مہل ہے؟“

ایک مرید نے دھر ادھر دیکھ کر حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”میاں صاحبزادے، آپ کس مہل کی بات کر رہے ہیں؟ کون سا مہل؟ یہاں تو کوئی مہل نہیں ہے۔“

شیخ احمد نے خانقاہ اور اس کے در پر موجود شان و شکوہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس مہل اور اس کے ساز و سامان کی بابت پوچھ رہا ہوں۔“

مرید نے جواب دیا۔ ”صاحبزادے! یہ مہل نہیں ایک خانقاہ ہے حضرت جلال الدین کبیر الاولیا کی خانقاہ۔“
آپ نے طنز فرمایا۔ ”تو یہ خانقاہ ہے۔ خوب، میں تو اس کو مہل سمجھ بیٹھا تھا۔ کیا خانقاہیں ایسی ہوتی ہیں؟ درویش کی خانقاہ لیکن ٹھات باٹ شاہانہ مہل جیسے تعمیر کی گئی جس پر شاہی قصر کا گمان ہوتا ہے۔“

مرید نے کہا۔ ”صاحبزادے! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“

آپ نے جوش میں فرمایا۔ ”میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں درست کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ اندر میرا ضمیر اس مہل کو کھنپا کہنے پر آمادہ ہی نہیں۔“

مرید نے انہیں ایک بار پھر سمجھایا۔ ”صاحبزادے! یہ قلبِ ربانی کی خانقاہ ہے، آپ یہاں سے واپس جا کر بچھتا ہے گا۔“
شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”میں سکونِ قلب کی تلاش میں ہوں، میں طمانیت کی جستجو میں ہوں اور جہاں یہ ساز و سامان
موجود ہو، وہاں سکون اور طمانیت کا کیا کام؟“

مرید نے بے بسی سے عرض کیا۔ ”آپ کی مرضی، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ جو جی میں آئے کریں۔“
شیخ احمد نے اسی وقت اس در کو چھوڑ دیا اور پانی پت سے نکل جانے کے ارادے سے سارا دن پیدل ہی سفر کرتے رہے
یہاں تک..... کہ وہ شام تک ایک دوسری آبادی میں داخل ہو گئے۔ ایک درخت کے نیچے سستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ رات
سر پر کھڑی تھی۔ پریشان تھے کہ شبِ ببری کہاں ہوگی۔ انہوں نے ایک راہ گیر سے پوچھا۔ ”بھائی ذرا سنا تو۔“
راہ گیر کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”صاحبزادے! آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟“
انہوں نے جواب دیا۔ ”پانی پت سے۔“

راہ گیر مسکرایا۔ ”پانی پت سے، واللہ طبیعت تو ٹھیک ہے جناب کی؟“
آپ نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیوں اس میں طبیعت کی خرابی یا صحت پابی کو کیا دخل؟ میں پانی پت سے چلا آ رہا ہوں۔“
راہ گیر نے جواب دیا۔ ”صاحبزادے! اس وقت آپ پانی پت ہی میں تشریف فرما ہیں پھر پانی پت سے آنے کا کیا
سوال پیدا ہوتا ہے۔“

شیخ احمد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا لیکن پھر اس شے میں پڑ گئے کہ شاید وہ راستہ بھول کر پانی پت ہی میں چلے پھرتے
رہے ہیں راہ گیر نے جانتے جانتے کہا۔ ”صاحبزادے! اب آپ گھر جائیں کیونکہ یہ پردیس نہیں آپ کا اپنا وطن پانی پت ہے۔“
شیخ احمد خاموش رہے اور پوری رات اس درخت کے نیچے گزار دی۔

صبح طلوع آفتاب کے فوراً بعد آپ دوبارہ چل کھڑے ہوئے اور نہایت ہوشیاری اور احتیاط سے دن بھر سفر کرتے
رہے۔ شام سے پہلے ہی وہ پانی پت سے دور جا چکے تھے۔ نئی آبادی، نئے نئے اجنبی سے مکانات، غیر مانوس کیفیت غرضیکہ
ماحول کی ہر شے نئی اور اجنبی تھی۔ یہ ایک محل کے سائے میں جا کھڑے ہوئے اور سوچنے لگے کہ اگر کوئی نظر آ جائے تو اس سے
شبِ ببری کے لیے جگہ مانگی جائے۔ راستے میں ایک گھڑسوار آتا دکھائی دیا، یہ اپنی جگہ سے اٹھے اور گھڑسوار کی راہ میں
کھڑے ہو گئے۔ اس نے گھوڑا روک دیا اور گھوڑے کی پشت ہی سے سوال کیا۔ ”کیوں صاحبزادے کیا بات ہے؟“
شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”مجھے جانا تو بہت دور ہے لیکن سردست میں پانی پت سے بھاگ جانا چاہتا ہوں اور خدا کا شکر
ہے میں اس میں کامیاب ہو گیا۔“

گھڑسوار ہنسا۔ ”خوب یعنی آپ پانی پت سے تشریف لائے ہیں اور پانی پت ہی میں کھڑے یہ سوال کر رہے ہیں۔ خوب۔“
شیخ احمد نے گھبرا کر گھڑسوار کا جواب دہرایا۔ ”یعنی اس وقت میں پانی پت میں ہوں؟ وہ پانی پت جس کو میں نہایت
ہوشیاری اور احتیاط سے بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں؟ اس وقت بھی میں اسی پانی پت میں موجود ہوں؟ یہ معاملہ کیا ہے اور یہ مجھ
سے کون مذاق کر رہا ہے؟“

گھڑسوار نے آپ کو حیرت و استعجاب سے دیکھا اور اپنی راہ لی۔
شیخ احمد کو ضد ہو کر خود سے بولے۔ ”احمد! کچھ بھی ہو، میں پرکار کی طرح ساری عمر یوں ہی کوشش جاری رکھوں گا اور
دیکھوں گا کہ کس طرح اس پرکار سے گلنا نصیب نہیں ہوتا۔“

انہوں نے پوری رات محل کی دیوار کے سائے میں گزار دی اور علی الصبح ایک بار پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ دوپہر تک
نہایت سرگرمی سے سفر کرتے رہے لیکن دھوپ کی تمازت نے انہیں آرام کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ایک خشک درخت کے نیچے جا بیٹھے۔
تین سے چھ گھنٹے تک لگا کر ماضی حال اور مستقبل کی ہیر کرنے لگے۔ اسے اسے میں اچانک آواز سنائی دی۔ ”اے بھائی تمہیں کہاں جانا ہے؟“
آواز درخت کے اوپر سے آ رہی تھی چنانچہ انہوں نے اوپر درخت کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک خوب صورت نوجوان
ایسے لباس میں مٹی لٹائی پہنے بیٹھا تھا۔ انہیں حیرت تھی کہ یہ نوجوان اس جگہ قموڑی دیر پہلے تو نہیں تھا۔ اب یہ کہاں سے آ گیا۔
نوجوان انہیں حیرت زدہ اور متحیر دیکھ کر مسکرایا اور طنز یہ کہا۔ ”لڑکے تو اتنا پریشان کیوں ہے۔ کیا ہوا؟“
شیخ احمد نے گھبرا کر سوال کیا۔ ”ارے بھائی یہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“
نوجوان نے جواب دیا۔ ”میں یہاں کچھ بھی نہیں کر رہا۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

شیخ احمد نے کہا۔ ”بھائی! میں منزل کی تلاش میں یہاں تک آ گیا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ اب مجھے کدھر کو جانا ہے؟“
 نوجوان ہنس دیا۔ مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔ ”معلوم نہیں میں تمہیں کیا کہوں، خوش قسمت یا بد قسمت۔ تم وہ شخص
 ہو جو منزل پر پہنچ کر بھاگ بھاگ رہا ہوتا ہے، تم نے تو اپنا راستہ جلال الدین کے در پر پہنچ کر ہی ختم کر دیا۔“
 شیخ احمد نے کہا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

نوجوان نے جواب دیا۔ ”بھائی! میں ہی نہیں ایک زمانہ یہی کہے گا۔“ پھر..... سامنے آتے ہوئے دو آدمیوں کی طرف
 اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان دونوں سے بات کرو اللہ نے چاہا تو یہ بھی میری تائید کریں گے۔“
 شیخ احمد دونوں کی طرف بڑھے۔ یہ دونوں نہایت ستم سے کپڑوں میں لباس انہی کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ شیخ
 احمد ان کی طرف بڑھے اور قریب پہنچ کر سوال کیا۔ ”صاحبان! مجھے کدھر جانا چاہیے۔ میرا راستہ کدھر ہے؟“
 ان دونوں نے ہلکے آواز جواب دیا۔ ”راستہ کھونے کے بعد راستہ پوچھ رہے ہو؟ کیا جلال الدین قطب ربانی کا در
 تیری منزل نہیں تھا؟ تو نے تو اپنا سارا راستہ خود ہی کھو دیا۔“

شیخ احمد شرمسار و شرمندہ درخت کی طرف مڑے اور درخت پر بیٹھے ہوئے نوجوان کا شکر یہ ادا کرنا چاہا لیکن اب درخت
 پر کوئی بھی نہ تھا۔ ادھر سے مڑ کر دونوں اجنبیوں کی طرف بڑھے لیکن اب وہ بھی غائب ہو چکے تھے۔ یہ قبل و شرمندہ ہو کر
 درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے۔

آخر اٹھے اور پانی پت کی طرف چل پڑے لیکن راستے میں ندامت اور شرمندگی نے انہیں نڈھال کر دیا۔ وہ بے ہوش
 ہو کر گر گئے اور بڑی دیر تک یوں ہی پڑے رہے لیکن ہوش میں آتے ہی وہ پانی پت کی طرف چل نکلے۔
 ابھی آستانہ دور ہی تھا کہ دوسووں نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ معلوم نہیں، انہیں کون درغلازہ تھا۔ دل بار بار یہی کہہ رہا
 تھا کہ تجربے اور ثبوت کے بغیر میں انہیں کس طرح وہی کال اور قطب ربانی مان لوں پھر کسی نے دل سے یہ مشورہ دیا کہ ”شیخ
 احمد! ذرا ان قطب ربانی کا امتحان تولے لے۔“

اس آواز سے شیخ احمد نے سوال کیا۔ ”میں ان کا کیا امتحان لوں؟“
 جواب ملا۔ ”جب تو ان کے سامنے پہنچے تو اپنے دل میں دو خواہشیں لیے ہو کہ حضرت قطب ربانی اپنے سر کی ٹوپی اپنے
 پیر کی قبر سے کس کر کے تیرے سر پر رکھ دیں اور اس کے بعد شیرینی عصار فرمادیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو واقعی قطب ربانی
 ٹھہریں گے ورنہ کچھ بھی نہیں۔“

چنانچہ شیخ احمد اپنے دل میں دونوں خواہشیں لیے ہوئے قطب ربانی کی خدمت میں پہنچ گئے۔ خادم سے پوچھا۔ ”کیوں
 بھائی، قطب ربانی تشریف رکھتے ہیں، میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔“
 خادم نے جواب دیا۔ ”قطب ربانی اس وقت اپنے پیر کے مزار پر کھڑے فاتحہ پڑھ رہے ہیں، اگر ان سے ملاقات کا
 اتنا ہی شوق ہے تو اندر مزار کے پاس چلے جاؤ اسی وقت ملاقات ہو جائے گی۔“
 شیخ احمد اسی وقت مزار کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ اس وقت قطب ربانی فاتحہ پڑھ کر وہی ایسی کارادہ کر رہے تھے،
 اپنے سامنے شیخ احمد کو کھڑے دیکھا تو مسکرا دیے۔ پوچھا۔ ”تو تم ابھی تک پانی پت میں ہی موجود ہو؟“
 شیخ احمد کے دل پر حیرت لگی بولے۔ ”حضرت میں خطا کار ہوں۔“

حضرت قطب ربانی نے فرمایا۔ ”تم پر کار کی طرح عمر بھر چکر لگانے کا عہد کر چکے تھے؟“
 شیخ احمد تڑپ کر بولے۔ ”مجھ سے غلطی ہوئی میں شرمندہ ہوں۔ مجھ کو اور زیادہ شرمندہ نہ کیجیے۔“
 جواب میں قطب ربانی نے کلاہ سر سے اتار کر ہاتھ میں لے لی اور پھر اس کو مزار سے چھوا کر شیخ احمد کے سر پر رکھ دی۔
 دوسرے ہاتھ میں روٹی اور حلوا تھا فرمایا۔ ”یہ کھاہ اپنے سر پر رہنے دے اور روٹی اور حلوا کھالے۔“
 شیخ احمد کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ ”حق حق حق۔“

اور بے اختیار قطب ربانی کے قدموں میں ڈیر ہو گئے۔ قطب ربانی نے انہیں اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور بڑی دعا میں دیں۔
 حضرت قطب ربانی انہیں اپنے ساتھ خانقاہ میں لے گئے اور اپنے ہاتھوں سے سر کے بال کاٹ دیے اور باقاعدہ اپنا
 مرید کر لیا۔ کچھ دیر بعد دسترخوان بچھا اور اس پر کئی قسم کے کھانے سجا دیے گئے۔
 شیخ احمد نے ہر کھانے میں تامل سے کام لیا۔

قطب ربانی نے دریافت کیا۔ ”کیا بات ہے شیخ احمد، کھاتے کیوں نہیں؟“
انہوں نے جواب دیا۔ ”حضرت میری کیا مجال جو کھانے سے گریز کروں لیکن اندر دل میں معلوم نہیں کون ہے جو مجھے
دوسوں میں جلا کر دیتا ہے۔ میں کھانا کھانا چاہتا ہوں لیکن دل سے آواز آرہی ہے کہ خبردار، محتاط جو کچھ بھی کھانا سوچ مجھ کو
کھانا، کھانے کی طرف سے ہر طرح اطمینان کر کے۔“
اس کے بعد شیخ احمد نے کئی بار حق حق کا نعرہ بلند کیا۔

قطب ربانی نے جواب دیا۔ ”میں تمہارے دوسو سے کا علاج کرتا ہوں، تمہارے دل کو ہاں اور نہیں کے دوسوں سے
پاک کرتا ہوں۔“

شیخ احمد نے عجز و انکسار سے فرمایا۔ ”خدا کے لیے جلدی کیجیے ورنہ میں بیمار پڑ جاؤں گا۔“
قطب ربانی نے تیز تیز نظروں سے شیخ احمد کو گھورا اور حکمانہ فرمایا۔ ”شیخ احمد! ان سوجھ بوجھ کھانوں میں جو ناپسند ہوں،
انہیں چھوڑ دو بقیہ کھا لو۔“

شیخ احمد کو یوں محسوس ہوا گویا ان کا دل دوسوں سے پاک ہو چکا ہے، انہوں نے بے ساختہ ”حق حق“ کا نعرہ بلند کیا۔
قطب ربانی نے فرمایا۔ ”شیخ احمد، یہ تو حق حق کا نعرہ کیوں لگا رہا ہے؟“
شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”مجھ کو حق حق سے سکون ملتا ہے۔“

قطب ربانی نے ارشاد فرمایا۔ ”اب آج سے تو شیخ احمد کے ساتھ ساتھ عبدالحق بھی ہے۔ یہ نام تیرے ساتھ اچھا ہے
گا۔ اب تو عبدالحق ہے اور ہمیشہ عبدالحق ہی رہے گا۔“
اس کے بعد سے وہ واقعی عبدالحق ہی ہو گئے۔

کچھ عرصہ دوسرے کے پاس رہ کر انہوں نے سیاحت اختیار کی۔ قطب ربانی نے بھی اس کی اجازت مرحمت فرمادی
تھی۔ یہ پانی پت سے ردولی پہنچے، ماں اپنے بیٹے کی یاد میں سو گوار ہو رہی تھیں۔ اچانک بیٹے کو سامنے دیکھ کر بے چین ہو گئیں
اور دیر تک بیٹے سے لگا رہیں۔

بعد میں ماں نے پوچھا۔ ”کیا تیرے بھائی تقی الدین نے تیری مدد کی؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”ذرا بھی نہیں کیونکہ بھائی تقی الدین علوم ظاہری کا درس تو دے سکتے ہیں علوم باطنی کا انہیں کوئی تجربہ نہیں۔“
ماں نے شفقت سے پوچھا۔ ”پھر تو نے کیا کیا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”پھر میں نے اپنے بھائی کی قیام گاہ چھوڑ دی اور مرشد کامل کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ مجھے پانی پت کا
ہنا بتایا گیا تھا چنانچہ جب میں پانی پت پہنچا اور وہاں قطب ربانی کے در پر ہاتھیوں اور گھوڑوں کا جھوم جو دیکھا تو میرے دل میں یہ
دوسرے پیدا ہوا کہ آخر یہ کیسا سحر ہے جو اس کو فر اور شان و شوکت سے رہتا ہے۔ میں نے اس خانقاہ میں دوبارہ جانا ہی گوارا نہ کیا اور
پانی پت کو چھوڑ دیا۔ سارا دن چلتا رہا اور بعد میں یہ معلوم ہوا کہ میں پانی پت تھا، میں عمر بھر گردش کرتا رہوں گا کسی پرکار کی طرح۔“

ماں نے بے چینی سے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“
شیخ احمد نے سب کچھ تفصیل سے بتا کر عرض کیا۔ ”ماں اب میں بہت شرمندہ بھی ہوں اور مطمئن بھی۔“
ماں نے ایک بار بھر بیٹے کو اپنے سینے سے لگا لیا اور بڑی دعا مانگی دیں۔ اس کے بعد شیخ احمد سیاحت کے لیے نکل کھڑے
ہوئے اور کئی سال تک سیاحت کرتے رہے۔ پانی پت میں پھر دوسرے کی طبیعت بہت نازک ہو گئی اور انہیں اپنی زندگی کی طرف
سے مایوسی ہو گئی۔ اپنے بیٹے شیخ احمد عارف کو بلا کر فرمایا۔ ”بیٹے عارف! اب میں عنقریب اپنے خالق کے پاس چلا جاؤں گا۔“

قطب ربانی کے صاحبزادے رونے لگے کہا۔ ”باوا جان! خدا آپ کو ہزاروں سال زندہ سلامت رکھے آپ اسکی بات نہ کیجیے۔“
شیخ عارف کی باتیں آپ نے بڑے اٹھماک سے سنیں اور فرمایا۔ ”فرزند! میرے بعد شیخ احمد جو اب عبدالحق ہو چکا ہے
تیرے پاس آئے گا تو میرے سارے تبرکات اس کے حوالے کر دے گا، کیونکہ وہی میرا خلیفہ اور سجادہ نشین ہوگا۔“

بیٹے کو رونا آئے چا جا رہا تھا۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”باوا جان! آپ اسکی باتیں نہ کیجیے میرا دل غم سے پھنسا جا رہا ہے۔“
باپ نے بیٹے کو ڈانٹ دیا۔ ”بیٹے! تو آنسو نہیں بہائے گا کیونکہ رسول ﷺ نے اس سے منع کیا ہے۔“ پھر پوچھا۔ ”کیا
میری ساری وصیتیں اور نصیحتیں تو نے سن لی ہیں؟“

بیٹے نے گلو گیر آواز میں کہا۔ ”میں نے آپ کی نصیحتیں اور وصیتیں اچھی طرح سن لی ہیں اور اللہ نے چاہا تو میں

ان پر پورا اتروں گا۔“

اس کے چند دن بعد حضرت قطب ربانی نے وصال فرمایا۔ کچھ عرصہ بعد شیخ احمد پانی پتہ واپس پہنچے۔ مرحوم قطب ربانی کے صاحبزادے شیخ عارف نے بعد ادب و احترام تبرکات ان کے حوالے کر دیے اور کہا۔ ”حضرت! پدر مرحوم فرمائے ہیں کہ ان کا سلسلہ آپ ہی سے جاری ہوگا۔ آپ ان کے جانشین ہیں۔ چنانچہ ان کے سارے تبرکات پیش خدمت ہیں قبول فرمائیے۔“
شیخ احمد نے تبرکات لے کر صبر و مشرد کے فرزند شیخ عارف پر توجہ دینا شروع کر دی اور تعلیم و تربیت دے کر انہیں مرتبہ کماں کو پہنچا دیا۔ ادھر سے فارغ ہو کر آپ نے ردولی کے لیے رختِ سبز باندھا۔ شیخ عارف نے سوگوار ہو کر وریافت کیا۔
”حضرت! میرے لیے کیا اہ شاد ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”مرشد زادے! تم میرے خلیفہ اور جانشین ہو۔ چاہو تو ردولی چلو، ورنہ یہیں رہ جاؤ۔“
مرشد زادے نے عرض کیا۔ ”میں آپ کے ساتھ ردولی چلوں گا کیونکہ آپ کے بغیر میرا وجود ہی کیا۔“
آپ مرشد زادے کے ساتھ ردولی تشریف لے گئے گھر کی حالت ہی بدل چکی تھی۔ والدین میں سے کوئی بھی بقیہ حیات نہ تھا۔ ردولی چند مکانوں کی ایک بستی کا نام تھا ورنہ ہر طرف جنگل و بیابان تھا۔ آپ اپنے آبائی مکان میں رہنے لگے۔ آپ کے عقیدت مندوں نے آپ کی صحبت میں ردولی کا قیام اختیار کیا اور اس کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا۔
آپ کے حجرے میں نہ مکہ تھا نہ بستر۔ جسم پر ایک خرقدہ تھا جس پر بے شمار بیوند لگے ہوئے تھے۔ شیخ عارف نے ایک عرصہ بعد آپ کو یاد دلایا۔ ”حضرت! کمال تیس سال گزر چکے ہیں کہ آپ کا سر بھیجے کی لذت سے نا آشنا ہے۔ اب ضعیفی میں تو سر کو آرام دے لیجیے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”کلیہ ایک ہی ذات کا کافی ہے، اس کے ہوتے ہوئے کسی اور بھیجے کی کیا ضرورت۔ اور اس بھیجے میں جو لذت ہے اس کا بیان کرنا ہی کیا۔“
شیخ عارف نے عرض کیا۔ ”حضرت! آپ کا لباس بھی بیوندوں کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے اور ان کی کثرت سے یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہ لباس کا اصل کپڑا کون سا ہے۔“

آپ نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ”مجھے اپنے لباس کی نہیں اپنی شناخت منظور ہے، اگر یہ شناخت میں نہ حاصل کر سکوں تو پھر میرے پاس رہے گا کیا لیکن اب میری شناخت میں یہ لباس بھی شامل ہو چکا ہے۔“
اس کے بعد آپ پر محویت طاری ہو گئی اور دنیا فراموش ہونے کے ساتھ ساتھ خود فراموشی میں ایسے گم ہوئے کہ سب کچھ بھلا دیا۔ وہ ذات واحد میں گم ہو چکے تھے، جمعے کی نماز پڑھنے کے۔ یہ باقاعدگی سے تشریف لے جاتے اور ردولی اتنی ترقی کر چکا تھا کہ وہاں کئی مسجدیں تعمیر ہو چکی تھیں اور ایک جامع مسجد بھی بن چکی تھی۔ آپ ہمیشہ جامع مسجد ہی میں نماز پڑھتے تھے لیکن خود ان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ جامع مسجد کہاں ہے۔

مرید اور رشتے دار آپ کی خدمت میں حاضر یاں دیتے لیکن آپ کو دنیا سے بے نیاز اور گم دیکھ کر واپس چلے جاتے۔ آپ کسی سے مخاطب ہوتے نہ کسی کا مخاطب کرنا پسند فرماتے۔ دنیا فراموشی کا یہ عالم تھا کہ رشتے دار ان کے سامنے کھڑے ہوتے مگر آپ انہیں پہچاننے سے قاصر رہتے۔

ایک دن تو بظاہر فراموشی حد کمال کو پہنچ گئی۔ آپ کا ایک استہانی قرعی رشتے کا نوجوان اس زعم میں آپ کے پاس پہنچا کہ آپ اس کو تو پہچان ہی لیں گے۔ آپ نے اپنے روبرو ایک سایہ سا محسوس کیا پوچھا۔ ”بھائی! تم کون ہو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں آپ کی بہن کا بیٹا ہوں۔“
آپ نے حیرت سے کہا۔ ”میری بہن کا بیٹا، یہ کیا ہوتا ہے؟“
بھانجے نے جواب دیا۔ ”بہن کا بیٹا بھانجا ہوتا ہے، آپ کی بہن کا بیٹا۔“
آپ نے بدستور کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”میری بہن کا بیٹا! میرا بھانجا، میں تیری بات نہیں سمجھا، میرا وقت کیوں ضائع کرتا ہے اپنی راہ لے اور میرے سامنے سے ہٹ جا۔“

بھانجے نے چڑا کر عرض کیا۔ ”میں خود کو پہچان کرانے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا، چاہے جو ہو جائے۔“
آپ نے فرمایا۔ ”پھر جلدی پہچان کر لوں گے تمہیں نہیں پہچان سکا۔“
بھانجے نے پوچھا۔ ”کیا آپ اپنی بہن کو بھول گئے؟“

آپ نے ذہن پر زور دیا، فرمایا۔ ”بہن؟ یہ کوئی چیز ہوتی تو ضرور ہے۔ ذرا اس کا اتنا پتا تو جتا۔ ممکن ہے اس طرح میں اسے پہچان لوں۔“

بھانجے نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ”حد ہے تو گویا آپ نے اپنی بہن ہی کو بھلا دیا۔ اس بہن کو جو آپ کی ماں اور باپ کی بیٹی تھی۔ آپ کے والدین کی بیٹی آپ کی بہن۔“

آپ نے ذرا سکوت اختیار کیا اور پھر فرمایا۔ ”میرے والدین کی بیٹی؟ ہاں ایک تھی تو ضرور لیکن آج کل وہ ہے کہاں؟ وہ کہاں چلی گئی۔ شاید بھین میں اس کا میرا کچھ ساتھ بھی رہا ہے۔“

بھانجے نے خوش ہو کر جواب دیا۔ ”بے شک بے شک آپ نے درست فرمایا۔ اب آپ نے پہچان لیا، بالکل صحیح پہچانا۔“

آپ نے دریافت کیا۔ ”تو تو میری بہن کا بیٹا ہے لیکن وہ میری بہن ہے کہاں؟“

بھانجے نے جواب دیا۔ ”حضرت! وہ اللہ کو پیاری ہو چکیں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہم سب کو وہیں جانا ہے بس اللہ ہی باقی رہے گا۔“

بھانجے نے عرض کیا۔ ”حضرت! اسی خود فراموشی بھی کس کام کی کہ بہن اور بھانجے تک کو بھلا دیا۔“

آپ نے پوچھا۔ ”کوئی کام کی بات کرنا ہو تو کر، وقت ضائع نہ کر۔“

بھانجے نے جواب دیا۔ ”حضرت! میرے حق میں دعا کیجیے۔ میں بہت پریشان ہوں۔“

آپ بدستور حق فرماتے رہے، اس طرح گویا انہوں نے بھانجے کی آواز سنی ہی نہیں۔

بھانجے نے ایک بار پھر عرض کیا۔ ”حضرت! کچھ میری بھی سنیے، میں کچھ عرض کر رہا ہوں۔“

آپ نے بھانجے کو غور سے دیکھ کر سوال کیا۔ ”کیا کچھ مجھ سے کہہ رہے ہو؟“

بھانجے نے جواب دیا۔ ”ہاں آپ ہی سے کہہ رہا ہوں، میں بہت پریشان ہوں میرے حق میں دعا فرمادیجیے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”لیکن تم ہو کون؟“

بھانجے نے جواب دیا۔ ”میں ہوں آپ کا بھانجا۔“

آپ نے ذہن پر زور دے کر پوچھا۔ ”بھانجا۔ یہ بھانجا کیا ہوتا ہے؟“

بھانجے نے زچ ہو کر عرض کیا۔ ”بھانجا بہن کا بیٹا ہوتا ہے۔“

آپ نے ذہن پر مزید زور دیا۔ ”بہن کا بیٹا؟ یہ بہن کیا ہوتی ہے؟“

بھانجے نے عاجز آ کر جواب دیا۔ ”حضرت! انجی انجی بہن کا مطلب سمجھا چکا ہوں اور آپ پھر پوچھ رہے ہیں کہ بہن کیا ہوتی ہے اب میں بار بار کیا بتاؤں کہ بہن کیا ہوتی ہے۔“

آپ نے ”حق حق“ کا نعرہ لگایا۔ بولے۔ ”ہاں بتا بتا یہ بہن کیا چیز ہوتی ہے؟“

بھانجے نے جواب دیا۔ ”حضرت! آپ کو اپنے والدین کا علم ہے؟ آپ کی ایک ماں تھی ایک باپ تھا؟“

آپ نے فرمایا۔ ”ہاں تھے تو سہی، پھر؟“

بھانجے نے کہا۔ ”ان کا ایک بیٹا تھا جو آپ ہیں اور ایک بیٹی تھی وہ بیٹی آپ کی بہن تھی میں اس کا بیٹا ہوں۔“

آپ نے متحسم ہو کر فرمایا۔ ”سمجھا سمجھا۔ بالکل سمجھ گیا۔“

بھانجے نے فوراً عرض کیا۔ ”میں آپ کی بہن کا بیٹا ہوں، میرے حق میں دعا کیجیے۔“

آپ پھر ”حق حق“ کہنے لگے فرمایا۔ ”دعا کروں گا ضرور کروں گا۔ تیرے لیے بھی۔ بہن کے لیے بھی، سب کے لیے دعا کروں گا۔“

اس کے بعد آپ جتنے دن بھی رہے خود فراموشی میں رہے۔ آخر سی حال میں 15 جمادی الثانی 837ھ کو آپ نے وصال فرمایا۔ آپ کا سن وقات، عارف حق احمد عبدالحق مکن، سے لکھا ہے۔

آپ کے بعد آپ کے مرشد زادے عارف خلیفہ اور سجادہ نشین رہے ان کے بعد یہ خلافت محمد بن عارف کو منتقل ہوئی اور پھر یہ خلافت حضرت، شیخ عبدالقدوس گنگوہی کو ملی اور ان سے یہ سلسلہ پورے برصغیر میں پھیلتا چلا گیا۔



سہنس سے کہا۔ ”میرے ساتھ اندر آ جاؤ اور کافی پی لو۔“
 سہنس کاؤنٹر کے پیچھے سے گھوم کر دروازے سے اندر
 کیمین میں چلا گیا۔ اس کیمین میں فرش سے چھت تک طاق بنے
 ہوئے تھے، جن میں چھوٹی چھوٹی بوتلیں بھی ہوئی تھیں۔ دوا
 فروش نے کافی تیار کرنے والی بجلی کی مشین کا پلگ آن کیا اور دو
 خالی کپ اٹھا کر اس چھوٹی سی میز پر رکھ دیے جس کی دونوں
 جانب دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے سہنس کو سامنے کی
 کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔
 ”اب مجھے بتاؤ؟“ دوا فروش نے کہا۔ ”تم کسے مار ڈالنا
 چاہتے ہو؟..... اور کیوں؟“

”کیا یہ بتانا ضروری ہے؟“ سہنس نے پوچھا۔ ”کیا یہ
 کافی نہیں کہ میں اس کا مواضدا کروں گا؟“
 تب دوا فروش نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے
 سے روک دیا۔ ”ہاں، یہ ضروری ہے۔ مجھے لازمی قائل کرنا
 ہوگا کہ جو میں تمہیں دے سکتا ہوں تم واقعی اس کے مستحق ہو۔“

”میں نے ایک افواہ سنی ہے۔“ سہنس نے کہا پھر
 گردن گھما کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ جب اسے کمال یقین
 ہو گیا کہ وہ اور دوا فروش اس چھوٹی سی پریسکرپشن فارمی میں
 تنہا ہیں تو پھر وہ دوبارہ دوا فروش کی جانب متوجہ ہو گیا۔ دوا
 فروش ایک پختہ عمر کا پتہ قد آدمی تھا لیکن اس کی عمر کا صحیح اندازہ
 لگانا مشکل تھا۔ اس کی عمر پچاس سے سو برس کے درمیان کچھ بھی
 ہو سکتی تھی۔

تنہائی کے باوجود سہنس کا لہجہ دھیما تھا۔ اس نے اپنی
 بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ تمہارے پاس
 ایک ایسا زہر ہے جس کا کسی طور سراخ نہیں لگایا جاسکتا۔“
 دوا فروش نے اثبات میں سر ہلادیا پھر وہ کاؤنٹر کے
 پیچھے سے نکل کر باہر آ گیا اور دکان کے داخلی دروازے کا اندر
 سے تالا لگا دیا۔ پلٹنے کے بعد اس کا رخ کاؤنٹر کے پیچھے بنے
 ہوئے چھوٹے سے کیمین کے دروازے کی جانب تھا۔
 ”میں کافی کا وقفہ کرنے جا رہا تھا۔“ دوا فروش نے

تمام اندیشوں سے بے نیاز ایک منصوبہ ساز کی چالاکی

کسی بھی منصوبے کو کامیاب یا ناکام بنانے کے لیے تدابیر اہم کردار
 ادا کرتی ہیں گویا... تدبیریں کرنے والا اپنی چٹکی بھر عقل کا
 اظہار کرتا ہے یہ اور بات کہ یہ اظہار اس کے ارادے ظاہر کرتا ہے یا
 معاملات پر پرنے نال دیتا ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال یہاں بھی
 تھی جس نے بڑی ہوشیاری سے منصوبہ بنایا مگر نتائج نکلنے پر نہ
 ہوش پاس رہا نہ ہاری نے ساتھ دیا۔

بانتدبیر

سلیم انور



Copied From Web

”ترياق کا معاوضہ کیا ہوگا؟“ سمپسن نے جھلاہٹ

بھرے لہجے میں پوچھا۔

”خامسا مناسب ہے۔ صرف پانچ ہزار ڈالرز۔ آخر کار ایک شخص کے لیے زعمہ رہنا بھی ضروری ہے اور اس کی گزر بسر کے اخراجات بھی ہوتے ہیں۔ چاہے اس کا مشغلہ مل کو روکنا ہی کیوں نہ ہو اور اس کا کوئی جواز نہیں کہ وہ اپنے اس مشغلے کو اپنی آمدنی کا ذریعہ نہ بنائے۔ ہے نا؟“

سمپسن نے غراتے ہوئے اپنا پستول پیچھے کر کے اسے اپنی دسترس میں ہی رکھا اور جیب میں سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال لی۔ اس نے سوچا شاید تریاق حاصل کرنے کے بعد اسے اپنے پستول کو استعمال کرنے کی ضرورت پیش آجائے۔ پھر اس نے سو سو ڈالرز کے نوٹ گڈی میں سے نکال کر گنتا شروع کیے اور..... پانچ ہزار ڈالر کی رقم دو فروش کے سامنے میز پر رکھ دی۔

دو فروش نے اس رقم کو اٹھانے کے لیے کسی قسم کی عجلت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ بولا۔ ”تمہاری بیوی کے اور اپنے تحفظ کے لیے ایک اور بات۔ تمہیں اپنے ارادے..... بلکہ سابقہ ارادے کے اعتراف میں ایک تحریر دینا ہوگی کہ تم اپنی بیوی کو قتل کرنا چاہتے تھے جس کا مجھے یقین ہے۔ پھر تمہیں اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک میں تمہاری وہ تحریر..... تمہارا اعتراف نامہ اپنے اس دوست کو نہ پہنچا دوں جو پولیس کے اس شعبے سے وابستہ ہے جو قتل کی وارداتوں کی تفتیش کرتا ہے۔ وہ اس اعتراف نامے کو یہ طور ثبوت اپنے پاس رکھے گا اگر تم نے اپنی بیوی یا مجھے قتل کرنے کا فیصلہ کیا۔“

سمپسن خاموشی سے سب کچھ منہ دیا تھا۔

دو فروش نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”جب یہ تحریر میرے دوست کے پاس حفاظت سے پہنچ جائے گی تو تب ہی میرا یہاں واپس آنا محفوظ ہوگا اور پھر میں تمہیں تریاق دے دوں گا۔ اب میں تمہیں کاغذ اور قلم دے رہا ہوں تاکہ تم لکھنا شروع کر دو۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنی میز کی دراز کھولی۔

”ارے ہاں، ایک بات تو کہنا بھول گیا۔ دو فروش گویا ہو۔“ گو میں اس پر قطعی اصرار نہیں کروں گا لیکن میرے سراغ نہ لگائے جانے والے زہر کی بات لوگوں میں ضرور پھیلا دینا۔ میری خاطر اتنا تو کر سکتے ہوتا؟ کسی کو کیا پتا کہ جو زعمہ کی تم بچارہ ہو وہ تمہاری اپنی زعمہ کی بھی ہو سکتی ہے..... اگر کوئی تمہارے دشمن ہوں تو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں مسٹر سمپسن؟“

سمپسن نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

ورنہ پھر.....“

دو فروش نے شانے اچکا دیے۔

”آل رائٹ۔“ سمپسن نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”جسے میں ہلاک کرنا چاہتا ہوں وہ میری بیوی ہے۔“

”اور کیوں؟“

تب سمپسن نے ایک طویل کہانی بیان کرنا شروع کر دی۔ اس سے مل کہ وہ اپنی داستان کھل کر بتا، کافی تیار کرنے والی بجلی کی مشین نے کافی تیار ہونے کا سنل دے دیا۔ دو فروش نے سمپسن کو رکنے کا اشارہ کیا اور اٹھ کر کافی لینے چلا گیا۔ جب وہ کافی لے کر پلٹا تو سمپسن اپنی کہانی دوبارہ بیان کرنے لگا۔

جب اس نے اپنی داستان کھل کر دیکھی تو پتہ چل گیا کہ دو فروش نے اشارت میں سر ملادیا۔

”ہاں، میں کبھی کبھار وہ زہر تقسیم کر دیتا ہوں جس کا سراغ نہیں لگا جاسکتا۔ یہ کام میں مفت کیا کرتا تھا۔ اگر میں سمجھتا ہوں کہ کیس مستحسن ہے۔ میں نے کئی قاتلوں کی مدد کی ہے۔“

”فائن! سمپسن نے کہا۔“ ”تب یہ مجھے بھی دے دو۔“ دو فروش اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے لگا۔ ”میں پہلے ہی دے چکا ہوں۔ جس وقت کافی تیار ہو رہی تھی تو میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ تم اس کے مستحق ہو..... جیسا کہ میں نے کہا تھا میں یہ زہر مفت دیا کرتا ہوں لیکن اس کے تریاق کی ایک قیمت ہے۔“

یہ سن کر سمپسن کے چہرے کا رنگ اڑ گیا لیکن اسے اس بات کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ اسے گمان تھا تو اس بات کا کہ اس کے ساتھ یا تو عہد شکنی ہو سکتی ہے یا پھر کسی طریقے سے بلیک میل کیا جاسکتا ہے۔ اس نے فوراً ہی اپنی جیب میں سے ایک پستول نکال لیا۔

پتہ چل گیا کہ دو فروش نے پستول پر نگاہ پڑتے ہی ایک ہلکا سا قہقہہ لگا لیا۔ ”تم اسے استعمال کرنے کی جرأت مت کرنا۔ کیا تم ان میں سے زہر کا تریاق تلاش کر سکتے ہو؟“ اس نے اپنے عقب کے طاقتوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہاں تو ہزاروں بوتلیں رکھی ہوئی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں کوئی زیادہ تیز اثر زہر کی شیشی ہاتھ میں آجائے اور اگر تم سمجھ رہے ہو کہ میں تمہیں دھوکا دینے کے لیے جھوٹ بول رہا ہوں کہ میں نے تمہیں حقیقت میں زہر نہیں دیا ہے تو پھر دیر مت کرو اور مجھے شوٹ کر دو۔ تمہیں اس کا جواب تین گھنٹے میں مل جائے گا جب زہر اپنا اثر دکھانا شروع کر دے گا۔“



زندہ بھوت

تویر ریاض

یہ حقیقت ہے کہ علم کسی کو کوئی انتہا نہیں البتہ انسانی عقل کی ایک حد ضرور مقرر ہے... اس علم کو استعمال کرنے کا اختیار بھی اللہ نے مکمل طور پر انسان کے ہاتھ میں دیا ہے۔ وہ بھی ایک عجب فریب تھا... جس کا وجود نہیں تھا وہ ہی نظر آتا اور جو نظر آتا اس کا کوئی نشان تک نہ ملتا تھا۔

دل کے چوراہے اور نظر کے دھوکوں پر مشتعل ایک حیرت انگیز کہانی

وہ بوڑھی عورت اپنی ایک آنکھ سے مسلسل گھورے جا رہی تھی لہذا جولی نے مسکراتے ہوئے مٹی کا پیالہ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ ذون نے بھی اس کی تقلید کی۔ پہلا گھونٹ لیتے ہی جولی پڑسکون ہو گئی، ورنہ وہ سوچ رہی تھی کہ چائے کے نام پر جو شراب انیس پیش کیا گیا ہے، اس کا ذائقہ نہ جانے کیسا ہو۔ گرما گرم سبز چائے اس کی توقع سے بڑھ کر خوش ذائقہ تھی جس میں یقیناً شہد، سرکہ اور شاید... دل چینی بھی ملائی گئی تھی لیکن جولی کو یہ سب جاننے کی ضرورت

سپینس ڈائجسٹ 41 فروری 2015ء

Copied From Web

نہیں تھی۔ وہ اطمینان سے بیٹھی چائے کے گھونٹ لیتی اور مسکراتی رہی۔

ڈون اس کے برابر نہیں گھاس پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس نے بھی ایک بھر پور مسکراہٹ کے ذریعے چائے کی تعریف کی تو بوڑھی عورت نے گھورنا بند کر دیا اور اپنی پوتی کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا اور اطمینان سے کٹن سے فیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ٹین کی چھت والا کٹری سے بنا کا بیج جزیرے کے دور افتادہ حصے میں واقع تھا۔ اس میں بجلی تھی اور نہ ہی کوئی فرنیچر البتہ ہر کونے میں بڑی بڑی موم بتیوں روشن تھیں۔ ایک پردے کے ذریعے اس کمرے کو بقیہ کالنج سے علیحدہ کیا گیا تھا اور موم بتی کی روشنی میں سفید دیواروں پر سائے نقش کرتے نظر آ رہے تھے۔ جائزہ لینے کے بعد جولی نے سوچا کہ یہ کسی ویسٹ انڈین ہارر فلم کے لیے مکمل سیکس ہو سکتا ہے۔

ان گے یہاں آنے کا مقصد ڈون کو اپنی نئی کتاب کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھا کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے دنوں میں تفصیل سے بیان کرنے کا عادی تھا اور اس کے لیے وہ انتہائی حد تک جان سکتا تھا۔ وہ ایک سسٹمز تحریر لکھنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا جس کا پس منظر جزائر عرب البند تھے، لہذا وہ اس کے لیے ہر سرج کرنے کی غرض سے سینٹ تھامس میں آیا تھا اور اسی سلسلے میں وہ ابوبی قبیلے سے تعلق رکھنے والی اس ایک چشم عورت کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

”سب سے پہلے میں تمہیں ایک بات بتادینا ضروری سمجھتی ہوں۔“ بوڑھی عورت نے دہمی آواز میں کہا۔ ”تم اپنی کتاب میں کوئی ایسی بات نہیں لکھو گے جس سے یہاں کے رہنے والوں کی دل آزاری ہو اور نہ ہی ان کے مذہبی عقائد اور رسم و رواج کا منہمکہ اڑاؤ گے یا اس پر کتہ چینی کرو گے۔“

”میں ہر فرد کے عقیدے کا احترام کرتا ہوں۔“ ڈون نے اپنی میزبان کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ”میں اس جزیرے کی تہذیب و ثقافت کو نکتہ طور پر صحیح انداز میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یونیورسٹی آف دی ورجن آئی لینڈ کے پروفیسر لیگ کا کہنا ہے کہ تم اس موضوع پر مکمل دسترس رکھتی ہو۔“

بوڑھی عورت نے یہ سن کر قہقہہ لگایا۔ جولی نے اس کی جانب چونک کر دیکھا۔ کمرے کی مدھم روشنی میں اس کے سفید دانت چمک رہے تھے۔ اس کی ایک آنکھ بادامی جبکہ دوسری زرد تھی جس سے کم دکھائی دیتا تھا۔ اس عیب کے باوجود وہ خاصی خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ اس نے قدم

افریقی عورتوں کی طرح ایک لالبا چھہ بہن رکھا تھا جس پر نیلے اور بادامی رنگ کی دھاریاں پڑی ہوئی تھیں۔ سر کے بالوں کو اس نے ایک گول ٹوپی سے ڈھانپ رکھا تھا اور کانوں میں بڑی بڑی بالیاں جمول رہی تھیں۔

”مذات میں کہہ دیا ہوگا۔“ عورت نے کہا۔ ”ممکن ہے کہ وہ ٹھیک ہی کہتا ہو۔ ویسے وہ وقتاً فوقتاً میرے پاس لوگوں کو بھیجتا رہتا ہے جن میں ڈاکٹر، اسکالر اور مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل ہیں۔ ایک دفعہ اس نے کسی ماہر نفسیات کو بھیج دیا وہ بھی ایک کتاب لکھ رہا تھا۔ ایسے پور لوگوں کو میں منہ نہیں لگاتی۔ اسی لیے میں نے اسے چائے بھی نہیں پلائی لیکن تم مجھے اچھے آدمی لگے ہو اور تمہاری بیوی بھی بہت خوب صورت ہے۔ میں تم دونوں کو کس نام سے پکاروں۔“

”میرا نام ڈون ہے۔“ مرد نے کہا۔ ”اور یہ جولی بیکسٹر ہے۔۔۔۔۔ اور یہ میری بیوی نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ابھی ہماری شادی نہیں ہوئی۔“

بوڑھی عورت کی بادامی آنکھ جولی کے چہرے پر جم گئی لیکن اس نے شرمانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ بوڑھی عورت نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے سامنے ایک تیس سالہ پرکشش عورت بیٹھی ہوئی تھی جس نے بڑے سلیقے سے اپنے آپ کو سنوار رکھا تھا۔ اس نے ہلکا سوتی لباس پہن رکھا تھا جو اس نے تازہ روزی نورست شاپ سے خریدا تھا۔ عورت کی نظر اس کے ہاتھوں پر گئی جس کی درمیانی انگلی میں سونے کی انگلی نظر آ رہی تھی۔

”میرا نام مرینہ ہے۔“ بوڑھی عورت نے کہا۔ ”ابھی تک تمہاری شادی نہیں ہوئی۔ کوئی بات نہیں، جلد ہو جائے گی۔“ اس کی نظریں ابھی تک انگلی پر جمی ہوئی تھیں۔ جولی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں بیوہ ہوں۔ میرے شوہر کا چند ماہ قبل ہی انتقال ہوا ہے۔ ڈون ہمارا پرانا دوست ہے اور اس کا اصرار تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ سینٹ تھامس چلوں۔“ یہ کہہ کر اس نے ڈون کی طرف دیکھا تو اس کی بات سن کر مسکرا رہا تھا۔ ”جہاں تک ہماری شادی کا تعلق ہے۔ ہمارے درمیان اس موضوع پر گفتگو ہوئی ہے لیکن میں اتنی جلدی شادی نہیں کروں گی۔ ابھی۔۔۔۔۔ شوہرں جدائی کا کم تازہ ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔“ بوڑھی عورت نے سادگی سے کہا۔ ”تمہیں اس پر قابو پانے میں کچھ وقت لگے گا۔ میرے شوہر کو مرے ہوئے عرصہ ہو گیا۔ اس وقت تم شاید پیدا ابھی نہ ہوئی ہو گی لیکن میں کافی عرصے تک اس کے تم

کی نظریں ڈون کی جانب اٹھ گئیں اور بولی۔ "اور تم اس وقت کہاں تھے؟"

ڈون کا چہرہ سفید پڑ گیا، وہ بولا۔ "معاف کرنا، میں کچھ سمجھا نہیں۔"

اس گفتگو کے دوران مرینہ نے تیسری بار قہقہہ لگا یا اور سر کو پیچھے لے جاتے ہوئے بولی۔ "میں نوہ لینے والی جاؤ گری ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی ہنسی پر قابو پایا اور ایک بار پھر آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ "یہ سوال میں نے تم سے اس لیے پوچھا کہ میں نے ایک سایہ دیکھا۔ جب میں نے دروازہ کھولا تو وہ مجھے تمہارے پیچھے نظر آیا تھا۔ میں حیران رہ گئی کہ وہ سایہ کس کا ہو سکتا ہے لیکن اتنا جانتی ہوں کہ وہ ایک مرد تھا۔ اس نے سر کی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا جس پر چوڑی دھاریاں تھیں۔ نیلی ٹائی پر چھوٹے چھوٹے ستارے بنے ہوئے تھے۔ چاندی جیسے ہال اور زرد آنکھیں..... نہیں زرد نہیں اس کے لیے ایک اور لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔"

"بھئی۔" بولی نے سر کو کھینچ کر تے ہوئے کہا۔ "ہاں، یہ صحیح لفظ ہے۔" بوڑھی عورت بولی۔ "وہ تمہارے ساتھ یہاں آیا تھا۔"

جولی سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ چاروں طرف نگاہیں گھمانے لگی جیسے اس سائے کو دیکھنا چاہ رہی ہو۔ اس نے دیکھا کہ ڈون بھی ایسا ہی کر رہا تھا پھر انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اپنی میزبان کی جانب متوجہ ہو گئے۔

"کیا وہ اب بھی یہیں ہے؟" جولی نے پوچھا۔ "میرے بچے، وہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا لیکن تم اسے دیکھ نہیں سکو گے کیونکہ تمہارے پاس وہ آنکھ نہیں ہے لیکن میں اسے دیکھ سکتی ہوں بلکہ میں ہر شخص کو دیکھ سکتی ہوں چاہے وہ زندہ ہو یا مردہ۔ یہ طاقت صرف مجھے حاصل ہے۔" پھر اس نے آواز لگائی۔ "سیلینا!"

وہی خوب صورت لڑکی مگن سے برآمد ہوئی۔ اس نے ان کی پیالیوں میں اور چائے ڈال دی اور خاموشی سے چلی گئی۔ "چائے پیو۔" مرینہ نے حکم صادر کیا۔ "یہ جمبی چائے ہے اور صرف ان لوگوں کو پیش کی جاتی ہے جنہیں میں پسند کرتی ہوں۔ مجھے تم لوگ پسند آئے۔"

ڈون نے چائے کا گھونٹ لیا اور بولا۔ "جمبی چائے، جمبی کے معنی تو بھوت پریت کے ہیں۔ امریکا میں انہیں زومبی کہا جاتا ہے۔"

مرینہ نے اپنا سر ہلایا اور اسے ایک آنکھ سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "نہیں، تم اس بارے میں غلطی پر ہو اور تمہیں

نہات حاصل نہ کر سکی تھی۔ اسی طرح تمہیں بھی اس میں کچھ وقت لینے کا پھر تم اس کے بارے میں ضرور سوچنا۔" اس نے انگوٹھے سے ڈون کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ خوش شکل ہے اور عمر میں تقریباً تمہارے ہی برابر ہے۔ کیا تمہارے بچے ہیں؟"

جولی شرمائی۔ وہ یہاں کے لوگوں کی طرح صاف گو نہیں تھی اس نے کہا۔ "میرا کوئی بچہ نہیں اور تمہارے؟"

"پانچ۔" مرینہ دانت نکالتے ہوئے بولی۔ "تین لڑکے اور دو لڑکیاں۔ ایک لڑکا مر چکا ہے۔ وہ غشیات فردشوں کے گروہ میں شامل ہو گیا تھا اور ایک جھگڑے کے دوران گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا۔ میرے نو پوتے، پوتیاں اور نو اسے، نو اسیاں ہیں۔ یہ میری سب سے چھوٹی پوتی ہے جس نے تمہیں چائے دی تھی۔ اس کا نام سیلینا ہے۔"

"بہت خوب صورت لڑکی ہے۔" جولی نے کہا۔ "ہاں، میرے جیسے کی ساری خوب صورتی اسے مل گئی ہے۔" یہ کہہ کر وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگی جس سے اس کے کانوں میں بڑی بالیاں آگے پیچھے ہولنے لگیں پھر اچانک ہی اس کی ہنسی رک گئی اور وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ "تمہارے شوہر کی کیا عمر ہوگی؟"

جولی نے ہلکی جھپکاتے ہوئے کہا۔ "وہ اکیاون سال کا تھا۔"

"گو یا تمہاری عمر سے دو گنا۔ اس کی موت کیسے واقع ہوئی؟" جولی نے ایک بار پھر ہلکی جھپکاتے ہوئے کہا۔ "وہ ہمارے پام بیچ والے گھر کی سیزھیوں سے گر گیا تھا۔"

"پام بیچ، یہ تو فلوریڈا میں ہے۔ میرا خیال تھا کہ تم نیویارک کی رہنے والی ہو۔"

"ہاں، ہمارے گھر دونوں جگہوں پر ہیں۔ اس کے علاوہ لندن میں مکان اور دہلی میں ایک ولا بھی ہے۔ میرے شوہر کا ان سب جگہوں پر آنا جانا لگا رہتا تھا۔ وہ ایک بہت بڑی کمپنی کا سربراہ تھا۔ ورلڈ وائیڈ کمپیوٹرز..... شاید تم نے یہ نام سنا ہو۔"

"اوہ، تم تو خاصی امیر عورت ہو۔" مرینہ نے حیرت سے کہا۔ "جب تمہارا شوہر سیزھیوں سے گرا تو تم اس کے پاس ہی تھیں؟"

اس سوال پر جولی کچھ بے چکن سی ہو گئی۔ اس نے کہا۔ "نہیں، جب یہ حادثہ پیش آیا اس وقت میں نیویارک میں تھی۔"

"حادثہ۔" بوڑھی عورت نے سر کو کھینچ کر کہا پھر اس

دلچسپ عورت ہے اور اس نے مجھے کتاب کے لیے چھا
خاصا مواد فراہم کیا ہے۔“

”پھر تو ہمیں کوئی نقصان نہیں ہوا۔“ جولی اپنے خوف
پر قابو پانے کے لیے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ”اور
اس پر اسرار چائے کے بارے میں کیا کہو گے؟“

”وہ سبز چائے تھی اور اس میں شاید کوئی نشہ آور شے
ملائی گئی تھی۔ مجھے تو ہلکی ہلکی غنودگی محسوس ہو رہی ہے۔“

”میرا بھی یہی حال ہے۔“ جولی نے کہا۔ ”کیا تم
نہیں سمجھتے کہ اس نے ہمیں نشہ دیا؟“

ڈون نے اس کی جانب دیکھا اور بولا۔ ”وہ ایسا
کیوں کرے گی ڈارلنگ اور تمہیں ایسی احمقانہ باتوں سے
پریشان نہیں ہونا چاہیے۔“

”احمقانہ۔“ وہ تعجب سے بولی۔ ”میں تو سمجھتی تھی کہ تم
جادو تو نے اور جن بھوتوں پر یقین رکھتے ہو اور دیگر مذاہب یا
رسومات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بہت پُر جوش
ہو جاتے ہو۔“

جولی نے محسوس کیا کہ اس بار ڈون نے قہقہہ نہیں
لگایا۔ اس نے اپنی نظریں سامنے سڑک پر جمائی ہوئی تھیں
لیکن وہ دیکھ سکتی تھی کہ کار کا انٹرکنڈیشنر چلنے کے باوجود ڈون
کی پیشانی اور گردن سے پسینا بہہ رہا تھا اور اسٹیرنگ پر
رکھے ہاتھ لرز رہے تھے۔

اس وقت وہ جزیروں کے اس حصے میں تھے جو
یوڈونی کہلاتا تھا۔ یہ جگہ ساحل پر بنے ہوئے ہوٹلوں سے
بہت دور تھی۔ جولی نے ڈیش بورڈ پر لگی ہوئی گھڑی میں
وقت دیکھا۔ ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ انہوں نے لچ
کے بعد سے اب تک کچھ نہیں کھایا تھا۔

”مجھے بھوک لگ رہی ہے، ہمیں کچھ کھالینا چاہیے۔“
اس نے آئب ریستورنٹ کا انتخاب کیا جو لائبریری
سے زیادہ دور نہیں تھا۔ جزیرے کا موسم گرم تھا جس کا
اندازہ انہیں پارکنگ لاٹ سے ریستورنٹ تک آتے ہوئے
ہو گیا تھا تاہم وہ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی کہ ڈون بری طرح
پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ چہرہ سرخ اور سانس پھول رہی تھی۔

صاف لگ رہا تھا کہ اس بوڑھی عورت مرینہ سے
مٹنے کے بعد وہ پریشان ہو گیا تھا۔

وہ داخلی دروازے سے کافی دور ایک الگ تھلگ
کوٹہ میں جا کر بیٹھ گئے۔ جولی نے نظریں گھما کر گاڑوں
سے بھرے ہوئے ہال کا جائزہ لیا۔ دیواروں پر خوب
صورت تصاویر آویزاں تھیں اور مہانگی کی میزوں پر سین

اپنی کتاب کے لیے زیادہ جاننے کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔
بے شک یہ بھوت پریت یا تو چھپے عیروں پر چلنے والی چڑیلیں ہیں
لیکن تم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔“

”میں سمجھ گیا۔“ ڈون نے یہ کہہ کر گھاس پر پڑے
ہوئے چھوٹے سے ٹیپ ریکارڈر کی طرف دیکھا تا کہ یقین
کر سکے کہ ان کی گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہے پھر بولا۔ ”یہ کس
قسم کی رد میں ہیں، اچھی یا بری؟“

”دونوں لیکن زیادہ تر بدرد میں ہوتی ہیں اور یہ نقصان
پہنچا سکتی ہیں لیکن کبھی کبھی یہ بے ضرر بھی ہوتی ہیں اور کسی چیز کی
حفاظت میں دو دنیاؤں کے درمیان بھٹکتی رہتی ہیں۔“ جولی نے
اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنناٹاٹ محسوس کی۔

”انہیں کس چیز کی حفاظت ہوتی ہے؟“
مرینہ نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور بولی۔ ”وہ
حقیقت جاننے کے لیے ادھر ادھر بھٹکتی رہتی ہیں۔“ اس کا
چہرہ جگمگا اٹھا اور وہ ایک بار پھر قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

”مرغی سڑک کیوں پار کرتی ہے؟“
ڈون مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تا کہ سڑک کے دوسری
جانب جا سکے۔“

وہ عورت بولی۔ ”وہ مرغی بدروح بھی ہو سکتی ہے۔“
”بہت خوب۔“ ڈون نے کہا۔ ”اور یہ چائے؟“
”یہ چائے تمہیں دوسری دنیا کو دیکھنے میں مدد دے
گی۔ اس کو پینے کے بعد تم بھوتوں اور بدروحوں کو دیکھ سکو
گے۔ اس کا اثر ایک دن تک رہتا ہے یعنی سورج غروب
ہونے سے لے کر اگلے روز سورج غروب ہونے تک۔ اس کے
بعد تمہیں دوبارہ یہ چائے پینا ہوگی۔“ پھر وہ جولی سے
مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

”تم اس چائے سے لطف اٹھاؤ جب تک میں
تمہارے ساتھی سے اس کی کتاب کے بارے میں کچھ
باتیں کر لوں۔“

☆☆☆
”یہ سب بہت سنسنی خیز تھا۔“ ڈون نے واپسی کے
دوران کرائے کی کار چلاتے ہوئے کہا۔
”بہت زیادہ۔“ جولی نے اس سے اتفاق کرتے
ہوئے کہا۔ ”اس نے رچھڑکا حلیہ ہو بہو بیان کر دیا۔ یہ سب
اسے کیسے معلوم ہوا؟“

ڈون قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”یاد کرو، اس نے کیا
کہا تھا کہ وہ غیر معمولی قوت کی حامل ہے لیکن ڈارلنگ! تم
اسے بھول جاؤ۔ وہ صرف دکھاوا کر رہی تھی، البتہ وہ کافی

دیکھی لے رہا ہے۔

رجہ ڈاؤن اس دنیا سے جا چکا تھا اور اب ڈون اس کی غمزدہ بیوہ اپنے ساتھ ریسرچ کے لیے ورجن آئی لینڈ لے آیا تھا۔ اس نے جولی سے اصرار کیا کہ اس سفر پر جتنے بھی اخراجات ہوں گے، وہ ادا کرے گا۔ فی الوقت تو ہوائی جہاز کے قیمت سے بے کر ہوٹل، کرائے کی کار اور یہاں تک کہ اس ڈنر کی ادا ہوگی بھی وہی کر رہی تھی۔ اس نے جولی سے شادی کرنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا تھا لیکن اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ وہ اس پر غور کرے گی اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ اسے اس سلسلے میں کچھ وقت درکار ہے۔

اب وہ ڈنر کرتے ہوئے اس شخص کے بارے میں سوچ رہی تھی جو کبھی اس کے شوہر کا دوست تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ کبھی اس سے شادی کر سکے گی۔ اس کا زوال پذیر کیریئر اور بڑھتی ہوئی شراب نوشی نے اسے ایک ایسا غیر مطمئن اور موذی شخص بنا دیا تھا جس کا ساتھ کسی عورت کے لیے خوشنواں نہیں ہو سکتا اور یہی وہ شخص تھا جس نے آخری بار رجہ ڈاؤن کو زندہ دیکھا تھا۔ اس روز وہ رجہ ڈاؤن کے ساتھ اس کے پام بیچ والے گھر میں موجود تھا اور دونوں شراب نوشی کر رہے تھے۔

اس نے بل کی ادا ہوگی کے لیے ویٹر کو اپنا کریڈٹ کارڈ دیا تھا اور اس کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اچانک اس کی نگاہ ڈون کے عقب میں کھڑے ایک شخص پر پڑی جو ریستوران کے آخری سرے پر داخلی دروازے کے نزدیک نظر آ رہا تھا۔ لہذا قدم چاندی جیسے بال، دھاریوں والا سوٹ اور نیلی ٹائی جس پر سفید ستارے چمک رہے تھے۔ وہ ہوہو رجہ ڈاؤن اور اپنی منگنی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ جولی نے اسے دیکھا اور ہانپنے لگی۔

”کیا ہوا؟“ ڈون نے اپنے پسندیدہ مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”کچھ بڑبڑ ہے؟“

”اوہ خدایا۔“ وہ سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ ”وہ دیکھو رجہ ڈاؤن۔“

ڈون نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور جولی نے محسوس کیا کہ اس شخص پر نظر پڑتے ہی ڈون کی کمر میں سختی آگئی۔ وہ کافی پر تک اسے دیکھتا رہا اور جب جولی کی طرف مڑا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل چکی تھیں۔ اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ ”یہ کیا مصیبت ہے؟“

یعنی اسی وقت ویٹر، جولی کا کریڈٹ کارڈ اور ادا ہوگی کی رسید لے کر آگیا۔ وہ اس طرح کھڑا ہوا تھا کہ انہیں ہال کا بقیہ حصہ اور داخلی دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا اور جب ویٹر وہاں

سے پوش پڑے ہوئے تھے۔ سب سے اچھی بات یہ کہ ہال کا انٹرکٹو لیشتر خوب ٹھنڈک دے رہا تھا۔ مستعد اور چاق و چوبند ویٹرس نے فوراً ہی ان کی میز پر مشروبات لا کر رکھ دیے۔ اب ڈون کی حالت قدرے بہتر نظر آ رہی تھی لیکن جولی نے نوٹ کیا کہ ڈون نے اپنا گلاس فوراً ہی خالی کر لیا تھا۔ کھانے کے دوران وہ زیادہ تر خاموش رہے اور جولی کو یہی اچھا لگتا تھا۔ وہ اپنے گرد بیٹھے لوگوں کی باتیں سن رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اس گانے سے بھی لطف اندوز ہو رہی تھی جو ایک خوش شکل مقامی گلوکار کو نے میں رکھے ہوئے پیانو پر گارہا تھا۔

وہ یہ بات برسوں سے جانتی تھی کہ ڈون شراب پینا ہے لیکن اس سے پہلے اس نے بھی اس طرح بتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اور رجہ ڈاؤنوں ایک ہی ہیلتھ کلب میں جایا کرتے تھے اور ہفتے میں دو بار ریکٹ ہال بھی کھیلا کرتے تھے اور جب وہ درمیان میں آئی، اس وقت تک دونوں بہترین دوست بن چکے تھے۔ چھ سال پہلے جولی کی ملاقات رجہ ڈیکسٹر سے ہوئی جس کی کھلی ہوئی مرچنگ تھی۔ وہ کھلی نظر میں ہی ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے اور جب اس کی شادی رجہ ڈاؤن سے ہوئی تو ڈون بھی اس کا دوست بن گیا۔

وہ جولی سے چار سال بڑا تھا۔ اس طرح اب اس کی عمر چھتیس برس ہو چکی تھی جبکہ گزشتہ چند ماہ سے بطور مصنف اس کا کیریئر زوال پذیر تھا۔ اس نے دس سال پہلے اپنا پہلا ناول لکھا جو پسند کیا گیا اور اس کی فروخت بہت اچھی رہی لیکن بعد میں لکھی جانے والی کتابوں کو پہلے کی طرح پذیرائی نہ مل سکی جس کی وجہ سے اسے ملنے والے معاوضے میں کمی کی آگئی۔ یہ ایک طرح سے پبلشنگ کی صنعت کے زوال کی شروعات تھی اور اس صورت حال میں غیر معمولی ناول ہی کامیاب ہو سکتے تھے۔

اس دوران ڈون نے ان لوگوں سے اس حد تک مراسم بڑھالیے کہ وہ ایک طرح سے ان کے گھر کا فرد بن گیا۔ ہر اہم تقریب اور موقع پر اس کی موجودگی ناگزیر بھی جاتی تھی۔ وہ ہمیشہ برج اور ریکٹ ہال میں رجہ ڈاؤن کا پارٹنر بنتا اور اپنے ناولوں کو مقررہ وقت میں مکمل کرنے کی خاطر ان کے مختلف گیسٹ روم میں قیام کرتا۔ وہ ان کے ساتھ لندن، پیرس، روم، ہانگ کانگ کا سفر کرتا۔ ویسے تو رجہ ڈاؤن کے ساتھ بڑی عزت و احترام سے پیش آتا لیکن مذاقی ہی مذاقی میں جولی کو اس کا نام لے کر چھیڑتا رہتا تھا۔ جولی اور اس کے مرحوم شوہر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ڈون لارن، جولی میں

سے ہٹا تو وہ شخص جاچکا تھا۔ جولی نے ڈون کی ہلکی سی چیخ سنی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور میزوں کے درمیان سے راستہ بنا تا ہوا داخلی دروازے کی جانب لپکا۔ جولی نے بھی جلدی سے اپنا پرس اٹھایا اور اس کے پیچھے چل دی۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ حیرت سے انہیں دیکھنے لگے۔

جولی ریستوران کے تنگ ماحول سے نکل کر گرم مرطوب گلی میں آئی اور اندھیرے میں دائیں بائیں جھانکنے لگی۔ ادھر ڈون اپنی کار کی مخالف سمت گلی میں دوڑ رہا تھا اور اس کا رخ مرکزی سڑک کی جانب تھا۔ رات کے سناٹے میں اس کے بھاری قدموں کی آواز پوری گلی میں گونج رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے بھاگی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس نے دوپٹی بڑی والے جوئے نہیں پہن رکھے تھے۔

ڈون نے اس نے عقب سے اسے پکارا لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ بالآخر وہ گلی اور مرکزی سڑک کے سنگم پر اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ فٹ پاتھ پر کھڑا سڑک کے دونوں جانب دیکھ رہا تھا۔ مرکزی سڑک پر بھی بہت زیادہ روشنی نہیں تھی اور تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ پوری سڑک تاریکی اور سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی پھر انہیں اپنے بائیں جانب کسی کے دور جانے کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ ڈون نے اس کا تعاقب کیا اور جولی بھی اس کے پیچھے چل دی۔

انہوں نے اسے ایک بلاک کے قاصدے پر ایک اسٹریٹ لیمپ کے نیچے سے گزرتے دیکھا۔ وہ مارکیٹ اسکوائر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا اوپن ایر پلازا تھا جسے وہ گزشتہ روز لائبریری جاتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے تیزی سے سڑک پار کی اور مخالف سمت کی فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ مارکیٹ اسکوائر سے گزرنے کے بعد وہ ایک تاریک گلی میں داخل ہو گیا اور اس کے قدموں کی آواز آہستہ آہستہ معدوم ہوتی چلی گئی۔ یوں لگا جیسے وہ شخص چلتے چلتے غائب ہو گیا ہو۔ ڈون نے آگے کی جانب چھلانگ لگائی۔ جولی بھی اس کا ساتھ دینے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ اس جگہ تک پہنچ گئے جہاں آخری بار وہ شخص انہیں نظر آیا تھا۔ وہ ایک بڑی عمارت کے سامنے رک گئے۔ جولی نے اس کے بند دروازوں اور کھڑکیوں اور صلیب کے نشان کی طرف دیکھا اور بولی۔

”سینٹ پیٹر اور پال۔“ اس نے یہ آواز بلند عمارت کی پیشانی پر لکھی ہوئی عمارت پڑھی اور بولی۔ ”ڈون! یہ ایک گرجا ہے کیتھولک چرچ۔ میرا خیال ہے کہ وہ اندر گیا ہے۔“

”مجھے تو یہ مقفل نظر آ رہا ہے۔“ ڈون نے اپنی سانس

پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”کیا گرجا میں بھی تالا لگایا جاتا ہے؟“ جولی نے پوچھا۔ ”میں سمجھتی ہوں کہ یہ ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ دو تین میزھیاں اور پرگنی اور بند دروازوں کو دیکھنے لگی۔

”اب ایسا نہیں ہوتا۔“ ڈون بولا۔ ”ویسے بھی یہ ہمیں کس طرح معلوم ہوگا کہ وہ اندر گیا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ اس وقت گرجا میں کیوں جائے گا؟“

جولی اس کی طرف مڑی اور اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ”رچرڈ... بھی کیتھولک تھا۔“

”وہ رچرڈ نہیں تھا۔“ ڈون چلاتے ہوئے بولا۔ ”وہ رچرڈ سے ملتا جلتا کوئی شخص ہے۔“

جولی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی اور بولی۔ ”پھر ہم اس کا تعاقب کیوں کر رہے ہیں؟“

ڈون نے اسے گھورا اور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ ”اب ہمیں چلنا چاہیے۔ میں نہیں سمجھتا کہ شہر کا یہ حصہ رات میں بھوت پریت کے حوالے سے محفوظ ہے۔ ہمیں یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔“

”یہ کیا پاگل پن ہے؟“ جولی چلاتے ہوئے بولی۔ ”ڈون! تم احقانہ باتیں کر رہے ہو۔ بھوتوں کا کوئی وجود نہیں۔ یہ سب کہانیاں ہیں۔“

ڈون نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بہت سے لوگ ان چیزوں کے وجود پر یقین رکھتے ہیں۔“

جولی نے نہ ماننے والے انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ”سمجھ دار لوگ ان پر یقین نہیں کرتے۔“

”اب میں پاگل ہو جاؤں گا جولی۔ تم نے اسے دیکھا ہے، خدا کے واسطے بتاؤ کہ کیا تم اپنے شوہر کو بھی نہیں پہچانتی؟“

وہ دونوں سیٹ ہاؤس کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ جولی نے کہا۔ ”اپنی آواز پہنچی رکھو ورنہ دوسرے لوگ جاگ جائیں گے۔“

”کیا ہم رنر کارٹن میں نہیں ٹھہر سکتے تھے؟“ ڈون نے جھلاتے ہوئے کہا۔

جولی نے اس پر طنز کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری جیب میں پیسے نہیں لیکن شوق مہنگے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ مجھے ایسی ٹیمپس پسند نہیں جہاں سیاحوں کا جھگڑا ہو۔ اس کے بجائے میں یہاں قیام کرنا پسند کروں گی۔“

اس سیٹ ہاؤس کی مالکن میگی نیویارک میں جولی کی کلاس فیلو ہوا کرتی تھی اور اسے اپنے مہمانوں کا بہت خیال

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریٹریوم ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر پو پو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

رہتا تھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ ڈون نے بحالت مجبوری اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں ابھی تک یہ نہیں جان پایا کہ وہ شخص کون تھا؟“

”تم کچھ دیر پہلے خود ہی کہہ چکے ہو کہ وہ رچرڈ سے ملتا جلتا کوئی آدمی تھا۔ اس نے سی ریسٹوران میں کھانا کھایا جہاں ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد وہ وہاں سے چل دیا۔“

”اس کے کپڑوں کے بارے میں کیا کہو گی؟“ ڈون نے اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے کہا۔

”سرکئی دھاری دار سوٹ اور اس کی پسندیدہ نیلی نائی جس پر سفید ستارے بنے ہوئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم نے رچرڈ کو زخمی کپڑوں میں دفن کیا تھا۔“

جولی نے غمی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس طرح کے سوٹ عام ہیں اور وہ ٹائی میں نے سیل میں خریدی تھی۔ اس طرح کی ہزاروں ٹائیاں بازار میں مل جائیں گی۔“

ڈون اب بھی قائل نہیں ہوا اور کہنے لگا۔ ”تمہیں یاد ہے مرینہ نے کیا کہا تھا کہ اس کی چائے بننے کے بعد ہم... بروحوں کو دیکھ سکتیں گے۔ اس بارے میں کیا کہو گی؟“

”اوہ ڈون! تم جس طرح کی باتیں کر رہے ہو انہیں سن کر تو لگتا ہے کہ کچھ دیر بعد تمہیں گلابی ہاتھی بھی نظر آنے لگیں گے۔“

”شکریہ جولی! شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ جولی کو اکتا ہوتے ہوئے لگی تھی۔ وہ اس کے پاس آئی اور بازو چھتھپاتے ہوئے بولی۔ ”تاریخ مت ہو ڈیر اور دیر تک مت جاگنا۔ تمہیں کل صبح دوبارہ لائبریری جانا ہے۔ اس کے بعد ہم ساحل پر جائیں گے، شب بخیر۔“

جب وہ گیسٹ ہاؤس کے اندر جانے لگی تو اس نے ڈون کو بڑبڑاتے ہوئے سنا۔ ”آئی لو یو۔“

وہ بستر پر لیٹتی چمت پر لگے ہتھکے کو دیکھ رہی تھی جب اس نے ڈون کے قدموں کی آواز سنی جو اپنے بیڈروم کی طرف جا رہا تھا۔ جولی کو اس وقت اپنا شوہر بہت یاد آ رہا تھا۔ روزانہ رات کو بستر پر لیٹتے وقت اس کی یہی کیفیت ہوتی تھی لیکن اس وقت وہ ڈون کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

اسے اس بات کی حیرانی تھی کہ پام بیچ پر ہونے والے حادثے کے بعد ڈون کی عجیب و غریب کیفیت ہو گئی تھی۔ وہ پریشان رہنے لگا تھا اور اس کی شراب نوشی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس لیے جب ڈون نے اسے اپنے نئے ناول کے بارے میں بتایا تو وہ اس کا ساتھ دینے پر تیار ہو گئی۔ اس

نے اس سفر کا انتظام کیا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے اپنی پرانی دوست میگی کو فون کیا اور اس کے ساتھ ہی یونیورسٹی کے پروفیسر مل لینگ کو بھی ڈون کی آمد کے بارے میں بتادیا جو ہارورڈ میں رچرڈ کا روم میٹ تھا۔ جب اس نے ڈون کو بتایا کہ یہ ٹور اس کی جانب سے کرس کے قتل کا قلم ہے تو وہ بہت خوش ہوا اور اس نے اصرار کیا کہ جولی بھی اس کے ساتھ چلے۔ وہ خود بھی چند دنوں کے لیے نیویارک سے باہر جانا چاہ رہی تھی تاکہ اپنے شوہر کی موت کا غم بھلا سکے لہذا اس نے رضامندی ظاہر کر دی۔

ڈون کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو اس کی شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آیا۔ وہ ہر وقت اپنے گلے میں صلیب لٹکائے رہتا تھا اور روزانہ اخبار میں قسمت کا حال پڑھتا تھا۔ وہ انتہائی وہمی ہونے کے ساتھ ساتھ جن بھوتوں، چڑیلوں اور بدروحوں کا بھی قائل تھا۔ شاید اسی لیے خوشبودار چائے کا پیالہ بنے اور رچرڈ سے ملنے جلتے شخص کی ایک جگہ دیکھ لینے کے بعد اس کی حالت غیر ہو گئی تھی اور وہ اسے بھی رچرڈ کا بھوت سمجھ بیٹھا تھا۔

اگلی سہ پہر وہ شخص ساحل پر دوبارہ نظر آیا لیکن جولی نے اس کے بارے میں ڈون کو نہیں بتایا کیونکہ اسے شک تھا کہ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ خوشگوار موسم اور ساحل کے دقترب نظارے بھی اس کا موڈ بحال نہ کر سکے لیکن اس نے جولی کے چہرے کے تاثرات بھانپ لیے اور پیچھے مڑ کر دیکھا اور اس کے تعاقب میں دوڑ لگا دی۔ جولی بھی اس کے پیچھے تھی۔

وہ جب ساحل پر پہنچے تو آسمان پر چھائے گہرے بادلوں کو دیکھ کر جولی کو خیال آیا کہ کسی وقت بھی بارش ہو سکتی ہے۔ انہوں نے ریت پر مکمل چھائے اور سمندر میں نہانے لگے۔ کچھ دیر بعد ڈون قریبی اسٹیک بار سے کھانے کا سامان اور کوک کی بوتلیں لے کر آ گیا۔ کھانے کے دوران جولی نے اس سے پوچھا۔ ”تمہاری ریسرچ کیسی جا رہی ہے؟ کیا تمہیں اپنے ناول کے لیے مطلوبہ مواد مل گیا؟“

اس نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ”ہاں، میں ایک ایسے شخص کے بارے میں معلومات حاصل کر چکا ہوں جو یہاں کے قدیم لوگوں کو جرائم پر اکساتا تھا اور انہیں اپنے دشمنوں کو قتل کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا لیکن اب مجھے اس میں کوئی دلچسپی نظر نہیں آ رہی۔“

”کیوں؟“ جولی بولی۔ ”یہ تو بہت زبردست آئیڈیہ ہے۔“

”میں نہیں جانتا۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”اب

بگھتی کٹناں سے پاس ڈون ہے۔ وہاں تو بجلی بھی نہیں ہے۔
ڈون نے اس کے ہاتھ سے کار کی چابی چھین لی اور بولا۔
”پھر ایک ہی گل ہے، ہمیں اس کے پاس دوبارہ جانا ہوگا۔“

☆☆☆

مرینہ نے ایک بار پھر ان کی توضیح چائے سے کی
لیکن اس مرتبہ جولی نے چائے نہیں پی البتہ ڈون نے اس
بار بھی کوئی تکلف نہیں کیا اور مزے لے لے کر چائے پیتا
رہا۔ جب اس کی پیالی ختم ہو گئی تو وہ بولا۔ ”میں جانتا چاہتا
ہوں کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟“

مرینہ بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے ان
دونوں کے آنے پر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اس نے انہیں
دیکھتے ہی کہا۔ ”میں جانتی تھی کہ تم واپس آ رہے ہو۔“ اس کی
پوتی ان کے لیے صاف سفید تولیے لے کر آئی تھی تاکہ وہ اپنا
بدن اور چہرہ خشک کر سکیں۔

”وہ آج یہاں نہیں ہے۔“ مرینہ نے کہا۔ ”میں نے
حصار سمجھ دیا ہے۔ اس لیے وہ میرے گھر میں داخل نہیں ہو سکتا
لیکن یہ بتاؤ کہ تم دونوں میں سے کس نے پہلے اسے دیکھا؟“
”میں نے۔“ جولی نے کہا۔ ”گزشتہ شب
ریستوران میں اور آج بھی ساحل پر میں نے ہی اسے پہلے
دیکھا۔ دونوں بار وہ مجھے ڈون کے عقب میں نظر آیا۔“

”گزشتہ شب وہ چراغ میں گیا تھا؟“

جولی اور ڈون ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ”ہمارا
یعنی خیال ہے۔“ ڈون نے کہا۔

”اور آج وہ درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا؟“

”ہاں۔“

مرینہ نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا
اور آنکھیں بند کر کے منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی۔ وہ دونوں
خاموش بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد اس نے
آنکھیں کھولیں اور بولی۔

”چراغ ایک مقدس جگہ ہے اسی لیے وہاں جانے کے
بعد وہ کسی کو نظر نہیں آیا۔ وہ صرف اس شخص کا پیچھا کر رہا ہے
جس کی اسے تلاش ہے۔ اسی لیے وہ اس کے پیچھے کھول ہوا
نظر آتا ہے اور جیسے ہی وہ شخص پیچھے مڑ کر دیکھے تو وہ چل دیتا
ہے اور وہ شخص یقیناً ڈون ہی ہے۔“

وہ دونوں حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ ڈون اپنی جگہ
سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس چھوٹے سے کمرے میں ٹپٹنے لگا۔

جولی نے کہا۔ ”وہ ڈون کو بتاتا کیوں نہیں کہ کیا چاہتا ہے؟“
بوڑھی عورت ڈون کو کمرے میں ٹپٹتے ہوئے دیکھ

میں سوچ رہا ہوں کہ شاید یہاں کچھ حقیقی پراسرار واقعات
بھی ہوتے ہیں مثلاً جن ہوت یا بدروحوں سے متعلق۔“
”یہ بھی اچھا آئیڈیا ہے۔“ وہ اس کی حوصلہ افزائی
کرتے ہوئے بولی۔

ڈون نے ایک بار پھر کندھے اچکائے اور کبل پر
لیٹتے ہوئے بولا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ میں اس کام سے اکتا گیا
ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ لکھنا چھوڑ دوں۔“

جولی نے مزید گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھا اور ساحل پر
ٹھپٹنے لگی۔ ایک گھنٹے بعد اس کی واپسی ہوئی اور وہ چلنے کی
تیاری کرنے لگے کیونکہ بارش کسی وقت بھی شروع ہو سکتی
تھی۔ انہوں نے لباس تبدیل کیے۔ ڈون کبل پیٹ رہا تھا
جب جولی نے اس کے عقب میں اسی طویل قامت سرخی
سوٹ میں بیوس شخص کو دیکھا جو جنگل کے کنارے کھڑا نہیں
دیکھ رہا تھا۔ ڈون نے جولی کی آنکھوں میں حیرت کی
پرچھائیں دیکھی تو فوراً پلٹا اور اس آدمی پر نظر پڑتے ہی اس کی
جانب بھاگنے لگا لیکن اس کے وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی
وہ شخص جنگل میں غائب ہو گیا۔ اب وہ ڈون کو نظر نہیں آ رہا
تھا۔ ڈون بھی اس کے تعاقب میں آگے بڑھتا رہا۔ عین اسی
وقت بارش شروع ہو گئی۔ جولی نے جلدی جلدی سامان سمیٹا
اور ڈون کو بلانے چل دی۔ جنگل تک پہنچتے پہنچتے وہ بری
طرح بھیگ چکی تھی۔

”ڈون۔“ اس نے پوری قوت سے آواز لگائی لیکن
کوئی جواب نہیں آیا۔ البتہ اسے ڈون کی آواز ضرور سنائی
دی جو چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ ”کتیا کی اولاد۔ اپنا چہرہ
دکھاؤ۔“ وہ اس آواز کی سمت میں پام کے درختوں کے
درمیان چلتی رہی۔ کچھ فاصلے پر اسے ڈون نظر آ گیا۔ وہ
درختوں کے جھنڈ کے درمیان تھا کھڑا اور زور سے سانس
لے رہا تھا۔ جب وہ اس کے قریب پہنچی تو سر ہلاتے ہوئے
بولا۔ ”وہ پھر بھاگ گیا۔“

جولی نے ادھر ادھر دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا کہ وہاں
کوئی نہیں تھا۔ سب لوگ بارش شروع ہوتے ہی چلے گئے
تھے ورنہ ان کا تماشا بین جاتا۔ اس نے ڈون کا بازو پکڑا اور
بولی۔ ”چلو۔“

پارکنگ لائٹ کی طرف جاتے ہوئے ڈون نے
جیب سے اپنا سیل فون نکالا اور جولی سے پوچھا۔
”تمہارے پاس مرینہ کا نمبر ہے؟ میں اس سے بات کرنا
چاہتا ہوں۔ اگلی اور اسی وقت۔“

”پروفیسر لینگ نے اس ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔ میں نہیں

ڈون نے گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی اور بولا۔ ”ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔ ہمیں آج رات ہی آخری پرواز سے نکل جانا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے۔“ جولی نے کہا۔ وہ اس سے بحث نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ ”شاید ہم نے یہاں آ کر غلطی کی۔“ وہ تلخ انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔ ”ائر لائن کو فون کر کے سٹیٹس چیک کروالو۔“

جولی نے سیل فون پر ائر لائن کا نمبر ملا یا اور جب اس نے بات ختم کی تو ڈون کا پارک کر رہا تھا۔

جولی نے کہا۔ ”ہمیں نو بیچے والی پرواز میں دو سٹیٹس مل گئی ہیں لیکن تمہاری ریسرچ کا کیا ہوگا؟“

”مجھے اس کی پروا نہیں۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ وہ کار سے اتر کر بارش میں بھیستے ہوئے پورج تک آئے اور ایک چھوٹی سی لابی میں رک گئے۔ میگی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی اور نہ ہی کوئی دوسرا مہمان موجود تھا۔ گیٹ ہاؤس کے ملازمین گھروں کو جا چکے تھے۔ وہاں بالکل خاموشی تھی۔

”سب لوگ کہاں ہیں؟“ ڈون نے کہا۔ ”وہ باہر گئے ہوئے ہوں گے۔“ جولی نے اپنے بالوں سے پانی جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”میگی ان سب کو ڈنر پر لے گئی ہے۔ تمہیں یاد نہیں کہ اس نے ہمیں بھی دعوت دی تھی۔“

اس نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ”تم اس کے لیے ایک خط چھوڑ دو کیونکہ ہم ان کے آنے سے بہت پہلے چلے جا کر گئے۔“ یہ کہہ کر اس نے لاؤنج میں جا کر اسکاچ کی بوتل اٹھائی اور اپنے لیے گلاس بھرنے لگا۔ جولی نے ایک بار پھر اسے تنبیہ کی کہ زیادہ شراب نوشی اس کے لیے نقصان دہ ہے لیکن وہ شراب پیتا اور لاؤنج میں ٹہکتا رہا۔ دو گلاس ختم کرنے کے بعد وہ بولا۔

”اب ہمیں تیار کر لینا چاہیے۔“ وہ دونوں میزوں پر چڑھ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ جولی نے کمرے کی لائٹ جلائی اور اپنا پرس بستر پر پھینکا اور دیوار پر لگے ہوئے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔ ”جولی!“

اس نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی اور دوسرے کمرے کی طرف بھاگی۔ ڈون اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑا تھا اور اس کی نظریں چھت پر لگے ہوئے چنگھے پر تھیں جس کے ایک پر کے ساتھ نیلے رنگ کی ٹائی لگی ہوئی

رہی تھی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”شاید اس کا خیال ہے کہ ڈون پہلے سے جانتا ہے۔“

”نہیں۔“ ڈون چلا یا۔ ”میں کچھ نہیں جانتا۔“

”ڈون! بیٹھ جاؤ۔“ جولی نے کہا تو وہ بیٹھ گیا۔ سیلیبا پر دسے کے پیچھے سے چائے کی کیتلی لیے ہوئے برآمد ہوئی اور اس نے ان کی پیالیاں دوبارہ بھریں۔ ڈون نے دوبارہ چائے پینی شروع کر دی لیکن جولی نے اس مرتبہ بھی اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ اپنی میزبان سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”کیا کوئی ایسا طریقہ ہے کہ رچرچ ڈیمو مطلب ہے کہ وہ ہجرت اپنی بات ڈون تک پہنچا سکے۔ اگر وہ اس سے براہ راست بات نہیں کر سکتا تو اسے پیغام ہی بھیج دے۔“

مرینہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”دو باتیں ہو سکتی ہیں یا تو وہ کوئی پیغام چھوڑ دے یا اپنی کوئی نشانی۔“

”نشانی؟“ ڈون نے پوچھا۔ ”ہاں، کوئی ایسی چیز جس سے اس کے وجود کا پتا چل سکے۔“

جولی آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ”تم نے نشانی دینے کی نہیں بلکہ چھوڑنے کی بات کی ہے۔ ایسی کون سی جگہ ہے جہاں وہ یہ نشانی چھوڑ سکتا ہے؟“

یوزمعی عورت نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ”وہ جہاں ڈون سوتا ہے۔“

ڈون اور جولی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ڈون نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائی اور ایک گھونٹ لینے کے بعد بولا۔ ”ٹھیک ہے، ہم بہت جلد نیو یارک واپس جا رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہاں پہنچ کر مجھے پیغام مل جائے۔“

وہ آگے کی طرف جھکا اور اس نے مرینہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا پھر اس نے جولی کو کھڑا ہونے میں مدد دی اور وہ دونوں دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ ڈون نے گرم جوش مسکراہٹ کے ساتھ مرینہ کو دیکھا۔ جولی نے بھی اس کی تھلید کی۔ مرینہ اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”مجھے امید ہے کہ تمہاری تلاش جلد ختم ہو جائے گی۔“ واپسی کے سفر میں ڈون پاگلوں کی طرح گاڑی چلا رہا تھا۔ جولی نے کہا۔ ”گاڑی آہستہ چلاؤ ورنہ کوئی حادثہ ہو سکتا ہے۔“ اس نے ونڈ شیلڈ سے جھانکتے ہوئے کہا۔ باہر اب بھی بارش ہو رہی تھی۔ وہ مضطرب لہجہ میں بولی۔ ”تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے؟“

نظر دروازے پر گئی، وہاں وہی شخص کھڑا ہوا تھا۔ چاندی جیسے بال، بنفشی آنکھیں اور دھاریوں والا سرخی سوٹ لیکن اس کے لیے میں ٹائی نہیں تھی پھر اس نے ڈون کو دیکھا جو اس کے قدموں کے پاس بیٹھا سسکیاں لے رہا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل جھکی اور ایک بار پھر اس کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

”تم کیا بتانا چاہ رہے ہو؟“

”میں نے اسے مارا ہے۔“ وہ فریادی لہجے میں بولا۔ ”میں نے ہی اسے میز میوں سے دھکا دیا تھا۔ پہلے اسے شراب پلائی تاکہ اس کا میز میوں سے گرنا ایک حادثہ معلوم ہو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اسی لیے رچرڈ کا وجود میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جو میں چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس سے چھٹکارا حاصل کر کے تم سے شادی کر لوں۔ اس طرح اس کی تمام دولت مجھے مل جاتی۔ میں اس سے نفرت کرتا تھا اسی لیے مار دیا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔“

بالآخر اس نے اعتراف کر ہی لیا۔ جولی نے اس کے بازوؤں سے اپنے ہاتھ ہٹائے اور کھڑی ہو کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ اس نے اپنے دوست کو دیکھا جو اس کے شوہر کا بھی دوست تھا پھر اس نے دروازے میں کھڑے ہوئے شخص کو دیکھا اور سر ہلا دیا۔

پام بیچ پولیس ڈیپارٹمنٹ کا سراغ رساں جان رہے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے مرینڈ کی خوب صورت پوتی ورجن آئی لینڈ کی سراغ رساں سیلینا ہیرس بھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وردی میں ملیوں دو پولیس والے بھی اندر آ گئے۔ سیلینا نے ڈون کو گرفتار کرنے کا حکم دیا اور پولیس والوں نے اسے پھٹکڑیاں پہنا دیں۔ ان کے ساتھ جاتے ہوئے بھی وہ سسکیاں لے رہا تھا۔ سیلینا بھی ان کے ہمراہ چلی گئی البتہ سراغ رساں رہے وہیں رک گیا۔ وہ جولی کو اپنے ساتھ نیچے لادوئج میں لے کر آیا اور اسے ایک کرسی پر بٹھا کر اس کے لیے برانڈی کا گلاس بھرنے لگا۔

جولی نے اس کی جانب دیکھا اور بولی۔ ”میں نے اپنی زندگی میں اس سے ہولناک کام بھی نہیں کیا۔“

”لیکن یہ تمہارا ہی منصوبہ تھا۔“

”ہاں، صرف اس لیے کہ تم ہو پھر رچرڈ جیسے ہو۔“ جولی نے کہا۔ ”میں نے تمہیں رچرڈ کی موت کی پیش کش کے دوران دیکھا تھا اور تمہاری بنفشی آنکھوں کو دیکھ کر خیال آیا کہ اگر تمہارے سر پر چاندی جیسے بال ہوں تو تم بالکل

تھی جس پر سفید ستارے بنے ہوئے تھے۔ ڈون کی پشت اس کی جانب تھی۔ ڈون آہستہ آہستہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ وہ گھوم کر اس کے سامنے آئی اور خود بھی جھک کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

”ڈون! کیا ہوا، تم مجھے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟“

اس نے ہنسنے کی طرف اشارہ کیا۔ جولی کی نظریں اس جانب گئیں پھر وہ بولی۔ ”تم کیوں چلا رہے تھے اور کس چیز کی طرف اشارہ کر رہے ہو؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

ڈون نے ہنسنے سے نظریں ہٹا کر جولی کو دیکھا اور بولا۔ ”تم نے کچھ نہیں دیکھا؟“

”کیا نہیں دیکھا؟ ڈون! تم مجھے ہوش میں نہیں لگ رہے۔“

”ٹائی۔“ اس نے دوبارہ ہنسنے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”رچرڈ کی ٹائی۔“

”ڈون امیری طرف دیکھو۔“ جولی نے حکمانہ لہجے میں کہا۔ ”تم اس وقت ایک بچے کے مانند لگ رہے ہو۔“

اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی ڈون کی چیخ ابھری۔ اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور فرش پر بیٹھے بیٹھے ہی جولی کو دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں جولی کے عقب میں دیوار پر لگے ہوئے آئینے پر گئیں۔

”اوہ خدایا۔“ وہ ایک بار پھر چلایا۔ ”مجھے بہت افسوس ہے۔“

جولی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ آئینے پر بڑے بڑے سرخ حروف میں لکھا ہوا تھا۔ ”اسے بتادو۔“

جولی نے دوبارہ ڈون کے چہرے پر نظریں جمادیں اور تجسس بھرے لہجے میں بولی۔ ”تم کیا دیکھ رہے ہو؟“

”کیا تم نے کچھ نہیں دیکھا؟“ ڈون نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔

”کیا؟“

ڈون نے ایک بار پھر ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ جولی یہ مشکل اس کے الفاظ سن سکی تھی۔

”تم نہیں دیکھ سکتیں کیونکہ تم نے آج وہ چائے نہیں پی۔ آئینے پر لکھا ہے سے بتادو۔ وہ چاہتا ہے کہ میں تمہیں اصل بات بتا دوں۔ اسی لیے وہ میرا پیچھا کر رہا ہے اور جب تک میں تمہیں نہیں بتاؤں گا، وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔“

اب اس نے اپنے ہاتھ چہرے سے ہٹائے پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جولی کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ اسے ڈون کی حالت پر ترس آنے لگا۔ اچانک اس کی

گزارے کے لیے آزاد ہو۔“
 ”ہاں۔“ جولی نے اپنی آنکھیں صاف کیں اور مسکرا دی۔
 ”اب تم کہاں جاؤ گی؟“ مرینہ نے پوچھا۔
 جولی سوچتے ہوئے بولی۔ ”مجھے نیویارک واپس جانا ہوگا لیکن سوچ رہی ہوں کہ کچھ عرصہ یہاں قیام کروں۔ یہ بہت ہی خوب صورت جزیرہ ہے۔“
 ”ہاں یہ تو ہے، کل تم اور تمہاری دوست مگی میرے گھر ڈنر پر آ رہی ہو۔“

”اس جنگل میں؟“ جولی نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔
 مرینہ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولی۔ ”مائی ڈیئر، وہ کانسٹیبل میری خادمہ کا ہے البتہ اس نے ہمارے لیے اسے نئے سرے سے ترتیب دیا تھا۔“
 جولی مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میری طرف سے اس کا شکریہ ادا کر دینا اور تمہارا بھی شکریہ۔ میں تمہیں اس کا معاوضہ دینا چاہتی ہوں۔“

”بے وقوف لڑکی۔“ مرینہ بولی۔ ”اس کیس کی وجہ سے سیلینہ کی ترقی ہو جائے گی، یہی میرا معاوضہ ہے۔“
 ”پروفیسر لیگ نے مجھے بتایا ہے کہ تم ادا کارہ نہیں۔“
 ”اوہ، یہ بہت پرانی بات ہے۔ اس وقت تو شاید تم پیدا بھی نہیں ہوئی ہو گی۔ شادی کے بعد میں نے اداکاری ترک کر دی تھی اور شادی کے بعد میرے یہاں پانچ بچے ہوئے۔“
 ”گو یا بچوں والی بات سچ تھی؟“

”ہاں۔“
 ”کیا وہ واقعی جادوئی چائے تھی؟“ جولی نے پوچھا۔
 ”ہاں۔ وہ تمہیں چائے ہے اور یہ صرف میں ان لوگوں کو پیش کرتی ہوں جو مجھے پسند آتے ہیں۔“ مرینہ نے اس بوڑھی عورت کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”اور تم بھی مجھے پسند آ گئی ہو۔“

”میں نہیں مانتی۔“ جولی نے کہا۔ ”جس طرح تم نے اس عورت کا سواگت بھرا تھا ویسے ہی اس چائے کی حقیقت بھی کچھ اور ہے۔ سچ بتاؤ وہ کون سی چائے تھی؟“
 مرینہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی۔ ”لیٹن! جولی کی آنکھیں حیرت سے کھیل گئیں اور وہ سوچنے لگی کہ جادو چائے میں نہیں بلکہ مرینہ کی زبان میں تھا جس نے ڈون کو چکرا کر رکھ دیا۔“

میرے مرحوم شوہر کی طرح نظر آؤ گے اور بعد میں جب ڈون نے اپنی ریسرچ کے سلسلے میں یہاں آنے کا پروگرام بنایا تب میں نے یہ منصوبہ بنایا۔ میں جانتی تھی کہ وہ پراسرار باتوں پر یقین رکھتا ہے۔ اس نے رچرڈ کے گرنے کے بارے میں جو کہانی سنائی، اس پر مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ رچرڈ کو چکرا آیا کرتے تھے اس لیے وہ زیادہ استعمال نہیں کرتا تھا۔ ڈون کو یہ بات یاد نہ رہی۔ اسی طرح وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ کیتھولک تھا۔ اس نے رچرڈ کو شراب پلائی اور جب اس پر پوری طرح نشہ غالب آ گیا تو اسے میڈیوں کے پاس لاکر دھکا دے دیا۔“

سراخ رساں اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے سر پر موجود مصنوعی بانوں کی وگ اتار دی اور بولا۔ ”اب تمہیں یقین آ جانا چاہیے کہ ہمارا کام ختم ہو گیا۔“
 جولی نے تائید میں سر ہلایا اور بولی۔ ”اب اس کے ساتھ کیا ہوگا؟“

”پہلے میں پولیس اسٹیشن جاؤں گا جہاں اسے باضابطہ میری تحویل میں دیا جائے گا پھر ایک تقریر کر کے مقامی پولیس کا شکریہ ادا کروں گا کیونکہ ان کے تعاون کے بغیر یہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ خصوصاً اس کیس میں سیلینہ کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ میں آج رات ہی ڈون کو لے کر پام بیچ روانہ ہو جاؤں گا اور یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا کیونکہ وہ خود ہی اپنی زبان سے اس قتل کا اعتراف کر چکا ہے۔“

جولی نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اب تمہیں چلے جانا چاہیے۔“

”کیا تم یہاں تمہارا سکونگھی؟“ سراخ رساں نے پوچھا۔
 ”ہاں۔“ وہ اسے یقین دلاتے ہوئے بولی۔ ”میری دوست اب آنے ہی والی ہو گی۔“
 ”شب بخیر مسز بیکسٹر۔“ وہ لاپٹی کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے تعاون کا شکریہ۔“
 ”اپنی ٹائی تو لیتے جاؤ۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

اس کے جانے کے بعد وہ وہیں بیٹھی براہنڈی کے گھونٹ بیٹی رہی۔ ایک گھنٹے بعد وہی بوڑھی عورت لاؤنج میں داخل ہوئی اور اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اب اس نے قبائلی چنڈ اور ٹوپی کے بجائے عمدہ تراش کا لباس زیب تن کر رکھا تھا اور آنکھوں سے کنٹیکٹ لینس ہٹا دیے تھے اور وہ مقامی لہجے میں بات کر رہی تھی۔

”کھیل ختم ہو گیا۔“ مرینہ بولی۔ ”اب تم اپنی زندگی

برعکس

کاشف زہیر

کہتے ہیں کہ دور سے دنیا کے تمام مکرو قریب بڑے رنگین لگتے ہیں لیکن ساتھ رہ کر ذات کی سنگینی اس طرح پرت پرت کھلتی ہے کہ انسان کسی کو جان لینے کے گمان میں یقین کی ہر حد کو پار کر لیتا ہے مگر... اُس پار جا کر بھی جب یہی یقین گمان میں بدلتا ہے تو اپنی ذات سے بھی اعتبار ختم ہو جاتا ہے۔ وہ جو اس کی ذات کا عکس تھا، جسے اپنی کوکہ، اپنی گود کے ستھرنے پر فخر تھا کہ اچانک فخر کا وہ کانچ محل کرچی کرچی ہو گیا... زندگی لہو لہو، دل زخمی اور وہ اپنے پائی پر مجبور ہو گئی... یہ کیسا عجب سنگم تھا ستم ظریفی اور اعلیٰ ظریفی کا... وقت گزرتا رہا اور گل کائنات لٹ جانے کے باوجود ایک خواب سراب اس کے تعاقب میں جذبوں کو مہمیز کرتا رہا حتیٰ کہ اس دھندلے عکس میں دھیرے دھیرے رنگ بھرتے گئے اور عکس درعکس ان منے ہوئے نقوش میں اسے اپنی گم شدہ کائنات کا اشارہ ملتا چلا گیا۔

سچے موتیوں کی جموئی وقاداری کا پُر فریب منظر... ایک

منا کی ماری کا دلخراش احوال

نرم اور گرم کیل میں لپٹا بچہ اپنی کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ گلابی رنگت اور بہت نازک سے نقوش تھے۔ پہلے وہ سنجیدہ رہا تھا پھر اس کے ہونٹ کھلے اور وہ مسکراتے لگا۔ اس مسکراہٹ نے رعنا و اندر تک مرشار کر دیا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں کے لرزتے آنسوؤں میں بیک وقت دکھ بھی تھا اور خوشی بھی۔ اس نے بچے کو سینے سے لگا لیا اور رندگی ہوئی آواز میں بولی۔ "میرا بیٹا... میرا کامی..."

☆☆☆

سپنس ڈائجسٹ ————— 252 ————— فروری 2015ء

Copied From Web



Copied From Web



رعنا کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔ شاید وہی انتہا پسند ہو گئی تھی۔ شاید جاوید کی اجانگ جدائی نے اسے سہا دیا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی تھی کہ اکیلے کیسے کامی کی پرورش کرے گی؟ وہ صرف بیس سال کی نا تجربہ کار لڑکی تھی۔ رشتوں کے لحاظ سے بھی نا تجربہ کار تھی، ہوش سنبھالنے کے بعد ماں کے سوا کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ ان کا کوئی رشتے دار تھا یا نہیں، میمونہ نے کبھی نہیں بتایا۔ بڑے ہونے پر جب اس نے کئی بار ماں سے پوچھا تو ہر بار انہوں نے ایک ہی جواب دیا۔ ”رعنا! اس بارے میں نہ پوچھو تو بہتر ہوگا۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا صرف دکھ ہوگا۔“

میمونہ ورنگ و دین تھیں۔ پتا نہیں وہ شروع سے جا ب کرتی رہی تھیں یا پھر مجبوری میں ملازمت کی تھی۔ انہوں نے بی کام کے بعد چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بننے کی کوشش کی مگر وہ سال بعد تعلیم ادھوری چھوڑ دی پھر بھی انہوں نے اتنا کچھ سیکھ لیا تھا کہ ایک نئی کہانی میں اکاؤنٹنٹ بن گئی تھیں۔ اس وقت اس شعبے میں لڑکیاں بہت کم آتی تھیں۔ اس لیے اگر کسی کو پتا چلتا تو وہ تعجب کرتا۔ کسی قدر ہوش سنبھالنے پر رعنا کو پتا چلا کہ اس دنیا میں اس کا سوائے ماں کے اور کوئی نہیں ہے۔ باپ کا وجود اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ رعنا کی پیدائش سے پہلے اس دنیا سے گزر چکے تھے۔ راحت ریلوے لائن کراس کرتے ہوئے ٹرین کی زد میں آ گئے تھے۔ میمونہ کے مطابق یہ حادثہ تھا لیکن بارہ تیرہ سال کی عمر میں رعنا نے وہ فائل دیکھ لی جس میں میمونہ نے اخبارات کے تراشے سنبھال کر رکھے تھے۔ ان تراشوں میں راحت کو پیش آنے والے واقعے کی کننگز تھیں۔ ان تراشوں کے مطابق یہ حادثہ نہیں بلکہ خودکشی کا واقعہ تھا یعنی شاہدین نے بتایا کہ راحت جان بوجھ کر ٹرین کے سامنے آئے تھے مگر ان تراشوں میں خودکشی کی وجہ بیان نہیں کی گئی تھی۔ بہت عرصے بعد رعنا نے میمونہ سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے وہی جواب دیا۔

”نہ جانتا تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔“
کامی کی طرح رعنا بھی بہت فرمانبردار تھی مگر اس کی طرح رویوں تک عمل کرنے والی نہیں تھی۔ ان کا اپنا گھر تھا جو بعد میں رعنا کا گھر ہوا اور اسی گھر کا ایک کمرہ کامی کے لیے مخصوص ہوا۔ یہ چھوٹا سا گھر میمونہ نے خود بنایا تھا یا راحت ان کے لیے چھوڑ کر گئے تھے۔ رعنا اس بارے میں بھی نہیں جانتی تھی لیکن اس کا اندازہ تھا کہ مکان ابو نے چھوڑا

رعنا نے کامی کے کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر سے اس کا دل ٹوٹنے لگا۔ آج پورے ایک مہینے بعد اس نے یہ دروازہ کھولا تھا۔ یہی دروازہ وہ دن میں درجنوں بار کھولتی تھی مگر اس بار ایک مہینا ہو گیا تھا۔ پہلے ہوش نہیں تھا اور پھر ہمت نہیں تھی۔ ویسے تو اس گھر کے چتے چتے پر کامی کی خوشبو اور اس کا احساس موجود تھا مگر یہ تو اس کا کمرہ تھا۔ یہاں اس کی خوشبو اور احساس نہیں زیادہ شدید تھا۔ اتنا شدید کہ دروازہ کھلنے پر رعنا بے اختیار اسے آواز دینے والی تھی مگر پھر اس حقیقت کی گئی نے اس کی زبان کو چھولیا کہ کامی اب دنیا میں نہیں رہا تھا۔ آج سے ٹھیک ایک مہینا پہلے وہ اس دنیا سے جا چکا تھا۔ آنسوؤں کی نمی نے رخساروں سے پہلے اس کا حلق ٹھیک کر دیا۔ کامی کا کمرہ ایسا ہی صاف ستھرا اور قریب سے تھا جیسا اس کی زندگی میں ہوتا تھا۔ درحقیقت وہ اپنا کمرہ خود صاف کر کے گیا تھا۔ وہ اس کا عادی تھا۔ حالانکہ رعنا تھی اور ماسی زریں بھی آتی تھی۔

اسے رعنا نے ہی تو یہ سب سکھایا تھا۔ وہ بچپن سے ذہین اور فرمانبردار تھی، رعنا اسے جو سکھاتی وہ فوراً سیکھ جاتا اور پھر اس پر سن دین لگتا تھا۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا، اس کا طرز عمل اس معاملے میں شدید ہوتا چلا گیا۔ کبھی بھی رعنا بھی جھنجھلا جاتی کہ وہ ایسا کیوں ہو گیا تھا۔ رعنا اسے ڈھنگ سے زندگی گزارنے کے لیے ڈسپلن سکھانا چاہتی تھی مگر اس نے ڈسپلن کو اپنی پوری زندگی پر طاری کر لیا تھا۔ رعنا نے اسے جلدی سونے کی تربیت دی اور وہ اس پر اتنی سختی سے عمل کرنے لگا کہ ٹھیک تو سمجھتی ہی اپنے کمرے کا رخ کرتا۔ چاہے موقع کوئی بھی ہو اور گھر میں کوئی آیا ہوا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ صرف کمرے میں ہی نہیں جاتا بلکہ پندرہ منٹ بعد منہ ہاتھ دھو کر اور دانت برش کر کے۔ بیستر پر لیٹ چکا ہوتا تھا۔ رعنا اسے گڈ ٹائٹ کہنے اور پیار کرنے جاتی تھی۔ اس کے ہونٹ کامی کے ماتھے سے الگ بھی نہیں ہوتے تھے کہ اس کی آنکھیں بند ہو جاتیں اور بعض اوقات تو رعنا کوشہ ہوتا کہ وہ سو چکا ہے۔

وقت پر سونا اٹھنا، کھانا پینا، کام کرنا اور زندگی کے دوسرے معمولات پر عمل کرنا وہ چھ سات سال کی عمر میں سیکھ چکا تھا۔ اس کے بعد رعنا کو کبھی ضرورت پیش نہیں آئی کہ اسے کسی بات کے لیے ٹوکتی۔ ہاں کبھی کبھی اسے کہنا پڑتا تھا کہ وہ معمولات کو ذرا ایک طرف بھی رکھ دیا کرے مگر وہ بڑی سنجیدگی سے کہتا۔ ”ماما..... آپ نے ہی مجھے یہ سب سکھایا ہے تو اب مجھے کیوں منع کرتی ہیں؟“

ڈاکٹر کو دکھاتی تھیں۔ ایک فزیشن نے علامات سن کر انہیں نیوروجیکل ماہر کے پاس بھیجا اور اس نے فوری طور پر میمونہ کا سی ٹی اسکین کرایا۔ اس کا نتیجہ جو سامنے آیا وہ ہولناک تھا۔ میمونہ کے دماغ میں تین رسولیاں پرورش پا کر پھور ہو چکی تھیں اور اب ان کو دواؤں یا آپریشن سے ختم کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ مزید چند ٹیسٹ کے بعد ڈاکٹرز نے انہیں جواب دیا اور انہیں بتا دیا کہ ان کے پاس مشکل سے تین مہینے ہیں۔ شاید میمونہ نے اسی وجہ سے نہایت عجلت میں جاوید کا انتخاب کیا۔

جاوید میمونہ کے ڈیپارٹمنٹ میں نیا نیا جاب پر آیا تھا۔ اس کی عمر بائیس سے زیادہ نہیں تھی، یعنی رخصت سے چار سال ہی بڑا تھا۔ اتفاق سے اس کا بھی دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ ایک مختصر شخص نے جاوید کی پرورش کر کے اسے تعلیم دلا کر اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا۔ جاوید حیدر آباد میں رہتا تھا پھر جاب کے لیے کراچی آ گیا۔ میمونہ کے ماتحت آنے کے بعد جب انہیں جاوید کے بس سطر کا علم ہوا تو انہیں جاوید سے بھرتی ہو گئی اور وہ اس کا خاص خیال رکھنے لگیں۔ میمونہ کی کوشش سے وہ ایک مہینے بعد جاب پر مستقل ہو گیا۔ جاوید ذہین تھا۔ میمونہ نے اسے شورہ دیا کہ وہ کچھ عرصہ جاب کرنے کے بعد آگے تعلیم حاصل کرے۔ کیونکہ ترقی کا واحد راستہ اعلیٰ تعلیم تھی۔ جاوید بھی یہی چاہتا تھا مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

کینسر کے انکشاف کے بعد میمونہ کو سب سے پہلے رخصت کا خیال آیا کہ ان کے بعد اس کا کیا ہوگا؟ اسے کون دیکھے گا اور اس کی شادی کون کرے گا؟ ان سوالوں کا ممکنہ جواب ایک ہی تھا کہ کوئی نہیں۔ اس لیے میمونہ نے خود ہی سب کر کے جانے کا فیصلہ کیا۔ پھر انہوں نے اپنے آس پاس دیکھا تو انہیں جاوید ہی سب سے مناسب نظر آیا۔ وہ خوش شکل اور اچھے کردار کا لڑکا تھا۔ اس لیے انہوں نے رخصت کو اپنا فیصلہ سنا لیا اور پھر پوچھنے پر اس کی وجہ بھی بتا دی۔ ساتھ ہی انہوں نے واضح کیا کہ اس کے پاس کوئی چوائس نہیں ہے۔ اسے بہر صورت میمونہ کی رضا کے آگے سر جھکانا تھا۔

رخصت مزاحمت کر ہی نہیں سکتی تھی، اس لیے میمونہ کے فیصلے کے ایک ہفتے بعد اس کا جاوید سے سادگی سے نکاح ہو گیا۔ اس وقت جاوید ایک فلیٹ میں کچھ لڑکوں کے ساتھ شراکت میں رہ رہتا تھا اور رخصت کو وہاں رکھنا ممکن نہیں تھا پھر اس کی خواہ اتنی نہیں تھی کہ وہ رخصت کو الگ سے کہیں رکھ سکتا اس لیے میمونہ نے اسے گھر داماد بنانے کا فیصلہ کیا۔ رخصت کی

ہوگا۔ رخصت کی شادی سے چند سال پہلے انہوں نے اسے ریویٹ کیا تھا۔ ان کے بعد رخصت نے اسے مزید بہتر کیا تھا۔ اس نے اوپری منزل کی چار دیواری اونچی کرائی اور نیچے ایک طرف موجود کیلری میں گرل کرائی گئی کیونکہ حالات اچھے نہیں تھے۔

مکان ایک اچھے علاقے میں اور خوب صورت تھا مگر یہ عجیب مکان تھا۔ اس سے شاید مردوں کا وجود برداشت نہیں ہوتا تھا یہاں کسی مرد کو زیادہ دیر رہنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ راحت تین سال رہے، پھر جاوید دو سال رہا اور سب سے زیادہ کامی انیس سال رہا مگر وہ سب سے جلدی چلا بھی گیا۔ جبکہ رخصت کو اس گھر میں اڑیس سال ہونے کو آئے تھے البتہ میمونہ کو بس بائیس سال رہنا نصیب ہوا تھا۔ رخصت اٹھارہ سال کی تھی اور اس کی شادی کو صرف دوسرا مہینہ ہوا تھا جب میمونہ کینسر کے موذی مرض کے ہاتھوں زندگی ہار گئیں۔

میٹرک کے بعد رخصت نے کالج میں داخلہ لیا تو میمونہ کی خواہش کے مطابق کامرس لی۔ وہ چاہتی تھی کہ رخصت ایم بی اے یا ایم کام کرے۔ اسے خود بھی اکاؤنٹس سے دلچسپی تھی اس لیے اس نے شوق سے داخلہ لیا۔ میٹرک میں اسے ون گرینڈ آیا تھا اور آئی کام میں بھی اس نے اسے ون گرینڈ لیا۔ رخصت چاہتی تو یونیورسٹی میں آنرز میں داخلہ لے سکتی تھی۔ اس کے نمبرز کافی تھے مگر اس نے بی کام کو ترجیح دی اور اسی کالج میں آگے تعلیم جاری رکھی جہاں سے آئی کام کیا تھا۔ بی کام پارٹ ون کے پیمز دیے تھے کہ میمونہ نے اچانک ہی اس کی شادی کا فیصلہ کر لیا۔ رخصت دنگ رہ گئی تھی۔ اب تک میمونہ نے اس کا جو بھی فیصلہ کیا تھا، اس میں رخصت کی رضا شامل رہی تھی لیکن یہ فیصلہ ایسا تھا کہ میمونہ نے بس اسے سنایا اور اس سے سو فیصد فرمائندہ داری چاہی۔ رخصت نے احتجاج نہیں کیا ماس سے اس اچانک فیصلے کی وجہ جاننا چاہی تب میمونہ نے اسے جو وجہ بتائی اسے سن کر رخصت کے ہاتھ پیروں کی جان کے ساتھ دل و دماغ سے ذرہ برابر احتجاج کا ارادہ بھی نکل گیا۔

میمونہ کو برین کینسر تھا اور وہ نہ جانے کب سے اسے پال رہی تھیں۔ شروع میں معمولی سی ٹیسس اٹھتی رہیں، انہوں نے توجہ نہیں دی۔ اپنی صحت کی طرف سے وہ کسی قدر بے پروا تھیں۔ جب درد کا دورہ جلدی جلدی اور شدت سے پڑنے لگا تو انہوں نے خود ہی چین ٹھہر لینا شروع کی اور اسی چکر میں وہ وقت نکل گیا جب کینسر کا عفریت قابو میں آسکتا تھا۔ انہوں نے رخصت سے چھپایا تھا۔ وہ دفتر سے واپسی پر

رعنا کا بہت زیادہ خیال رکھا اور اس کی دل جوئی کی وجہ سے وہ بہت جلد سنبھل گئی۔ دھیان بنانے کے لیے جاوید نے مشورہ دیا کہ وہ کالج جانا شروع کر دے۔ ویسے بھی بی بی کام کا آخری سال تھا اور چند مہینے بعد بھیہمہ زتھے۔ رعنا کو مشورہ مناسب لگا اور اس نے کالج جانا شروع کر دیا۔ جاوید کی تنخواہ زیادہ نہیں تھی مگر ان کے گزارے کے لیے کافی تھی۔ جاوید نے رعنا کو بینک اکاؤنٹ کھولنے سے منع کیا۔

”اسے کسی وقت کے لیے رہنے دو، ابھی تو ہمارا گزارہ ہو رہا ہے۔“

جاوید بہت دیکھ بھال کر خرچ کرنے والا تھا اور فضول خرچ رعنا بھی نہیں مگی اس لیے وہ آرام سے گزارہ کرنے لگے۔ دونوں کم عمر تھے انہیں خیال نہیں آیا کہ شادی کے بعد کچھ مراحل اور بھی آتے ہیں۔ میمونہ کی وفات کے دو مہینے بعد رعنا کی طبیعت گڑبڑ ہوئی۔ چکر آئے اور تلی کی کیفیت ہوئی تو وہ کھلی اور ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے تصدیق کر دی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ رعنا اور جاوید خوش ہو گئے۔ اگرچہ ابھی وہ دونوں ہی جدوجہد سے گزار رہے تھے۔ رعنا تعلیم کھل کر رہی تھی اور جاوید کوشش کر رہا تھا کہ اپنی آمدنی بڑھائے۔ اس لیے بچے کی آمد کسی قدر غیر متوقع تھی لیکن پھر بھی وہ خوش تھے۔

ماں کی وفات کے بعد رعنا کو جاوید کی رفاقت کے بعد صحیح معنوں میں کوئی خوشی ملی تھی تو وہ کامیابی کی آمد کی تھی۔ جلد وہ اور جاوید خواب دیکھنے لگے جو ہر آنے والے نئے مہمان کے لیے ماں باپ دیکھتے ہیں۔ وہ اس کے لیے شاپنگ کر رہے تھے اور اس کی باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے طے کیا کہ پٹنا ہوا تو اس کا نام کامران اور بیٹی ہوئی تو اس کا نام حنا رکھیں گے۔ جلد انہیں پتا چل گیا کہ لڑکا ہے اور گھر میں کامیابی آمد سے پہلے اس کا ذکر نام کے ساتھ ہونے لگا۔

☆☆☆

دروازے کے اندر سے کامیابی کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ یہ خوشبو رعنا کو جذباتی کر رہی تھی مگر اب وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ گزشتہ ایک مہینے میں اس نے اتنے آنسو بہائے تھے کہ اس کی آنکھیں ہی نہیں، جسم بھی خشک ہو گیا تھا۔ وہ اب مزید رونا نہیں چاہتی تھی۔ جانے کئی دیر بعد صدمہ کر کے رعنا اندر داخل ہوئی۔ فرش پر کامیابی کے پسندیدہ رنگ کا ہلکا سرمئی قالین بچھا ہوا تھا۔ پھوٹا سنگل بیڈ ایک کونے میں تھا اور دوسری طرف کامیابی کی اسٹری ٹیبل تھی اور ان دونوں کے درمیان میں اس کی کپیوٹر ٹرالی تھی جس پر کامیابی کا ڈیسک

شادی کے ساتھ ساتھ میمونہ دوسرے تمام کام بھی بہت جلدت میں نمٹا رہی تھی۔ انہوں نے مکان رعنا کے نام کیا اور مشروط کیا کہ وہ اسے پانچ سال سے پہلے فروخت نہیں کر سکتی تھی۔ میمونہ نے اپنے وکیل کو اس معاملے میں ضامن بنایا۔ مکان کے کاغذات اس کے پاس ہی تھے۔ اسی طرح اپنے واجبات اپنی زندگی میں وصول کر کے میمونہ نے انہیں ایک سیونگ اکاؤنٹ میں رکھ دیے جو رعنا کے نام پر تھا۔ یہ اسے بعد میں معلوم ہوا کہ مذکورہ رقم خاصی تھی۔ شاید جاوید پر اعتماد کے باوجود میمونہ کو خدشہ تھا کہ ہمیں وہ غلط نہ لکھے اور ان کے بعد وہ رعنا سے مکان اور رقم ہتھیانے کی کوشش نہ کر لے اس لیے وہ یہ سب کر کے جاری تھی۔ رعنا کو تو ان کے انتقال کے بعد پتا چلا کہ انہوں نے کیا کیا ہے۔

جاوید نکاح کے بعد اپنا مختصر سامان لے کر ان کے گھر منتقل ہو گیا اور یہیں ان کی شادی کی پہلی رات آئی۔ اس اولین رات میں جاوید نے رعنا کو اپنی ساری محبت اور سارا اعتماد دے دیا اس نے رعنا کو اپنی زندگی کی کھل داستان سنائی۔ وہ ایک بہت غریب گھر سے تعلق رکھتا تھا اور پھر بیٹے کی وبا میں اس کا پورا گھر موت کے گھاٹ اتر گیا۔ وہ بچنے والا واحد فرد تھا اور پھر ایک مختصر عرصے میں اس کی پرورش کی اور صرف اللہ واسطے کی۔ اس نے جاوید کو بہترین تعلیم و تربیت دلوائی اور جب وہ اس قابل ہو گیا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے تو اسے اپنی زندگی آپ گزارنے کو کہا۔ جاوید نے اعتراف کیا کہ آج وہ جو بھی تھا، اسی شخص کی وجہ سے تھا۔ رعنا ماں کے بعد ڈر رہتی تھی لیکن جاوید اتنا اچھا اور سنبھلا ہوا انسان نکلا کہ جب میمونہ کے بعد ان کا وصیت نامہ اور مکان کی ملکیت کی بات سامنے آئی تب بھی اس نے اس بارے میں ایک لفظ نہیں کہا اور نہ ہی اسے اپنی توہین سمجھا۔ اس کے بجائے اس نے میمونہ کی تائید کی کہ انہوں نے بالکل درست فیصلہ کیا ہے۔

شادی کے فوراً بعد جاوید نے ایک مرد کی طرح گھر کی ساری ذمہ داری سنبھال لی اور آخری دنوں میں میمونہ کی اتنی خدمت کی کہ وہ اسے دعا میں دے کر گئیں۔ وہ صرف پونے دو مہینے اور زندہ رہیں اور پھر ایک صبح ناشتے کی میز پر اچانک انہیں جھنکا لگا اور وہ میز پر ہی اوندھی ہو گئیں۔ جب انہیں اٹھایا تو ان کا جسم روح سے خالی ہو چکا تھا۔ ٹیمر پھٹ گیا تھا اور وہ سیکنڈ سے بھی پہلے جان سے گزر گئیں۔ خلاف توقع رعنا نے یہ صدمہ برداشت کر لیا۔ شاید اس لیے بھی کہ اسے سنبھالنے کے لیے جاوید موجود تھا۔ اس نے ان دنوں

ٹاپ کپور اور اس کے لوازمات رکھے تھے۔ پینڈھیٹ اہوار تھی اور کمر صاف ستھرا ہو رہا تھا۔ شاید مایا زریٹ ہر دوسرے تیسرے دن یہاں کی صفائی کرتی تھی۔ بیڈ کی مخالف سمت دیوار کے کونے میں دو بیٹ والی الماری تھی اور اس کے ساتھ چھوٹی سی ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ جس پر کامی کے پرفیوم، باڈی اسپرے اور دوسری چیزیں بیلٹے سے رکھی تھیں۔

سنڈی ٹیبل پر لیسپ کے ساتھ کتابیں رکھی تھیں کامی بی بی اسے کے چوتھے سمسٹر میں تھا جب ایک غیر متوقع طور پر بچے والی سیل فون کی بیل سے اس کی زندگی کی ڈور کاٹ دی۔ رہنا آفس میں گئی جب اسے اطلاع ملی تو اسے یقین نہیں آیا۔ بلکہ اب تک نہیں آیا تھا۔ ایک چھوٹی سی غلطی نے کامی کی جان لے لی تھی۔ جس لڑکے، شاید نے اسے شوٹ کیا، اس نے گرفتاری کے بعد پولیس کو بیان دیا کہ اس نے غصے میں آکر یہ فعل کیا تھا کیونکہ کامی اس کی گرل فرینڈ اسما کے چکر میں تھا وہ اسے کال کرتا تھا اور اسما کو اس کے خلاف بہکاتا تھا۔ اتفاق سے جب اسے پتہ چلا کہ اسما اس کے رقیب سے ملنے آرہی ہے، وہ بھی اس ریستوران پہنچ گیا جہاں یہ ملاقات ہوئی تھی مگر اسما نہیں آئی اور وہ اس لڑکے سے ہرگز واقف نہیں تھا۔ شاید گھر سے سبج ہو کر آیا تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس لڑکے کو قتل کر دے گا۔ جب اسما نہیں آئی تو اس نے لڑکے کو تلاش کرنے کے لیے اس کے نمبر پر بیل دی، اتفاق سے اسی وقت رہنا نے کامی کو کال کی اور اس کے موبائل نے بیل دی۔ ٹائٹنگ پر ٹیکٹ تھی اور لڑکے نے بیل کی آواز پر کامی کی جانب دیکھا اور نزدیک جا کر اسے عقب سے گولی مار دی۔ وہ کال بھی ریسیو نہیں کر سکا تھا۔

آج کل ایسے واقعات عام ہیں۔ نوجوان لڑکے ذرا سی بات پر کسی کو قتل کر دیتے ہیں۔ کامی اس کا غلط شکار تھا وہ تو لڑکیوں سے دوستی کا قائل ہی نہیں تھا۔ جب وہ سولہ سترہ سال کا ہوا اور رہنا اسے چھیڑنے کے لیے کہتی کہ وہ خود کو قتل لڑکی پسند کر لے تاکہ میں جو تیاں گھسنے سے بچ جاؤں تو وہ سنجیدہ ہو جاتا اور کہتا۔ "ماما پلیز، میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے تو میری جی ڈرا بھی خواہش نہیں ہے۔"

رہنا ہنس کر کہتی۔ "تب مجھے ہی جو تیاں گھسنی پڑیں گی۔"

"بالکل آپ کو یہی کرنا ہو گا مگر ماما ابھی اس میں بھی بہت وقت ہے۔ ابھی مجھے پڑھنا ہے اور بہت سارا پڑھنا ہے پھر اپنا کیریئر بنانا ہے۔۔۔ تب شادی کی بات کیجیے گا۔"

رہنا سوچ رہی تھی کہ کامی کو تو پتا ہی نہیں چلا کہ اسے کس نے اور کیوں مارا ہے۔ اس کا شاہد اور اس کی گرل

فرینڈ اسما سے کوئی تعلق نہیں تھا اور جب یہ بات شاہد کو پتا چلی تو وہ بھی شاہد کو ذرا لگا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے غلطی نہیں کی شکار ہو کر ایک ایسے لڑکے کو قتل کر دیا تھا جس کا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا لیکن اس سے اس کے جرم کی سنگینی کم نہیں ہوئی تھی۔ پولیس نے چالان بنا کر اسے عدالت میں پیش کر دیا تھا۔ وہ رکنے ہاتھوں پکڑا گیا تھا، آٹھ قتل سمیت شہد و گواہ اس کے خلاف تھے، جنہوں نے اپنی آنکھوں سے اسے کامی پر گولی چلاتے دیکھا تھا۔ امکان یہی تھا کہ اسے بہت جلد سیشن کورٹ سے سزا ہو جائے گی اور سزائے موت کا بھی پورا امکان تھا۔ اگرچہ وہ اس کے بعد ہائی کورٹ اور پھر سپریم کورٹ تک جاتا۔ اس کا تعلق ایک کھاتے پتے خاندان سے تھا اور وہ اتنی آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالتا۔ اس کے باوجود کیس بہت مضبوط تھا۔ اس کی رہائی کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔

رہنا نے بی بی وی پر اس خوب صورت سی لڑکی کو دیکھا تھا جو اس سارے فساد کی جزئی تھی اور اس نے صاف انکار کر دیا تھا کہ اس کا قائل سے کوئی تعلق تھا۔ اسما کا کہنا تھا کہ وہ خود اس کے پیچھے پڑا رہتا تھا مگر وہ اسے لفت نہیں کراتی تھی۔ اس نے یہ بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ کسی اور لڑکے کو پسند کرتی تھی۔ مگر رہنا کو یقین تھا اس نے بہت سارے جھوٹ یونے تھے۔ وہ قائل سے تعلق رکھتی تھی اور وہ اس لڑکے کو بھی پسند کرتی تھی جس کے دھوکے میں قائل نے کامی کو قتل کیا تھا۔ گویا اسما اچھے کردار کی لڑکی نہیں تھی جو بیک وقت دو لڑکوں سے تعلق رکھے ہوئے تھی۔ اس کی وجہ سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ شاہد نے پاگل ہو کر کامی کو قتل کر دیا اور اب خود اسے سزائے موت کا سامنا تھا۔ اس سامنے نے رہنا کو دنیا سے بیگانہ کر دیا تھا۔ کامی کی تدفین تک تو اسے ہوش ہی نہیں رہا تھا سب کچھ محلے والوں اور اس کے دفتر کے کولیکٹرز نے دیکھا تھا۔ جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس کی سوچوں پر جو سوال سب سے زیادہ حاوی تھا وہی تھا کہ کامی کا کیا تصور تھا؟ اسے یوں اچانک موت کیوں ملی؟ اور وہ بھی کس اور کے حصے کی موت۔

رہنا جتنا سوچتی، اتنا ہی الجھتی اور اس کا دماغ اتنا ہی منتشر ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ یہ سوچیں اس پر اتنی حاوی ہو گئیں کہ اسے رات کو نیند نہیں آتی تھی اور اسے لگتا کہ وہ پاگل ہو جائے گی۔ ٹھگ آ کر سوچوں سے تپتپا چھڑانے کے لیے وہ نیند کی دوا لینے لگی۔ محلے والے اور کولیکٹرز چند دن تک آتے جاتے رہے پھر سب اپنی اپنی مصروفیات میں مگن ہو

گئے۔ اگلے میں سوچوں کے سوا اور کیا تھا اور وہ سوچ سوچ کر پاگل ہونے لگی۔ کامی کے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟ وہ تو لڑکیوں کے معاملے میں آج کے لڑکوں سے بالکل مختلف سوچ رکھتا تھا۔ ان سے بہت محدود تعلق کا قائل تھا۔ کبھی کبھی زرینہ کی طبیعت خراب ہو جاتی اور وہ اپنی جگہ اپنی بیٹی کو بھیج دیتی۔ شاذ یہ سولہ سترہ برس کی اور بڑی بیماری سی لڑکی تھی۔ اگر رحمان گھر میں نہ ہوتی اور صرف کامی ہوتا تو وہ اسے واپس بھیج دیتا تھا کہ امی نہیں ہیں وہ بعد میں آئے۔

ایسی سوچ والے لڑکے کو یوں بے دردی سے ایک فلفل ترین الزام لگا کر قتل کر دیا گیا۔ رحمان کو قاتل سے شکوہ نہیں تھا۔ اس نے جو کیا ایک شدید فلفل تھی کے تحت کیا، اسے تو تقدیر سے شکوہ تھا جو کامی کو اس سے زیادہ بہتر جانتی تھی، اس کے باوجود..... کامی کی موت اس طرح ہوئی۔ یہ سب سوچتے ہوئے رحمان کے پاؤں کا پھینکے۔ وہ کامی کے بستر پر بیٹھ گئی اور اس کی آنکھوں سے وہ آنسو پھر پھوٹ نکلے، جن کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ خشک ہو چکے ہیں۔ روتے ہوئے وہ کامی کو پکار رہی تھی مگر وہ تمام پکاروں سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ پھر رحمان نے اس ہستی کو پکارا جو سب کی سنا ہے اس سے شکوے کیے، پرانی باتیں نکال کر بیٹھ گئی کہ اس نے اس کے نصیب میں ہمیشہ تمہاری کیوں لکھی؟ پہلے باپ، پھر شوہر اور اب بیٹا واپس لے لیا۔ اس کے پاس رہا ہی کیا تھا؟

رونے اور شکوے کرنے سے رحمان کا دل ذرا ہلکا ہوا تو وہ اٹھ کر کامی کی اسٹری نچیل کے پاس آئی۔ اس کی کتابیں، چین، رجسٹر اور دوسری چیزیں اسی طرح رکھی تھیں جیسے وہ رکھ کر گیا تھا۔ ان میں پارکر بین کا وہ سیٹ بھی تھا جو رحمان نے اسے کالج کے پہلے دن تحفے میں دیا تھا۔ کامی کو یہ بین بہت پسند آئے تھے اور وہ اب تک ان سے کام لے رہا تھا۔ انظر کے بعد اسے کمپیوٹر کی ضرورت پیش آئی تھی۔ اس سے پہلے گھر میں ایک معمولی سا کمپیوٹر تھا۔ رحمان نے اب تک کامی کو اس کے کمرے میں کمپیوٹر نہیں دیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ آج کی نئی نسل، بلکہ اچھے خاصے میچور آدمی بھی اس آلے کی وجہ سے بے راہ روی کا شکار ہو رہے تھے۔ کمپیوٹر نے جہاں ایک طرف معلومات تک رسائی کو بہت آسان بنا دیا تھا وہیں اس نے کچھ ذہنوں کی تباہی کا راستہ بھی کھول کر رکھ دیا تھا۔ مگر اب کامی کو ضرورت تھی اور رحمان کو اس پر اعتماد بھی تھا۔ اس نے اپنے کردار اور عمل سے ثابت کیا تھا کہ وہ بھگنے والے نوجوانوں میں سے نہیں ہے۔ اس نے رحمان سے مطالبہ

نہیں کیا تھا کہ اسے کمپیوٹر اس کے کمرے میں مہیا کیا جائے لیکن اس نے خود یہ فیصلہ کیا اور کمپیوٹر مع ٹرائی کے اس کے کمرے میں سیٹ کر دیا۔ یہ جدید ترین کمپیوٹر تھا جس کے ساتھ اسکیئر اور پرنٹر بھی تھے۔ ویڈیو چیٹ کے لیے مائیکرو فون کیمرہ نصب تھا۔ رحمان نے ہر چیز بہترین لی تھی تاکہ کامی کو کوئی مسئلہ نہ ہو۔ لوڈ شیڈنگ سے بچنے کے لیے گھر میں یو پی ایس تھا لیکن کمپیوٹر کے لیے الگ سے یو پی ایس لیا تاکہ اچانک کمپیوٹر بند ہونے سے کامی کے کسی کام کا نقصان نہ ہو۔ یو پی ایس اور دوسری چیزیں سب ٹرائی میں ہی فٹ تھیں۔ کامی کو میوزک کا شوق تھا مگر اسے موسیقی میں وہ غز نہیں اور پرانے گیت پسند تھے جو کبھی رحمان نے بھی نہیں سنے تھے جب اس کا موڈ ہوتا تو کمپیوٹر پر ہی سنا تھا۔

یہاں سب کچھ تھا بس کامی نہیں تھا۔ رحمان نے کی بورڈ پر ہاتھ پھیرا اور پھر غیر ارادی طور پر ہاتھ بڑھا کر کمپیوٹر آن کر دیا۔ جب سے اس نے کامی کو کمپیوٹر دلوا دیا تھا، ایک بار بھی اسے آن کر کے نہیں دیکھا تھا۔ وجہ وہی تھی کہ اسے کامی پر عمل اعتماد تھا۔ اگر کامی زندہ ہوتا اور یہاں آتا تو ماں کو اپنا کمپیوٹر آن کرتے دیکھ کر حیران ضرور ہوتا۔ دو سالوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ رحمان اس کا کمپیوٹر آن کر کے دیکھ رہی تھی۔ ونڈو اسٹارٹ ہوئی اور پھر ڈیسک ٹاپ آن ہوا تو سامنے ہی رحمان اور جاوید کی شادی کی تصویر تھی۔ وہ دلہن بنی ہوئی تھی اور جاوید اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ حیران ہوئی کیونکہ کامی نے بھی اسے نہیں بتایا تھا کہ اس نے ان کی شادی کی تصویر اسکرین کر کے کمپیوٹر پر وال پیپر کے طور پر لگائی ہوئی تھی۔ وہ رحمان سے بہت محبت کرتا تھا مگر اس کی محبت کا اظہار ایسا ہی ہوتا تھا۔ اچانک کوئی بات، کوئی چیز سامنے آتی اور رحمان حیران رہ جاتی۔ وہ ماں باپ سے متعلق ہر موقع یاد رکھتا تھا مگر اس موقع کو اس کی مناسبت سے مناتا تھا۔ رحمان سب یاد کر رہی تھی اور اس کا دل جیسے کٹ رہا تھا۔ آنکھیں پھر برسنے لگی تھیں۔

☆☆☆

کامی کی آمد کی اطلاع ان دونوں کے لیے بیک وقت خوشی اور کسی قدر فکر کا باعث تھی۔ فکر یہ تھی کہ رحمان بھیڑ کیسے دے گی اور تیاری کیسے کرے گی۔ اس کی طبیعت خراب تھی اور وہ کالج سے زیادہ چھٹیاں کرتی تو اسے بھیڑ میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس نے سوچا کہ وہ اس سال بھیڑ نہیں دے گی، اگلے سال دے گی مگر جاوید نے رحمان کی حوصلہ افزائی کی۔ اس نے کہا: "یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔"

لیکن تیسرے مہینے تک اس کی حالت کسی قدر سنبھل گئی شاید یہ دواؤں کا اثر تھا۔ خوراک بہتر لینے لگی تھی اس لیے رونا بھیرا کی تیاری کرنے لگی۔ ہفتے میں دو تین بار وہ کالج بھی چلی جاتی اور وہاں اپنی فرینڈز سے تازہ ٹوش لے آتی۔

گھر کی تمام ذمے داریاں جاوید نے اپنے ذمے لے لی تھیں۔ وہ صبح ناشتا بنا کر اور رونا کے ساتھ کر کے دفتر جاتا تھا۔ میونہ کے پاس ایک چھوٹی سی کار تھی مگر رونا اور جاوید دونوں میں سے کسی کو ڈرائیونگ نہیں آتی تھی اس لیے انہوں نے کار فروخت کر دی۔ وہ بس یا رکشے سے آتے جاتے تھے۔ واحد کام رونا یہ کرتی تھی کہ وہ دوپہر میں کالج سے آ کر سالن بنا لیتی۔ شام کو جاوید دفتر سے آتے ہوئے روتی اور اگلے دن ناشتے کا سامان لے آتا۔ میونہ نے اپنے آخری دنوں میں کوشش کی تھی کہ جاوید کو ترقی مل جائے اور اس کی خواہ بڑھ جائے مگر اس کی نئی نئی جاب کی وجہ سے ایسا ہونے میں سکا تھا۔ سال مکمل ہونے پر جاوید کو پہلا انگریز سنٹ ملا اور اس نے رونا کو یہ خوش خبری سنائی۔ "اب ہم اپنے آنے والے بے بی کے لیے کچھ کر سکیں گے۔"

"جاوید! ہمارے پاس کی تو نہیں ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہمارے بے بی کے لیے سب آئے گا۔"

"ہاں کی نہیں ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اپنے بچے کے لیے سب فرود کروں۔ میں نے جو محرومی دیکھی ہے، وہ میرے بچے کو نہ دیکھنی پڑے۔"

جاوید افسردہ ہو گیا اور رونا کو اس کی افسردگی برداشت نہیں تھی اس لیے فوراً مان گئی۔ "کیوں نہیں جناب! ہمارے بے بی کا سب اس کے پاپا کریں گے۔"

جاوید کا چہرہ چمک اٹھا۔ "یہی تو میں بھی چاہتا ہوں۔"

میونہ نے جاوید کو آگے بڑھنے کا مشورہ دیا تھا اور اس کا ارادہ ایم کام کرنے کا تھا مگر پہلے شادی اور اب بچے کی آمد کی وجہ سے اسے مہلت نہیں ملی۔ شاید اس نے اس بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا مگر رونا نے سوچ رکھا تھا کہ اس کا بی بی کام مکمل ہوگا اور جب کای کسی قدر بڑا ہو جائے گا تو وہ جاب کر لے گی اور تب جاوید ایم کام کر سکے گا۔ مگر اس نے جاوید سے کہا نہیں، شاید وہ ابھی نہ مانا۔ اس لیے رونا نے اس معاملے کو آنے والے وقت پر چھوڑ دیا۔ پھر ز میں ایک مہینہ گزرا گیا تھا، اس لیے رونا کا بیشتر وقت پڑھنے میں گزرتا یا پھر وہ آرام کرتی تھی۔ صفائی اور دوسرے کاموں کے لیے زہرینہ آتی تھی اور وہ برتن اور کچن بھی نمٹاتی تھی۔

درحقیقت ان دنوں زہرینہ نے رونا کا بہت سا ٹھہرایا تھا۔ رونا

اسی ملک میں لاکھوں عورتیں اس حالت میں جاب بھی کرتی ہیں اور پڑھتی بھی ہیں۔ تم بھی پڑھ سکتی ہو۔"

"مجھے شرم آئے گی۔"

جاوید نے نرمی سے کہا۔ "یہ فطری چیز ہے اور اس میں شرم کیسی؟"

"لیکن میری اتنی جو چھٹیاں ہو رہی ہیں؟"

"تم کالج میں بات کر لو اور اپنی مجبوری بتا دو۔ مجھے یقین ہے کالج انتظامیہ تم سے کوآپرٹ کرے گی۔ ویسے بھی امتحان تک تمہاری جسمانی حالت بہت چھینچ نہیں ہوگی۔ اس لیے کسی کو پتا نہیں چلے گا۔"

اصل میں رونا کو اس حالت میں کالج جاتے ہوئے

شرم آ رہی تھی۔ وہاں بہت سی فرینڈز تھیں اور وہ سب اس کا

ریکارڈ لگاتیں۔ دوستوں کی حد تک ٹھیک تھا لیکن ان سے یہ

بات سب میں پھیل جاتی اور کالج میں بہت سے مرد لپکھڑا اور

پروفیسر بھی تھے۔ اس لیے وہ چاہتی تھی کہ یہ بات زیادہ نہ

پھیلے۔ اس نے اچھی خاصی تیاری کر لی تھی اور اسے یقین تھا

کہ وہ اپنے بار کس برقرار رکھے گی۔ جاوید کے مشورے پر

رونا نے کالج پر بس سے بات کی اور انہیں اپنی مجبوری بتائی

تو وہ مان گئیں۔ انہوں نے کہا۔ "رونا! آپ لکرنہ کریں۔۔۔۔۔"

حاضری کا مسئلہ نہیں ہوگا ویسے بھی آپ سیونٹی فائیو پر سنٹ

اشینڈس سے زیادہ دور نہیں ہیں لیکن آپ کی تیاری مکمل ہونی

چاہیے۔ یہ کالج کی ریپوٹیشن کا معاملہ ہے۔"

"میڈم! میں نے پریویس میں سیونٹی تھری پر شیج

حاصل کی تھی، اس بار مجھے 'میڈم' ہے میں زیادہ حاصل کر

سکوں گی۔"

"وش یو گڈ لک ایٹڈ وٹش یو اسے ہیلڈی بے بی۔"

انہوں نے کہا تو وہ شرمائی۔

"تھینک یو میڈم۔"

"میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہنا مجھے

تمہارے کام آکر خوشی ہوگی۔ تم دہری ذمے داریاں نبھا

رہی ہو۔"

رونا ایک بار پھر میڈم کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گئی۔ وہ

خوش تھی کہ اب پھر زہرینہ میں مشکل نہیں ہوگی۔ اگر

حاضری کا مسئلہ ہو تو وہ بھی میڈم دیکھ لیں گی۔ اس وقت اس

نے سوچا نہیں تھا کہ جلد یہ دہری ذمے داریاں تہری ہونے

والی تھیں۔ اس کے لیے پہلا موقع تھا اور ابتدائی دن تھے اس

لیے طبیعت رہ رہ کر خراب ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نے جو دوا میں

دی تھی وہ باقاعدگی سے لے رہی تھی۔ کالج جانا تقریباً بند تھا

ٹٹے میں کئی دن باقی تھے۔ جب رعنا نے زیادہ اصرار کیا تو جاوید نے چڑ کر کہا۔ ”میرے پاس صرف چار سو روپے ہیں ڈاکٹر کی فیس، دوں گا تو دفتر کیسے جاؤں گا۔“

”جاوید ہمارے پاس رقم ہے اور رقم ہوتی ہی اس لیے ہے کہ کام آئے پلیز آپ۔۔۔۔۔“

”اس کی بات مت کرو۔“ وہ بات کاٹ کر بولا۔ ”شاید بھی ایسا وقت آئے کہ تمہیں اس کی ضرورت نہیں زیادہ ہو۔“

”اللہ نہ کرے۔“ رعنا دہلی گئی تھی۔ ”پلیز جاوید ایسی بات نہ کریں میرا دل رکنے لگتا ہے۔“

”تب تم بھی مجھ سے اس رقم کا مت کہا کرو۔“

”اچھا جیسے ہی تنخواہ ملے گی آپ فوراً ڈاکٹر کے پاس جائیں گے۔“

”اچھا جاؤں گا بابا۔“

”ایسے نہیں مجھ سے وعدہ کریں۔“

”وعدہ بکا وعدہ۔“

جاوید کو تنخواہ چار دن بعد ملی اور ان چار دنوں میں اس کی حالت ایسی ہو گئی کہ خود وہ بھی پریشان ہو گیا۔ اس کی رنگت اب ہیلی سے سیاہی مائل ہو رہی تھی جسم جیسے گھلنے لگا تھا۔ ہاتھ پیروں میں جان نہیں رہی تھی جو کھاتا، کچھ دیر بعد اٹی کی صورت میں نکل جاتا تھا یہ کہ جوس اور پانی بھی پیتا تو اٹی ہو جاتی تھی۔ جب وہ ڈاکٹر کے پاس گیا تو عملاً دو دن کے فاقے سے تھا۔ ڈاکٹر بھی پر تشویش ہو گیا اور اس نے فوری طور پر جاوید کو جگر کے ٹیسٹ لکھ کر دیے اور بولا۔ ”یہ فوری کرائس اور ایمرجنسی میں کرائس، ممکن ہے چند گھنٹے کی تاخیر بھی خطرناک ہو۔“

”ڈاکٹر صاحب مسئلہ کیا ہوا ہے؟“ جاوید نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”شاید ہیپاٹائٹس ہے لیکن ٹھیک سے ٹیسٹ کے بعد پتا چلے گا۔“

جاوید پریشان ہو گیا۔ اس نے فوری طور پر ٹیسٹ کرایا تو اس میں ہیپاٹائٹس ہی نکلا اور مرض جگر پر حاوی ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ علاج کے ساتھ مزید ٹیسٹ کیے گئے تھے۔ جن سے پتا چلا کہ مرض بگڑ چکا ہے اور ڈاکٹروں کا رویہ بتا رہا تھا کہ وہ مایوس تھے۔ رعنا کو پتا چلا تو اس کا برا حال ہو گیا۔ ماں کے انتقال کے بعد اس کے لیے یہ ایک اور مشکل وقت تھا۔ شاید وہ زیادہ پریشان تھی کیونکہ اب وہ اکیلی نہیں تھی بلکہ اس کے وجود میں ایک سہیلی جان بھی تھی اور جاوید ان دونوں کے لیے ناگزیر تھا مگر تقدیر یہ نہیں دیکھتی کہ کون ناگزیر ہے

کو اچھا نہیں لگتا تھا کہ وہ یوں بنا معاوضہ اتنا کام کرے۔ وہ غریب عورت اپنا گھر چلانے کے لیے صبح سے شام تک کام کرتی تھی۔ اس لیے رعنا نے یہ کہا کہ اپنے اکاؤنٹ سے چیک سے رقم نکال کر اسے دیتی رہتی تھی۔

اپنی پوزیشن برقرار رکھنے اور اچھے مارکس لانے کے لیے رعنا نے بہت زیادہ محنت کی تھی۔ شاید اسی وجہ سے امتحان کے دنوں میں ہی طبیعت خراب ہو گئی تھی مگر وہ برداشت کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح بچہ رو جتی رہی، جس دن آخری بچہ دے کر آئی ایسی بے سندھ بڑی کہ دو تین دن تک تو اسے ہوش ہی نہیں رہا۔ جاوید اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا اور ڈاکٹر نے بھی بتایا کہ زیادہ محنت اور صحت پر توجہ نہ دینے سے کیس ذرا مشکل ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے رعنا کو مکمل بیڈ ریسٹ اور خوراک پر توجہ دینے کی تاکید کی۔ ساتھ میں ڈھیروں طاقت کی دوائیاں بھی لکھ دی تھیں۔ ان دنوں جاوید اس کا بہت خیال رکھ رہا تھا شام کو کھانا ماندا ڈیوٹی سے آنے کے بعد وہ اس کے ساتھ لگا رہتا۔ شاید اسی لیے اس کی طبیعت خراب ہوئی۔ ایک دن وہ دفتر سے آیا تو اس کی آنکھیں سرخ اور چہرہ مہر مہا یا ہوا لگ رہا تھا۔ رعنا پریشان ہو گئی۔ ”کیا ہوا۔ ہے آپ کو! طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”پتا نہیں دو تین دن سے طبیعت متلا رہی ہے اور کھانے کو دل نہیں چاہتا۔“

جاوید کو بخار بھی ہو رہا تھا۔ رعنا نے کہا۔ ”آپ ڈاکٹر کے پاس جائیں۔“

”ارے، نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے تین دن پہلے آفس میں دعوت ہوئی تھی سب مرغن تھا اس لیے پیٹ ذرا گڑبڑ ہوا ہے ٹھیک ہو جائے گا تم فکر مت کرو۔“

رعنا نے بہت اصرار کیا مگر جاوید کا انکار برقرار رہا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کے علاج اور دواؤں پر بہت خرچ ہو رہا تھا اور جاوید کا ہاتھ تنگ تھا اس لیے وہ ڈاکٹر کے پاس جانے سے گریز کر رہا تھا کہ اس میں بھی غریب ہوتا۔ اگلے دن اس کی طبیعت کسی قدر بہتر تھی مگر منگی والی کیفیت برقرار تھی۔ اس کے لیے وہ چوہن اور بانسے کی دوا لے رہا تھا۔ اس کی رنگت عجیب ہیلی سی ہو رہی تھی اور آنکھوں کے گرد جلتے نمایاں ہونے لگے تھے حالانکہ اس سے پہلے جاوید کی صحت بہت اچھی تھی۔ شادی کے بعد رعنا نے شاید ہی اسے بیمار پڑتے دیکھا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ اگلے دن رعنا نے پھر ڈاکٹر کے پاس جانے کو کہا اور اس نے پھر انکار کر دیا۔ مہینے کی آخری تاریخ تھی اور تنخواہ

کامی کو گود میں لیا تھا۔ اس کا چہرہ بیک وقت آنسوؤں اور خوشی سے تر تھا اور دلہانہ انداز میں کامی کو دیکھ رہی تھی۔ یہ تصویر کامی کی پیدائش کے آدمے گھنٹے بعد کی تھی اور رعنا کی ایک کلاس فیلو نازیہ نے لی تھی۔

☆☆☆

جاوید کی اچانک اور ناکہانی موت نے رعنا کے حواس گم کر دیے تھے۔ کئی دن تو اسے اپنے وجود میں موجود کامی کا خیال بھی نہیں رہا، وہ اپنے آپ سے بیگانہ ہو گئی تھی۔ ابتدائی دکھ ایسا تھا کہ لگا جیسے وہ مر جائے گی۔ شاید وہ مرجانا چاہتی تھی مگر یہ اس کے اختیار میں نہیں تھا اس لیے زندہ رہی اور زندگی کی طرف بھی آنا پڑا۔ اپنے لیے بھی اور کامی کے لیے بھی۔ نازیہ نے ان دنوں رعنا کا بہت ساتھ دیا تھا۔ وہ کالج میں اس کی سب سے اچھی دوست تھی اور صرف اسے ہی علم تھا کہ رعنا امید سے ہے۔ نازیہ کا تعلق ایک اوپری متوسط گھرانے سے تھا اور اس کے گھر میں لڑکیوں کو مناسب آدوی حاصل تھی۔ جاوید کے انتقال پر وہ مستقل رعنا کے ساتھ رہی اور اس کے ساتھ ساتھ گھر بھی سنبھالتی رہی۔ اسے جینے پر اکساتی رہی۔

بالآخر وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہی، بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اس نے رعنا کو زندگی کی طرف گھنٹ لیا۔ اس نے اس کا اتنا خیال رکھا کہ ہوش میں آنے کے بعد رعنا نے خود کو تقریباً ٹھیک پایا۔ وہ نازیہ کی شکر گزار ہوئی جس نے صرف دوستی کے ناتے اس کا اتنا ساتھ دیا۔ رعنا کو پتا چلا کہ جاوید کا کفن دفن محلے والوں اور اس کے آفس کولیکٹرز نے مل کر کیا تھا۔ بعد کے معاملات بھی وہی دیکھتے رہے تھے۔ ان کا کوئی رشتے دار نہیں تھا ایسے میں ان ہی لوگوں نے ساتھ دیا تھا۔ جاوید کی تدفین کے پانچویں دن اس نے نازیہ سے کہا۔ ”میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں اتار سکوں گی۔“

”یہ احسان نہیں ایک دوست کی طرف سے دوست کے لیے کوشش ہے۔“

”نہیں یہ احسان ہے۔“ رعنا نے اصرار کیا۔ ”تم چھ دن سے مستقل میرے ساتھ ہو۔ تمہارے گھر والوں کا بھی احسان ہے کہ انہوں نے تمہیں یہاں رکھنے کی اجازت دی۔“

”یہ بھی ایسی بات نہیں ہے۔ میں تو ویسے بھی فرینڈز کے گھر رک جاتی ہوں میرے گھر والے اعتراض نہیں کرتے اور اس موقع پر تو اعتراض کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ جانتے ہیں کہ تمہیں میری کتنی ضرورت ہے۔“

”لیکن اب میں ٹھیک ہوں۔“

اور کون نہیں، اس کا اپنا حساب کتاب ہوتا ہے۔ کاتب تقدیر نے جس کی جتنی زندگی لکھی ہوتی ہے وہ اس سے ایک سانس زیادہ نہیں لے سکتا۔ جاوید کا وقت آ گیا تھا۔ دو دن اسپتالی میں رہ کر اس نے آخری سانس لینے سے پہلے بہت حسرت سے رعنا کو دیکھا اور آہستہ سے بولا۔۔۔ ”پتا نہیں اللہ نے میرے لیے کیا لکھا ہے لیکن یہ اس کا احسان ہے کہ اس نے تمہیں دیا اور پھر مجھے اولاد دی شاید میں اسے دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہوں لیکن میرا کوئی نام لیا تو ہوگا۔“

”ایسا نہ کہیں۔“ رعنا تڑپ کر رو دی تھی مگر اس کا رونا تڑپنا کام نہیں آیا۔ کچھ دیر بعد جاوید اسے چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔

☆☆☆

رعنا نے ڈیبک ٹاپ کی تصویر دیکھی تو اسے جاوید یاد آ گیا۔ اسے دنیا سے گزرے برسوں گزر گئے لیکن رعنا کے دل میں اس کی یاد ہمیشہ تازہ رہی۔ رعنا نے جو وقت اس کے ساتھ گزارا وہی اس کا اصل سرمایہ تھا۔ اس نے کبھی دوسری شادی کا نہیں سوچا تھا۔ اگرچہ وہ انیس سال کی ہونے سے پہلے بیوہ ہو چکی تھی۔ اس نے آنکھیں صاف کر کے تصویر دیکھی۔ وہ بہت سادہ تیار ہوئی تھی، جاوید نے بھی سادہ شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا لیکن دونوں بہت اچھے لگ رہے تھے۔ جب جاوید رعنا کی زندگی میں آیا تو وہ ماں سے محروم ہونے والی تھی پھر جاوید بھی سال سے پہلے چلے گیا اور اب کامی بھی نہیں رہا تھا۔ وہ خالی ہاتھ رہ گئی تھی۔ کامی کا خیال آیا تو ایک بار پھر اس کے پاؤں کانپنے لگے تھے اور وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ رعنا کا ہاتھ کی بورڈ پر تھا اور اسے پتا نہیں چلا کہ کب کون سا ہٹن دب گیا جب اس نے اسکرین کی طرف دیکھا تو ایک فولڈر سامنے تھا۔ اس کا نام تھا ”مائی اسٹف“

ویسے تو یہ کمپیوٹر کامی کا تھا لیکن یہ فولڈر شاید اس نے خاص طور پر اپنے لیے بنایا ہوا تھا۔ رعنا نے اسے کھولا تو اس کے اندر کئی سب فولڈر بنے ہوئے تھے۔ ایک پر پکسر (تصاویر) لکھا ہوا تھا۔ اسے کھولا تو سامنے ہی رعنا اور کامی کی بے شمار تصویریں تھیں۔ میٹرک میں پوزیشن حاصل کرنے پر رعنا نے اسے جو گفٹس دیے تھے ان میں ایک جدید ڈیجیٹل کیمرہ بھی تھا۔ وہ گاہے بگاہے رعنا کی تصویریں لیتا رہتا تھا۔ کامی نے تصویروں کے نیچے نام دیے تھے۔ رعنا کی تصویروں کے ساتھ اس نے مائی لولی مانا اور مائی سوٹ ماما کے نام دیے ہوئے تھے۔ ان میں ایک تصویر اس وقت کی تھی جب رعنا نے شاید پہلی بار ہوش و حواس میں

کنزئیل

☆ اس دنیا میں کروڑوں لوگ ہیں، پھر آپ کے پیدا ہونے کی وجہ؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے وہ چیز توقع کر رہا ہے جو کروڑوں لوگوں سے ممکن نہیں ہے۔

☆ ایک انسان اپنی سوچوں اور اپنی حرکات سے جانا پہچانا جاتا ہے اپنی دولت اور فکریوں سے نہیں۔ اصلی تعلیم آپ کا دوسروں سے حسن سلوک اور رجحان ہے۔

☆ پانی کے ایک قطرے کی جھیل یا تالاب میں کوئی قدر و قیمت نہیں، کوئی پہچان نہیں مگر یہی قطرہ اگر کسی پتے پر گرتا ہے تو ایک ہیرے کی طرح چمکتا ہے چنانچہ کسی ایسی درست جگہ کا انتخاب کریں جہاں آپ ہیرے کی طرح چمک سکیں۔

☆ کچھ رشتے "نام اینڈ جیری" کی طرح ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے کو اذیت دیتے اور لڑتے جھگڑتے ہیں۔ ایک دوسرے کو مارتے ہیں مگر ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے۔

☆ یقین کی پختگی اور اخلاق کا حسن جس بندے میں ہوگا۔ وہ ایک ہی وقت میں خالق اور مخلوق دونوں کا محبوب بن جائے گا۔

مرسلہ۔ سیدہ شاہدہ شاہ، جہلم

سیاسیات

دو مختلف پارٹیوں کے سیاستدان آپس میں بحث و مکرار کر رہے تھے۔ دونوں پہلے تو ایک دوسرے کو قائل کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ پھر الزامات پر اتر آئے۔ ایک سیاستدان نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے، تم کس کے اشارے پر ناچتے ہو؟"

دوسرے سیاستدان نے مشتعل ہو کر کہا۔

احق آدمی۔ "سیاسی بحث میں بیوی کو کیوں

تہمتیں دیتے ہو۔"

مرسلہ: ریاض بیٹ، حسن ابدال

نازیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اس وقت تک تمہارے ساتھ رہوں گی جب تک مجھے خود اطمینان نہیں ہو جاتا۔"

رہانے اسے یقین دلایا کہ وہ اب ٹھیک ہے اور اپنی دیکھ بھال کر سکتی ہے اس کے باوجود نازیہ بہ مشکل دسویں دن ٹی۔ اس کے جانے کے بعد رہانے کو ایسا سناٹا محسوس ہوا کہ اس کا دل چاہا سب چھوڑ کر گلیوں سڑکوں پر نکل جائے، جہاں لوگ ہوں اور وہ خود کو اتنا اکیلا محسوس نہ کرے۔ اس رات اس نے جانا کہ اکیلا پن کیا ہوتا ہے۔

☆☆☆

اور اب کامی ایک بار پھر اسے تیار کر گیا تھا۔ صرف اس کی چیزیں، تصویریں اور ویڈیو گئی تھیں۔ تصویریں بہت سی تھیں رہانے بچ اسکرول کیا تو بچے موجود تصویریں سامنے آئیں۔ تب رہانے پہلی بار اس لڑکی کی تصویریں دیکھیں اور جب اس نے نام پڑھنا چاہا تو اسے جھٹکا لگا۔ کامی نے پہلی تصویر کے نیچے نام لکھا ہوا تھا مائی بیوٹی فل جی ایف۔ یعنی میری خوب صورت گرل فرینڈ۔ لڑکی خوب صورت تھی۔ عمر میں وہ کامی سے بڑی لگ رہی تھی شاید بیس یا اکیس برس کی تھی مگر اس کے چہرے پر مصویت تھی۔ وہ تصویریں ہناتے ہوئے کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں شرم اور جھجک کا تاثر تھا۔ اگلی تصویروں کے نیچے نام کی جگہ مزید سستی خیز الفاظ تھے۔

رہانے کا دل تیز سے دھڑکنے لگا اسے بالکل یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کامی نے لکھا ہے۔ فولڈر میں لڑکی کی کوئی درجن بھر تصویریں تھیں اور سب میں وہ کبھی باہر تھے۔ چھ تصویریں ساحل سمندر اور پارک کی تھیں۔ دو کسی ریستوران یا ہوٹل کی اور باقی بھی ہیں منظر میں کمرے سے باہر کی لگ رہی تھیں۔ کامی نے کسی تصویر میں لڑکی کا نام نہیں لکھا تھا۔ تصویریں دیکھتے ہوئے رہانے کو خیال آیا کہ ممکن ہے یہ تصویریں کامی نے نہ لی ہوں۔ شاید کسی اور نے اسے دی ہوں۔ یعنی ان تصویروں سے کامی کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ رہانے نے خود کو تسلی دی۔ "ہاں۔ یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ کامی اس نیچر کا لڑکا تھا ہی نہیں، یہ تصویریں اس نے یقیناً کسی اور سے لی ہیں۔ دوست اپنی گرل فرینڈز کے ہارے میں ایک دوسرے کو بتاتے رہتے ہیں۔"

رہانے نے کمپیوٹر بند کر دیا اور وہاں سے اٹھ آئی۔ اگرچہ اس نے خود کو تسلی دی تھی مگر اس کے اندر بے چینی موجود تھی۔ اس کا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ کامی کے انتقال کے بعد وہ دو ہفتے تک دفتر نہیں گئی تھی۔ اگرچہ آفس کی طرف

جب رحمان مائی اور اس نے زرینہ کو پھر سے صرف کام کے لیے رکھ لیا تھا۔ اب کامی خود اسکول جاتا تھا۔ ایک سال بعد رحمان نے کارلے لی تو اسے اسکول چھوڑتی ہوئی دفتر چلی جاتی۔ اسکول گھر سے ایک بلاک کی دوری پر تھا۔ چابی کامی کے پاس ہوتی تھی وہ خود گھر آ جاتا۔ جب وہ بارہ سال کا ہوا تو رحمان نے اسے موبائل فون دلایا کہ کسی مشکل میں وہ اسے کال کر سکے۔ مگر کال کا موقع کبھی نہیں آیا تھا چھوٹی موٹی بات ہوتی تو کامی اسے کال کر کے بتا دیتا تھا مگر اس نے رحمان سے مدد طلب نہیں کی اور نہ ہی اس کی وجہ سے رحمان کو کبھی قبل از وقت دفتر سے نکل کر آنا پڑا۔

وہ شام کو گھر آتی تو گھر صاف ستھرا ہوتا اور تمام کام نئے نئے ہوتے تھے۔ کامی کو بچپن میں بھی چیزیں پھیلانے کی عادت نہیں تھی اور ڈرا پڑے ہونے پر تو اس نے کھلی چیزیں سمیٹنا شروع کر دی تھیں۔ اس سے ڈرا بھی بے ترس بنی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ رات کے کھانے میں رحمان کانی اہتمام کرتی تھی اور عام طور سے کامی کی پسند کی چیز ہوتی تھی۔ اسے چاول کی ڈشز پسند تھیں اس لیے رحمان زیادہ تر وہی بناتی تھی۔ کبھی کبھی وہ کھانے کے لیے باہر بھی چلے جاتے تھے۔

جیسے جیسے کامی بڑا ہوا ہاتھ رحمان پر ڈسے داریاں کم ہوتی جا رہی تھیں۔ کامی نے میٹرک کرنے کے بعد ایک ڈرائیونگ اسٹی ٹیوٹ سے ڈرائیونگ سیکھی اور اس کا لرننگ لائسنس بھی بن گیا۔ اس کے بعد وہ کبھی مل کر جاتے تو کامی ہی ڈرائیونگ کرتا تھا۔ اب ہر کام کے لیے رحمان کو نہیں جانا پڑتا تھا۔ گھر کی چیزیں اور سودا سلف کامی لانے لگا تھا۔ رات کو کھانا بناتے ہوئے وہ رحمان کا ہاتھ بھی بناتا تھا۔

کامی کے دوستوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی۔ وہ کھینچنے کے لیے شام کے وقت جاتا اور عام طور سے مغرب سے پہلے گھر آ جاتا تھا۔ پھر صرف ضرورت کے وقت ہی باہر جاتا۔ اس نے اپنے دوستوں کو بھی منع کیا ہوا تھا کہ وہ شام کے بعد اس کے گھر نہ آئیں۔ اسے رحمان کے ساتھ گھر میں رہنا پسند تھا۔ وہ اس کی مدد کرتا، تھوڑا بہت فی وی دیکھ لیتا اور رات کا کھانا کھا کر نو بجتے ہی پنڈروم کا رخ کرتا تھا۔ اس کے سونے کے بعد رحمان کچھ دیر فی وی دیکھتی یا پھر پڑھتی تھی لیکن وہ بھی عام طور سے ساڑھے دس بجے تک سونے کے لیے لیٹ جاتی تھی۔

رحمان سوچ رہی تھی کہ کامی کے پاس اتنی ڈیڑھ ساری مصروفیات میں وقت ہی کہاں ہوتا تھا جو وہ باہر کسی لڑکی سے ملتا۔ اس کے معمولات لگے بندھے تھے مگر وہ اس دن بھی تو

سے اسے چھٹی میں کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ آفس جائے گی۔ گھر کا اکیلا پن اور کامی کا خیال اسے کاٹ کھانے کو دوڑاتا تھا۔ کامی کی پیدائش کے ایک سال بعد اس نے جاب کر لی تھی کیونکہ بیٹے کرکھانے سے تو خزانہ بھی خالی ہو جاتا ہے۔ کامی کی دیکھ بھال کے لیے اس نے ماسی زرینہ کو مستقل رکھ لیا تھا۔ وہ گھر کا کام کاج بھی کرتی تھی اور کامی کی دیکھ بھال بھی کرتی تھی۔ وہ اوپر کی فیڈ لیتا تھا اس لیے اس کا بھی مسئلہ نہیں تھا۔ رحمان کو ایک فرم میں جاب ملی وہ دو سال وہاں رہی۔ بی کام کے بعد وہ باقاعدہ تو نہیں پڑھ سکی تھی مگر اس دوران میں اس نے اکاؤنٹس کے کچھ کورسز کر لیے تھے۔ خاص طور سے کمپیوٹر پر اکاؤنٹس کا کورس کرنے سے اسے ایک ملٹی میٹل فرم میں اچھی جاب مل گئی اور وہ اب تک یہیں کام کر رہی تھی۔

شروع کے چند سال بہت مشکل گزرے تھے۔ کامی چھوٹا تھا اور اس کی جدائی محسوس کرتا تھا۔ جب وہ دفتر سے آتی تو اسے دیکھتے ہی یوں چٹکتا کہ پھر جان نہیں چھوڑتا تھا۔ زرینہ اسے بڑی مشکل سے بہلاتی تھی۔ تین سال کی عمر میں وہ کسی قدر سنبھل گیا اور جب رحمان نے اسے اسکول میں داخل کر لیا تو اس نے رونا دھونا ترک کر دیا تھا۔ اسکول وہ بہت خوشی سے گیا تھا۔ رحمان صبح اسے خود چھوڑتی ہوئی دفتر جاتی اور دوپہر میں زرینہ اسے لے آتی۔ ہفتہ اتوار چھٹی ہوتی اور یہ دو دن ماں بیٹے کے ہوا کرتے تھے۔ دو دن زرینہ کی چھٹی ہوتی اور رحمان سب دیکھتی تھی۔

رحمان سے پڑھائی بھی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ بچے جو بات ماں سے سیکھ سکتا ہے وہ اسے دنیا کا کوئی فرد اتنی آسانی سے نہیں سکھا سکتا۔ اس لیے وہ کامی کی تربیت پر خاص توجہ دیتی تھی۔ اسے اس کا ایک ایک کام خاص طور سے سکھاتی تھی جیسے برش کیسے کرتے ہیں۔ منہ ہاتھ کیسے دھوتے ہیں، صفائی کا خیال کیسے رکھتے ہیں۔ کامی ذہین تھا۔ رحمان اسے جو بتاتی وہ عام طور سے ایک بار میں سمجھ لیتا تھا اس کے باوجود رحمان اس کا بار بار امتحان لیتی۔ شاید اسی وجہ سے بہت چھوٹی عمر میں وہ اپنے سارے کام خود کرنے لگا تھا۔ جب وہ دس سال کا ہوا تو اس نے رحمان سے کہا۔ "ماما اب زرینہ بی کو بس کام کے لیے رکھ لیں۔"

"کیوں پتا؟"

"ماما میں اپنی دیکھ بھال کر سکتا ہوں۔" کامی نے اعتماد سے کہا۔ "آپ نے مجھے سب سکھا دیا ہے، میں اکیلا بھی رہ سکتا ہوں۔"

دوران اس کا دماغ الجھا رہا اور جب اشرف صاحب نے اسے دوسری بار مخاطب کیا تو وہ چونگی۔ اشرف صاحب پوچھ رہے تھے۔ ”سرس رعنا آریو او کے؟“

”نہیں سر..... سوری سر۔“ اس نے معذرت کی۔ ”میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“

”تو آپ چھٹی کر لیتیں۔“ وہ ہمدردی سے بولے۔ انہیں علم تھا کہ رعنا کس سانچے سے گزری ہے۔ ”بلکہ ایسا کریں چند دن کی چھٹی لے لیں۔“

رعنا چھٹی نہیں کرنا چاہتی تھی اشرف صاحب کی بات پر اس نے سر ہلایا۔ ”تھینک یوسرناؤ آئی ایم بیٹر۔“

رعنا واپس اپنے کمرے میں آئی تو کام کرنے کے بجائے وہ کسی سوچ میں گم گئی۔ چار بجے وہ اشرف صاحب کے کمرے میں آئی۔ اس نے کہا۔ ”سرا میں نے آپ کی بات پر غور کیا ہے مجھے واپس چند دن آرام کی ضرورت ہے۔“

”آپ نے درست فیصلہ کیا ہے۔ ایسا کریں منظر سے چھٹی کی درخواست دے دیں آج فرمائی ڈے ہے آپ پانچ دن کی چھٹی لیں تو آپ کو لو دن کی چھٹی مل جائے گی۔ ٹیکسٹ منظر سے تک۔“

رعنا نے ان کا شکریہ ادا کیا اور درخواست دے دی جو اشرف صاحب نے اسی وقت منکھور کر لی۔ رعنا چھٹی کے وقت دفتر سے نکلی اور اس نے نازیہ کو کال کی۔ دفتر کے ساتھیوں سے ہٹ کر اس کی کسی سے ملاقات ہوتی تو وہ نازیہ ہی تھی جو اس کے بہت قریب تھی۔ جاوید کی طرح کامی کی ہدائی پر بھی اس نے رعنا کا پورا ساتھ دیا تھا۔ نازیہ کی شادی ہو گئی تھی اور اس کے چار بچے تھے۔ نازیہ کا شوہر اقبال ایک خیرنگی بینک میں منبر تھا۔ ان کی رہائش رعنا کے علاقے میں تھی۔ اس لیے نازیہ جلدی جلدی چکر لگاتی رہتی تھی۔ درمیان میں ملنا ذرا کم ہو گیا تھا مگر کامی کی وفات کے بعد وہ رعنا کا خاص خیال رکھ رہی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی اور بولی۔ ”میں ابھی تمہارا ہی سوچ رہی تھی کیا خیال ہے آج دفتر ہمارے ساتھ کرو؟“

”میں نے اسی لیے کال کی ہے۔ میں دفتر سے نکلی ہوں لیکن گھر سے ہو کر آؤں گی۔“

”ٹھیک ہے لیکن جلدی آنا۔“

”ہاں جلدی آؤں گی مجھے تم سے کچھ بات بھی کرنی ہے۔“ رعنا نے جواب دیا۔

دو گھنٹے بعد وہ نازیہ کے گھر میں اس کے ڈرامنگ روم میں موجود تھی۔ لاؤنج میں بیچے کی وی دیکھ رہے تھے اور

اس ریستوران میں تھا۔ لوگوں اور ویٹرز کا بیان ہے کہ وہ اکیلا تھا مگر اس نے اپنے لیے کچھ منگوا یا نہیں تھا پھر وہاں کیوں موجود تھا؟ کیا اسے کسی سے ملنا تھا اور وہ اس کا انتظار کر رہا تھا؟ ریستوران شہر کے ایک بہت پوش علاقے میں تھا اور وہ جگہ ان کے گھر اور کامی کی یونیورسٹی سے خاصی دور پڑتی تھی تب وہ وہاں کیوں گیا تھا؟ ایک دن پہلے اس نے ڈزینیل پر رعنا کو تفصیل سے بتایا تھا کہ گزشتہ روز اس کے معمولات کیا تھے اور اسے اگلے دن کئی اہم لیکچرز نوٹ کرنے تھے اور اس کے بعد وہ لائبریری جاتا۔ یونیورسٹی سے وہ دو بجے نکل جاتا تھا اور اس کے بعد وہ کم سے کم دو گھنٹے لائبریری میں بیٹھتا تو وہ سہ پہر ساڑھے تین بجے اس ریستوران میں کیوں موجود تھا؟

رعنا لیکن میں کام کر رہی تھی سوالات کی بھرمار نے اسے ایسا حواس باختہ کیا کہ اس کے سامنے ہانڈی لگ گئی اور اسے پتا نہیں چلا۔ جب تیز بول کے ساتھ دھواں بھی اٹھنے لگا تب وہ چونگی اور اس نے گہری سانس لی اور خود سے کہا۔ ”میں کیوں فضول باتیں سوچ رہی ہوں۔ جب کہ میں اپنے بیٹے کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ کوئی غلط کام نہیں کر سکتا۔“

اس کا اب کھانا کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے چائے بنائی اور اپنے کمرے میں آگئی۔ دفتر جانے سے پہلے کہ صبح سے شام تک کا وقت آسانی سے گزرنے لگا تھا مگر اس کے بعد کا وقت کاٹنا بہت دشوار ہو جاتا تھا۔ گھر میں ہر جگہ ہر قدم پر اور ہر عمل میں کامی کی یاد آتی اور اس کے لیے خود پر قابو رکھنا دشوار ہو جاتا۔ اب یہ نیا مسئلہ سامنے آ گیا تھا۔ اس نے انکار کیا مگر اس سے سوالات کا سلسلہ رکنا نہیں۔

آنے والے کئی دنوں تک وہ ان سوالات کو بہ ظاہر نظر انداز کرتی رہی مگر درحقیقت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ ایسا کچھ ہے جس سے وہ بے خبر تھی۔ اگر وہ لڑکی کامی سے ہی تعلق رکھتی تھی تو بہت کچھ تھا جس کا اسے علم نہیں تھا۔ اسے خیال آیا کہ وہ کامی کے دوستوں سے پوچھے لیکن پھر اس نے یہ خیال مسترد کر دیا۔ اسے اچھا نہیں لگا کہ وہ اپنے مرحوم بیٹے کے ماضی کے بارے میں اس کے دوستوں سے پوچھے۔ ہو سکتا ہے وہ لاعلم ہوں اور اس کے بعد وہ کامی کے بارے میں سوچیں۔ تب وہ حقیقت تک کیسے پہنچ سکے گی؟

اگلے دن وہ آفس میں تھی۔ دوپہر میں ڈائریکٹر ٹرانس اشرف صاحب نے میٹنگ بلائی۔ وہ اپنے شعبے میں نائب تھی اس لیے اس کی شرکت بھی لازمی تھی۔ میٹنگ کے

سہنسی ڈائجسٹ 265 فروری 2015ء

”آج میں گھر پر نہیں ہوں گی، تم اب میرے دن آنا۔“
 زرینہ کے پاس گھر کی چابی تھی وہ دوپہر میں آکر کام
 کر کے چلی جاتی تھی۔ رعنا کو اس پر پورا اعتماد تھا اسی لیے
 اس نے چابی اس کے حوالے کر دی تھی۔ گھر سے نکلنے سے
 پہلے اس نے شاہد لیا۔ اس کا چہرہ سنا ہوا اور آنکھوں کے نیچے
 حلقے تھے۔ اگرچہ اب وہ خاصی بہتر ہو گئی تھی لیکن اس سانچے
 کے اثرات پوری طرح گئے نہیں تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ
 دیکھنے والوں کو بہتر نظر آئے اور کوئی خاص طور سے اس کی
 طرف متوجہ نہ ہو۔ سن گلاسز لگا کر وہ باہر آئی تو کسی قدر گری
 تھی اس نے کار کا اسے ہی آن کر لیا اور روانہ ہو گئی۔ ابھی وہ
 ڈرائیو کر رہی تھی کہ نازیہ کی کال آئی۔ ٹریک کا شور سن کر
 اس نے پوچھا۔ ”تم راستے میں ہو؟“

”ہاں۔“

”کب تک پہنچ جاؤ گی؟“

”نازیہ اصل میں، میں تمہاری طرف نہیں آ رہی
 ہوں۔“ وہ کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ بولی۔
 ”لیکن کیوں؟“ نازیہ چلا آئی۔ ”مگر کہاں جا رہی ہو؟“
 رعنا نے کار روک دی۔ ”اسی ریستوران جہاں کامی کا
 مرزا رہتا تھا۔“

نازیہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئی۔ ”لیکن کیوں رعنا؟“
 ”میں نہیں جانتی۔“ رعنا نے آہستہ سے کہا۔ ”اوکے
 میں تمہیں بعد میں کال کروں گی۔“

”رعنا میری بات تو سنو.....“ نازیہ نے کچھ کہنا چاہا
 لیکن وہ کال کاٹ کر نیچے اتر آئی۔ وہ اس ریستوران کی
 پارکنگ میں تھی۔ جس وقت وہ کار سے اتر رہی تھی تو اچانک
 ہی ایک بڑی سلور رنگ کی کار آئی اور اس کی کار کے برابر
 میں رہی۔ اس کی رفتار کسی قدر تیز تھی۔ کار اس سے ڈرا اور
 رکی تھی۔ رعنا ساکت رہ گئی۔ دوسری طرف سے ایک مرد
 اترا۔ کتھی سے سفید ہوتے بالوں سے اس کی عمر کا پتا چل رہا
 تھا، اس کے باوجود وہ دیکھنے میں چالیس یا پچاس سے زیادہ
 کا نہیں لگ رہا تھا۔ قد متوسط سے ڈرا زیادہ اور جسم درمیانہ
 تھا۔ اس نے تھری پیس سوٹ پہنا ہوا تھا اور خاصا خوش شکل
 مرد تھا۔ وہ اترتے ہی رعنا کی طرف دیکھ کر محضرت خواہانہ
 انداز میں بولا۔ ”سوری مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ کار سے
 اتر رہی ہوں گی میری رفتار بھی تیز تھی۔ آپ ٹھیک ہیں نا؟“
 رعنا ایک لمحے کو خوفزدہ ہو گئی تھی کیونکہ اگر وہ ایک قدم
 بھی آگے ہوتی تو کار کی زد میں آ جاتی۔ اس نے سر
 ہلایا۔ ”اٹس اوکے آئی ایم فائن۔“

اقبال بینک کی طرف سے ان دنوں آسٹریلیا گیا ہوا تھا اس
 لیے ان کی گفتگو میں مداخلت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ رعنا
 نے اسے کامی کے کمپیوٹر میں موجود لڑکی کی تصاویر اور اس کے
 بعد اپنے ذہن میں آنے والے خیالات اور احساسات کے
 بارے میں کھل کر بتایا۔ نازیہ ایسی ہستی تھی جس سے وہ سب
 ٹیئرز کر سکتی تھی۔ نازیہ خاصوٹی سے سختی رہی۔ جب رعنا نے
 بات کھل کی تو اس نے کہا۔ ”میں تم سے متفق ہوں، تمہاری
 جگہ میں ہوتی تو میرے ذہن میں بھی ایسی سوالات آتے۔“
 ”میں کیا کروں میں ان سوالوں سے بچھا چھڑانا
 چاہتی ہوں لیکن چھڑا نہیں پارہی۔“

”ممکن ہے ان سوالوں میں ہی تمہارے ان سوالوں
 کا جواب بھی ہو جو کامی ان وقت پر تمہارے ذہن میں آئے
 تھے۔“ نازیہ نے کہا تو رعنا نے چونک کر اس کی طرف
 دیکھا۔ اسے لگا جیسے نازیہ کی بات نے اس کے ذہن میں
 کوئی کھڑکی سی کھول دی ہو۔ اس کے بعد ان کے درمیان
 اس موضوع پر مزید بات نہیں ہوئی۔ وہ ہلکی ہلکی گفتگو کرتی
 رہیں۔ نازیہ کو پتا چلا کہ اس نے دفتر سے چھٹی لی ہے تو وہ
 بولی۔ ”ایسا کرو میرے پاس آ جاؤ، کل اور پرسوں بچوں کی
 اسکول کی چھٹی ہے۔ تفریح کے کچھ پروگرام ہیں تمہارا دل
 بھی بہل جائے گا۔“

”میں سوچوں گی۔“ رعنا نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے
 ساتھ کہا۔ نازیہ ڈنر کی تیاری کے لیے اٹھی تو رعنا بھی اس کے
 ساتھ آ گئی۔ انہوں نے مل کر سارا کام کیا۔ ڈنر کے بعد وہ
 نازیہ کے اصرار کے باوجود جانے لگی۔ نازیہ نے اس شرط پر
 اجازت دی کہ وہ کل لازمی آئے گی۔ رعنا مان گئی۔ گھر میں
 داخل ہو کر وہ اپنے بیڈ روم کی طرف جا رہی تھی کہ کامی کے
 بیڈ روم کے سامنے رک گئی۔ پھر وہ دروازہ کھول کر اندر آئی،
 اس نے کمپیوٹر آن کیا۔ کامی کا مخصوص فولڈر اس کی بائی
 ڈاکیمنٹس میں تھا۔ رعنا نے پہلے کمپیوٹر میں کامی کی دوسری
 چیزیں دیکھیں مگر اسے اور کچھ خاص نہیں ملا۔ پھر اس نے
 فولڈر کھول کر لڑکی کی تصویر اوپن کی اور پھر ایک ایک کر کے
 اس کی ساری تصاویر دیکھ لیں اور آخر میں اس نے دو
 تصاویر منتخب کر کے انہیں پرنٹر سے نکالا۔ دونوں تصاویر
 اسے فورسائز کے ایک ہی صفحے پر چھپیں۔ اپنے کمرے میں
 لا کر رعنا نے انہیں کتھی سے کاٹ کر الگ کیا۔ اس رات
 سونے سے پہلے وہ سوچتی رہی کہ یہ لڑکی کون ہے اور کہاں
 ہے؟ صبح پانچ بجے کے بعد اس نے گھر صاف کیا۔ زرینہ دوپہر
 تک آئی تھی۔ مگر رعنا نے اسے کال کر کے منع کر دیا۔

لازمی تھی۔ ویٹرنے خود سے بات چینی تھی اس لیے رعنا کو اب اس سے بات کرنے میں آسانی ہوگئی تھی اس نے کہا۔
 ”کانی..... کامران اکیلا آتا تھا؟“
 ویٹرنے ہلکا ہلکا۔ ”نہیں جی ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہوتی تھی۔“

رعنا نے پرس سے لڑکی کی پرنٹ شدہ تصویریں نکال کر میز پر رکھیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کوئی اور اسے ویٹرنے سے کسی کے بارے میں بات کرتے دیکھے۔ اس نے کامی کی تصاویر بھی میز پر رکھی تھیں۔ ویٹرنے ذرا جھک کر دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ ”یہی لڑکی ہوتی تھی۔“
 رعنا نے تمام تصویریں داہیں پرس میں رکھ لیں اور ویٹرنے سے کہا۔ ”تمہارا شکر یہ۔۔ جاؤ اور دس منٹ بعد میرے لیے چائے لے آنا۔“

ویٹرنے چلا گیا اور رعنا اور مچ جوس کے گھونٹ لینے لگی مگر اس کا ذہن پہلے سے زیادہ الجھ گیا تھا۔ اس نے لڑکی کے متعلق جو مفروضہ قائم کیا تھا وہ غلط ثابت ہوا۔ لڑکی کامی کی گرل فرینڈ ہی تھی اور کامی نے ہی اس کی تصاویر پر نام دیے تھے۔ رعنا سوچ رہی تھی کہ کامی کے بارے میں اس کا اندازہ ٹلط ثابت ہوا تھا لڑکیوں کے معاملے میں وہ عام سانو جوان ہی ثابت ہوا تھا۔ بے شک وہ پڑھنے میں بہت تیز تھا اس طرح آج کل کے نوجوانوں کی طرح اس میں بے پروائی بھی نہیں تھی مگر وہ صنف نازک سے جتنی بے رغبتی اور بے اعتنائی کا اظہار کرتا تھا وہ آج غلط نکلی تھی۔ رعنا کے دل میں نہیں سی اٹھی، اس نے زیر لب کہا۔ ”میرے بچے تم نے یہ کام کیا تھا تو اپنی ماں پر تو اعتماد کر لیتے۔ اگر تم اس لڑکی میں چھپی رکھتے تھے تو میں خود تمہارا رشتہ لے کر جاتی۔“

یہ کہتے ہوئے رعنا کو خیال آیا کہ کیا کامی اس لڑکی سے ظلم تھا یا صرف وقت گزاری کر رہا تھا؟ شاید اس نے اسی وجہ سے اس لڑکی سے بے خبر رکھا۔ کاش کہ وہ کسی طرح اس لڑکی کے بارے میں جان سکے۔ وہ سوچوں میں گم تھی کہ ویٹرنے چائے لے آیا اس نے گولی ٹرے میز پر رکھی جس پر چائے کے تمام لوازمات الگ سے موجود تھے۔ رعنا نے اپنی چائے میں دودھ اور شکر ملائی۔ ویٹرنے وہیں موجود تھا۔ رعنا نے نمسوس کیا کہ جب اس نے تصویریں شناخت کرانے کے بعد اس سے مزید کچھ نہیں پوچھا اور چائے لانے کو کہا تو وہ کسی قدر مایوس ہو کر گیا تھا۔ رعنا نے کہا۔ ”میں ایک بار پھر تمہاری شکر گزار ہوں لیکن کیا تم میری ایک مدد اور کر سکتے ہو؟“

”پھر بھی میری طرف سے ایک بار پھر معذرت۔“
 وہ آگے تھا رعنا اندر جانے لگی تو اس نے رعنا کے لیے دروازہ کھولا۔ صبح کے ساڑھے دس بج رہے تھے، ناشتے کا وقت ختم ہو گیا تھا اور لچ کا وقت ابھی دور تھا اس لیے وہاں صرف چند ایک افراد ہی تھے۔ جو کسی وجہ سے وقت گزاری کر رہے تھے یا کسی سے ملاقات کے لیے وہاں آئے تھے۔ ریستوران زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اعلیٰ درجے کا اور بہترین فرنچیز سے آراستہ تھا۔ جگہ جگہ بڑے ساڑھے کے آرائشی گیلے رکھے تھے جن میں خوب صورت پودے لگے تھے۔ ایک طرف کرسیوں اور میز والی شنگ تھی اور دوسری طرف گدیلی شنگ تھی۔ تین طرف آگے نینگوں شیشوں سے باہر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ذرا دور سمندر تھا۔ رعنا ایک کونے والی میز تک آئی، یہ جگہ باقی ہال سے کسی قدر الگ تھلگ تھی۔ اس کے بیٹھے ہی ایک ویٹرنے آ گیا۔ اس نے منو بانہ انداز میں پوچھا۔ ”س میڈم؟“
 ”اور مچ جوس لے آؤ۔“ رعنا نے کہا۔

”اور کچھ میڈم؟“
 ”نی الحال یہی لاؤ۔“
 ویٹرنے چلا گیا، وہ تقریباً پچیس برس کا خوش شکل نوجوان تھا لچہ مہذب تھا مگر زبان سے معمولی پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔ دس منٹ بعد وہ اس کے لیے اور مچ جوس لے آیا۔ اس وقت رعنا میز پر کامی کی کچھ تصویریں رکھ کر ان کا معائنہ کر رہی تھی اور ویٹرنے تصویریں دیکھ کر واضح طور پر چوڑکا تھا۔ یقیناً اس نے کامی کو شناخت کر لیا تھا۔ اس نے جھکتے ہوئے پوچھا۔ ”میڈم یہ.....“
 ”میرا بیٹا ہے، کامران۔“ رعنا نے کہا۔ ”تم نے پہچان لیا ہے؟“

”مجھے افسوس ہے میڈم۔“ ویٹرنے آہستہ سے کہا۔
 ”میں نے انہیں کئی بار سرو کیا تھا لیکن جب یہ حادثہ ہوا تو میں ڈیوٹی پر نہیں تھا۔“
 چونکہ ویٹرنے کی بار کامی کو سرو کر چکا تھا اسی لیے اس نے فوراً اس کی تصویریں شناخت کر لیں۔ اس کا مطلب تھا کہ کامی کئی بار یہاں آچکا تھا مگر اس نے بھی رعنا کو نہیں بتایا کہ وہ اس ریستوران میں آتا تھا۔ جب وہ یونیورسٹی میں آیا تو رعنا نے اسے بائیک دلائی تھی تاکہ اسے پبلک ٹرانسپورٹ میں دھکے نہ کھانے پڑیں۔ ویٹرنے بھی وہ بڑا ہو گیا تھا اور اس کا حلقہ احباب بھی محلے سے بڑھ کر دوسرے علاقوں تک پھیل گیا تھا اور اسے کئی جگہوں پر جانا ہوتا تھا اس لیے بائیک

”کیسی مد میڈم؟“ ویٹر محتاط ہو گیا۔

”میں اس لڑکی کے بارے میں جانتا چاہتی ہوں۔“

ویٹر نے ٹی میں سر ہلایا۔ ”سوری میڈم میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

ویٹر نے جتنی جگت میں انکار کیا رعنا کھٹک گئی کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہے۔ اس نے اپنے پرس سے پیسے نکالے اور ایک سو کا نوٹ میز پر رکھا۔ ”یہ تمہاری ٹھیک ٹھیک ٹپ ہے۔ اس کاٹل کی ٹپ سے تعلق نہیں ہے۔“

ویٹر چمکپٹا مگر اس نے نوٹ اٹھایا اور اسے سلام کر کے چلا گیا۔ رعنا نے اس کے سامنے چارہ ڈالا تھا۔ اب وہ انتظار کر رہی تھی کہ مچھلی چارے پر منہ مارتی ہے یا نہیں۔ ممکن تھا وہ اپنے انکار پر قائم رہتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ لڑکی کے بارے میں مفت میں بتانے پر چمکتا رہا ہو۔ رعنا کے خیال میں دوسری بات زیادہ بہتر تھی۔ اسی صورت میں بات آگے بڑھتی۔ چائے ختم کر کے اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا، ویٹر فوراً آن موجود ہوا تھا۔ رعنا نے اس سے مل لانے کو کہا۔ وہ برتن اٹھا کر لے گیا اور مل لے آیا۔ رعنا نے پانچ سو کا نوٹ رکھا اور مگر ویٹر کو الگ سے سو کا ایک نوٹ دیا۔ اس نے سلام کر کے نوٹ جیب میں غائب کیا اور آہستہ سے بولا۔ ”ایک بلاک آگے سٹائن بونیک ہے میں دو بیچے وہاں آؤں گا۔ آپ انتظار کیجیے گا۔“

رعنا کا دل دھڑک اٹھا۔ ”میں انتظار کروں گی۔“

دو بیچے میں بہت وقت تھا۔ رعنا نے سٹائن بونیک دیکھا اور پھر سڑکوں پر بلا مقصد کار گھمانے لگی۔ وہ وقت گزاری کر رہی تھی اور وقت تھا کہ گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد جب کار میں کیس ختم ہونے لگی تو وہ ایک پارک کے پاس رک گئی۔ مچھلی کا دن تھا اور دن کے ابتدائی حصے میں وہاں بیچے اور عورتیں آئی ہوئی تھیں اس لیے رعنا بھی اتر کر اندر آ گئی۔ عورتیں آپس میں بات کر رہی تھیں اور بیچے شور مچا رہے تھے ایک بیچے پارک خالی ہونے لگا اور ڈیڑھ بیچے تک وہاں سناٹا چھا گیا۔ رعنا اکیلی بیٹھی رہ گئی تو اسے عجیب سا لگنے لگا اس لیے وہ بھی اٹھ گئی۔ کچھ وقت کار میں گزار کر وہ دو بیچے سے ذرا پہلے سٹائن بونیک کے سامنے کھینچی گئی۔ کئی بڑی دکانوں پر مشتمل اس بونیک کی تمام بیرونی دیواریں شیشے کی تھیں۔ اس نے کار پارکنگ میں روک وی اور انتظار کرنے لگی۔ ویٹر ذرا تاخیر سے سوا دو بیچے نمودار ہوا اور جب وہ نزدیک آیا تو رعنا نے اسے پہچانا کیونکہ وہ سادہ لباس میں تھا۔ اس نے کھڑکی کا شیشہ ہچکچایا۔ رعنا نے شیشہ

نیچے کیا۔

”میڈم۔“ ویٹر نے سرگوشی میں کہا حالانکہ وہاں کوئی نہیں

تھا۔ ”میرے پاس اس لڑکی کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی ہے۔“

”کہاں ہے؟“ رعنا نے بے تابی سے کہا۔ جواب میں ویٹر نے اسے ایک فوٹو کاپی اس طرح دکھائی کہ صرف لڑکی کی تصویر دلا حصہ آرہا تھا۔ یہ اچھی قسم کی فوٹو کاپی تھی مگر اس کے وجود تصویر نمایاں نہیں تھی بس رعنا کو لگا کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ اس نے مطالبہ کیا۔ ”مجھے دو۔“

گر ویٹر نے ہاتھ پیچھے کر لیا وہ خاموش رہا تھا۔ رعنا نے گہری سانس لی اور پرس کھول کر ایک پانچ سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا مگر اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ اگلی بار رعنا نے ہزار کا نوٹ دیا اور اس بار بھی وہ ساکت کھڑا رہا تو رعنا جھنجھلا گئی۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”دس ہزار روپے۔“ ویٹر نے جواب دیا۔

”تمہارا دماغ درست ہے؟ دس ہزار کس چیز کے؟“ رعنا کو غصہ آ گیا۔

”ٹھیک ہے آپ کو اس کی ضرورت نہیں ہے شاید۔“ ویٹر نے اکثر لہجے میں کہا اور جانے کے لیے مڑا۔

”ایک منٹ۔“ رعنا نیچے اتر آئی۔ ”تم اس طرح نہیں پاسکتے، مجھے یہ کاپی چاہیے۔“

”میں نے قیمت بتا دی ہے۔“ وہ بد تمیزی سے بولا۔ اس کا رویہ بالکل بدل گیا تھا۔ ”یہ چاہیے تو دو روٹہ مرضی تمہاری۔“

پرس میں رعنا کے پاس کل چار ہزار کی رقم تھی۔

”میرے پاس چار ہزار روپے ہیں اس وقت۔“

”کوئی بات نہیں، باقی کے چھ ہزار لے آؤ میں کل اسی بجگہ ملوں گا۔“

رعنا کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ ”ستو میرے ساتھ کسی اے ٹی ایم تک چلو میں ابھی تمہیں رقم نہ دوں گی۔“

اس نے ٹی میں سر ہلایا۔ ”میں نہیں نہیں جاؤں گا۔ تم جا کر لے آؤ میں یہیں موجود ہوں۔“

ویٹر بہت ہوشیار ثابت ہو رہا تھا شاید اسے خوف تھا کہ کہیں رعنا اسے پھنسانہ دے۔ وہ غریب تھا معاملہ پولیس تک جاتا تو رعنا کی بات سنی جاتی۔ مجبوراً رعنا روانہ ہوئی۔

اسے اس جگہ کا پتا نہیں تھا مگر خوش قسمتی سے ایک اے ٹی ایم پاس ہی مل گیا اور وہ رقم نکلوا کر لے آئی۔ ویٹر بونیک کے سامنے نہیں تھا مگر جیسے ہی رعنا نے کار روکی وہ نمودار ہوا اور

تیر کی طرح اس کے پاس آیا۔ ”تم رقم لے آئی ہو؟“

اس بار رعنا کو اس کے لہجے پر غصہ آ گیا۔ ”یہ تم بات

اس کے لیے رکنا مشکل تھا۔ وہ اتنا جان بچی تھی کہ اب سب جانے بغیر رہنا ممکن نہیں تھا۔ گھر آ کر وہ نڈھال سی بستر پر گر گئی جیسے کوئی بہت مشقت والا کام کر کے آ رہی ہو۔ جسم سے زیادہ اس کے اعصاب جھکے ہوئے تھے۔ کھانے کے بجائے چائے کی طلب تھی مگر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اٹھ کر چائے بنا لیتی۔

پھر اسے اونگھ آگئی اور جب پانچ بجے اس کی آنکھ کھلی تو وہ خود کو بہتر محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر منہ دھویا اور مکن میں آئی چائے بناتے ہوئے وہ آج ہونے والی پیش رفت پر سوچ رہی تھی۔ عجیب بات تھی اسے ویٹر سے زیادہ اس شخص کا خیال آ رہا تھا جو دو بار اس سے گھرایا تھا دوسری بار اس نے رحمان کی مدد کی تھی۔ اسی کی وجہ سے پرنس ویٹر نے شرافت کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ چائے بنا کر لاؤنج میں آئی اور ابھی چائے پی کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ کال بیل بجی۔ دروازے پر نازیہ تھی۔ وہ بچوں کو ایک تفریحی پارک سے گھما کر لائی تھی اور انہیں گھر پر اتار کر سیدھی اس کے پاس چلی آئی تھی۔ اسے محسوس تھا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ ”کیا چکر ہے تم اس ریسٹوران میں کیوں گئی تھیں؟“

رحمان نے اسے بتایا کہ اسے کیا کچھ معلوم ہوا تھا۔ وہ بھی حیران رہ گئی۔ ”میں کامی کو ایسا نہیں سمجھتی ہوں۔“
رحمان نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”مجھے تو میں بھی ایسا نہیں تھی لیکن بہت کچھ انسان کی توقع کے مطابق نہیں ہوتا۔“
”یہ لڑکی ندا اسمیل کہاں رہتی ہے؟“

”پتا نزدیک کا ہے۔“ رحمان نے آئی ڈی کارڈ کی کاپی نکالی۔ نازیہ نے پتا نوٹ کر لیا۔ ”کل اقبال آجائیں گے میں ان سے کہتی ہوں اس کا پتا چلائیں۔“

رحمان نے اعتراض نہیں کیا اس نے نازیہ کو کامی کے کمپیوٹر میں موجود نندا کی تصاویر دکھائیں۔ اس نے فور سے دیکھ۔ ”لڑکی تو پیاری ہے اور آج کل کی لڑکیوں کی طرح دیدہ ہوائی بھی نہیں لگ رہی ہے۔“

”لیکن ہے تو لڑکی..... جو محبت کے ہاتھوں ہمیشہ مجبور ہوتی ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو، میں اقبال سے کہتی ہوں وہ معلوم کر لیں گے لیکن تم اس کے بعد کیا کرو گی؟“

رحمان ہنسی۔ ”میں نے کچھ سوچا نہیں ہے، ممکن ہے کچھ نہ کروں اور ہو سکتا ہے اس سے مل بھی لوں۔“

نازیہ نے پر خیال نظروں سے اسے دیکھا۔ ”بعض اوقات نہ جاننا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔“

کس طرح کر رہے ہو؟ تمیز۔ سے بات کرو۔“
”میں اسی طرح بات کرتا ہوں رقم دو۔“ ویٹر بھی تیز لہجے میں بولا۔ رحمان کا اندازہ ٹھیک نکلا، وہ معمولی بڑھا لکھا تھا۔
”نہیں پہلے مجھے کاپی دو میں اپنی تسلی کر کے رقم دوں گی۔“

”رقم لیے بغیر میں اسے دیکھنے بھی نہیں دوں گا تم نے پتا یا نمبر دیکھ لیا تو پھر مجھے رقم کہاں دو گی۔“

”ایکسکیوز می۔“ قریب سے آواز آئی۔ رحمان نے مڑ کر دیکھا تو سلور کار والا آدمی نزدیک ہی کھڑا تھا۔ وہ شاید یونیک کے اندر سے نکلا تھا کیونکہ اس کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا۔ وہ رحمان سے مخاطب تھا۔ ”اپنی پراہلم؟“
آدمی کو دیکھتے ہی ویٹر کا رنگ اڑ گیا اور وہ پھر سے شریف نظر آنے کی کوشش کرنے لگا۔ رحمان نے اسے دیکھا اور بولی۔ ”تھنک یو۔“

آدمی اپنی کار کی طرف بڑھا اور رحمان نے ویٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس بار اس نے شرافت سے کاپی اسے تھمادی۔ رحمان نے اپنی تسلی کر کے اسے رقم بے دی۔ وہ رقم لیتے ہی وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔ فوٹو کاپی والی تصویر لڑکی کی تصویر سے مل رہی تھی مگر رحمان کو سو فیصد یقین نہیں تھا۔ کاپی پر لڑکی کا نام ندا اسمیل اور پتا رحمان کے گھر سے کچھ دور ایک پوسٹ سوسائٹی کا تھا۔ لڑکی غیر شادی شدہ تھی کیونکہ اس کے ساتھ باپ کا نام تھا۔ شناختی کارڈ دو سال پرانا تھا اور رحمان کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ وہ کامی سے دو سال بڑی تھی۔ اس کی تاریخ پیدائش کے مطابق اس کی عمر اکیس سال سے ذرا زیادہ بن رہی تھی۔ مگر یہ ابھی مفروضہ تھا جب تک وہ خود اس لڑکی سے نہیں مل لیتی وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ وہ ویٹر سے جاننا چاہتی تھی کہ اس کے پاس لڑکی کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی کیسے آئی مگر وہ رکائی نہیں۔ رقم لیتے ہی نو دو گیارہ ہو گیا۔

رحمان اس چکر میں کافی تھک گئی تھی مگر اس نے بڑی کامیابی حاصل کی تھی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ اسے اتنی معلومات مل جائیں گی۔ دس ہزار روپے خرچ ہونے سے تھے لیکن وہ جان گئی تھی کہ کامی کا اس لڑکی سے تعلق تھا اور اب اس کے پاس لڑکی کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی بھی تھی۔ وہ گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ اسے خیال آیا کہ وہ اپنے مرجانے والے بیٹے کی جاہلی کر رہی ہے کیا یہ ابھی بات ہے؟ اس کے اندر سے کوئی کہنے لگا کہ وہ اس سلسلے کو یہیں روک دے۔ شاید اسے کوئی بہت دکھ دینے والا خبر ملے۔ مگر اب

رعنا کی مایوسی بڑھ گئی۔ اس نے سر ہلایا۔ "پلیز آپ ان سے فون پر پوچھ لیں اور میرا نمبر لیں یا اپنا نمبر مجھے دے دیں۔ میں بعد میں آپ سے معلوم کر لوں گی۔"

عورت نے سوچا اور بولی۔ "اپنا نمبر مجھے دے دیں میں اپنے شوہر سے پوچھ کر بتاتی ہوں۔"

رعنا جانے کے لیے مڑی تھی کہ اچانک اسے خیال آیا۔ "سہیل صاحب کی ایک جینی ہے نہ؟"

"جی آئی۔" عورت سے پہلے لڑکا بولا۔ "وہ سامنے والی سیر اباجی کے پاس آتی ہیں ان کی فرینڈ ہیں۔"

عورت نے بیٹے کو گھورا اور بولی۔ "نہا کی شادی ہو گئی تھی ہمارے ہاں بھی کارڈ آیا تھا مگر ہم گئے نہیں تھے۔"

رعنا چوکی۔ "شادی ہو گئی تھی یہ کب کی بات ہے؟"

"شاید سات مہینے پہلے کی، ہاں یاد آیا سات فروری کو تھی اس کی شادی۔"

"میں آپ کی شکر گزار ہوں۔" رعنا نے کہا اور اسے اپنا نمبر دے دیا۔

"آپ کس سلسلے میں سہیل صاحب سے ملنا چاہتی ہیں؟" عورت کو اب تجسس ہو رہا تھا۔

"مجھے اصل میں نہا سے ملنا تھا۔"

"نہا سے؟"

"وہ میری بیٹی کی کلاس فیلو تھی۔" رعنا نے ہچکچا کر کہا اور اپنی کار کی طرف بڑھ گئی۔ عورت نے سچے سمیت اندر چلی گئی تھی۔ اس کے جاتے ہی رعنا نے رخ بدلا اور اس مکان کی طرف بڑھی جس کے بارے میں سچے نے کہا تھا کہ وہاں رہنے والی سیرا سے نہا کی دوستی تھی۔ رعنا نے کال ٹیل بھائی۔ ایک نوجوان لڑکا باہر آیا۔

"جی فرمائیے؟"

"مجھے سیرا سے ملنا ہے۔" رعنا بولی۔

نوجوان نے غور سے اسے دیکھا۔ "سیرا میری بہن ہے آپ اس سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟"

"مجھے ان سے ایک ضروری کام ہے۔"

"ایک منٹ....." نوجوان کہہ کر اندر چلا گیا۔ اس کی واپسی پانچ منٹ بعد ہوئی تھی۔ رعنا نے کئی بار پلٹ کر سہیل احمد کے ساتھ مکان کی طرف دیکھا۔ اسے خدشہ تھا کہ عورت یا لڑکا نہ نکل آئیں۔ اگرچہ اس سے فرق نہیں پڑتا لیکن اس کا امکان تھا کہ وہ تجسس میں پڑ جائیں گے اور رعنا چاہتی تھی کہ اس بات کی اہمیت واضح نہ ہو۔ لڑکا واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک بیس بائیس سال کی مناسب سی لڑکی تھی۔ اس نے

"ہاں۔" رعنا نے گہری سانس لی۔ "لیکن میں اپنے اندر کی کٹنگ کا کیا کروں؟"

نازیہ کچھ دیر بعد چلی گئی مگر میں اس کے بچے تھے۔ رعنا اس کی بات پر سوچتی رہی کہ بعض اوقات نہ جانتا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اس کا بھی یہی خیال تھا مگر اس معاملے میں نہیں۔ وہ اسے آخر تک لے جانا چاہتی تھی۔ جب وہ نازیہ سے کہہ رہی تھی تب بھی اس کے اندر یہ احساس تھا کہ وہ پیچھے نہیں ہٹے گی۔ اگلے دن اتوار تھا، اس نے کال کر کے زریہ کو آنے کا کہہ دیا تاکہ صفائی ٹھیک سے ہو سکے۔ دوپہر تک زریہ سب نمٹا کر چلی گئی۔ رعنا ٹی وی دیکھ رہی تھی کہ نازیہ کی کال آگئی۔ اس نے بتایا کہ اتہال مزید دو دن کی تاخیر سے واپس آئے گا۔ رعنا ذرا مایوس ہوئی کیونکہ وہ جلد از جلد نما کے بارے میں جان لینا چاہتی تھی۔ نازیہ سے بات کر کے اس نے سوچا کہ اسے خود کچھ کرنا ہوگا۔

چار بجے اس نے کپڑے بدلے اور کار لے کر نکل آئی۔ اس کا رخ اسی سوسائٹی کی طرف تھا جس کا پتا نما کے آئی ڈی کارڈ پر موجود تھا۔ سوسائٹی جدید قسم کی تھی اور وہاں یقیناً تعلیم یافتہ اور مہذب لوگ رہتے تھے مگر بہت کم نے اپنے دروازوں پر نمبر پلیٹ کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ اس لیے رعنا کو کئی بار پتا پوچھنا پڑا۔ بالآخر وہ اس چھوٹے سے خوب صورت مکان کے سامنے پہنچی جہاں اس پر نمبر پلیٹ تھی لیکن اس پر نام کسی احمد الدین کا لکھا ہوا تھا۔ رعنا نے کال ٹیل کاٹن دبا یا تو اندر سے دس بارہ سال کا ایک بچہ نکلا۔

"جی آئی؟"

"جی ہاں سہیل احمد کا گھر یہی ہے؟"

"نہیں آئی، تو ہمارا گھر ہے۔" سچے نے جواب دیا۔

"آپ کی انی گھر پر ہیں؟"

بچہ اندر گیا اور ایک منٹ بعد اپنی ماں کو بلا لایا۔ عورت کی عمر چالیس کے آس پاس تھی اور وہ غالباً کام کرتے ہوئے آئی تھی کیونکہ اس کے کپڑوں اور ہاتھوں پر آنے کے آثار تھے۔ اس نے سوالیہ نظروں سے رعنا کی طرف دیکھا تو اس نے وہی سوال کیا۔ عورت نے نشی میں سر ہلایا۔ "میرے شوہر نے سہیل صاحب سے یہ مکان خرید لیا ہے۔ ایک سال سے ہم یہاں رہ رہے ہیں۔"

رعنا مایوس ہوئی تھی۔ "آپ کو پتا ہے کہ وہ کہاں گئے یہاں سے؟"

"شاید میرے شوہر کو پتا ہو لیکن وہ لاہور گئے ہوتے ہیں۔ ایک ہفتے بعد آئیں گے۔"

تاری لڑکی سے واقفیت تھی لیکن اس نے کبھی مجھ سے ذکر نہیں کیا۔" رعنا نے دل ہی دل میں اپنے جھوٹ پر تادم ہوتے ہوئے کہا۔ اس بار میرا نے جیسے اطمینان کا سانس لیا۔ رعنا سوچ رہی تھی کہ کیا کوئی ایسی بات ہے جو اس لڑکی کو پریشان کر رہی ہے اور وہ رعنا سے اسی حوالے سے ڈر رہی ہو۔ مگر جیسے ہی رعنا نے بیٹی کا جھوٹ بولا وہ مطمئن نظر آنے لگی۔ میرا نے کہا۔

"آئی آپ مجھے اپنا نمبر دے دیں میں خدا کو دے دوں گی اور آپ سے کوئی ٹیکٹ کر لے گی۔"

"اگر تم مجھے اس کا نمبر دے دو تو میں خود اس سے رابطہ کر لوں گی۔" رعنا نے سچی لہجے میں کہا۔ "میں اس سے جلد بات کرنا چاہتی ہوں یا اگر نمبر نہیں دے سکتیں تو پتا دے دو۔" میرا سوچ میں پڑ گئی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ اس پر اعتبار کرے یا نہ کرے۔ رعنا نے اپنے پرس سے اپنا آئی ڈی کارڈ، ڈرائیونگ لائسنس اور آفس کارڈ نکال کر اس کے سامنے رکھا۔ "بٹا یہ دیکھ لو، میں ورکنگ دو مین ہوں اور ایک ملٹی ٹیکسل کہنی میں جاب کرتی ہوں۔ مجھ سے کوئی خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔ نہ تمہیں نہ خدا کو۔"

میرا نے تینوں چیزیں دیکھیں اور گہری سانس لے کر بولی۔ "آئی میں آپ کو اس کا سیل نمبر دے سکتی ہوں لیکن ایک شرط کے ساتھ....."

رعنا نے جلدی سے کہا۔ "میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ تمہارا نام نہیں لوں گی اور یقین کرو اس میں ایسی کوئی بات بھی نہیں ہے۔"

رعنا کے کہنے کے باوجود میرا کو اطمینان نہیں ہوا تھا اور اس نے یہ مشکل کئی بار یاد دہانی کے ساتھ اسے نمبر دیا تھا۔ رعنا اس کی بہت شکر گزار ہوئی تھی۔ وہ نکلتے نکلتے بھی اسے یقین دلاتی رہی کہ اس کا نام نہیں لے گی مگر گھر جاتے ہوئے اسے خیال آیا کہ میرا معمول سے زیادہ پریشان لگ رہی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بات سے واقف تھی۔ دوسرے اس نے محسوس کیا تھا کہ نشست گاہ کے آس پاس کوئی تھا شاید میرا کے گھر والے یا اس کا بھائی محسوس تھا کہ وہ اس کی بہن سے کیا بات کرنے آئی تھی؟ ویسے یہ فطری بات تھی۔ گھر والوں کو محسوس ہوتا ہے کہ ان کی بیٹی یا بہن سے کوئی ملنے کیوں آیا ہے؟ رعنا کے اندر یہ احساس بڑھنے لگا کہ کوئی ایسی بات سامنے آنے والی ہے جو اسے شاک کر دے گی۔

رعنا نے جان بوجھ کر میرا سے اس کی شادی پر بات نہیں کی۔ اسے خطرہ تھا کہ وہ کھٹک جائے گی اور پھر شاید

مہذب انداز میں کہا۔ "آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟"

رعنا نے پیچھے کھڑے اس کے بھائی کو دیکھا اور بولی۔ "کیا میں آپ سے کیلے میں مل سکتی ہوں؟ دراصل مجھے خدا کیلے کے بارے میں بات کرنی ہے۔"

میرا ہچکچائی، اس نے پلٹ کر بھائی سے سرگوشی میں کچھ کہا اور اس نے کچھ جواب دیا۔ چند لمحوں میں سرگوشیوں میں ہی تبادلاً خیال ہوتا رہا پھر میرا پلٹ کر آئی۔ "آئیے اندر آ جائیں۔"

وہ اسے نشست گاہ میں لے آئی۔ رعنا نے اپنا تعارف کرایا۔ میرا بولی۔ "آپ کیا نہیں گی؟"

"کٹف کی ضرورت نہیں ہے بس ایک گلاس سادہ پانی چاہیے۔"

میرا اندر گئی اور کولڈ ڈرنک لے آئی۔ وہ کسی قدر زور سے تھی۔ "آپ خدا کے بارے میں کیا بات کرنا چاہتی ہیں؟"

"آپ کی اندازہ پرانی دوستی ہے؟"

"بچپن سے۔" میرا نے سر ہلایا۔ "ہم ساتھ پڑھے اور ساتھ کھیلے ہیں۔ پڑوسی بھی تھے۔"

"پھر خدا اور اس کے گھر والے یہاں سے چلے گئے؟"

"ہاں وہ ایک سال پہلے یہاں سے چلے گئے تھے۔"

"شادی سے پہلے خدا پڑھ رہی تھی؟"

"ہاں کالج تک ہم نے ساتھ پڑھا تھا پھر خدا نے آئرز میں..... یونیورسٹی میں ایمیشن لے لیا۔" میرا نے

یونیورسٹی کا نام بتایا تو رعنا چونک گئی۔ یہ کامی کی یونیورسٹی تھی۔ اگر خدا نے آئرز میں داخلہ لیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اس کا آئرز مکمل نہیں ہوا تھا، رعنا نے اندازے کا تیر چلایا۔

"پھر آئرز مکمل ہونے سے پہلے اس کی شادی ہوئی؟"

اس سوال پر میرا کسی قدر زور سے نظر آنے لگی۔ "آں..... ہاں اس کا آئرز کمپلیٹ نہیں ہوا تھا۔" اس نے

ہچکچا کر کہا اور پوچھا۔ "آپ اس سے واقف ہیں؟"

"میں ملی نہیں ہوں لیکن ملنا چاہتی ہوں۔" رعنا نے سوچ کر جواب دیا اور یہاں بھی وہی جھوٹ بولا۔ "میری بیٹی اس کے ساتھ پڑھتی تھی۔"

"تو آپ اپنی بیٹی سے اس کے بارے میں پوچھیں۔"

"نہیں پوچھ سکتی، اس کا انتقال ہو گیا ہے۔"

میرا جیسے شاک میں رہ گئی تھی۔ اس نے یہ مشکل کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔"

"اس کے انتقال کے بعد مجھے پتا چلا کہ اس کی خدا

اسے ندا کا پتا یا فون نمبر نہیں ملے گا۔ پہلے اس نے سوچا کہ گھر جاتے ہی کال کرے گی مگر پھر اسے خیال آیا کہ ممکن ہے اس کا شوہر گھر میں ہو اور وہ اس کے سامنے کھل کر بات نہ کر سکے، ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ اس کے بارے میں جانتے ہی وہ کال کاٹ دے اور شاید نمبر بھی بند کر دے۔ یوں اس سے رابطہ ممکن نہ رہے۔ خاصے فور و خوش کے بعد رونا نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے اپنے بارے میں نہیں بتائے گی بلکہ کسی اور بہانے سے پتا حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔ وہ اس سے آگے سامنے ملے گی تب ہی بات ہو سکے گی مگر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ایسا کیا کرے کہ ندا جی خوشی اسے اپنا پتا دے دے۔ رات کے کھانے کے بعد اس نے نازیہ کو کال کی اور اپنی کارگزاری سنائی۔ وہ ہنسی۔

”تم تو پوری جاسوس بنتی جا رہی ہو۔“

”مجبوری میں انسان سب کرتا ہے۔“ رونا نے کہا۔ ”لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کا پتا کیسے حاصل کروں۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”میں کوشش کرتی ہوں۔“ نازیہ یوں۔ ”مجھے اس کا سیل نمبر دو۔“

رونہ نے اسے ندا کا نمبر دیا۔ ”مگر احتیاط سے اسے کسی صورت بتانہ چاہئے کہ اس کا نمبر کہاں سے ملا ہے۔“

”مگر مت کہو میں نے سوچ لیا ہے کہ کیا کرنا ہے۔ میں کچھ دیر بعد کال کرتی ہوں۔“ نازیہ نے کال کاٹ دی۔ اس نے دس منٹ بعد کال کی تو ہنس رہی تھی۔ ”لو تمہارا کام بہت آسانی سے ہو گیا، پتا لوٹ کر لو۔“

رونہ نے پتا لوٹ کیا۔ پتا اس علاقے کا تھا جہاں ریستوران تھا۔ یہ بہت سہ لگژری اپارٹمنٹس تھے جو ریستوران سے کچھ ہی فاصلے پر تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ندا کا شوہر یا سسرال بہت دولت مند تھا۔ ”تم نے پتا کیسے لیا؟“

”بہت آسانی سے، میں نے اس سے کہا کہ سیل فون کبھی کی طرف سے اس کے نمبر پر لگی ڈرامیں ایک اسمارٹ فون نکلا ہے۔ وہ پتا موجودہ پتا بتا دے تو اسے کوریئر سے اس کا گفٹ بھیج دیا جائے گا۔ اس نے فوراً بتا دیا۔ رونا یہ لڑکی بہت سادہ ہے ورنہ فوراً بھی چالاک ہوتی تو اتنی آسانی سے بیوقوف نہ بنتی، میرا تو سیل نمبر بھی دوسری کبھی کا ہے۔ ندا کا نمبر دوسری کبھی کا ہے۔ یہ سامنے کی بات ہے کہ کسی موبائل کبھی کا نمبر دوسری کبھی کا نمبر تو استعمال نہیں کرے گا۔“

”ہو سکتا ہے۔“ رونا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”صورت

سے بھی وہ سادہ ہی نظر آتی ہے۔“

”اب تم کیا کرو گی؟“

”میں اس سے طوں کی اور معلوم کروں گی کہ اس کا کامی سے تعلق کس حد تک تھا۔“

☆☆☆

رونہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ اپارٹمنٹ کی کال تیل بجائی۔ یہ جگہ اس کے اندازے سے بھی زیادہ پوش تھی، نہایت صاف ستھری بلڈنگ اور کار پارکنگ، شیشے کی طرح چمکتی راہداریاں، جدید ترین لفٹس اور سکیورٹی کا مکمل سسٹم تھا۔ گیٹ پر اسے روک لیا گیا اور اس نے اپارٹمنٹ نمبر بتایا تو گارڈ نے ویڈیو کال کی۔ رونا نے اپنا نام کہیں بتایا تھا لیکن اس نے گارڈ سے کہا کہ خدا لائن پر آئے تو اس کی بات کرا دے۔ گارڈ نے اسے کمرے کے سامنے آنے کو کہا اور اسے فون ریسیور تھا دیا۔ گارڈ خود رادور چلا گیا تھا۔ ندانے اسے دیکھا اور کسی قدر تعجباً انداز میں یوں۔ ”آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟“

”یہ میں طے کرنا چاہتی ہوں۔“

اس نے انکار کر دیا۔ ”سوری اس وقت میں اکیلی ہوتی ہوں اور کسی سے نہیں مل سکتی۔“

”اکیلے میں ملنا تمہارے لیے بہتر ہوگا، میں کامی کی ماں ہوں۔“

اس بار ندا سناکت رہ گئی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اور کانپتی آواز میں کہا۔ ”میں..... میں..... کسی کامی کو..... نہیں..... جانتی۔“

”دیکھو بیٹا میں صرف تم سے ملنا چاہتی ہوں، میں نہ تمہیں پریشان کروں گی اور نہ ہی تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ ہو گا۔ میں صرف چند سوالوں کے جواب چاہتی ہوں۔ مجھے ان سوالوں کے جواب مل جائیں تو تم اس کے بعد مجھے دوبارہ نہیں دیکھو گی۔“

”دیکھیں یہ بہت مشکل ہے۔“

”میں بھی مشکل میں ہوں۔“ رونا کا لہجہ تیز ہو گیا۔ ”اپنی مشکل آسان کرنے آئی ہوں۔ تم سے صرف یہ چاہتی ہوں۔ اسی میں ہم دونوں کا مفاد ہے کہ ہم اکیلے میں مل لیں میری بات سمجھ رہی ہوں؟“

ندا کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے رونا سے کہا۔ ”فون گارڈ کو دیں۔“

رونہ نے فون گارڈ کو دے دیا اور وہ دوسری طرف سے ملنے والی ہدایات سن رہا اور پھر رونا کے پاس

بو عکس

بارے میں تو مجھے اس کے کمپوٹر سے پتا چلا جس میں تمہاری تصاویر ہیں۔“

ندا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ”میری تصاویر..... کیسی تصاویر ہیں؟“

رحمہ چونکی اس نے جواب دیا۔ ”عام سی تصاویر ہیں جو اس نے کہیں باہر لی تھیں بس منظر سے تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔“

”آپ سچ کہہ رہی ہیں تا بس یہی تصویریں تھیں؟“ اس نے تصدیق چاہی۔ وہ پہلے بھی آہستہ آواز میں بول رہی تھی اور روتے ہوئے بھی خیال رکھا تھا کہ اس کی آواز بلند نہ ہو لیکن تصویروں کے بارے میں تو وہ اتنی دھیمی آواز میں پوچھ رہی تھی کہ رحمانے مشکل سے سنا۔

”تو کیا کامی نے تمہاری اور تصاویر بھی لی تھیں؟“

ندا خاموش رہی، وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں رگڑ رہی تھی اور اس کے وجود سے شدید بے چینی چھٹک رہی تھی۔ رحمانے اسے آواز دی لیکن اس نے سنی نہیں وہ جیسے کہیں اور تھی آخر رحمانے اسے ہلایا تو وہ چونکی اور پھر بولی۔ ”پلیز اس کے کمپوٹر کی ہارڈ ڈسک فارمیٹ کر دیں۔“

”ندا ایسی کیا بات ہے تم کل کر مجھ سے بات کر سکتی ہو۔“

اس نے ٹھی میں سر ہلایا۔ ”نہیں کر سکتی..... میں برباد ہو جاؤں گی..... عامر مجھے چھوڑ دیں گے۔“

”پلیز ندا میں وعدہ کرتی ہوں کسی کو نہیں پتا چلے گا۔“

”میں نہیں بتا سکتی۔“ ندا تجح اٹھی اور کھڑی ہو گئی۔ ”آپ..... آپ جا نہیں یہاں سے۔“

”میں جانے کے لیے نہیں جانتے کے لیے آئی ہوں۔“ رحمان بولی۔ ”تم کیا سمجھتی ہو کہ یہ سب جان کر مجھے سکون مل جائے گا۔ نہیں میں بھی اسی آگ میں جلوں کی جس میں تم جل رہی ہو۔ تم مجھ سے بھی نہیں ملیں۔ اگر کچھ پتا بھی ہے تو کامی کے توسط سے ہے۔ اس نے شاید تمہیں بہت کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ میں نے اسے بہت سخت سے پالا تھا۔ میں اکیلی تھی اور صرف انیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ کامی میرے شوہر کے مرنے کے بعد پیدا ہوا تھا، مجھے اسے پالنا بھی تھا اور اس کی تربیت بھی کرنی تھی۔ تم سمجھ سکتی ہو مجھ پر دہری ذمے داریاں تھیں۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمہارے ساتھ تمہارا شوہر ہے اس بچے کو اس کا باپ ملے گا۔ کامی کو اس کا باپ نہیں ملا۔ اسے میں نے بنایا اور مجھے لگا وہ وہی بنا جو میں چاہتی تھی۔“

ندا نے ٹھی میں سر ہلایا۔ ”وہ دیکھا نہیں پتا۔“

”میں یہی تو جانتا چاہتی ہوں کہ وہ کیا بنا..... اس نے

آیا۔“ میڈم اپنا آئی ڈی کارڈ یہاں جمع کرادیں واپسی پر آپ کو مل جائے گا۔“

رحمانے اس کا مطالبہ پورا کر دیا اور اسے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ کال بیل کے جواب میں ایک ملازمہ نے دروازہ کھولا، گویا ندا نے غلط کہا تھا کہ وہ اکیلی ہے۔ ملازمہ اسے ایک بہت خوب صورت جدید فرنیچر سے آراستہ ڈرائنگ روم میں لائی۔ یہاں ایک طرف شیٹے کی بڑی سی کھڑکی کے پار دور سمندر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔

اپارٹمنٹ ساتویں فلور پر تھا، اس لیے منظر وسیع تھا۔ کچھ دیر بعد ندا کمرے میں داخل ہوئی تو رحمانے دیکھ کر بے اختیار کھڑی ہو گئی۔ وہ تصویر کے مقابلے میں کمزور ہو گئی تھی، گلابی رنگت ماند پڑ گئی تھی اور چہرہ دبلا ہو گیا تھا، آنکھوں کے گرد حلقے تھے، مگر اس کا پیٹ نمایاں ہو رہا تھا، وہ یقیناً چھ مہینے سے زیادہ کے حمل سے تھی۔ سی سی ٹی وی کمرے میں صرف چہرہ آ رہا تھا اور وہ بھی نمایاں نہیں تھا، اس لیے رحمانے اندازہ نہیں کر سکی تھی کہ وہ اس قدر کمزور ہو گئی ہوگی۔ اس نے نشست گاہ کا دروازہ بند کر دیا۔ وہ اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی اور اپنے دونوں ہاتھ آپس میں جوڑ کر پیٹ پر رکھ لیے۔ رحمانے اسے غور سے دیکھا۔ ”تم امید سے ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں۔“

”بے بی ہے یا بابا؟“

”آپ..... آپ کیوں آئی ہیں؟“ ندا کا لہجہ کسی قدر بھائی ہو گیا۔ ”پہلے کامی نے مجھے برباد کیا اب آپ کرنے آئی ہیں۔“

اس کے ابتدائی پرسکون رویے کے بعد رحمان کو اس سے اس قدر جذباتی رد عمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ جیسے پھٹ پڑی اور رحمانے شہرہ گئی تھی۔ وہ مسلسل بول رہی تھی۔ ”میں اب جا کر سنبھلی ہوں..... ماضی کو بھولنا شروع کیا ہے..... تو آپ آئیں..... کیا چاہتی ہیں آپ..... جو کس کامی نے چھوڑ دی تھی..... وہ پوری کرنے آئی ہیں۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رحمانے کا دل کھلنے لگا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آگئی اور برابر میں بیٹھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”مجھے غلط مت سمجھو..... مجھے نہیں معلوم کامی نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ تڑپ کر بولی۔ ”آپ اس کی ماں ہیں آپ کو کیسے علم نہیں ہو سکتا کہ آپ کا اکلوتا بیٹا کیا کر رہا ہے؟“

”اللہ گواہ ہے مجھے کچھ نہیں معلوم اور تمہارے

لے جانا چاہتا ہے۔ پاپا راضی نہیں تھے مگر میں نے اپنی مرضی شامل کر کے انہیں منالیا۔ پاپا تھا جسے کہ میں نے تعلیم ادھوری کیوں چھوڑ دی۔ ان کو پتا ہی نہیں کہ ان کی بیٹی پر کیا گزر گئی ہے۔ ہم نے دنیا دکھا دے کہ شادی کر لی کیونکہ میں اور عامردونوں اللہ کو دھوکا نہیں دے سکتے تھے۔ ہمارے درمیان آج بھی اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا شادی سے پہلے تھا۔ عامر نے مجھ سے کہا کہ جب بچہ ہو جائے گا تو وہ مجھ سے شریعت کے مطابق اصل نکاح کریں گے اور پھر ہم سچ میں میاں بیوی ہوں گے۔“

ندا بول رہی تھی اور اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ دل کی بھڑاس نکال رہی ہے۔ اس کی سانس تیز تھی لیکن آواز مدہم ہی تھی۔ اچانک کال بیل کی آواز آئی تو وہ چونکی اور اس نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کیے۔ چند لمبے بعد ملازمہ نمودار ہوئی۔ ”بی بی جی بڑے صاحب آئے ہیں۔“

”پاپا۔“ ندا نے کہا اور رعنا کی طرف دیکھا۔ ”پلیز۔“

رعنا کچھ گئی تھی اس نے سر ہلایا۔ ”میں بعد میں آؤں گی۔“

ملازمہ چلی گئی تھی اس لیے اس نے دلی زبان میں کہا۔ ”نہیں اب میں آپ سے نہیں ملوں گی۔ آپ نے جو معلوم کرنا تھا وہ کر لیا۔ پلیز دوبارہ یہاں مت آئیے گا۔“

رعنا نے اسے دیکھا۔ ”شاید ایک بار اور ملتا ہوں۔“

”میں نے آپ کو جو بتانا تھا بتا دیا۔ اب آپ کا مجھ سے اور میری زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”نہیں تعلق تو ہے۔“ رعنا نے ایک نظر اس کے بڑھے ہوئے پیٹ پر ڈالی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ دروازے کے پاس پہنچی تھی کہ سامنے سے وہی ادھیڑ عمر شخص نمودار ہوا جو رعنا کو پہلے ریسٹوران کے باہر اور پھر بوتیک کے سامنے ملا تھا۔ اس نے وہی شاہراہ اٹھا رکھا تھا جو لے کر بوتیک سے نکلا تھا۔ رعنا تو حیران لگی ہی، وہ بھی رعنا کو دیکھ کر حیران ہوا تھا۔

”آپ.....؟“

ندا جو رعنا کے پیچھے تھی وہ بھی حیران ہوئی۔ رعنا سہیل احمد کو نظر انداز کر کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اس نے عقب میں ندا کو کہتے سنا۔ ”پاپا! آپ انہیں جانتے ہیں؟“

سہیل احمد نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”ہاں لیکن صرف چہرے کی حد تک، میرا کل ان خاتون سے دو بار اتفاقاً سامنا ہوا تھا۔“ سہیل احمد نے کہتے ہوئے ندا کے ہاتھ پر پکار کیا۔ ”تم کتنی کمزور ہو رہی ہو، اپنا

مجھے اتنا بڑا دھوکا کیوں دیا۔ اس نے خود پر اداکاری کا ایک خول چڑھ لیا تھا۔ وہ گھر میں کچھ تھا اور باہر کچھ اور۔ میں اس کا باہر والا روپ جانتا چاہتی ہوں۔“

”مجھے دیکھ کر آپ کو اندازہ نہیں ہوا کہ کامی کا دوسرا روپ کیسا تھا۔“ ندا کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔

”تم اس سے یونیورسٹی میں ملی تھیں؟“

”ہاں کاش میں اس یونیورسٹی میں نہ جاتی کالج میں پڑھتی مگر پاپا نے مجبور کر کے بھیجا وہ چاہتے تھے میں ایم بی اے کروں۔“

”تم شاید تین سال پہلے یونیورسٹی گئی ہوگی؟“

”ساتھ سے تین سال پہلے۔“ اس نے صبح کیا۔ ”میرے پانچ سمسٹر مکمل ہوئے تھے اور پھر مجھے تعلیم چھوڑنا پڑی۔“

”کامی کی وجہ سے؟“

”ہاں اس نے مجھے محبت کے دھوکے میں رکھ کر برباد کر دیا۔“

ندا جس طرح لفظ برباد استعمال کر رہی تھی رعنا کو احساس ہوا کہ معاملہ اس کے انداز سے سے زیادہ آگے جا چکا تھا۔ اس کے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ اس کا صرف انہیں برس کا چہنچہ جو یہ ظاہر لڑکیوں سے بھاگتا تھا کسی لڑکی کو محبت کا دھوکا دے کر اس کا جسمانی استحصال بھی کر سکتا تھا۔ رعنا نے سمجھتے ہوئے کہا۔ ”کیا اس نے تم سے جسمانی تعلق.....“

”یہ اسی کا نتیجہ ہے۔“ ندا نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اس بار رعنا نے حد شدت زورہ گئی تھی۔ ندا نہ جانے کیسے اس راز کو کھول گئی جس سے صرف وہ اور اس کا شوہر واقف تھے۔ وہ لفظ چہنچہ کر بولی۔ ”آپ نے غلط کہا جس طرح کامی کو اس کا باپ کس ملا اس طرح اس بچے کو بھی اس کا باپ نہیں ملے گا۔“

”میرے خدا۔“ رعنا نے سر تھام لیا۔ ”میں نے کامی کو کیا بتانا چاہا اور وہ کیا نکلا؟“

”اس نے مجھے کھلا دھوکا دیا۔ جیسے ہی اس کا مطلب نکلا وہ پھر پلٹ کر نہیں آیا۔ میں رو دھو کر چپ ہو گئی لیکن پھر مجھے پتا چلا کہ میں امید سے ہوں تو میری دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی۔ اگر عامر نہ ہوتے تو میرے پاس خود کشی کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔ میرے پاپا کو پتا چلتا تو وہ غیرت سے مر جاتے۔ عامر نے ہم دونوں کو بچالیا اس نے اس بچے کو بھی بچالیا۔ یہ شادی اسی کی کوشش سے ہوئی اس نے پاپا سے کہا کہ وہ ہائر اسٹڈی کے لیے باہر جانا چاہتا ہے اور شادی کر کے مجھے بھی

خیال نہیں رکھتیں؟“
 ”رکھتی ہوں پاپا۔“ ندانے کسی قدر بے چینی سے کہا۔
 ”آپ اچانک کیسے آئے؟“
 ”گل میں نکلا تھا تو تمہارے لیے یہ لے لیا۔“ سہیل
 احمد نے اسے شاہ پر تھمایا۔ ”بیسے اچھا لگا۔“
 ندانے شاہ پر سے سوٹ نکال کر دیکھا اور بے دلی سے
 بولی۔ ”اچھا ہے پاپا تھینک یو۔“
 سہیل احمد نے اسے غور سے دیکھا۔ ”یوری تھینک
 از او کے؟“

”ہاں پاپا سب ٹھیک ہے۔“ نماز بروہی مسکرائی۔
 ”یہ خاتون یہاں کیسے آگئیں، تمہاری جانتے والی ہیں؟“
 ”جی پاپا۔“ ندانے جھوٹ بولا۔ ”ان کی بیٹی میرے
 ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔“
 ”تھی؟“
 ”اس کی ڈیڑھ چھ ہو گئی۔“
 ”اوہ افسوس ہوا۔“ سہیل احمد نے کہا۔ ”تو یہ تم سے
 ملنے آئی تھیں؟“

”جی پاپا۔“ ندانے نظریں جراتے ہوئے جواب
 دیا۔ اسے علم نہیں تھا کہ اس نے اتفاق سے وہی جھوٹ بولا تھا
 جو رعنا نے اس کا پتا حاصل کرنے کے لیے میرا سے بولا تھا۔

☆☆☆

رعنا سہیل احمد کا جواب نہیں سن سکی تھی وہ حیران تھی کہ
 یہ کیسا اتفاق تھا وہ جس شخص کی بیٹی کی تلاش میں تھی وہی اسے
 دو بار ملا اور اسے پتا نہیں چلا کہ یہ وہی سہیل احمد ہے۔ لفت
 تک وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی لیکن لفت میں
 اس کا ضبط جواب دے گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی وہ رونے
 لگی تھی۔ آج کامی نے اس کا مان توڑ دیا تھا۔ وہ اس کے
 بارے میں کیا سوچتی رہی تھی اور وہ کیا نکلا تھا؟ وہ اس کی
 خاطر اللہ سے شکوہ کرتی رہی کہ کامی کو ایسی موت کیوں ملی؟
 وہ اس انجام کا مستحق نہیں تھا مگر اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ
 اللہ کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا ہے۔

شاید اسی سے غلطی ہوئی تھی۔ اس نے صرف سکھانے
 کو کافی سمجھا اور کامی پر نظر نہیں رکھی۔ دوسری طرف اس نے
 بھی جو کیا بہت ہوشیاری سے کیا۔ اس نے رعنا کو ڈرا بھی
 احساس ہونے نہیں دیا کہ اس کی بیرونی سرگرمیاں کس
 نوعیت کی ہیں۔ اس نے اپنے معمولات میں یہ ظاہر فرق
 نہیں آنے دیا تھا۔ اپنے کپیوٹر کے فولڈر میں تصاویر بھی
 شاید اس نے غلطی سے چھوڑ دی تھیں۔ تصویروں پر اسے

خیال آیا کہ ندا تصویروں کے نام پر اتنی سفید کیوں پڑ گئی تھی
 اور اس نے یوں کہا تھا کہ وہ کامی کے کپیوٹر کی ہارڈ ڈسک
 فارمیٹ کر دے۔ کیا کامی نے اس کی غیر اخلاقی تصاویر بھی
 لی تھیں؟ جو شخص ایک ٹرکی کو دھوکا دے کر اس کا جسمانی
 استحصال کر سکتا تھا، اس سے کسی بھی بات کی توقع کی جاسکتی
 تھی۔ وہ ندا کی اخلاق سے گری تصاویر بھی لے سکتا تھا۔ اس
 پر رعنا کو یہ خیال بھی آیا کہ اگر کامی نے ایسا کوئی کام کیا بھی
 تھا تو کیا اس میں ندا کی مرضی شامل تھی یا نہیں؟

رعنا کا دل دکھ رہا تھا مگر گھر آتے آتے اس نے خود کو
 سنبھال لیا۔ اس نے آتے ہی سب سے پہلے کامی کے کپیوٹر
 کا سی پی یو نکھولا اور اس میں لگی ہارڈ ڈسک باہر نکالی۔ اسے
 پوریج میں لاکر اس نے ہتھوڑے سے مار مار کر اسے پچکا
 دیا۔ اسے یقین تھا کہ اب اس میں موجود سارا ڈیٹا ضائع
 کیا ہوگا۔ اگر اس میں ندا کی ایسی کوئی تصویر تھی تو وہ
 ضائع ہو گئی تھی۔ اس نے ہارڈ ڈسک کھرے میں ڈال
 دی۔ پھر اس نے کامی کا ڈیجیٹل کیمرا چیک کیا مگر اس کا
 میموری کارڈ خالی تھا۔ احتیاطاً اس نے کامی کے سامان کی
 تلاشی لی۔ اس کی یو ایس بی اور سیل فون کے میموری کارڈ کو
 بھی چیک کیا مگر ان میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ رعنا کا اندازہ
 درست ثابت ہو رہا تھا۔ کامی کے فولڈر والی تصاویر بھی اتفاقاً
 رہ گئی تھیں موت نے اسے مہلت نہیں دی کہ وہ انہیں بھی
 ضائع کر دیتا۔ اس رات اس نے عشا کی نماز کے بعد کامی
 کے بچے خصوصی دعا کی۔

”اے اللہ میرے بچے پر رحم فرما، اس نے مجھے دھوکا
 دیا لیکن میں نے اسے معاف کیا، تو بھی اسے معاف کر دے
 اور اس پر آخرت کی منزل آسان فرما دے۔“

مگر جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو اسے خیال آیا کہ
 اصل میں تو کامی ندا کا مجرم تھا، جب تک وہ اسے معاف نہیں
 کرے گی اللہ بھی اسے معاف نہیں کرے گا۔ یہ تو طے ہے
 کہ اللہ اپنے حقوق معاف کر سکتا ہے۔ لیکن بندوں کے نہیں
 جب تک کہ وہ خود نہ معاف کر دیں۔ یہ خیال آتے ہی رعنا
 بے چین ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ ابھی ندا سے رابطہ کرے
 لیکن دل پر جبر کر کے وہ رک گئی کہ اس وقت گھر میں اس کا
 شوہر ہوگا۔ اگرچہ ندا کا کہنا تھا کہ عامر سب جانتا تھا مگر شاید
 وہ اس کے ماضی کا سامنا کرنا پسند نہ کرے۔ اس لیے ندا اس
 حوالے سے بھی خوفزدہ تھی۔ عامر نے پہلے ہی ناقابل یقین
 حد تک فریخ دلی کا ثبوت دیا تھا۔ وہ یقیناً ندا سے محبت کرتا
 تھا بھی اس نے اسے اس بچے سمیت قبول کر لیا اور یہ اس کا

طور پر دیکھتا ہے۔ وہ کسی کا بار دوسرے پر نہیں ڈالتا۔“
رعنا کو حوصلہ ہوا مگر پھر اسے کامی کا خیال آیا۔“ اسے
تو سزا ملے گی نا۔“

”یہ تو ہے ہر انسان کو اپنے اعمال کی سزا بھگتنی پڑتی
ہے۔“ نازیہ صاف گوئی سے بولی۔

”اگر خدا سے معاف کر دے تو شاید اللہ بھی اسے
معاف کر دے گا۔“

”کیا تم نے خدا سے بات کی؟“
”بھی میں کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ایک بار اس

نے کال ریسیو نہیں کی اور پھر سیل فون آف کر دیا۔ میں نے
اسے سچ کر دیا ہے۔ شاید اس کے دل میں رحم آجائے اور وہ
مجھ سے بات کر لے۔ تب میں اس سے کہوں گی کہ وہ کامی کو
معاف کر دے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے جس لڑکی کو محبت میں دھوکا دیا
گیا ہو وہ دھوکا دینے والے کو معاف کر سکتی ہے؟“

نازیہ کے اس سوال پر رعنا چپ ہو گئی۔ پھر اس نے
کہا۔ ”شاید وہ ایسا نہ کرے لیکن میں کوشش تو کر سکتی ہوں۔
کامی کے لیے یہ ایک کام ہے جو میں کر سکتی ہوں۔ اس کی
مظہرت کی دعا کے علاوہ۔“

”ہاں اللہ اس کی آخرت کی مشکلیں آسان کر دے تو
یہی سب سے بڑی بات ہوگی۔“

رعنا سارا دن وقفے وقفے سے خدا کا نمبر ملاتی رہی مگر
وہ بدستور بند جا رہا تھا، ایسا لگ رہا تھا کہ یہ نمبر اس نے
مستقل بند کر دیا ہے اور شاید اسے اس کی ضرورت بھی نہیں
تھی، اس کے پاس یقیناً دوسرا نمبر تھا جسے وہ استعمال کر سکتی
تھی۔ شام تک رعنا سوچ رہی تھی کہ وہ پھر اس کے
اپارٹمنٹ جائے۔ وہ ایک بار خدا کا جواب ضرور سننا چاہتی
تھی۔ اگلے دن تک اس کا فیصلہ کئی بار ڈانواں ڈول ہوا مگر
وہ نکل گئی۔ وہ ایک بار آچکی تھی اس لیے اس بار گاڑنے
اسے بنا پوچھے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ رعنا نے
اطمینان کا سانس لیا، ورنہ اسے خدشہ تھا کہ شاید عدا گیت پر
ہی انکار کر دے گی اور وہ ایسا ہی کرتی کیونکہ اتفاق سے کال
تل کے جواب میں دروازہ اسی نے کھولا اور اس کے
چہرے پر جو تاثرات آئے تھے وہ ہرگز اچھے نہیں تھے۔ اس
نے گھٹی آواز میں کہا۔

”آپ کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہیں؟ میں آپ
سے ملنا اور بات کرنا نہیں چاہتی۔“

”پلیز میں صرف دو منٹ کے لیے بات کرنا چاہتی ہوں۔“

طرف تھا کہ وہ اسے اپنا نام دیتا۔ رعنا رونے لگی۔ ”کامی یہ
تو نے کیا کیا، اپنی ماں کو اپنی نظروں میں ہی سراٹھانے کے
قابل نہیں چھوڑا۔“

رات دیر تک رونے، سوچنے اور پھر صبح کسی وقت
سونے کی وجہ سے اس کی آنکھ کھلی تو سر میں شدید درد تھا اور
طبیعت بوجھل تھی۔ اس نے نیم گرم پانی کا شاور لیا تو اس کی
طبیعت کسی قدر بہتر ہوئی۔ نیم سیاہ چائے کے ساتھ درد کش
گولیاں لے کر وہ خود کو حیرت بہتر محسوس کرنے لگی تھی پھر اس
نے خدا کا نمبر ملایا مگر وہ کال ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ رعنا نے
دوسری بار کال کی کوشش کی تو اس کا نمبر بند ملا۔ واضح طور پر
وہ اس سے بات کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔ اس نے سیل ہی
آف کر دیا تھا۔ رعنا نے اسے ایس ایم ایس کیا۔ ”سوری خدا
میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی بس ایک بات کہنا چاہتی
ہوں اگر تم سن لو تو تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔“

اس نے ایس ایم ایس کیا تھا کہ نازیہ کی کال آگئی۔ وہ
جاننے کے لیے بے تاب تھی کہ اب کیا ہوا ہے۔ رعنا نے
اسے بتایا کہ کس طرح اس نے خدا کا نمبر ملایا اور وہ اسے ملنے لگی
تھی۔ نازیہ بولی۔ ”اس نے کامی کے بارے میں کیا بتایا؟“
”بھی کہ کامی نے اس سے اچھا سلوک نہیں کیا، اسے
محبت کے نام پر دھوکا دیا۔ جب وہ اس کے بچے کی ماں بنتے
والی ہو گئی تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔“

نازیہ بھی سن رہی تھی پھر اس نے دکھ سے کہا۔ ”اوہ
مجھے کامی سے یہ امید ہرگز نہیں تھی۔“

”تم سوچ سکتی ہو یہ جان کر میرا کیا حال ہوا ہوگا۔“
”رعنا مجھے سچ سچ محسوس ہے تم نے کامی کو اچھا انسان
بنانے کی پوری کوشش کی اور شاید وہ اچھا انسان بنا بھی۔ مگر
انسان کتنا ہی اچھا کیوں نہ بن جائے وہ فرشتہ نہیں بن سکتا۔
کامی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، خدا کے معاملے میں اس کے
قدم بہک گئے۔“

”شاید، لیکن اس کی ایک ہی حرکت نے مجھے اپنی
نظروں میں ہمیشہ کے لیے شرمندہ کر دیا۔“

”ایسا مت سوچو۔“ نازیہ نے اسے تسلی دی۔ ”بے
شک وہ انہیں برس کا تھا لیکن عاقل اور بالغ تھا، اس نے جو
کیا اس کا ذمے دار وہ خود تھا۔ تم نے اپنی طرف سے کوئی
کوئی بات نہیں کی اس لیے تم ذمے دار کیسے ہو سکتی ہو؟“

”میں اس کی ماں جو ہوں۔“ رعنا کی آواز ہینگ
گئی۔ ”ذمے دار تو میں ہی سمجھی جاؤں گی۔“

”دنیا کی نظر میں، لیکن اوپر والا تو ہر بندے کو انفرادی

رعنا اس کے رویتے سے مطمئن ہو گئی تھی اور اب اسے جس تھا کہ وہ اس سے کیا بات کرنا چاہتا ہے؟ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سر ہلایا تو سمیل احمد خوش ہو گیا۔ ”آپ میرے پیچھے آئیے زیادہ دور نہیں ہے۔“

ریستوران چھوٹا اور پرسکون تھا۔ اس وقت وہاں چند ہی افراد تھے۔ سمیل احمد نے اس کے منع کرنے کے باوجود چائے کا کہہ دیا اور اپنا تعارف کرایا۔ ”نام سے آپ واقف ہیں۔ میں ندا کا باپ ہوں بلکہ اس کی ماں بھی ہوں کیونکہ وہ صرف چھ مہینے کی تھی جب اس کی ماں ہم دونوں کو چھوڑ گئی تھی۔“

رعنا نے افسوس سے کہا۔ ”یعنی ندا آپ کی اکلوتی بیٹی ہے؟“ اس نے سر ہلایا۔ ”میں چھوٹا سا بزنس مین ہوں اور میں بتا نہیں سکتا کہ بزنس کے ساتھ ساتھ ندا کی دیکھ بھال میں مجھے کتنی دشواری پیش آئی، مگر اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے بیٹی کی ذمہ داری میں سرخرو کیا، اب وہ اپنے گھر میں خوش ہے، کچھ عرصے بعد ماں بن جائے گی۔“

لگتا تھا کہ سمیل احمد کو بھی اس کی طرح خوش نہیں تھی جیسے وہ کامی کو مصوم اور ہار کردار سمجھتی تھی ایسا ہی سمیل احمد بھی ندا کو سمجھتا تھا اور اسے علم ہی نہیں تھا کہ ندا بن بیٹی ماں بننے والی تھی۔ رعنا نے اپنے تاثرات پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

سمیل احمد نے اسے دیکھا۔ ”ندا میری اکلوتی بیٹی ہے اس نے مجھ سے آج تک کچھ نہیں چھپایا۔ میں اس کی ساری فریڈز کو اور ان کے گھر والوں کو جانتا ہوں کیونکہ انہیں جانتا میری ذمہ داری تھی۔ مجھے نہیں یاد کہ آپ کی بیٹی کب میری بیٹی کی فریڈ تھی، کیونکہ میں اس سے قطعی نا آشنا ہوں اور نہ میں نے بھی آپ کو دیکھا ہے۔ نہ ہی میرے علم میں آپ کی بیٹی کی ذمہ داری ہے۔“

رعنا حیران رہ گئی۔ نادانگہی میں ندا نے اپنے باپ سے وہی کہا جو اس نے ندا کا پتا حاصل کرنے کے لیے سمیرا سے کہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے وہ دنگ رہ گئی تھی۔ پھر اس نے سنبھل کر کہا۔ ”میری بیٹی اور ندا کی دوستی بس چند دن رہی اور پھر اس کی ڈھچھ ہو گئی۔“

”ندا نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“

”یہ تو آپ اس سے پوچھیں، ویسے ان دونوں کی دوستی بہت گہری نہیں تھی۔“

”ندا بہت حساس ہے۔ وہ تو اخبار پاتی وی پر کسی کی موت کی خبر سنی پڑھتی ہے تو اس کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔“ سمیل احمد نے نئی میں سر ہلایا۔ ”یہ ممکن ہی نہیں ہے

”میں نہیں کرنا چاہتی۔“ ندا نے کہتے ہوئے دروازہ بند کرنا چاہا تو رعنا نے دونوں ہاتھ آگے کر دیے۔ اس کے جڑے ہاتھ اور آنکھوں میں لرزتے آنسو اچھا کر رہے تھے۔ ندا رک گئی اسی لمحے اندر سے کسی نے پوچھا۔

”ندا باہر کون ہے؟“

”عامر گھر پر ہیں۔“ ندا آہستہ سے بولی۔ ”آپ مجھے شام کو کال کیجئے گا مگر پلیز ابھی چلی جائیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ رعنا نے آنسو صاف کیے۔ ”میں شام کو کال کروں گی مگر تمہارا اسل.....“

”آن ہوگا۔“ ندا نے کہا اور دروازہ بند کر دیا پھر اس کی آواز آئی۔ ”سز شہباز نہیں۔“

سز شہباز شاید اس کی پڑوسی تھیں۔ رعنا نے باہر جاتے ہوئے سوچا۔ وہ لفٹ سے نکل کر پارکنگ میں آئی اور اس نے نوٹ نہیں کیا کہ اسی لمحے سمیل احمد کی سلور کار وہاں آ کر رکی تھی، اس نے رعنا کو دیکھ لیا تھا۔ جب وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر باہر جانے لگی تو سمیل احمد کی کار اس کے پیچھے آئی تھی۔ وہ ڈرا آگے نکل ہوگی کہ سمیل احمد نے کار پاس لاکر ہارن دیا تو رعنا چوکی اور اس نے سمیل احمد کو دیکھ کر رتار کم کر لی۔ سمیل احمد نے رکنے کا اشارہ کیا تو اس نے کار سڑک کے کنارے روک لی مگر وہ اندر بیٹھی رہی۔ چند لمحے کو اس کے ذہن میں خدشات آئے کہ سمیل احمد نے اسے کیوں روکا ہے؟ کیا وہ اس کے خلاف کچھ کرنا یا کہنا چاہتا ہے؟ یہ تو طے تھا کہ اس ٹھیلی کے جذبات اس کے لیے دوستانہ نہیں ہو سکتے تھے۔ ندا کا کہنا تھا کہ اس کا باپ ناواقف ہے لیکن یہ اس کی خوش نہیں بھی ہو سکتی تھی۔ شاید سمیل احمد واقف تھا اور اب یہ بھی جان گیا تھا کہ وہ کامی کی ماں ہے۔ خدشات کے باوجود اس نے گاڑی روک دی۔ سڑک پر ٹریفک کم تھا۔

سمیل احمد اتر کر اس کی گاڑی کے پاس آیا۔ اس کا انداز نارمل تھا۔ ”کبھی ہیں آپ؟“ سمیل احمد نے مہذب لہجے میں پوچھا۔

رعنا جبراً مسکرائی۔ ”میں ٹھیک ہوں لیکن آپ نے مجھے.....“

”میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟“

سمیل احمد ہچکچایا۔ ”دیکھیے آپ غلط مت سمجھیے گا لیکن یوں سڑک پر گھنگو مناسب نہیں ہے۔ اگر آپ برانہ مانیں تو نزدیک ایک ریستوران ہے وہاں سکون سے بات کی جاسکتی ہے۔“

”یہ درست ہے۔“
 سہیل احمد ہنچا پاپا۔ ”کیا کامران اور ندا میں کوئی تعلق تھا؟“
 ”شاید۔“ رشنا نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”میں ندا کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی لیکن جب چند دن پہلے میں نے کامی کا کپڑا پہلی بار دیکھا تو اس میں ندا کی تصویریں تھیں۔ کامی بالکل بھی ایسا لگا نہیں تھا جو لڑکیوں کے چکر میں رہتا ہو اس لیے مجھے تجسس ہوا۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ کامی اس ریستوران میں اکثر جاتا تھا جہاں اسے شوٹ کیا گیا تھا۔“
 ”تو آپ اس لیے وہاں گئی تھیں۔“ سہیل احمد نے سر ہلایا۔ ”ندا کے بارے میں وہیں سے پتا چلا؟“

”کہہ اپنی کسی عام سی دوست کی موت پر خاموش رہ جاتی۔“
 ”تب میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ رشنا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”ممکن ہے اس نے آپ کی عدم موجودگی میں رو کر دل ہلکا کر لیا ہو۔“
 ویٹر چائے لے آیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد سہیل احمد نے کہا۔ ”آپ واقعی کچھ نہیں کہہ سکتی ہیں؟“
 ”میں کہہ چکی ہوں۔“ رشنا کا لہجہ کسی قدر تیز ہو گیا۔ ”اب آپ جو کہنا چاہنا وہ کہہ دیں۔“
 سہیل احمد سنجیدہ ہو گیا۔ ”ہاں میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جب میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا تو مجھے آپ جانتی پہچانی لگی تھیں مگر مجھے یاد نہیں آیا کہ آپ کو کہاں دیکھا ہے؟“
 رشنا کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ”پھر آپ کو یاد آ گیا؟“



کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پراچین نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پراچین ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

- ☆ ایک اسٹال کا نام جہاں پراچین دستیاب نہ ہو۔
- ☆ شہر اور پلاٹے کے نام۔
- ☆ ممکن ہو تو ایک اسٹال کا PTCL یا سہیل فون نمبر

رابطہ اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

C-63 نئی سٹیٹس ہاؤس اتارنی میں کوئی روڈ کراچی

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

سہیل احمد نے سر ہلایا۔ ”میں نے انٹرنیٹ پر اسے اخبارات نکال کر دیکھے اور مجھے پتا چل گیا کہ آپ کیوں جانی پہچانی لگ رہتا تھیں۔“
 رشنا زور ہو گئی۔ ”تو آپ جان گئے ہیں.....؟“
 ”آپ کی بیٹی کا نہیں بلکہ بیٹے کا انتقال ہوا ہے۔“ سہیل احمد نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”مجھے افسوس ہے لیکن میں پوچھنا چاہوں گا کہ آپ اور ندا نے ایک ہی جیوٹ کیوں بولا؟“
 رشنا گہری سانس لے کر رہ گئی۔ ”میں نہیں بتا سکتی، آپ ندا سے کیوں نہیں پوچھ لیتے؟“
 اس بار سہیل احمد نے گہری سانس لی۔ ”اگر اس سے پوچھ سکتا تو آپ سے کیوں کہتا۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ باپ بیٹی کا رشتہ کتنا حساس ہوتا ہے۔ ماں بیٹی آپس میں ہر بات کر سکتی ہیں لیکن باپ بیٹی آپس میں ہر بات نہیں کر سکتے۔ میں اس کا باپ ہوں، میں جانتا ہوں جب سے اس کی شادی ہوئی ہے وہ کسی خوف کے زیر اثر جی رہی ہے لیکن یہ خوف عامر یا اس سے متعلق نہیں ہے۔ عامر میرا بیٹا ہے اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ کئی بار میں نے ندا سے پوچھا کہ وہ کیوں پریشان ہے، وہ کیوں کمزور ہو رہی ہے لیکن وہ مجھے ہمیشہ ٹال جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے عامر بھی پریشان ہے۔“
 ”آپ کا خیال ہے ندا کی پریشانی کا تعلق مجھ سے ہے؟“
 ”نہیں میرا خیال ہے اس کی پریشانی کا تعلق آپ کے مرحوم بیٹے کامران سے ہے۔ میں نے مزید ریسرچ کی تو مجھے پتا چلا کہ وہ بھی اسی یونیورسٹی میں پڑھتا تھا جہاں ندا پڑھتی تھی۔“

مرد کی شادی اسی وقت کی جانی چاہیے جب وہ ذہنی لحاظ سے بچھرا اور ہر طرح کی ذمہ داری اٹھانے کا اہل ہو جائے۔
 ”تو آپ کے خیال میں کامران نے پیچھے ہٹ کر خدا کو دھوکا دیا؟“

”میرا یہی خیال ہے اور خدا نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ وہ بہت اب سیٹ ہو گئی تھی اور اس نے صرف عام سے یہ بات شیئر کی تھی۔ اسے نروس بریک ڈاؤن سے بچانے کے لیے عامر نے اسے پروپوز کیا اور ان کی عجلت میں شادی کی وجہ بھی یہی تھی۔“

”رہیل؟“ سہیل احمد نے بے یقینی سے کہا۔ ”انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔“

”کیونکہ خدا جانتی تھی کہ اگر آپ کو پتا چل گیا تو وہ ہمیشہ تے لیے آپ کی نظروں سے گر جائے گی اور وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ حالانکہ اس نے محبت میں دھوکا برداشت کر لیا تھا۔“

”تب وہ ابھی تک کیوں پریشان ہے؟“

”شاید اسے خطرہ ہو کہ یہ بات کھل نہ جائے۔“

سہیل احمد سوچ میں پڑ گیا۔ شاید یہ بات اس سے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ خدا اس کی بیٹی تھی اور اسے معلوم تھا کہ وہ کس صورت حال میں کس طرح کارڈ عمل دے سکتی ہے۔ اس کی فکر مندی اور حد سے زیادہ ٹیشن سمجھ سے باہر تھی۔ رحنا اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”وہ بہر حال ایک لڑکی ہے اور ماں سے محروم رہی ہے شاید اسی چیز نے اسے اتنا حساس بنا دیا ہے۔“

سہیل احمد نے گہری سانس لی۔ ”شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“

رحنا نے سکون کا سانس لیا۔ ”یہاں جو گفتگو ہوئی ہے وہ میرے اور آپ کے درمیان رہے تو بہتر ہوگا۔ خدا نے مجھ پر اتنا دیکھا۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ سہیل احمد نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”یہاں ہونے والی گفتگو آپ کے اور میرے درمیان رہے گی۔ لیکن میں کچھ پوچھنا چاہوں گا؟“

”مزید کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“ رحنا مطمئن ہوتے ہوئے ایک بار پھر مضطرب ہوئی۔

”آپ اس دن پہلی بار خدا سے ملی تھیں؟“

”ہاں۔“

”اور آپ نے مجھے جو کچھ بتایا ہے یہ سب باتیں اسی دن ہو گئی تھیں؟“

”ہاں اس وٹرنے مجھے خدا کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی دی تھی اس بوٹیک کے سامنے جہاں آپ آئے تھے۔“

”اس کے پاس خدا کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی کہاں سے آئی؟“

”مجھے نہیں معلوم، میں نے اسے خدا کی تصویر دکھائی تھی تو اس نے مجھے باہر لے کر لیا اور دس ہزار روپے لے کر یہ کاپی دی تھی۔“ رحنا نے پرس سے آئی ڈی کارڈ کی کاپی اور خدا کی پرنٹ تصاویر نکالیں اور سہیل احمد کے سامنے رکھ دیں۔ ”اسی ایک درجن تصاویر تھیں جو میں ڈیلیٹ کر چکی ہوں۔“

سہیل احمد کا چہرہ ست گیا تھا۔ وہ کچھ دیر ساکت نظروں سے ان تصویروں کو دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ خدا کسی کو پسند کر بیٹھے گی لیکن اس نے مجھ سے کیوں نہیں کہا میں اس کا باپ ہوں۔ اس کی خوشی مجھ سے زیادہ کون چاہے گا۔“

صورت حال رحنا کے لیے غیر متوقع تھی۔ جب سہیل احمد نے حقیقت اس کے سامنے رکھی تو وہ یوگلا گئی تھی مگر وہ ایک ورکنگ دو مین تھی اور اسے مسائل کا حل نکالنا آتا تھا۔ اتنی دیر میں اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کہنا ہے۔ کامی دنیا سے جا چکا تھا اور اب اسے ساری عمر اکیلے رہنا تھا۔ یہ اس کا مقدر تھا لیکن سہیل احمد اور خدا کے سامنے ایک بڑی زندگی تھی اس میں مزید رنگ بھرنے تھے۔ وہ اس کے حقدار نہیں تھے کہ ان کی باقی زندگی جلتے کڑھتے اور پچھتاؤوں کے ساتھ تڑپتی۔ انہیں کامی کے لیے کی سزا نہیں ملنی چاہیے تھی۔ اس نے کہا۔ ”سہیل صاحب، ایک ماں کی حیثیت سے بہت مشکل ہے کہ میں اعتراف کروں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں سارا قصور میرے بیٹے کا ہے اور کسی حد تک میرا بھی ہے۔ وہی خدا کی طرف بڑھا، اسے اپنی محبت کا یقین دلایا۔ لڑکیاں بہت آسانی سے محبت کا دعویٰ تسلیم کر لیتی ہیں۔ خدا نے بھی کر لیا مگر جلد کامی نے محسوس کیا کہ وہ اس محبت کو نبھانے کے لیے وہ ابھی بڑھ رہا تھا اور اسے اپنا کیریئر بنانا تھا۔ میں کسی صورت اس کی اتنی جلدی شادی نہیں کر سکتی تھی یہ بات میں نے اس پر واضح بھی کی تھی کہ پہلے وہ خود کو سیٹ کرے گا تب میں اس کی شادی کروں گی۔“

”حالانکہ وہ آپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور ایسے میں ماں کی خواہش ہوتی ہے کہ بیٹے کی جلد از جلد شادی کر دے تاکہ اس کے گھر میں رونق ہو۔“

”میں جذباتی عورت نہیں ہوں، میرے خیال میں

پہلا سبج

ایک یورپین اپنے دوستوں کو اپنی ہوں کی رواد ستار ہا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ مجھے اور میری بیوی کو آدم خور قبائلیوں نے گھیر رکھا تھا۔ جب قبائلیوں کے سردار نے مجھے دیکھا تو کہنے لگا کہ وہ چالیس برس سے زیادہ کی عمر کے آدمیوں کو نہیں کھاتا اور زندگی میں وہ پہلا موقع تھا۔ جب میری بیوی نے اپنی عمر کے متعلق سچ بولا۔

مرسلہ۔ ریاض بیٹ، حسن ابدال

”یہ قدرتی بات ہے۔“

”تیس بی بی جی آپ کی جلد بھی بالکل ٹھیک ہے کہیں ذرا بھی جھری نہیں پڑی ہے آپ کو دیکھ کر کوئی مان ہی نہیں سکتا کہ آپ اڑتیس برس کی ہو۔“

رعنا سکرائی۔ ”لیکن یہ حقیقت ہے میں اڑتیس برس کی ہوں۔“

”بی بی اگر برائے مان تو تو ایک بات کہوں؟“

”آپ شادی۔۔۔۔۔“

”نہیں زرینہ۔“ اس نے انکار کیا اور پھر اس نے موضوع بدل دیا۔ ”اب تم گھر جاؤ کب سے میرے ساتھ لگی ہو۔ میں اب ٹھیک ہوں۔ تم کل آنا۔“

”ٹھیک ہے میں دوپہر میں آؤں گی۔“ زرینہ نے کہا پھر ہچکچا کر بولی۔ ”بی بی، اب آپ اکیلی ہو اور عورت کو ہمارے اہم ضرورت ہوتی ہے۔“

زرینہ ٹھیک کہہ رہی تھی عورت کو ہمارے کی ضرورت ہوتی ہے اب تک وہ کامی کے ہمارے پر مبنی اور کامی رہا نہیں تھا۔ مگر اسے کون ہمارا دے گا؟ اسے بے اختیار سمیل احمد کا خیال آیا۔ وہ جس طرح اس سے ملا اور جس طرح اس کی طرف متوجہ ہوا تھا اسے کوئی عورت محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ آخر میں اس نے پھر ملنے کو کہا تھا اور رعنا نے انکار کر دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ کیا سچ یہ ممکن اور مناسب ہو گا۔ اس کے اندر سے کسی نے کہا۔ ”بالکل نہیں ذرا سوچو اسے پتا چل گیا کہ کامی نے اس کی بیٹی کے ساتھ کیا کیا تو کیا وہ پھر بھی اس طرح متوجہ ہوگا، ہرگز نہیں وہ اسے نفرت سے دیکھے گا اور شاید اسے دیکھنا بھی پسند نہ کرے۔“ عجیب بات تھی وہ سمیل احمد کی نفرت کا سوچ کر لرز گئی تھی۔ ”نہیں کہنی نہیں۔“

اس نے خود سے کہا۔ ”نہ ملنا ہی ہمارے لیے بہتر ہے۔“

”ہاں۔“

”تب آپ آج کیوں گئی تھیں؟“

رعنا کا سر جھک گیا۔ اس نے بھرا سنے سے لہجے میں کہا۔ ”کامی غلط تھی لیکن ہے تو میرا بیٹا، مجھے خیال آیا کہ اس نے ترا کا دل دکھایا ہے اور اللہ بھی اپنے بندوں کے حقوق معاف نہیں کرتا ہے جب تک کہ وہ خود معاف نہ کر دیں۔ میں نہ اسے کہنا چاہتی تھی کہ وہ کامی کو معاف کر دے تاکہ اس پر آخرت کی منزلیں آسان ہو جائیں۔“

”نہ اسے کیا جواب دیا؟“

”میں اس سے کہہ ہی نہیں سکی، وہ میری کال ریسیو نہیں کر رہی تھی تو میں خود آگئی مگر عام گھر پر تھا۔ نہ اسے کہا کہ میں بعد میں آؤں۔“

”میں نے آپ کو لفٹ سے نکلے دیکھا تھا۔ میں خود آپ سے ملنا چاہتا تھا اس لیے میں آپ کے پیچھے چلا آیا۔ امید ہے آپ نے اس کا برا نہیں مانا ہوگا۔“

”بالکل بھی نہیں، اس کے برعکس میں آپ کی اور ندا کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے کامی کی ماں ہونے کے باوجود میرے ساتھ برا سلوک نہیں کیا۔“

سمیل احمد ہچکچایا۔ ”اب آپ اکیلی ہیں؟“

”میں شروع سے اکیلا ہوں، مجھے رشتوں کی رفاقت بہت کم ملی۔ رعنا نے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ ”یہی میرا مقدر ہے۔“

”کیا ہم پھر مل سکتے ہیں؟“

”نہیں۔“ رعنا نے بے ساختہ کہا۔ ”یہ ممکن اور مناسب نہیں ہے۔ اسے آخری بار سمجھیں۔“

رعنا باہر کی طرف، بڑھی اور سمیل احمد اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

رعنا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی جس دن وہ سمیل احمد سے ریستوران میں ملی تھی اسی رات اسے شدت کا بخار ہوا تھا۔ دو دن وہ بخار میں پڑی رہی۔ زرینہ اگلے دن آئی تو اس کی حالت دیکھ کر ڈاکٹر بلائی اور اس نے رعنا کو دوا کے ساتھ غسل آرام کا مشورہ دیا۔ زرینہ اس کے پاس رک گئی، اگلے دن بھی وہ صبح سے آگئی اور اس کی دیکھ بھال اور خوراک و دوا کا خیال رکھنے سے رعنا دوسرے دن شام تک خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر اسے ذرا سکون ملا۔ زرینہ نے اس کے بال گنسی کر کے باندھے اور رٹنگ سے بولی۔ ”بی بی جی آپ کے بال ماشا اللہ کتنے گھنے اور بالکل سیاہ ہیں بس ایک دو تار ہی سفید ہیں۔“

اور سر پکڑ کر ستر پر بیٹھ گئی۔ وہ رو رہی تھی اور اسے لگا جیسے اس کا سر چکر رہا ہو۔ اسی لمحے اس کے موبائل کی بیل بجی اور اس نے اٹھنا چاہا تو لڑکھڑا کر گر پڑی۔ پھر اسے ہوش نہیں رہا تھا۔ ایک منٹ بعد زرینہ نے دروازے پر دستک دی اور جب رعنا کی طرف سے جواب نہیں ملا تو وہ دروازہ کھول کر اندر آئی اور رعنا کو قائلین پر بڑے دیکھ کر بدحواس ہو گئی۔ موبائل کی بیل مسلسل بج رہی تھی اس نے پہلے رعنا کو تھنجوڑا مگر جب اس نے حرکت نہیں کی تو زرینہ نے موبائل اٹھا کر کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے کسی مرد نے کہا۔

”ہیلو رعنا....؟“

”بی بی جی بے ہوش ہو گئی ہیں۔“ زرینہ نے رونے والے لہجے میں کہا۔ ”ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”کیا ہوا انہیں؟“ مرد پریشان ہو گیا۔

”کل سے بخار تھا۔ ابھی ٹھیک تھیں پر میں کمرے میں آئی تو یہ بے ہوش پڑی ہیں۔ آپ کون ہیں؟“

”میں..... میں ان کے ساتھ آفس میں کام کرتا ہوں۔“ مرد نے کہا۔ ”تم کون ہو؟“

”میں زرینہ ہوں جی، رعنا بی بی کی ملازمہ۔“

”کسی ڈاکٹر کا نمبر ہے تو ایسے بلاؤ۔“

”نہیں جی کل بلا کر لائی تھی پر وہ دور ہوتا ہے اور اس وقت اس کا کلینک بھی بند ہوگا۔“

”مجھے پتا بتاؤ میں آ رہا ہوں۔“

زرینہ نے اسے پتا بتایا۔ میں منٹ بعد کال بیل بج رہی تھی۔

☆☆☆

رعنا کو ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھی اور اس کے بازو سے ڈرپ منسک تھی۔ ڈرپ کا کسی قدر پتلا رنگ بتا رہا تھا کہ اس میں کوئی دوا بھی ڈالی گئی ہے۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر اس سے اٹھا نہیں گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم سے ساری طاقت خُج گئی ہو۔ اسے خیال آیا کہ یہاں کیسے آئی۔ اسے یاد آیا کہ وہ کمرے میں بے ہوش ہو گئی تھی تو زرینہ اسے اسپتال لائی ہوگی۔ ورنہ گھر میں اور کون تھا۔ اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک نرس اندر آئی۔ اسے ہوش میں دیکھ کر مسکرائی۔ ”اب کیسی ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک ہوں، مجھے کیا ہوا تھا؟“

”بخار اور کمزوری، اس وجہ سے آپ بے ہوش ہو گئی تھیں۔“ نرس نے اس کا درجہ حرارت اور بلڈ پریشر چیک کرنا شروع کیا۔ ”اب آپ تقریباً ٹھیک ہیں۔“

اس نے ندا سے رابلے کی پھر کوشش نہیں کی تھی۔ وہ بخار میں تھی مگر چاہتی تو اسے کال کر سکتی تھی۔ اس نے جان کر نہیں کی اس کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا ان دونوں میں عجیب سی بے حسی اور سن کر دہینے والی کیفیت اس پر طاری رہی تھی۔ مگر اب وہ اس کیفیت سے نکل آئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ ندا کو کال کر لے۔ وہ زرینہ کے جانے کی منتظر تھی اس کے سامنے کال نہیں کر سکتی تھی۔ زرینہ مگن میں تھی اور اس کے لیے پرہیزی کھانا تیار کر رہی تھی۔ رعنا کے موبائل کی بیل بجی تو اس نے اٹھا کر دیکھا۔ خلاف توقع ندا کا نمبر آ رہا تھا۔ وہ پہلے بیڈروم میں آئی اور دروازہ بند کر کے اس نے کال ریسیو کی۔ ندا نے بنا تمہید یا سلام دعا کے پوچھا۔

”آپ کیا کہنے آئی ہیں؟“

”ندا کیسی ہو تم؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ اس کے لہجے کی رکھائی کم ہوئی تھی۔

”آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“

”میں تم سے ایک درخواست کرنے آئی تھی۔ بی بی میری التجا ہے تم کامی کو معاف کر دو۔ تم نے معاف نہ کیا تو اللہ بھی اسے معاف نہیں کرے گا۔“

”باوجود اس کے جو اس نے میرے ساتھ کیا ہے؟“ ندا کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

”اسے ایک ماں کی التجا سمجھ لو، میں مانتی ہوں کامی نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا مگر بیٹا اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے یہی سوچ کر کامی کو معاف کر دو۔“

”آپ نے میری حالت دیکھی ہے؟“ ندا جذباتی ہونے لگی۔

”مجھے اس حال تک آپ کے بیٹے نے پہنچایا ہے اور آپ کہہ رہی ہیں کہ میں اسے معاف کر دوں۔ آپ سن لیں میں اسے بھی معاف نہیں کروں گی اور میری خواہش ہے کہ اس نے جو کیا ہے اس کی سزا وہ ضرور دیکھتے۔ اب مجھے فون مت کیجیے گا ورنہ ہی میرے گھر آئیے گا۔“

رعنا نے آہستہ سے کہا۔ ”ٹھیک ہے تم کامی کو معاف نہیں کرنا چاہتیں مت کرو لیکن ایک بار سوچنا ضرور کہ جو کچھ ہوا کیا اس میں صرف کامی کا قصور تھا؟ کیا تمہارے قدم نہیں ہٹکے تھے؟“

”چپ کر جائیں۔“ ندا نے تیز لہجے میں کہا اور کہتے ہی کال کاٹ دی۔ رعنا نے تڑپ کر اس کا نمبر ڈائل کیا مگر دوسری طرف سے نہ ہر بند ہونے کی اطلاع سنائی دی۔ ندا کو اندازہ تھا کہ وہ کال کرے گی۔ اس لیے اس نے کال کاٹنے ہی موبائل بند کر دیا۔ رعنا نے موبائل ایک طرف ڈال دیا

”وہ ہندی بھی ہے، جس سے ایک بار اس کے دل میں گروہ آجائے، اسے آسانی سے معاف نہیں کرتی ہے۔ پھر وہ اپنی غلطی نہیں مانتی ہے دوسرے کو الزام دیتی ہے۔“

”شاید کامی کے مقدر میں بھی تھا۔“ رحمان نے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”ڈاکٹر کیا کہہ رہا ہے؟ کیا میں گھر جا سکتی ہوں؟“

”میری بخار ہے۔ کمزوری کی وجہ سے آپ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ شاید آج رات یہاں رکنا پڑے، اس اسپتال کا مالک میرا دوست ہے آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

رحمن کسمائی۔ ”مجھے یہ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔“

”بت اچھے برے کی نہیں ہے، آپ کو اس وقت علاج اور آرام کی ضرورت ہے۔“ سہیل احمد نے کہا۔ ”اب آپ آرام کیجیے میں کل صبح آؤں گا۔“

”ایک بار پھر شکریہ۔“

”وہ ٹیکم۔“ سہیل احمد بولا۔ ”ہاں میں ایک اور وجہ سے بھی آپ کو کال کر رہا تھا۔ آپ سے ملاقات کے بعد میں اس ریسٹوران گیا اور اس ویٹر کو پکڑا اس نے اعتراف کیا کہ اس نے آپ کو ندا کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی دی تھی۔ یہ پرانی بات ہے ایک دن کامی اور ندا ریسٹوران میں ملنے کے لیے آئے تھے تو اتفاق سے دونوں کے پاس کیش نہیں تھا۔ کامی کے پاس اس کا آئی ڈی کارڈ بھی نہیں تھا۔ تو ندا نے اپنے آئی ڈی کارڈ کی کاپی دے دی۔ بعد میں مل ادا کر دیا تھا مگر وہ کاپی واپس لینا بھول گئی۔“

”اور اس کی اسی بھول کی وجہ سے مجھے اس کا سراغ ملا۔“

سہیل احمد کے جانے کے بعد رحمان اس کے بارے میں سوچتی رہی، حتیٰ کہ فرس نے آکر اس کی ڈرپ میں نیند کا انجکشن شامل کر دیا اور وہ سو گئی۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو ذہن اور جسم ہلکا ہو رہا تھا اور کمزوری کا احساس تقریباً مٹ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے چیک کیا۔ ”ناؤ یو آر فائن۔“

”تو میں گھر جا سکتی ہوں؟“

”بالکل جا سکتی ہیں۔“ ڈاکٹر نے اجازت دے دی۔ ”لیکن دو دن احتیاط کرنی ہے ہلکی لیکن پوری غذا یعنی سب اور آرام کرنا ہے۔ دوا کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک طاقت کا سیرپ کھد رہا ہوں وہ استعمال کریں۔“

زیرینہ اس کا پرس اور گھر کی چابیاں لے آئی تھی۔ رحمان نے کاؤنٹر پر مل کا پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ مل ادا کیا جا چکا ہے۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ اسے اندازہ تھا کہ مل سہیل احمد نے ادا کیا ہوگا۔ اسے اچھا نہیں لگا مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔ سہیل احمد نے اس سے پوچھ کر یہ سب نہیں کیا تھا۔ وہ

”مجھے یہاں کون لایا؟“

”ایک منٹ میں ان کو سمجھتی ہوں۔“

نرس چلی گئی اور کچھ دیر بعد دروازے سے سہیل احمد اندر آیا تو رحمان حیران ہو گئی۔ ”آپ مجھے یہاں لائے ہیں لیکن آپ کو.....؟“

”آپ کی ملازمہ نے بتایا میں کال کر رہا تھا، اس نے فون پر مجھے آپ کی حالت کے بارے میں بتایا تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ امید ہے آپ نے برا محسوس نہیں کیا ہو گا۔ میں زرینہ کی مدد سے آپ کو یہاں لایا ہوں۔ ابھی اسے اس کے گھر چھوڑ کر آیا ہوں۔“

”میں آپ کی شکر گزار ہوں اور اس صورت میں آپ کا احسان مزید بڑھ جاتا ہے کہ میں پہلے ہی آپ کی مقررہ ہوں۔“

”بالکل نہیں کامی نے جو کیا ہے اس کا بوجھ آپ خود پر نہ لیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے کہ کوئی کسی کے کیے کا ذمہ دار نہیں ہے۔“

”آپ نے ٹھیک کہا۔“ رحمان بولی۔ ”لیکن آپ مجھے کیوں کال کر رہے تھے؟“

”اتفاق سے جب آپ نے ندا کو کال کی تو اس کے کچھ دیر بعد ہی میں اس کے پاس پہنچا تھا اور میں نے اس کے سل میں آپ کا نمبر دیکھا۔“

”اتفاق سے؟“ رحمان کا لہجہ سوالیہ تھا۔

سہیل احمد شرمندہ ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میں نے آپ کا نمبر لینے کے لیے اس کا سل دیکھا تھا۔“

”آپ نے اس کے سامنے مجھے کال کی تھی؟“

”نہیں باہر آ کر کی تھی۔“ سہیل احمد نے جواب دیا۔ ”میں اس کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا۔“

”کیوں؟“

”میں جانتا چاہتا تھا کہ آپ نے ندا سے بات کی اور اس نے کیا جواب دیا؟“

”میں نے بات کی اور اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ کسی صورت کامی کو معاف کرنے کو تیار نہیں ہے۔“ رحمان نے اسے بتا دیا۔

سہیل احمد نے گہری سانس لی۔ ”مجھے اس سے ایسی ہی توقع تھی۔“

رحمان نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”بہ ظاہر تو ندا نرم مزاج لگتی ہے۔“

سہیل احمد نے کپ میز پر رکھا۔ ”رہنا اگر آپ برا نہ
مانیں تو ایک بات پوچھوں؟“
”جی پوچھیں۔“

”آپ ہر لحاظ سے ایک مکمل عورت ہیں۔ مالی لحاظ
سے بھی مضبوط ہیں اور لگتا ہی نہیں کہ ایک جوان بیٹے کی ماں
بھی ہیں، تب آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟“
رہنا کو اسی سوال کی توقع تھی۔ اس نے گہری سانس
لی۔ ”سہیل صاحب! اس کی بہت سی وجوہات ہیں، اول
جب میں بیوہ ہوئی تو میرے سر پر ایسا کوئی بڑا نہیں تھا جو
میری دوبارہ شادی کی کوشش کرتا، دوسرے جاوید کے بعد
میرے لیے کسی اور مرد کا تصور مشکل تھا۔ انہوں نے مختصر
عرصے میں مجھے اتنی محبت دی، پھر کامی تھا میں اسے سوچنے
باپ کے حوالے نہیں کر سکتی تھی۔“

”آپ کی طرف کوئی بڑھا بھی نہیں؟“
”کچھ لوگ آگے آئے تھے مگر ان میں اخلاص سے
زیادہ ذاتی دلچسپی تھی۔ اس لیے میں نے جواب نہیں دیا۔“
”اور کوئی خلوص سے آتا تب؟“
”تب شاید میں سوچتی۔“

سہیل احمد چند لمحوں کے لیے خاموش ہو کر چائے پیتا
رہا پھر اس نے کہا۔ ”رہنا! اگر اب کوئی خلوص سے آپ کی
طرف بڑھے تو.....؟“

”اب بہت دیر ہو گئی ہے۔“ رہنا اس کی بات کاٹ
کر بولی

”دیر نہیں ہوتی ہے۔“ سہیل احمد نے اصرار کیا۔
”دیر ہو گئی ہے۔“ رہنا کی آواز نرم ہو گئی۔ ”پلیز میری
درخواست ہے اب اس موضوع پر مزید بات نہ کریں۔“

سہیل احمد کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے طویل
سانس لے کر سر ہلایا۔ ”جیسے آپ کہیں اور رہنا..... مجھے
آپ کی مرضی بہت عزیز ہے۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔ ”اب میں
چلوں گا۔ میرا نمبر آپ کے موبائل میں آ گیا ہے۔ اسے سیو
کر لیجیے گا اور کوئی بھی بات یا مسئلہ ہوتا بلا جھجک مجھے کال
کر لیجیے گا۔ میں آپ سے رابطے میں رہوں گا اگر آپ کو
اعتراض نہ ہو تو۔“

”سہیل صاحب! مجھے اعتراض تو نہیں ہے لیکن میرا
خیال ہے اس سلسلے کو اب یہیں ختم کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔
بعد میں آنے والی پیچیدگیوں سے یہ بہتر رہے گا۔“
سہیل احمد نے آہستہ سے کہا۔ ”جیسے آپ کی مرضی،
میں نے کہا تھا مجھے آپ کی مرضی عزیز ہے۔“

اسپتال سے باہر نکلے تھے کہ سہیل احمد وہاں پہنچ گیا۔ اس
نے گاڑی ان کے پاس روکی اور بیٹھے اتر آیا۔ ”میں نے
آپ سے کہا تھا کہ میں آپ کو صبح ڈراپ کر دوں گا۔“

”کوئی بات نہیں میں خود بھی جا سکتی ہوں۔“ رہنا نے
کہا۔ ”اب میں ٹھیک ہوں پھر زور پینے بھی آگئی تھی۔“

”آئیے میرے ساتھ۔“ سہیل احمد نے گاڑی کا
دروازہ کھولا تو رہنا کو اس کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔ زرینہ پیچھے
آگئی تھی۔

”نندا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی میں اسے دیکھنے گیا
تھا۔ اس لیے ڈراپ دیر ہو گئی ورنہ میں پہلے آ جاتا۔“

”کوئی بات نہیں آپ نے پہلے ہی اتنی زحمت کی۔“
”یہ زحمت نہیں ہے۔“ سہیل احمد نے یوں کہا کہ رہنا
محبوب سی ہو گئی۔ گھر کے سامنے کار سے اترتے ہوئے رہنا
نے اخلافاً کہا۔

”اندر چلیں، میں آپ کے لیے چائے بنا رہی ہوں۔“
”اس شرط پر کہ چائے آپ بنا لیں گی۔“ سہیل احمد
نے کہا تو رہنا نے زرینہ کی طرف دیکھا جو تالا کھول رہی تھی۔
اس نے نہیں سنا تھا۔ رہنا نے سر ہلایا۔
”ٹھیک ہے میں بناؤں گی۔“

سہیل احمد اندر آیا، رہنا نے زرینہ کو دوسرے کام
دیکھنے کو کہا اور خود کچن میں آگئی۔ وہ چائے بنا کر لائی تو سہیل
احمد موبائل پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ ”تم اسے باقاعدگی
سے چیک کراتے رہو۔ مجھے بہت لگ رہا ہے۔ وہ کمزور ہو رہی
ہے، میں شام کو آؤں گا۔“

سہیل احمد نے موبائل رکھا تو رہنا نے پوچھا۔ ”نندا کو
کیا ہوا؟“

”کیس مسئلہ کر رہا ہے۔“ سہیل احمد نے کہا۔ ”ممکن
ہے آپ ریٹ کرنا پڑے۔“

رہنا جھینپ گئی تھی۔ اس نے جلدی سے چائے بنا کر کپ
اس کی طرف بڑھایا۔ ”آپ نے کچ میں بہت زحمت کی۔“

”میں نے کہا تھا بالکل بھی نہیں۔“ اس نے کہہ کر ٹھونٹ
لیا۔ ”میرا اندازہ درست لگلا، آپ چائے بہت اچھی بناتی
ہیں۔ آپ کھانا بھی اچھا بناتی ہوں گی۔“

”ہاں کامی گئی میرے ہاتھ کا پسند کرتا تھا۔“
”عام طور سے درکنگ دو مین کھانا بنانا پسند نہیں کرتی
ہیں یا اچھا نہیں بناتا ہیں۔“

”میرے ساتھ ایسا نہیں ہے مجھے کھانا بنانا پسند ہے
اور میں اچھا بھی بنتی ہوں۔“

اندازہ ہی نہیں تھا کہ یہ تعلق کس قدر دشوار ہو سکتا ہے اور بعض باتیں اس کے علم میں آجاتیں تو اس تعلق کی نوعیت ہی بدل کر رہ جاتی۔ ندا کے بارے میں سمیل احمد نے جو کہا تھا، اب رحنا کو لگ رہا تھا کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو کسی بھی بات کو آسانی سے نہیں بھولتے بلکہ اسے روگ بنا لیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا تھا مگر ایک اچھے شخص سے شادی اور طویل عرصہ گزار جانے کے باوجود اس نے اس بات کو اپنی زندگی پر طاری کیا ہوا تھا۔ اس کی حالت گواہی دے رہی تھی کہ وہ مسلسل کشیدہ اعصاب کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ اس نے جس طرح رحنا کو انکار کیا تھا اس سے لگ رہا تھا کہ اس کے اندر سب کچھ روز اول کی طرح تازہ تھا۔

رحنا کو خیال آیا کہ ندا کی شادی کو سات مہینے ہو چکے تھے مگر بچے کا پتا یقیناً اس سے پہلے ہی چلا ہوگا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ آخری دنوں سے مگی۔ اگرچہ ایسا لگ نہیں رہا تھا۔ وہ کمزور تھی اور بچہ بھی کمزور تھا۔ شاید اسی وجہ سے کیس میں مشکل ہو رہی تھی۔ اس نے دل سے دعا کی کہ اللہ ندا کی مشکل آسان کرے، اس کی اور ہونے والے بچے کی حفاظت کرے۔ زریںہ شام تک اس کے ساتھ رہی پھر چھٹی کر کے بتلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد گھر میں جب سناٹا چھا گیا۔ رحنا ایسی گھبرائی کہ چھت پر آگئی جہاں اس پاس روٹی تھی۔ رحنا کا دل بہلا مگر جب مغرب کے بعد نیچے آئی تو گھر گھبراہٹ ہونے لگی۔ اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ اسے اب ساری عمر اسی تنہائی کے ساتھ رہنا تھا۔ رات بستر پر سونے کی کوشش میں کروٹیں بدلتے ہوئے اسے خیال آیا کہ کاش سمیل ندا کا باپ نہ ہوتا یا پھر ندا کا کامی سے تعلق نہ ہوتا تب وہ شاید اکیلی نہ رہتی۔

دو دن آرام کے بعد وہ خود کو بالکل ٹھیک محسوس کرنے لگی تھی۔ تنہائی کی وحشت بھی کم ہونے لگی تھی اور اس نے سوچا کہ اب وہ سوائے اشد ضرورت کے چھٹی نہیں کرے گی۔ نامی تھا تو چھٹی کے دن بھی بہت اچھے گزرتے تھے مگر اب کامی بھی نہیں رہا تھا۔ نازیہ نے اسے رات کے وقت کال کی اور رحنا نے اسے نہیں بتایا کہ وہ ایک دن اسپتال میں رہ کر آئی ہے۔ اس کے بھائے اس نے نازیہ سے کہا کہ وہ آنے والا ہفتہ اور اتوار کا دن اس کے ساتھ گزارے گی۔ وہ باہر چلیں گے اور انجوائے کریں گے۔ نازیہ سن کر خوش ہو گئی تھی۔ خاص طور سے اس بات پر کہ رحنا ہفتے کی رات اس کے گھر میں رکے گی۔ وہ ہفتے کی صبح اس کے گھر پہنچ گئی۔ بچے

رحنا سے گیٹ تک چھوڑنے آئی تھی۔ سمیل احمد نے کار میں بیٹھ کر اس کی طرف دیکھا اور ہاتھ ہلا کر کار آگے بڑھادی۔ رحنا گیٹ بند کر کے اندر آئی تو بگن کی صفائی کرتی زریںہ نے کہا۔ ”بی بی جی صاحبہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ اگر کل یہ نہ آتے تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ انہوں نے آکر سب سنبھال لیا۔“

”انہوں نے آکر کیا کیا؟“ رحنا نے پوچھا۔
”بی بی آپ بالکل بے ہوش تھیں میں نے ٹھنڈا پانی چھڑکا تب بھی ہوش میں نہیں آئی تھیں پھر صاحبہ آئے اور انہوں نے آپ کو دیکھا تو اپنی کار اندر لائے اور آپ کو اٹھا کر اس میں ڈالا۔ میں ساتھ بیٹھی اور وہ آپ کو اسپتال لے آئے۔ وہاں ڈاکٹر نے آپ کو دیکھا اور جب آپ کی طرف سے اطمینان ہوا تو وہ مجھے میرے گھر تک چھوڑ گئے۔“

رحنا کو شرم محسوس ہوئی اور ساتھ ہی اچھا بھی لگا کہ سمیل احمد نے اس کا اس حد تک خیال رکھا کہ کار اندر لا کر اسے اٹھا کر اس میں ڈالا، گلی میں تو تماشا بن جاتا اور دیکھنے والے نہ جانے کیا سوچتے؟ اس نے زریںہ سے پوچھا۔
”کسی نے دیکھا اور پوچھا تھا؟“

زریںہ نے سر ہلایا۔ ”جی بی بی، سامنے والی شبانہ آئی نے پوچھا تھا، جب صاحبہ کار باہر نکال رہے تھے۔ میں نے بتایا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور صاحبہ آپ کے دفتر میں کام کرتے ہیں۔“

رحنا نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”یہ تم نے ٹھیک بتایا۔“
زریںہ نے کسی قدر تعجب سے دیکھا۔ ”تو صاحبہ آپ کے دفتر میں کام نہیں کرتے؟ انہوں نے یہی تو کہا تھا تب ہی میں نے گھر کا پتا بتایا تھا۔“

رحنا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ”میرا مطلب ہے تم نے ٹھیک کہا اور سمیل واقعی میرے آفس میں کام کرتے ہیں۔“

”صاحبہ بہت اچھے آدمی ہیں۔“ زریںہ نے کہا اور اپنے کام میں لگ گئی۔ رحنا گھبرائی سانس لے کر رہ گئی۔ سمیل احمد بہت اچھے آدمی ہیں۔ اس نے سوچا لیکن وہ جو چاہ رہے ہیں وہ ممکن نہیں ہے۔ پہلے بھی رحنا نے اس کی دلچسپی محسوس کی تھی مگر آج اس نے کھل کر بات کی اور بہت مہذب پھرائے میں اپنا مدعا بیان کیا۔ رحنا کے جواب کو اس نے اتنے ہی مہذب انداز میں قبول کیا اور جذباتی ہوئے بغیر چلا گیا۔ اسے انکار کرتے ہوئے رحنا کے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا تھا مگر وہ اس کا پروچرل قبول نہیں کر سکتی تھی۔ سمیل احمد کو

چھوٹ تھی جو بات یہاں تک پہنچی۔ "ندائے بھی وہی بات کی جو رہنا نہ چاہتے ہوئے بھی ندا سے کہہ دی گئی۔ یہ حقیقت تھی کہ کامی قصور تھا مگر ندا بھی اس حد تک قصور وار ضرور تھی کہ اس نے صحیح غلط کی پروا کیے بغیر خود کو کامی کے حوالے کر دیا۔ رہنا نہ سرد آہ بھری۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہے۔ اس کے خیال میں صرف کامی قصور وار ہے اور وہ کسی معافی کا حق نہیں ہے۔"

"تب وہ خود غلط ہے۔" نازیہ نے یقین سے کہا۔ "اس کے معاف کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس نے نہ صرف اللہ کے بنائے قانون کو توڑا ہے بلکہ اپنے باپ کے اعتماد کو بھی دھوکا دیا ہے۔ وہ کیسے خود کو بری الذمہ سمجھ سکتی ہے۔"

"میں نے اس کا اور کامی کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔" رہنا نے آہستہ سے کہا۔ "دیکھا جائے تو میں اور سہیل بھی قصور وار ہیں، ہم نے اپنی اکلوتی اولاد پر نظر نہیں رکھی کہ وہ باہر کیا کر رہی ہے۔ اللہ ہم سب کو معاف کرے۔"

"ہاں وہی معاف کرنے والا ہے۔" نازیہ بولی۔

"کاش یہ سب نہ ہوا ہوتا یا سہیل کا ندا سے تعلق نہ ہوتا۔" مجھے بھی یہی خیال آیا تھا مگر یہ سب تقدیر کا کھیل ہے۔" اگلے دن نازیہ نے باہر چلنے کی تجویز دی تھی لیکن رہنا نے منہ کر دیا۔ اس کا سوڈن میں ہو رہا تھا، اس نے کہا۔ "تم لوگ چلے جاؤ، میں گھر جانے کا سوچ رہی ہوں۔"

"ہرگز نہیں! تم ڈنر کر کے جاؤ گی۔" نازیہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اس نے بچوں کو باپ کے سر مارا کہ وہ انہیں باہر گھما کر لائے اور خود رہنا کے ساتھ گھر میں رک گئی۔ وہ گھر کے کام کرتی اور گپ شپ کرتی رہیں۔ جب ڈنر کے بعد نازیہ اور اقبال اسے گھر چھوڑ کر گئے تو وہ خود کو بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔ اس رات اسے لیٹنے کے چند منٹ بعد ہی نیند آگئی تھی اور وہ بہت گہری نیند میں تھی جب سوپنل کی مسلسل بجتے والی بیل نے اسے بیدار کیا۔ ندا کا نمبر دیکھ کر اس کی نیند اڑ گئی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

"ندا؟"

"آئی۔" ندا نے کہا تو اس کی آواز میں تکلیف تھی۔

"تم ٹھیک ہونا؟" رہنا بے چین ہو گئی۔

"نہیں مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔ آئی میں نے سوری سے لیے کال کی ہے۔ اس دن میں نے آپ سے بہت بد تمیزی کی تھی۔"

بھی خوش تھے کہ انہیں گھونے پھرنے کا موقع ملے گا۔

ساحل پر اقبال کے چیک کا ہٹ تھا۔ اس نے اس میں ایک کراپک کرا دیا تھا۔ کیونکہ اس کی چھٹی نہیں تھی اس لیے نازیہ خود بچوں اور رہنا کو لے کر چلی گئی۔ کھانے کا سامان ایک بیکری سے لیا تھا۔ ساتھ میں کولڈ ڈرنک تھی۔ ہٹ میں انہیں ایک کرا ملا تھا۔ وہاں کچھ دوسری فیملیز بھی آئی ہوئی تھیں مگر وہ الگ کمروں میں تھیں۔ سامنے صاف سٹمراریت والا ساحل تھا وہ سارا دن وہیں رہے۔ پانی میں کھیلنے رہے اور جب بھوک لگتی تو کمرے میں آکر کھا لیا کرتا وہ دم ہو جاتے تھے۔ شام کو واپسی پر سب ٹھکے ہوئے تھے۔ بچے تو نہا دھو کر جلد سونے چلے گئے۔ رہنا اور نازیہ نے نہا کر کھانا بنایا۔ رہنا گیٹ روم میں تھی۔ نازیہ کا ارادہ گپ شپ کا تھا اس لیے وہ رہنا کے کمرے میں آگئی۔ تب رہنا نے اسے وہ سب بتایا جو اب تک نہیں بتایا تھا۔ اس کی طبیعت خرابی کا سن کر وہ بے چین اور خفا ہو گئی۔

"مجھے نہیں بتا سکتی تھیں؟"

"اس وقت کیسے، بتاتی اور بعد میں سوچا کہ ملاقات پر بتاؤں گی۔" رہنا نے اسے ٹھنڈا کیا۔ پھر اس نے سہیل احمد کے پر پوزل کے بارے میں بتایا تو نازیہ اپنی خفگی بھول گئی۔ وہ اچھل پڑی تھی۔

"اب میں تجھے قتل کر دوں گی۔ اتنی بڑی خیراتی دیر سے دی۔"

"یہ بھی سامنے دینا چاہتی تھی۔" رہنا نے اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟"

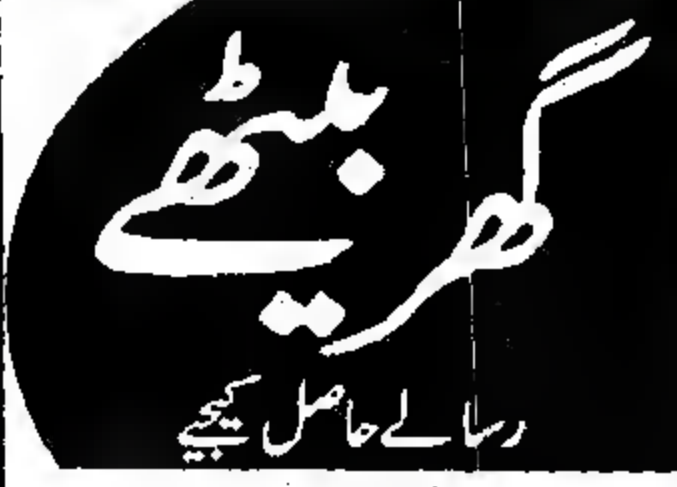
"وہی جو مجھے دینا چاہیے تھا۔" رہنا نے اسے بتایا کہ اس نے سہیل احمد سے کیا کہا۔ نازیہ بن کر پرتاسف ہو گئی۔

"تم نے اچھا نہیں کیا، آج کے دور میں اچھا آدمی مشکل سے ملتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن تم نے یہ سوچا کہ اگر کبھی ندا نے اسے اصل بات بتا دی تو اس کا رد عمل کیا ہوگا۔۔۔ وہ اس عورت سے تعلق رہنا تو بڑی بات ہے بات کرنا بھی پسند کرے گا جس کے بیٹے نے اس کی بیٹی کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی ہو؟"

"دیکھو رہنا، تم اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی احساس گناہ کا شکار ہو رہی ہو حالانکہ یہ تمہارا گناہ نہیں ہے۔ لیکن تم نے سوچا کہ اگر کامی قصور وار ہے تو کسی نہ کسی حد تک ندا بھی قصور وار ہوگی۔ اگر کامی اس کی طرف بڑھا تو یہ اس کی

دو سال کے کسی نئی آن لائن گزٹ میں ایک گزٹ



جاسوسی ڈائجسٹ، سسٹمز ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سسرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کار رسالہ (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، برطانیہ اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے

بقیمت ممالک کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ ہم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے نمبر پر پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مٹھی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجے پر ہماری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فلور 11، سسٹمز ڈائجسٹ، اتھارٹی ٹرانس کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 ٹیکس: 35802551

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ رحمان نے نرمی سے کہا۔ ”اگر تمہیں زیادہ تکلیف ہو رہی ہے تو تم عامر سے کہو وہ تم کو اسپتال لے کر جائے۔“

”مجھے لگ رہا ہے میں بچوں کی نہیں۔“ ندا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آئی ہاس ون میں نے آپ سے غلط کہا تھا کہ صرف کامی قصور وار ہے، اصل میں ہم دونوں قصور وار تھے، وہ آپ کا مجرم ہے اور میں پاپا کی، ہم دونوں نے آپ کے اعتماد کو دھوکا دیا۔ میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھی مگر آپ نے مجھے آئینہ دکھایا آئی، پتا نہیں مجھے پھر آپ سے بات کرنے کا موقع ملے یا نہ ملے میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔“

☆☆☆

ندا کالج سے یونیورسٹی آئی تو کچھ نروس تھی۔ اب تک اس نے ساری تعلیم لڑکیوں کے ساتھ حاصل کی تھی اور لڑکیوں کی کوشش میں یہ پہلا موقع تھا۔ اگر سہیل احمد کی حوصلہ افزائی شامل نہ ہوتی تو شاید وہ پہلا سمسٹر سے یونیورسٹی چھوڑ دیتی۔ مگر سہیل احمد کے اصرار پر اس نے تعلیم جاری رکھی۔ ندا سہیل سے تنہائی پسند اور کسی قدر زود درج تھی۔ وہ آسانی سے خفا ہو جاتی اور بہت مشکل سے مانتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی دوستی بہت کم لڑکیوں سے تھی۔ سب سے قریبی دوست سمیرا تھی۔ اسکول کی حد تک تو اس کی دوستیاں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔ سہیل احمد سمجھتا تھا کہ ماں سے محرومی نے ندا کو ایک خاص نفسیاتی کیفیت کا شکار کر دیا ہے اور وہ اسے اس نفسیاتی کیفیت سے نکالنا چاہتا تھا اس لیے اس کی حوصلہ افزائی کرتا کہ وہ سوشل انکلی ڈیز میں حصہ لے، لوگوں سے گھلے۔

یونیورسٹی میں اس کا گروپ صرف لڑکیوں پر مشتمل تھا اور اس نے دو گروپ اس کے لیے بدلے تھے کہ ان میں لڑکے بھی شامل ہو گئے تھے۔ چنانچہ سہیل نے اسے اس گروپ پر اوڈی بھی کہا جاتا تھا۔ ندا کو علم تھا مگر اس نے بھی پروا نہیں کی۔ اگر کسی دوست نے اس کے گریز پر بات کرنا چاہی تو ٹال کر بات ختم کر دیتی۔ اس لیے جب وہ کامران کی طرف پڑھی اور چند ملاقاتوں کے بعد اس کی طرف کھینچنے لگی تو کسی اور سے زیادہ خود اسے اپنی کیفیت پر تعجب ہوا تھا۔ کامران عمر اور کلاس میں اس سے کم تھا اور وہ بھی لڑکیوں سے دور رہنے کی وجہ سے مشہور تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوئے۔ ابتدائی چند ملاقاتیں اتفاقیہ تھیں اور اس کے بعد وہ خود ایک دوسرے

وہ یونیورسٹی سے واپسی پر ایک ڈاکٹر کے پاس چلی گئی۔
 علامات سن کر ڈاکٹر نے اسے پرہیزی ٹیسٹ کرانے کو کہا
 تو ندا کے ہوش اڑ گئے۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔
 اس نے خدشات کے ساتھ ٹیسٹ کرایا تو وہ مثبت
 نکلا۔ کامی کے بارے میں اسے یقین تھا کہ اس نے اسے
 دھوکا دیا ہے۔ ایسے میں اسے جو واحد فرد نظر آیا اور جو
 اسے اس دلدل سے نکال سکتا تھا وہ عامر تھا۔ عامر اس کی
 مدد کر آیا۔ وہ اس سے بہت پہلے سے محبت کرتا تھا اور ندا
 اس محبت سے واقف بھی تھی مگر اس نے اس سے پہلے بھی
 عامر کو اہمیت نہیں دی تھی مگر وہی اس صورت حال میں اس
 کا نجات دہندہ بن کر آیا تھا۔

☆☆☆

”آئی آپ مجھے معاف کر دیں۔“

”بیٹا کامی میری اولاد ہے اس نے میرے اعتماد کو دھوکا
 دیا لیکن میں نے اسے معاف کر دیا۔ تم سے بھی کہا تھا.....“
 ”میں کون ہوتی ہوں معاف کرنے والی میں تو خود
 گناہ گار ہوں۔“ وہ پھر رونے لگی۔ ”پاپا سے معافی بھی نہیں
 مانگ سکتی، کامی نے آپ کے اعتماد کو دھوکا دیا تو میں نے بھی
 پاپا کی عزت نہیں رکھی۔“
 ”تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ تم عامر سے کہو وہ تمہیں
 اسپتال لے جائے۔“

ندا گہری سانس لے رہی تھی۔ ”آئی مجھے آپ کو
 کچھ اور بھی بتانا ہے۔ اس دن کامی ریستوران میں میرا ہی
 نظارہ کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے التجا کی تھی کہ میں ایک بار
 اس سے مل لوں اور اس کے روبرو اسے معاف کر دوں
 مگر میرا دل نہیں مانا تھا اور میں آنے کا کہہ کر بھی نہیں گئی۔
 پھر وہ حادثہ ہو گیا۔ پتا نہیں اس روز میں اتنی سبک دل کیوں
 ہو گئی تھی۔“

اب رعنا کو پتا چلا کہ کامی اس ریستوران میں کیا کر رہا
 تھا۔ ”وہ..... اپنے کیے پر شرمندہ تھا؟“
 ”ہاں، مگر شاید میں شرمندہ نہیں ہوئی بس اسے ہی
 قصور وار سمجھتی رہی۔“ ندا رونے لگی۔ ”میں بھی تو گناہ
 گار تھی۔“

”ندا مت رو، تمہاری طبیعت اور خراب ہو جائے گی۔“
 ”میرا..... میرا سانس رگ رہا ہے۔“ وہ ہانپنے
 لگی۔ ”اللہ حافظ آئی میرے لیے دعا کیجئے گا کہ اللہ مجھے
 معاف کر دے۔“

ندا نے کہتے ہی کال کاٹ دی اور رعنا سے کال بیک

سے ملنے لگے مگر جب ان کی ملاقاتوں کی خبریں یونیورسٹی
 میں پھیلنے لگیں تو انہوں نے باہر ملنا شروع
 کر دیا۔ انہوں نے اس ریستوران کا انتخاب کیا کیونکہ یہ
 ان دونوں کے گھروں اور حلقہ احباب سے دور تھا اور
 یہاں کسی جان پہچان والے کے ملنے کا امکان بھی کم تھا۔
 مگر یہاں سے معاملات بالآخر اس طرف مڑے
 جس کا انہوں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ برائی آدمی کو یونہی
 چھوٹی ہے اور مرد و عورت کے درمیان تیسرا شیطان ہوتا
 ہے، اس کا اندازہ انہیں اس وقت ہوا جب کامی ایک بار
 اسے گھر لے آیا۔ پہلی بار تنہائی ملی تو وہ بہک گئے اور
 بہت دور نکل گئے۔ ندا نے حواس کھوئے تھے مگر اسے اتنا
 احساس تھا کہ کامی نے اس کی کچھ تصاویر بھی لی تھیں، وہ
 پہلے بھی اس کی تصویریں لیتا رہا تھا مگر یہ عام نہیں
 تھیں۔ ندا کو ہوش آیا تو اس نے کامی سے کہا کہ وہ ان
 تصویروں کو ڈیلیٹ کر دے اور اس نے یقین دلایا کہ وہ
 ایسا ہی کرنے گا۔ جذبات کا بھوت سر سے اتر تو دونوں
 ہی احساس گناہ سے ایک دوسرے سے نظریں چار رہے
 تھے۔ بنیادی طور پر دونوں کی تربیت اچھے ماحول میں
 ہوئی تھی اس لیے بہک جانے کے باوجود انہوں نے
 اسے ٹھیک نہیں سمجھا تھا۔

اس واقعہ کے بعد وہ ایک دوسرے سے گریز کرنے
 لگے تھے۔ صرف کامی پیچھے نہیں ہٹا تھا، ندا بھی اس سے ملنے
 سے ہچکچا رہی تھی۔ اس کے بعد وہ باہر بھی نہیں ملے تھے۔ پھر
 ایک دن کامی نے اسے کال کی۔ اس نے ندا سے کہا۔ ”میں
 تم سے ملنا چاہتا ہوں اسی ریستوران میں۔“
 ”کیوں؟“ ندا نے کسی قدر تلی سے کہا۔ ”تم نے اپنا
 مطلب تو نکال لیا ہے۔“

کامی نے آہستہ سے کہا۔ ”ندا میرا قصور زیادہ ہے
 اور تم سے معافی چاہتا ہوں۔ بس ایک بار مل لو بے شک اس
 کے بعد میری کال بھی ریسیو مت کرنا۔“

ندا میں احساسِ ندامت زیادہ تھا مگر وہ کامی کو قصور دار
 ... سمجھ رہی تھی کہ وہ اسے اسی مقصد کے تحت گھر لے گیا
 تھا۔ اس لیے اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے کامی سے
 کہا۔ ”میں تمہاری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ آج کے
 بعد مجھے کال مت کرنا۔“

کامی کو بھی غصہ آ گیا تھا۔ ”ٹھیک ہے اگر تم مجھ سے
 بات نہیں کرنا چاہتے تو میں بھی تم سے بات نہیں کروں گا۔“
 اس کے چند دن بعد ندا کی طبیعت خراب ہوئی اور

زندگی میں بہت دکھ دیکھے ہیں۔“
 ”میں دعا کروں گی..... ضرور کروں گی۔“ وہ بھی
 رونے لگی تھی۔ ”اس کی زندگی اور صحت کے لیے بھی کی تھی پر
 اللہ کو منظور نہیں تھا۔“

”میں پھر کال کروں گا، ابھی ندا کو دیکھنا ہے۔“
 سمیل احمد نے کہا اور کال کاٹ دی۔ رعنا پھوٹ پھوٹ کر
 رو دی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کا کوئی عزیز مر گیا ہو۔ جیسے
 کامی کا انتقال ہوا تھا، تب اس نے ایسا ہی دکھ محسوس کیا
 تھا۔ بہت دیر رونے کے بعد اس کا دل ہلکا ہوا تو اس نے
 ندا کے لیے دعا کی۔ اللہ سے اس کی اور کامی کی مغفرت
 کے لیے دعا مانگی۔ اسے رہ رہ کر اس بچے کا خیال آ رہا تھا
 جو باپ سے تو پیدائش سے پہلے ہی محروم ہو گیا تھا اور جب
 دنیا میں آیا تو ماں بھی ساتھ چھوڑ گئی۔ اس کا کیا ہوگا؟ اسے
 کون دیکھے گا؟ رعنا جانتی تھی کہ انسان کا بچہ مل ہی جاتا
 ہے، چاہے اس کا دنیا میں ایک بھی خون کا رشتہ نہ ہو اس
 کے باوجود اس کا دل کٹ رہا تھا۔ اس سارا دن وہ سوچتی
 رہی۔ سمیل سے بچے کا پوچھ کر اس کی امت نہیں ہو رہی
 تھی۔ وہ جانتی تھی سمیل کے لیے یہ سب سے بڑا دکھ تھا۔
 اسے سمیٹنے میں کچھ وقت لگتا۔

رعنا نے آج کی بھی چھٹی کر لی تھی۔ اس نے آفس
 فون کر کے اطلاع دی۔ تھی لیکن اگلے دن وہ دفتر گئی اور اس
 نے اپنا ذمے داری نبھانا شروع کر دی۔ وہ ایک حد سے
 زیادہ چھٹی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کسی کے جانے سے
 دنیا کے کام نہیں رکستے۔ اسے بھی کام کرنا ہی تھا اور وہ کام نہ
 کرتی تو کبھی اس کی جگہ کسی اور کو رکھ لیتی۔ کام چلتا
 رہتا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے دیکھ کر کہا تھا۔ وہ خود پر
 جبر کر کے خوش مزاجی بھی دکھاتی رہی۔ وہ ظاہر کرنا چاہتی تھی
 کہ وہ سوگ کی کیفیت سے نکل آئی ہے۔ ندا کا دکھ وہ کس
 حیثیت سے منانی اور دوسروں کو اس بارے میں کیا بتاتی،
 اس لیے وہ اس دکھ کو اندر ہی اندر سکتی رہی۔ دوسرے دن
 بھی اس نے سمیل احمد کو کال نہیں کی۔ ندا کی تدفین ہو چکی
 تھی مگر وہ ابھی سمیل احمد کو مزید وقت دینا چاہتی تھی تب ہی وہ
 اس سے رابطہ کرتی۔

☆☆☆

نرم اور گرم بلیکف میں لپٹا بچہ اپنی کھلی آنکھوں سے
 اسے دیکھ رہا تھا۔ گلابی رنگت اور بہت نازک سے نقوش
 تھے۔ پہلے وہ سنجیدہ رہا تھا پھر اس کے ہونٹ کھلے اور وہ
 مسکرانے لگا۔ اس مسکراہٹ نے رعنا کو اندر تک مرشار کر دیا

کرنے جا رہی تھی کہ اسے خیال آیا اور اس نے سمیل احمد کا
 نمبر ملایا۔ اس نے تیسری نفل پر کال ریسیو کی اور
 بولا۔ ”رعنا آپ.....؟“

”سمیل میری ابھی ندا سے بات ہوئی ہے۔“ رعنا نے..
 بلا تمہید کہا۔ ”اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، شی نیڈ ٹریٹمنٹ۔“
 اس کی بات سن کر سمیل فوراً تھک پہنچ گیا۔ ”اوکے
 میں دیکھتا ہوں۔“ اس نے کہتے ہی کال کاٹ دی۔ رعنا نے
 موبائل سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور جگ سے پانی نکال کر پیا،
 اس کا گلانشک ہو رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد سمیل نے اسے
 کال کی۔ ”عامر اسے اسپتال لے جا رہا ہے میں بھی راستے
 میں ہوں۔“

”اللہ کرے سب خیر خیریت سے ہو جائے۔“
 ”آپ دعا کریں۔“ سمیل احمد نے کہا۔ ”ندا نے
 آپ کو کیوں کال کی تھی؟“

”اس کی طبیعت خراب ہو رہی تھی اور وہ نادم ہو رہی
 تھی کہ اس نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا وہ سوری کر رہی
 تھی۔ پھر مجھے لگا کہ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے تو میں نے
 آپ کو کال کی۔ میں نے ٹھیک کیا تھا؟“

”آپ نے بروقت کال کی کیونکہ میں نے ہی عامر کو
 کال کر کے جگایا، ورنہ ندا نے اسے نہیں بتایا تھا وہ لاؤنج
 میں تھی۔“

”پلیز مجھے باخبر رکھیے گا۔“

”میں آپ کو اپ ڈیٹ کرتا رہوں گا۔“ سمیل احمد
 نے اسے یقین دلایا۔ اس سے بات کر کے رعنا نے وضو کیا
 اور دو رکعت نماز پڑھ کر ندا اور اس کے ہونے والے بچے
 کے لیے دعا کی۔ دعا کر کے اسے سکون ملا تھا مگر اندر ایک
 ہلکی سی کھٹک ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ صبح تک جاگتی رہی۔ فجر کی
 اذان پر اس نے تازہ وضو کیا اور نماز پڑھ کر سلام پھیرا
 تھا کہ موبائل کی نفل بجی، اس نے لپک کر موبائل اٹھایا۔
 سمیل احمد کی کال تھی اور رعنا نے کال ریسیو کی تو سمیل احمد
 کے رونے کی آواز سن کر اس کا دل بیٹھ گیا۔

”سمیل کیا ہوا..... ندا اور بچہ ٹھیک ہے نا؟“

”بچہ ٹھیک ہے۔“ سمیل نے خود پر قابو پاتے ہوئے
 کہا۔ ”پتا ہے۔“

”اور ندا؟“ رعنا نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔
 ”شی از ڈیڈ۔“ سمیل احمد بھر رونے لگا تھا۔ ”اس کی
 حالت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے بچانے کی
 کوشش کی مگر..... رعنا اس کے لیے دعا کرنا۔ میری بچی نے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریٹریوم ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر پو پو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety

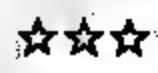


twitter.com/paksociety1

پھر اس نے کہا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم دونوں مل کر اس کی پرورش کریں؟"
 رعنا کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ سمیل احمد ایک بار پھر اسے پروپوز کر رہا تھا اور اس بار اس کے پاس انکار کا جواز بہت کم تھا۔ نذا نہیں رہی تھی اور عامر بھی یہاں سے جانے والا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ بچہ اصل میں کس کا تھا۔ صرف وہی جانتی تھی اور وہی سب سے زیادہ اس کی حق دار تھی مگر اس کا حق اُن لکھا تھا۔ عام حالات میں اسے کسی صورت یہ بچہ نہیں مل سکتا تھا لیکن اگر وہ سمیل احمد سے شادی کر لیتی تو اسے اس کا حق مل جاتا۔ وہ بچے کو سینے سے لگائے سوچ رہی تھی اور سمیل احمد متوقع نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا پھر وہ آنسوؤں کے درمیان مسکرائی تو سمیل احمد بھی مسکرانے لگا۔ وہ اٹھ کر رعنا کے پاس آیا اور اس نے بچے کے چہرے پر ہاتھ رکھا۔

"اسے ہم دونوں مل کر پالیں گے۔"

"ہاں یہ ہمارا بچہ ہے۔" رعنا کا لہجہ رندہ گیا تھا۔ "اسے ہم پالیں گے۔"



شاہد مرتجائے چہرے اور بڑھی شیو کے ساتھ عدالت کے کٹہرے میں کھڑا اپنی قسمت کا فیصلہ سن رہا تھا۔ تو اہوں اور ثبوتوں کی روشنی میں اسے قتل کا مرتکب قرار دیا گیا تھا اور جج نے اس کی طرف سے رضا کارانہ اعتراف کی وجہ سے اسے عمر قید کی سزا سنائی تھی۔ یہ سزا سن کر اس کا چہرہ زرد ہونیا تھا۔ اس کے ماں باپ، رشتے دار اور دوسرے لوگوں کے ساتھ میڈیا بھی وہاں موجود تھا۔ جیسے ہی جج نے سزا سنائی کر اپنے فیصلے پر مہر ثبت کی عقوبتوں سے رعنا اور اس کے ساتھ سمیل بھی کھڑے ہو گئے۔ رعنا نے بلند آواز سے کہا۔ "میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

تمام لوگ ان کی طرف گھوم گئے۔ رعنا نے بات جاری رکھی۔ "شاہد نے میرے اکلوتے بیٹے کا مران کو قتل کیا۔ اگرچہ یہ قتل غلط تھی کی وجہ سے ہوا مگر شاہد نے سوچ سمجھ کر یہ کام کیا ہوگا۔ اس کے باوجود میں صرف اللہ واسطے اسے معاف کرتی ہوں۔ میری طرف سے باقی کارروائی میرا وکیل کرے گا اور اسے میرا حتمی بیان سمجھا جائے۔"

یہ کہہ کر رعنا سمیل احمد کے ساتھ پلٹ کر باہر چلی گئی جس کی گود میں ننھا عدنان تھا۔ میڈیا والے ان کے پیچھے لپکے تھے اور شاہد کے اہل خانہ اس سے لپٹ گئے تھے۔

تھا۔ مگر اس کی آنکھوں کے لرزتے آنسوؤں میں بیک وقت دکھ بھی تھا اور خوشی بھی۔ اس نے بچے کو سینے سے لگا لیا اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "میرا بیٹا..... میرا کامی....."
 ندا کے انتقال کے تیسرے دن وہ آفس سے گھر آئی اور ابھی لاؤنج میں چادر اتار رہی تھی کہ گیٹ کی کال بیل بجی۔ وہ دوپٹا ٹھیک کرتی ہوئی باہر آئی تو دروازے پر سمیل احمد کھڑا تھا۔ اس نے ایک بے بی کارٹ اٹھا رکھا تھا جس میں ہلیکٹ میں لپٹا بچہ تھا۔ رعنا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، اس نے یہ مشکل خود کور وکا۔ ورنہ وہ سمیل احمد سے جھپٹ کر کارٹ لینے والی تھی۔ اسے بروقت خیال آیا کہ یہ ظاہر اس بچے سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے آہستگی سے اسے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ سو رہا تھا اور ایک نظر میں وہ اسے... دیکھ کا می لگا جب اس نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ پھر اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ اس نے اسے سینے سے لگا کر زیر لب کامی کہا تھا اور پھر سمیل سے بولی۔

"یہ ندا کا....."

"بیٹا ہے۔" سمیل احمد دھمکے لہجے میں بولا۔ "کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟"

رعنا نے اسے پیچھے ہٹ کر راستہ دیا اور اسے اندر لاؤنج میں لے آئی۔ سمیل احمد نے خالی بے بی کارٹ میز پر رکھ دیا۔ رعنا نے بچے کے گالوں کو چوما اور بولی۔ "آپ اسے دکھانے لائے ہیں؟"

"پرسوں یہ اپنی ماں سے محروم ہوا تھا۔" سمیل احمد نے کہا۔ "آج یہ باپ سے بھی محروم ہو گیا ہے۔"

رعنا چونکی۔ "کیا مطلب؟"

"عامر ہمیشہ کے لیے ملک سے باہر جا رہا ہے۔ اسے آسٹریلیا کا اسٹوڈنٹ ویزا مل گیا ہے اور اس کا کہنا ہے اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس نے اپنا بیٹا میرے حوالے کر دیا ہے۔"

رعنا اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ عامر نے اپنا نہیں ندا کا بیٹا اس کے باپ کے حوالے کیا تھا۔ وہ اس بچے کی اصلیت اچھی طرح جانتا تھا اور پھر ندا نہیں رہی جس کی خاطر اس نے اس بچے کو قبول کیا تھا تو اس بچے کو ساتھ رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ رعنا نے محبت سے اسے دیکھا۔ وہ اس کا پوتا تھا۔ سمیل احمد تھا ہوا لگ رہا تھا اس نے کہا۔ "میں کل سے اس کی دیکھ بھال کر رہا ہوں لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ یہ مجھ اکیلے کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لیے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے رکا

